آموزش

۱۰، شماره ۴] لاهور [جولائی ۵۷

اس شمارہ میں

تعلیمی ماہنامہ

آموزش

لاہور

جولائی ۱۹۵۷ء

سالانہ چندہ

جلد ———— ۱۰

شمارہ ———— ۴

پاکستان کے لیے ۶ رو۔

غیر ممالک کے لیے [illegible] روپے

قیمت فی پرچہ دس آنے

پبلشرز

یونیورسٹی بک ایجنسی۔ لاہور۔

آر۔ ایچ۔ ڈی خالد پرنٹر پبلشر نے دین محمدی پریس لاہور میں طبع کرا کے
یونیورسٹی بک ایجنسی ۲ کچہری روڈ لاہور سے شائع کیا

بچوں کی رہ نمائی

ایم۔ اے مخدومی

جولائی کے پہلے ہفتے میں مغربی پاکستان کے صدر مقام لاہور میں بچوں کی رہ نمائی کے موضوع پر علمی مذاکرات کا ایک سلسلہ جاری رہا۔ ان کے اختتام پر ڈائرکٹر تعلیمات لاہور   کی طرف سے ایک پیغام پڑھ کر سنایا گیا جس میں مذاکرات میں حصہ لینے والوں کو یقین دلایا گیا تھا کہ ان کی پیش کردہ سفارشات کو عملی جامہ پہنانے کے لیے ہر ممکن کوشش کی جائے گی۔ اس پیغام میں یہ وضاحت بھی کی گئی تھی کہ محکمہ تعلیم بچوں کی رہ نمائی کے موضوع پر مختلف مقامات پر کانفرنسیں اور علمی مذاکرات کے انعقاد کا ارادہ رکھتا ہے تاکہ رائے عامہ دور حاضر کی اس اہم تعلیمی ضرورت کے ما و علیہ کو اچھی طرح سمجھ جائے۔

بچوں کی رہ نمائی ہمارے یہاں ابھی ایک نئی چیز ہے۔ مگر ترقی یافتہ ملک یہ مفید تعلیمی خدمت دیر سے انجام دے رہے ہیں تعلیمی رہ نمائی کی ضرورت تعلیم کے جدید تصوّر کی براہ راست پیداوار ہے۔ جدید تعلیم کا سارا نظام کار اس نفسیاتی حقیقت پر مبنی ہے کہ ہر بچہ کچھ یگانہ صلاحیتیں لے کر پیدا ہوتا ہے، مدرسے اور معاشرے کی ذمہ داری یہ ہے کہ ہر بچے کی مخصوص صلاحیتوں کو زیادہ سے زیادہ صحت کے ساتھ دریافت کرے اور ان کی پوری پوری نشوونما کے لیے ہر طرح کی سہولتیں بہم پہنچائے۔ اپنی مخصوص ضرورتوں اور صلاحیتوں کے حسب حال تعلیمی مواقع حاصل کرنا ہر بچے کا پیدائشی حق ہے، اسے اس حق سے محروم رکھنا نہ صرف اس معصوم پر زیادتی ہے بلکہ خود معاشرے کے لیے بھی بے حد ضرر رساں۔

ہر بچے کے میلانات، دلچسپیاں اور خوابیدہ صلاحیتیں معلوم کرنے کے لیے جدید تعلیم نے طرح طرح کے آلات، ترکیبیں اور آزمائشیں وضع کی ہیں۔ ان میں ذہنی خارج قسمت کی پیمائش۔ میلانات کی آزمائش، مجموعی ریکارڈ اور اس قسم کی دوسری ترکیبیں زیادہ اہم ہیں۔ جدید مدرسہ تدریس مضامین سے زیادہ اہمیت بچے کی افتاد طبع اور اس کی استعداد کو دیتا ہے۔ وہ بجا طور پر اس بات پر زور دیتا ہے کہ تدریس مضامین اسی وقت

خاطر خواہ نتائج پیدا کر سکتی ہے جب وہ پڑھنے والوں کی استعداد کے حسب حال ہو۔ اگر اسے یونہی اندھا دھند بچوں پر ٹھونسا جائے گا تو بجائے فائدہ کے الٹا نقصان ہوگا۔

جدید تعلیم کی اس اہم ضرورت کو پورا کرنے کے لیے اب استاد کے لیے اپنے مضمون کا ماہر ہونا ہی کافی نہیں، اس کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ پیمائش و آزمائش کی جدید تکنیکوں سے کام لینا اور ان سے نتائج اخذ کرنا جانتا ہو۔ یہ کام بذات خود اتنا اہم اور اتنا بوجھل ہے کہ ایک عام استاد تدریسی مضامین کے ساتھ ساتھ اسے کما حقہٗ انجام نہیں دے سکتا۔ ہر بچے کی خوابیدہ صلاحیتوں، دلچسپیوں اور معاشرتی پس منظر کو معلوم کرنا، بچے اور اس کے والدین کو ان زبردست عوامل کے حسب حال طریق کار اختیار کرنے پر آمادہ کرنا، یہ اور اس قسم کی دوسری ذمہ داریاں جو بچوں کی رہ نمائی کی ذیل میں آتی ہیں، ایک ایسے استاد کے بس کی بات نہیں، جسے دوسرے تدریسی فرائض بھی انجام دینے ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ ترقی یافتہ ممالک میں عموماً ہر مدرسے کے عملے میں ایک ایسا استاد بھی ہوتا ہے جو رہ نمائی کے فن کا ماہر ہو۔ ہم ابھی دیر تک اس قابل نہ ہو سکیں گے کہ ہر مدرسے میں رہ نمائی کا ایک ماہر مہیا کر سکیں جب تک ایسا نہیں ہو سکتا، اسوقت تک دوسرے اساتذہ ہی کو رہ نمائی کی تھوڑی بہت خدمت انجام دینی چاہیے۔ ترقی یافتہ ملکوں میں بھی آغاز کار اسی طرح ہوا تھا اور اب بھی وہاں بہت سے مدرسے ایسے موجود ہیں، جہاں عام استاد ہی یہ خدمت انجام دے رہے ہیں۔

بچوں کی رہ نمائی کے متعلق اوپر جو کچھ کہا گیا ہے اس سے ظاہر ہے کہ یہ اہم تعلیمی خدمت والدین کے تعاون کے بغیر انجام نہیں دی جا سکتی۔ اس کی انجام دہی کے لیے ایک لازمی شرط یہ ہے کہ والدین استاد کو ایک فنی ماہر سمجھ کر اس کی تشخیص کو قبول کریں، اور اس کے ساتھ مل کر بچے کے خصوصی میلانات اور صلاحیتوں کے پھلنے پھولنے کے لیے سازگار فضا اور سامان فراہم کریں۔ یہی وجہ ہے کہ محکمہ تعلیم نے اپنے پروگرام میں رائے عامہ کی تربیت کو اولیت دی ہے، جب تک والدین کو یہ معلوم نہیں ہو جاتا کہ بچوں کی رہ نمائی کیوں ضروری ہے اور اس کی باگ ڈور کن ہاتھوں میں ہونی چاہیے، اس وقت تک بچوں کی رہ نمائی کا کوئی منصوبہ پروان نہیں چڑھ سکتا۔ تعلیمی ماہروں اور استادوں کو چاہیے کہ رائے عامہ کی تربیت کے لیے کوئی جامع منصوبہ تیار کریں، اور اسے سرگرمی کے ساتھ عملی جامہ پہنائیں۔

یونی ورسٹی اور ریاست

فضل احمد

برصغیر پاکستان و ہند میں جدید یونی ورسٹیاں حکومت کی حوصلہ افزائی اور مدد سے وجود میں آئیں، اور اب تک اسی کی زیر نگرانی ترقی کے مدارج طے کر رہی ہیں۔ غیر منقسم ہندوستان میں علی گڑھ اور بنارس پرائیویٹ یونی ورسٹی کی دو نمایاں مثالیں تھیں۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ یہ دونوں یونیورسٹیاں بھی سرکاری اثر سے بالکل اسی طرح متاثر تھیں جس طرح ملک کی دوسری یونیورسٹیاں۔ حکومت سے زر امداد حاصل کیے بغیر علی گڑھ یونی ورسٹی کا وجود میں آنا مشکل تھا۔ اور سرکاری زر امداد کے ساتھ سرکاری نگرانی اور سرکاری اثرات کا آنا ناگزیر تھا۔ جن دنوں علی گڑھ کالج کو یونیورسٹی کا درجہ دیا جانے والا تھا، ان دنوں اس تحریک کے ایک سرگرم حامی نے اپنے مقصد کی وضاحت اس فارسی شعر کے ذریعہ کی تھی:۔

مرا از لفظ یونیورسٹی یک مدعا باشد
کہ ایں سررشتہ تعلیم ما در دست ما باشد

اس پر ایک دل جلے نے جو زر اعانت دینے والے سرکاری ہاتھ کے عزائم کو پوری عریانی کے ساتھ دیکھ رہا تھا یہ مصرعہ کہا:۔

ولے شرط است کیں دست شما دشت شما شد

مغربی روایات

ہمارے ملک میں یونیورسٹیوں کو اگر چار و ناچار سرکاری سرپرستی اور نگرانی قبول کرنا پڑی تو یہ امر مخصوص تاریخی حالات کی پیداوار تھا۔ یورپ اور امریکہ میں یونیورسٹی کا ارتقا مختلف خطوط پر ہوا ہے۔ یورپ میں تحریک احیائے علوم نے یونیورسٹیوں کو جنم دیا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب یورپ صدیوں کی نیند سے یک دم بیدار ہو کر علم و حکمت کی تلاش میں نکلا تھا۔ علمی پیاس پورے زوروں پر تھی۔ علم و حکمت کے متلاشی اس دھن کی خاطر زندگیاں وقف کیے ہوئے تھے۔ علم و حکمت کے ان متوالوں نے یورپ میں جگہ جگہ مرکز قائم کر لیے۔ دوسرے لوگ علمی سیرابی کے لیے

ان مرکز داں میں جمع ہو گئے اور یہ مرکز رفتہ رفتہ پاکیزہ تشخص کا حامل اختیار کر گئے۔ یہ سب جدید یونیورسٹی کی تاریخ کا آغاز۔

ظاہر ہے کہ جدید یونیورسٹی کے تصور میں تلاش حق کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ جو لوگ یونیورسٹی میں پڑھائیں یا تعلیم پائیں، ان کا واحد مقصد سچائی کی تلاش ہونا چاہیے۔ قطع نظر اس کے کہ یہ تلاش کن حقائق کو بے نقاب کرتی ہے، حقیقت بذات خود مقصود ہے اور اس کے لیے کوئی قیمت بھی زیادہ بڑی نہیں۔ یہ ہے آزادیٔ فکر اور آزادیٔ تحقیق کا وہ مشہور اصول جو جدید یونیورسٹی کی فکری بنیاد کا درجہ رکھتا ہے۔ دنیا کی مشہور و معروف یونیورسٹیاں وہی یونیورسٹیاں ہیں جنہوں نے اس اصول کو زیادہ سے زیادہ اپنایا اور اس کی خاطر کسی قربانی سے دریغ نہ کیا۔

دشوار کام

تاہم آزادیٔ فکر و عمل کو برقرار رکھنا اتنا آسان کام نہیں جتنا یہ بظاہر نظر آتا ہے۔ مغربی یونیورسٹیاں بھی ہمیشہ اس آزادی کو برقرار نہیں رکھ سکیں۔ یہ یونیورسٹیاں اول اول کلیسا کی گرفت میں تھیں، ان کے لیے قطعاً یہ ممکن نہ تھا کہ کسی ایسے نظریے کی تعلیم دیں جو مسیحی دین کی مسلّمہ تعلیمات کے ساتھ ٹکراتا ہو۔ مشہور سائنسدان گلیلیو کے سائنسی نظریات نے پادریوں کو جس طرح برافروختہ کیا تھا، اس کا حال سب کو معلوم ہے۔ لیکن علم و سائنس کی پیش قدمی کے ساتھ جوں جوں مسیحی دین کی گرفت یورپ پر ڈھیلی پڑتی گئی اسی قدر یورپی یونیورسٹیاں آزاد ہوتی گئیں۔

پوپ کا اقتدار گھٹنے کے ساتھ ہی یورپ میں آزاد قومی ریاستوں نے جنم لیا۔ اس نو خیز اور تند و تیز قومیت نے بھی یونیورسٹی کو اپنے قابو میں رکھنے کی کوشش کی، اور بسا اوقات یونیورسٹیوں کو اپنی آزادی برقرار رکھنے کے لیے خاصی مہنگی جنگ لڑنا پڑی۔ تاہم انیسویں صدی میں یونیورسٹی کی علمی آزادی کا اصول عموماً تسلیم کر لیا گیا، اور عام حالات میں اس کا احترام بھی کیا جانے لگا۔

یونیورسٹی کو زیر اثر رکھنے کی کوششیں موجودہ زمانے سے مخصوص نہیں۔ قدیم زمانے کی یونانی اکاڈمی بھی جسے پیمانے پر ایک یونیورسٹی تھی، معاشرے نے اسے اپنی مرضی کے تابع رکھنے کی جو کوشش کی وہ تاریخ کا ایک افسوسناک واقعہ ہے۔ سقراط جیسے عظیم انسان نے فکری آزادی کی حفاظت کے لیے اپنی جان لطیف قیمت ادا کی۔

مغربی یونیورسٹیاں:- مغرب میں یونیورسٹی کی آزادی کا اصول اب پوری طرح تسلیم کیا جا چکا ہے۔ اب

اصول کو ناکارہ بنانے کے لیے اب بھی الیٹہ دوانیاں ہوتی رہتی ہیں۔ لیکن کھلم کھلا اس کی مخالفت کا حوصلہ کسی میں نہیں۔ برطانیہ میں یونیورسٹی قائم کرنے کے لیے پارلیمنٹ کا قانون ضروری ہے۔ اس کی دوسری صورت یہ ہے کہ کسی پرائیویٹ ادارے کو شاہی فرمان کی رو سے یونیورسٹی قائم کرنے کی اجازت مل جائے۔ امریکہ میں سرکاری اور پرائیویٹ یونیورسٹیاں پہلو بہ پہلو چل رہی ہیں۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ پرائیویٹ یونیورسٹیاں بہت زیادہ قدیم اور زیادہ مشہور ہیں۔ ان کی شہرت کا یہ عالم ہے کہ ان کی فیس سرکاری یونیورسٹیوں کے مقابلہ میں کہیں زیادہ ہے، پھر بھی ان میں داخلہ حاصل کرنا ایک امتیاز خیال کیا جاتا ہے۔ کولمبیا۔ ہارورڈ۔ ییل اور پرنسٹن سب پرائیویٹ یونیورسٹیاں ہیں۔ ان یونیورسٹیوں کے اقتدار اور مالی وسائل کا یہ عالم ہے کہ وہ مختلف علوم کے مشہور ترین استادوں کو اپنے ہاں کھینچ لانے میں عموماً کامیاب ہو جاتی ہیں۔

ہماری یونیورسٹیاں

جہاں مغربی یونیورسٹیاں زیادہ تر افراد اور پرائیویٹ انجمنوں کی قائم کردہ ہیں۔ یا کم از کم مغرب میں یونیورسٹیاں قائم کرنے کا آغاز پرائیویٹ افراد نے کیا۔ وہاں برصغیر پاکستان و ہند میں اس کام کی ابتدا حکومت نے کی۔ ہندوستان کی سب سے پرانی یونیورسٹیاں کلکتہ، بمبئی اور مدراس کی یونیورسٹیاں ہیں۔ یہ تینوں کی تینوں سر چارلس وڈ کے سنہ ۱۸۵۴ء کے مشہور سرکاری خط کے نتیجہ کے طور پر وجود میں آئیں۔ سرکاری سرپرستی کی یہ روایت کچھ اس طرح مستحکم ہوئی کہ برطانوی عہد میں دو ایک استثناؤں کو چھوڑ کر تمام ہندوستانی یونیورسٹیاں حکومت نے قائم کیں۔

آزادی کی آمد کے بعد برصغیر پاکستان و ہند دو آزاد اور خود مختار ملکوں میں بٹ گیا۔ لیکن ہر دو ملکوں میں یونیورسٹی کی روایات میں کچھ فرق نہ آیا۔ پاکستان میں پشاور، کراچی اور راج شاہی کی نئی یونیورسٹیاں قائم ہوئیں اور تینوں کی تینوں حکومت نے قائم کیں۔ بالکل یہی حال ہندوستان کا ہے بلکہ ۱۹۵۶ء میں ہندوستان میں یونیورسٹی گرانٹ کمیشن ایکٹ منظور ہوا۔ اس قانون کی رو سے آئندہ کوئی ادارہ اپنے آپ کو یونیورسٹی کا نام نہیں دے سکتا۔ تاوقتیکہ صوبائی یا مرکزی حکومت کا قانون اسے ایسا کرنے کی اجازت نہ دے۔

علمی آزادی

برصغیر پاکستان و ہند کی یونیورسٹیوں کی مخصوص تاریخ کے پیش نظر یہ نہ سمجھ لینا چاہیے کہ یہ علمی آزادی کو

فضا سے عاری رہی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ برطانوی عہد میں بھی ان یونیورسٹیوں کو کافی حد تک علمی آزادی حاصل رہی ہے۔ اس کی وجہ یہ کہ یہ یونیورسٹیاں ایک ایسے دور میں وجود میں آئیں جب یورپ میں یونیورسٹیوں کی علمی آزادی کا اصول تسلیم کیا جا چکا تھا۔ اس کی دوسری وجہ یہ تھی کہ حکومت ہند کے جن افراد نے یونیورسٹیوں کی بنیاد ڈالی وہ علمی آزادی کے نصب العین کے سرگرم حامی تھے۔ مثلاً میکالے نے یہاں تک کہہ دیا تھا کہ اگر مغربی تعلیم کے نتیجے کے طور پر ہندوستانی بھی جمہوری اداروں اور آزادیوں کا مطالبہ کرنے لگیں تو اسے اس بات پر ہرگز افسوس ہوگا بلکہ وہ اس بات پر فخر کرے گا۔ اور جس روز ہندوستان اپنے لیے آزادی حاصل کرے گا وہ اسے برطانوی تاریخ کا سنہرا دن خیال کرے گا۔ یہ اسی بات کا نتیجہ تھا کہ گو ملک کو سیاسی آزادی نصیب نہ تھی۔ ہندوستانی یونیورسٹیوں کو برطانوی راج کے دنوں میں بھی بڑی حد تک علمی آزادی حاصل رہی۔

اس علمی آزادی کی ایک اور وجہ مقامی روایات تھیں۔ برصغیر پاکستان و ہند کی ثقافت، قدیم ہندو روایات اور اسلامی روایات کے امتزاج پر مشتمل تھی۔ اور ان دونوں روایات میں علم و حکمت کا صد درجہ احترام اور جستجوئے حق کی صد درجہ پیاس موجود تھی۔

اسلام کی علم دوستی

سچ یہ ہے کہ ہندوستان میں علمی آزادی کی روایات قائم کرنے میں سب سے زیادہ حصہ مسلمان بادشاہوں نے لیا۔ یہ درست ہے کہ اس ملک میں اسلام کی آمد کے وقت علم و حکمت کا احترام ناپید نہیں تھا۔ بالخصوص بدھ مت نے اپنے دور اقتدار میں علم و حکمت کی سرپرستی کی عمدہ روایات قائم کیں۔ ٹیکسلا اور دوسرے اہم مرکزوں میں بدھ خانقاہوں کے زیر سایہ بڑے بڑے علمی مرکز قائم تھے۔ جہاں علم کے پیاسے دور دور سے کھچے چلے آتے تھے۔ ان تعلیمی اداروں کے متعلق سب سے زیادہ حیرت انگیز بات یہ تھی کہ ان کے خطیر اخراجات کی ذمہ داری راجاؤں اور امراء کے کندھوں پر تھی۔ ان لوگوں نے ان اخراجات کو پورا کرنے کے لیے بڑی بڑی جاگیریں وقف کر رکھی تھیں، جن کی آمدنی سے استادوں کے مشاہرے اور طلبہ اور اساتذہ کے اخراجات پورے ہوتے تھے، مگر اس مالی امداد کے باوجود، راجاؤں یا حکمرانوں نے کبھی یہ کوشش نہ کی تھی کہ نصاب تعلیم یا طریقہ تدریس کو اپنی مرضی کے تابع رکھنے کی کوشش کریں۔

یہ تھیں ہندوستانی علمی روایات جو اس ملک کے مسلم فاتحین نے ورثہ میں پائیں، یہ درست ہے کہ برہمنیت کے غلبہ نے ان بدھ روایات کا گلا گھونٹ دیا تھا، اور جب دہلی پر اسلامی پرچم لہرانے لگا تو بدھ یونیورسٹیاں صرف پرانی کہانیاں بن چکی تھیں۔ تاہم لوگوں کے ذہنوں سے ابھی ان کی یاد پوری طرح محو نہ ہوئی تھی، ان بنیادوں پر مسلمان بادشاہوں نے ایک نئی تعمیر کا آغاز کیا۔ ہر چند کہ دہلی کے مسلمانوں کی حکومت ایک شخصی حکومت تھی۔ مگر علماء اور فضلاء کے احترام میں ان سب کی گردنیں جھکتی تھیں۔ علاء الدین خلجی جیسا تیز مزاج فاتح بھی علماء کے سامنے دم نہ مارتا تھا۔ اور محمد تغلق جیسا ذہین وفطین حکمران ان کے سامنے زانوئے ادب تہ کرنے کو سعادت سمجھتا تھا۔

علم وحکمت کے اس احترام کا قدرتی نتیجہ اشاعت علم اور علمی آزادی کا وہ دور دورہ تھا جو انگریزوں کی آمد تک قائم رہا۔ ملک میں جگہ جگہ مدرسے، مکتب اور درس گاہیں قائم ہوئیں۔ جہاں بلند رتبہ استاد درس دیتے تھے۔ ان درس گاہوں اور علمی مرکزوں کی مالی کفالت کے لیے بے دریغی کے ساتھ اوقاف عطا کیے گئے چھوٹے سے چھوٹے مدرسے کے ساتھ کوئی نہ کوئی وقف ضرور ہوتا تھا۔ بادشاہ شاہزادے، وزراء اور امراء اس بازی میں ایک دوسرے سے آگے بڑھ جانے کی کوشش کرتے تھے۔ غرض ملک بھر میں درۂ خیبر سے لے کر خلیج بنگالہ تک اور ہمالہ کے دامن سے لے کر راس کماری تک مدرسوں، مکتبوں اور اوقاف کا ایک جال بچھا تھا۔

یہ علمی مرکز گو جدید معنی میں یونیورسٹی کہلانے کے مستحق نہ تھے، تاہم ان میں علمی آزادی کی وہ فضا بدرجہ اتم موجود ہوتی تھی جو جدید یونیورسٹی کا طرۂ امتیاز ہے۔ یہ تھیں وہ علمی روایات جو ہندوستان کے انگریز حاکموں نے مسلمانوں سے ورثہ میں پائیں۔ ان روایات پر جدید یونیورسٹی کی عمارت کھڑی کرنا چنداں مشکل کام نہ تھا۔ چنانچہ ملک کی سیاسی غلامی کے باوجود انگریزوں کو یہاں جدید وضع کی یونیورسٹیاں قائم کرنے میں کچھ مشکل پیش نہ آئی اور یہ یونیورسٹیاں علمی آزادی کے معاملے میں حیرت انگیز حد تک مغربی یونیورسٹیوں کے ہم پلہ بن گئیں

آزادی کی آمد کے بعد ــ غرض ہندوستانی یونیورسٹیوں میں علمی آزادی کی روایات کافی مستحکم تھیں جب

اس برصغیر کو آزادی ملی۔ آزادی کی آمد نے ان روایات کو مزید تقویت دی۔ زمانہ مابعد آزادی میں پاکستانی اور ہندوستانی ہر دو ممالک کی یونیورسٹیوں نے اپنی علمی آزادی کی بڑی سرگرمی کے ساتھ حفاظت کی ہے۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ خود حکومت بھی ان کی علمی آزادی کو برقرار رکھنے کی خواہاں ہے۔ دونوں ملکوں کی قومی پارلیمنٹوں میں جب بھی یونیورسٹی تعلیم کے متعلق کسی مسئلہ پر بحث ہوئی ہے۔ اراکین پارلیمنٹ نے یونیورسٹیوں کی آزادی فکر و عمل کی پوری حمایت کی ہے۔

جمہوریہ پاکستان کے دستور میں آزادئ فکر، آزادئ ضمیر، آزادئ مذہب اور آزادئ اظہار کی ضمانت دی گئی ہے۔ حکومت اور عوام دونوں کو بجا طور پر اس بات کا احساس ہے کہ ان آزادیوں کو بامعنی بنانے کے لیے یونیورسٹیوں کی علمی آزادی کو قائم رکھنا اور ترقی دینا ازبس ضروری ہے۔

تاہم یہ امر ناقابل انکار ہے کہ حکومت یونیورسٹی کو زر اعانت دیتی ہے۔ اور مجلس قانون ساز اس بات کی مجاز ہے کہ اس روپے کے مصرف کے متعلق سوالات پوچھے۔ یہ امر یونیورسٹی کی علمی آزادی کے منافی ہو سکتا ہے لیکن یونیورسٹی کو زیادہ ڈر مرکزی حکومت کی مداخلت کا نہیں بلکہ صوبائی حکومت کی مداخلت کا ہے۔ صوبے کا گورنر یونیورسٹی کا چانسلر ہوتا ہے۔ یونیورسٹی کی بعض اہم آسامیاں چانسلر پر کرتا ہے۔ چونکہ گورنر صوبے کا آئینی سربراہ ہوتا ہے اور وہ صوبائی وزارت کے مشورے کے مطابق کام کرتا ہے۔ اس لیے آئینی صورت حال کا صاف تر لفظوں میں یہ مطلب ہے کہ صوبائی وزارت یونیورسٹی کے معاملات پر اثر انداز ہو سکتی ہے۔ مغربی پاکستان کے صوبے میں جہاں تین چار یونیورسٹیاں ایک ہی چانسلر کی زیر نگرانی ہیں، صوبائی حکومت کے لیے عملاً یہ ممکن نہیں کہ ہر یونیورسٹی کے معاملات کو بہت زیادہ توجہ دے، اس لیے یونیورسٹیوں کی علمی آزادی کو اس سمت سے کوئی خاص خطرہ لاحق نہیں۔

سیاسیات میں آلودگی

آزادی کی آمد سے پہلے برصغیر پاکستان و ہند کی یونیورسٹیوں نے اپنی علمی آزادی کے حق سے فائدہ اٹھا کر جذبۂ آزادی کی خوب آبیاری کی تھی۔ جنگ آزادی کی تمام منزلوں پر یونیورسٹی طلبہ اور یونیورسٹی اساتذہ نے بڑا نمایاں حصہ لیا۔ ان کا یہ کارنامہ ہمیشہ یادگار رہے گا۔ لیکن یہ عجیب بات ہے کہ آزادی کی آمد کے بعد

حدِ تقسیم کے دونوں طرف یونیورسٹیوں کی فضا سیاسی دھڑے بازی سے گندہ نظر آتی ہے۔ سب سے بڑی ستم ظریفی یہ ہے کہ ہر قومی رہنما یونیورسٹی طلبہ کو یہی مشورہ دیتا ہے کہ وہ سیاسیات سے کنارہ کش رہیں۔ اور اپنی ساری توجہ پڑھائی پر صرف کریں۔ مگر اس کے باوجود طلبہ کی دھڑے بازی میں کوئی فرق پیدا ہوتا دکھائی نہیں دیتا۔ اس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ قومی راہنما خواہ کتنے ہی خلوص سے طلبہ کو مشورہ دیں کہ انہیں سیاسیات سے دور رہنا چاہیے ان کے چیلے اس اعلان سے غالباً یہ مراد لیتے ہیں کہ طلبہ کو ان کی سیاسی جماعت کے علاوہ باقی تمام کسی سیاسی جماعت سے کچھ سروکار نہ رکھنا چاہیے۔

اس صورتِ حال نے بہت افسوسناک نتائج پیدا کیے ہیں۔ یونیورسٹی اساتذہ یہ یقین کرنے لگے ہیں کہ ان کی ترقی کا مدار ان کی قابلیت یا ان کے علمی شغف پر نہیں بلکہ ان کی سیاسی پشت پناہی پر ہے۔ چنانچہ وہ سیاسی دھڑوں کے ساتھ رابطہ پیدا کرنا ضروری سمجھتے ہیں۔ اساتذہ کی مثال نوجوان طلبہ کو بھی متاثر کرتی ہے علاوہ پڑھائی کو توجہ دینے کی بجائے اپنا وقت سیاسی جوڑ توڑ میں صرف کرنے لگتے ہیں۔ غلط یا درست طور ان کے دلوں میں یہ بات جانشین ہو جاتی ہے کہ زندگی میں ترقی کرنے کے لیے انہیں سیاسی گٹھ جوڑ پیدا کرنے چاہئیں۔ جب تک طلبہ میں یہ احساس موجود ہے، اس وقت تک کسی رہنما کا مشورہ انہیں بدنظمی اور دھڑے بازی کی عادتیں ترک کرنے پر آمادہ نہیں کر سکتا۔ اس کے برعکس اگر حالات و واقعات انہیں اس بات کا یقین دلا دیں کہ زندگی میں قابلیت کے علاوہ اور کسی چیز کا صلہ نہیں دیا جاتا تو وہ لامحالہ تمام تر توجہ مطالعہ پر صرف کرنے لگیں گے۔

زمانہ مابعد آزادی میں یونیورسٹیوں کو حکومت کی طرف سے ملنے والا زرِ اعانت مقدار اور تناسب دونوں لحاظ سے بڑھ گیا ہے۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ یہ چیز یونیورسٹیوں کی علمی آزادی کے منافی ہے۔ مگر یہ رائے درست نہیں۔ زرِ اعانت میں اضافہ کوئی ایسی شے نہیں جو صرف پاکستان کے ساتھ وابستہ ہو۔ بلکہ یہ ایک عالمی رجحان ہے۔ دنیا میں یونیورسٹیوں کو حکومت کی طرف سے ملنے والا زرِ اعانت پچھلی ایک دہائی میں بہت بڑھ گیا ہے اور یہ رجحان بدستور باقی رہے گا۔ حکومت کی بڑھتی مالی مدد کے باوجود یونیورسٹیوں کو سیاسی اکھاڑے بننے سے روکا جا سکتا ہے۔ یونیورسٹی کی علمی آزادی ہی جمہوری اقدار کی نشوونما کی بہترین ضمانت ہے۔ اس آزادی کو برقرار رکھنے کے لیے سب سے ضروری بات یہ ہے کہ زندگی میں ہر طرح کی ترقی کے لیے قابلیت کے علاوہ اور کسی

چیز کو معیار نہ بنایا جائے۔

اہم مقصد اور اس کی تکمیل

یونیورسٹی کے سامنے سب سے اہم مقصد یہ ہوتا ہے کہ وہ نوع انسان کے علمی ورثہ کو نوجوانوں کے حوالے کرے اور علم و سائنس کی حدود کو وسیع تر کرے۔ اس دوگونہ مقصد کی بجا آوری ایک پرسکون ماحول اور ایک معروضی نقطہ نگاہ کا مطالبہ کرتی ہے۔ یہ شرائط علمی آزادی کی فضا میں ہی پوری ہو سکتی ہیں۔ مکمل علمی آزادی کی فضا پیدا کیے بغیر کوئی یونیورسٹی اپنے بلند مقاصد میں کامیاب نہیں ہو سکتی۔

علمی آزادی سے یہ مراد نہیں کہ یونیورسٹی گرد و پیش کی زندگی سے کٹ کر رہ جائے۔ اساتذہ اسے عملی زندگی کے ہر شعبے کے لیے رہنما مہیا کرتے ہیں۔ اس خدمت کی موثر انجام دہی انہیں ضروری ہے۔ تاہم قومی مسائل کا فہم پیدا کرنا اور بات ہے اور متنازعہ فیہ مسائل میں طرف داری اختیار کرنا بالکل دوسری بات ہے۔ بے شک یونیورسٹی اساتذہ اور طلبہ کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ سیاسی عقاید رکھیں۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ان پر یہ فرض بھی عاید ہوتا ہے کہ ہر عقیدے اور ہر مسئلے کا بے لاگ تجزیہ کریں۔ انہیں دوسروں کا یہ حق بھی تسلیم کرنا چاہیے کہ وہ ان سے مختلف عقاید رکھیں۔ سیاسی عقاید کے اختلاف کو ملکی مسائل کے مل جل کر حل کرنے کے راستے میں رکاوٹ نہ بننے دینا چاہیے۔

دوسروں کی مثال

علمی آزادی کا یہ نصب العین کوئی ایسا نصب العین نہیں جو قابل عمل نہ ہو۔ ترقی یافتہ جمہوری ملکوں کی مثال ہمارے سامنے ہے۔ انگلستان اور امریکہ میں سیاسی جماعتیں موجود ہیں جو حصول اقتدار کے لیے ایک دوسری کے خلاف برسرپیکار رہتی ہیں۔ یونیورسٹی اساتذہ اور طلبہ مختلف سیاسی اعتقاد رکھتے ہیں اور عام انتخابات کے موقع پر وہ آزادانہ رائے دہی کے شہری حق کو پوری طرح استعمال کرتے ہیں۔ مگر ان ساری باتوں کے باوجود ان ملکوں کی یونیورسٹیاں سیاسی سرپرستی اور سیاسی انتقام کے اکھاڑے نہیں بننے پاتیں۔ وجہ یہ کہ ان یونیورسٹیوں کے اساتذہ اور طلبہ معروضی نگاہ کا مطلب سمجھتے ہیں۔ وہ اپنے سیاسی عقاید کو جذباتیت کا جامہ پہنانے کے عادی نہیں۔ سنہ ۱۹۵۲ء کے صدارتی انتخاب کے وقت راقم الحروف امریکہ

میں تھا۔ ایک روز ایڈلائی سٹیونسن ایک یونیورسٹی کے قریب عوام کو خطاب کرنے آئے۔ حاضرین میں یونیورسٹی طلبہ کی خاصی تعداد موجود تھی۔ سٹیج کے پاس ہی ایک درخت تھا۔ ایک چھوٹا لڑکا ایک جھنڈی ہاتھ میں لیے درخت پر چڑھ گیا۔ جھنڈی کے کاغذی پھریرے پر جلی حروف میں لکھا تھا "میں آئزن ہاور کو پسند کرتا ہوں"۔ لڑکا اس جھنڈی کو درخت کی چوٹی پر باندھنا چاہتا تھا کہ وہ اس کے ہاتھ سے گر گئی، وہ اسے لینے کے لیے ذرا نیچے اترا۔ اور زمین پر کھڑے نوجوانوں سے درخواست کرنے لگا کہ میری جھنڈی پکڑا دو۔ یہ نوجوان ڈیموکریٹک پارٹی کے طرف دار اور آئزن ہاور کے مخالف تھے۔ ان میں سے ایک نے جھنڈی پر پاؤں رکھ دیا۔ اس پر لڑکا چیخ کر بولا:۔ "او بدتمیز کیا کرتے ہو؟ میری جھنڈی مجھے پکڑا دو ورنہ میں خود نیچے اتر کر اسے اٹھاؤں گا" نوجوان مسکرایا اور اس نے جھنڈی پاؤں تلے سے اٹھا کر لڑکے کے ہاتھ میں دے دی۔

یہ واقعہ مشرقی تماشائیوں کے لیے بڑا حیران کن تھا۔ مگر اس کی شرح جلد ہی آنکھوں کے سامنے آگئی۔ تھوڑی دیر میں مسٹر سٹیونسن سٹیج پر آ گئے۔ جلسہ گاہ سے چند گز ہٹ کر سڑک کے اس پار آئزن ہاور کے حامی نوجوانوں کا ایک گروہ قطار بنائے کھڑا تھا۔ ان میں سے اکثر کے ہاتھوں میں جھنڈیاں تھیں جن کے کاغذی پھریروں پر "میں آئزن ہاور کو پسند کرتا ہوں" کے الفاظ تحریر تھے۔ جونہی مسٹر سٹیونسن بولنے کے لیے کھڑے ہوئے۔ آئزن ہاور کے حامی نوجوانوں نے "میں آئک کو پسند کرتا ہوں" کا فلک بوس نعرہ لگایا۔ مسٹر سٹیونسن نے اپنے مخالفین کا یہ نعرہ خندہ پیشانی کے ساتھ سنا اور ان کو مخاطب کر کے مسکراتے ہوئے بولے۔ "میں بھی اس کو پسند کرتا ہوں"۔ اس کے بعد وہ تقریر کرنے لگے اور پھر کوئی آواز سننے میں نہ آئی۔

غرض یونیورسٹی طلبہ کو ضبط نفس اور علمی آزادی کا خوگر بنانے کے لیے قومی رہنماؤں کو ان کے سامنے بلند ذاتی مثال پیش کرنی چاہیے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہر تعلیمی ادارہ اس معاشرے کا ایک چھوٹا سا عکس ہوتا ہے جس نے اسے جنم دیا ہو وہاں وہی قدریں حکمراں ہوں گی جو خود معاشرے پر حکمرانی کرتی ہوں۔ یونیورسٹی چوں کہ نظام تعلیم کی آخری سیڑھی ہے۔ اس لیے وہ معاشرتی قدروں کی عکاسی پوری جامعیت کے ساتھ کرتی ہے۔ جس معاشرے کو یہ شکایت ہو کہ اس کے یونیورسٹی طلبہ نظم و ضبط کا احترام نہیں کرتے۔ وہ کتابوں کے مطالعہ کی بجائے ہلڑ بازی کے زیادہ شیدائی ہیں۔ ان کا طرز عمل مزدور یونین کے رہنماؤں کا سا ہے وغیرہ وغیرہ۔ اس معاشرے کو

پہلے اپنی ضمیر کو ٹٹولنا چاہیے، اور یہ معلوم کرنا چاہیے کہ اس نے عام زندگی میں کن قدروں کو اچھال رکھا ہے اگر اس کے یہاں قابلیت، دیانت اور محنت کی بجائے سیاسی طالع آزماؤں، ہلڑ بازوں اور گٹھ جوڑ کرنے والوں پر انعامات کی بارش ہو رہی ہو تو امید رکھنا عبث ہے کہ کوئی وعظ تلقین یونیورسٹی طلبہ کو محنت اور نظم و ضبط کی قدر و قیمت کا قائل بنا دے گا۔

جدید دور کے تقاضے

موجودہ دور سائنس اور ٹکنالوجی کا دور ہے۔ اس دور کی سب سے نمایاں خصوصیت زندگی کے ہر میدان میں رہنماؤں کی بھاری مانگ ہے۔ ایک ایسی دنیا میں جہاں خصوصی علم و مہارت کے بغیر قومی زندگی کا کوئی قابل ذکر کام انجام نہ پا سکتا ہو۔ رہنمائی کے منصب کو غیر معمولی اہمیت حاصل ہو گئی ہے۔ قومی زندگی کے ہر شعبے کے لیے ماہر رہنما تیار کرنا یونیورسٹی کی ذمہ داری ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جدید ریاستیں اپنی یونیورسٹیوں کو ہر قسم کی تعلیمی سہولتیں بہم پہنچانے اور ان کے ہاں ایک صحت مند علمی فضا پیدا کرنے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھتیں۔

پاکستان جیسی کم عمر ریاست کو فنی ماہرین کی جو شدید ضرورت ہے وہ کسی شرح کی محتاج نہیں۔ ان ماہروں کو قومی تعمیر کے مختلف شعبوں میں رہنمائی کے فرائض انجام دینا ہے۔ قومی تعمیر کی خوبی کا سارا مدار ان نوجوان رہنماؤں کے حسن قابلیت اور ان کے جذبۂ عمل پر ہوگا۔ یہ صورت حال اس بات کا شدید مطالبہ کرتی ہے کہ ہماری یونیورسٹیاں جن نوجوانوں کو رہنمائی کے منصب کے لیے تیار کریں، انہیں نہایت بلند اقدار دے کر رخصت کریں۔ یہ مقصد اس وقت تک پوری طرح حاصل نہیں ہو سکتا، جب تک قومی زندگی میں ان بلند اقدار کی حکمرانی نہ ہو۔

عام نشوونما اور پڑھنا سیکھنے میں باہمی رشتہ

عزیز احمد

بعض اوقات والدین اور استادوں کو اس بات پر حیرانی ہوتی ہے کہ ایک اوسط ذہانت کا بچہ پڑھائی میں پیچھے کیوں رہ گیا ہے۔ ہمارے یہاں بچوں کی ذہانت ماپنے کا کوئی انتظام نہیں۔ مگر ترقی یافتہ ملکوں میں ہر مدرسہ اپنے بچوں کا ذہنی خارج قسمت معلوم کرتا ہے۔ ایسے مدرسوں میں بھی اسی قسم کے بچے ملتے ہیں جن کا ذہنی خارج قسمت اوسط سے اوپر ہوتا ہے۔ مگر وہ پڑھائی میں کمزور رہتے ہیں۔ ایسی صورتوں میں عام طور پر یہ فرض کر لیا جاتا ہے کہ پڑھانے کے طریقے ناقص ہیں یا کتابیں اچھی نہیں ہیں۔ یہ دونوں باتیں معقولیت سے عاری ہیں۔ کیوں کہ اسی ذہانت کے دوسرے بچوں کو ان ہی طریقہ ہائے تدریس اور ان ہی کتابوں نے فائدہ پہنچایا ہوتا ہے۔ تعلیمی کمزوری کی زیادہ معقول وجہ بچے کی عام نشوونما میں تلاش کی جا سکتی ہے۔

کچھ عرصہ ہوا یونیورسٹی آف مشی گن کے ابتدائی مدرسے میں اس مسئلہ کا تحقیقی مطالعہ کیا گیا۔ یہ مطالعہ پہلی جماعت کے بچوں کا تھا۔ ان تمام کے ذہنی خارج قسمت برابر تھے۔ لیکن بعض بچے جلدی پڑھنا سیکھ گئے اور بعض کافی بعد میں یہ مہارت پیدا کر سکے۔ لیکن ان دونوں گروہوں میں بدنی نشوونما کے اختلافات بھی اسی طرح نمایاں تھے۔ مطالعہ کے عرصہ میں ان کے قد۔ وزن۔ قوت گرفت وغیرہ میں بھی مختلف شرحوں سے اضافہ ہوا تھا۔ یہی حال ان کے دانتوں کا تھا۔

پہلی جماعت کے بچوں کا مطالعہ

زیر نظر مطالعہ یونیورسٹی آف مشی گن کے پرائمری مدرسے میں پہلی جماعت کے لڑکوں کا مطالعہ ہے۔ یہ مطالعہ لگاتار کئی سالوں تک جاری رہا۔ اس مطالعہ سے ظاہر ہوا کہ جو بچے پڑھنا سیکھنے کی نسبتاً زیادہ استعداد رکھتے تھے وہ [illegible] کی اوسط عمر تک روانی کے ساتھ پڑھنا سیکھ گئے۔ مگر جن میں یہ استعداد کم تھی وہ

۹۶ ماہ کی اوسط عمر کو پہنچ کر یااس سے بھی بعد پڑھنا سیکھ سکے۔ جلد پڑھنا سیکھنے والوں کی اوسط عمر ۸۱٫۸ تھی۔ جبکہ دیر سے پڑھنا سیکھنے والوں کی اوسط عمر ۱۰۳٫۲ ماہ تھی۔

جن لڑکوں کا مطالعہ کیا گیا، پہلی جماعت میں داخلہ کے وقت ان کے ذہنی خارج قسمت معلوم کر لیے گئے تھے۔ ان زیر مطالعہ لڑکوں کے ذہنی خارج قسمت بالکل برابر تھے۔ یعنی خداداد ذہانت کے معاملے میں ان میں کچھ فرق نہ تھا۔ پڑھائی کی استعداد سے مراد آسان عبارت پڑھنے کی وہ استعداد لی گئی تھی جس کی بدولت طالب علم بلا رکاوٹ نثر کی آسان کتابیں پڑھ سکے۔ اس استعداد کی پیمائش کے لیے ایک معیاری آزمائش قرات سے کام لیا گیا تھا۔

زیر مطالعہ گروہ ستائیس جوڑوں پر مشتمل تھا۔ ان میں سے ۲۷ لڑکے جلد پڑھنا سیکھ گئے اور ۲۷ دیر سے یہ مہارت اخذ کر سکے۔ یہ تمام کے تمام لڑکے اوسط درجہ سے زیادہ ذہین تھے۔ پہلے گروہ کا اوسط ذہنی خارج قسمت ۱۱۰٫۹ تھا اور دوسرے گروہ کا ۱۱۰٫۷۔ دونوں گروہوں میں ایک بھی لڑکا ایسا نہ تھا جس کا ذہنی خارج قسمت ۱۰۰ سے کم ہوتا۔ بہ الفاظ دیگر دونوں گروہوں میں ایک لڑکا بھی اوسط درجہ سے کم ذہین نہ تھا۔

عام نشو ونما کا موازنہ

بادی النظر میں یہ بات بہت عجیب معلوم ہوتی ہے کہ جو بچے فطری ذہانت کے لحاظ سے ایک ہی درجے پر ہوں وہ قرات کی استعداد کے لحاظ سے نمایاں فرق رکھتے ہوں۔ لیکن اس اختلاف کی وجہ عام نشو ونما کی شرح میں آسانی سے تلاش کی جا سکتی ہے۔ قد، وزن، دودھ کے دانت نکالنے اور دوسرے بدنی خصائص کے لحاظ سے بھی ان لڑکوں میں اسی طرح نمایاں اختلاف موجود تھا جس طرح پڑھائی سیکھنے کی استعداد میں۔ اس سلسلے میں سبق آموز بات یہ ہے کہ بدنی نشو ونما کی شرح اور قرات کی استعداد میں واضح رشتہ موجود تھا (صفحہ ۲۰۹ پر درج شدہ نقشے کے مطالعہ سے یہ بات بخوبی واضح ہو جائے گی)۔

جلدی اور دیر سے پڑھنے والے لڑکوں کی نشوونما کا نقشہ

بدنی خصائص	۷۲ ماہ کی عمر میں	۸۴ ماہ کی عمر میں	۹۶ ماہ کی عمر میں	۱۰۸ ماہ کی عمر میں	۱۲۰ ماہ کی عمر میں
قد کے لحاظ سے عمر	۷۷٫۳	۸۷٫۴	۱۰۲٫۵	۱۱۵٫۳	۱۲۸٫۷
	۷۳٫۶	۸۵٫۲	۹۹٫۰	۱۱۳٫۱	۱۲۶٫۳
وزن کے لحاظ سے عمر	۸۱٫۲	۹۲٫۰	۱۰۶٫۱	۱۲۰٫۴	۱۳۱٫۹
	۷۵٫۱	۸۷٫۲	۱۰۰٫۷	۱۱۵٫۹	۱۲۰٫۳
دانتوں کے لحاظ سے عمر	۷۲٫۶	۸۶٫۷	۹۹٫۴	۱۰۷٫۷	۱۱۴٫۷
	۷۰٫۵	۸۳٫۰	۹۱٫۱	۱۰۳٫۱	۱۱۲٫۱
قوت گرفت کے لحاظ سے عمر	۸۱٫۷	۹۵٫۳	۱۰۶٫۴	۱۲۲٫۳	۱۳۰٫۶
	۷۵٫۵	۸۸٫۷	۱۰۲٫۳	۱۱۵٫۰	۱۲۹٫۴

اختلافات

قد کے لحاظ سے	۰٫۷	۲٫۲	۳٫۵	۲٫۲	۲٫۴
وزن کے لحاظ سے	۶٫۱	۵٫۷	۵٫۴	۴٫۵	۲٫۶
دانتوں کے لحاظ سے	۲٫۱	۳٫۷	۸٫۳	۴٫۶	۲٫۶
قوت گرفت کے لحاظ سے	۶٫۲	۶٫۶	۴٫۱	۷٫۳	۱٫۲

مندرجہ بالا نقشے کے بالائی حصے میں عمر کی پانچ منازل پر یکساں ذہانت کے بچوں کے دو گروہوں کے بدنی خصائص کی اوسط پیمائش دی گئی ہے۔ پہلی پیمائش جلدی قرأت سیکھنے والے گروہ کی ہے، اور دوسری پیمائش دیر سے قرأت سیکھنے والے گروہ کی۔ ایک ہی نظر میں یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ بدنی خصائص کی نشوونما کے لحاظ سے پہلا گروہ دوسرے گروہ پر نمایاں فوقیت رکھتا ہے، اور یہ فوقیت ہر بدنی خواص کے معاملے میں بدستور موجود ہے۔ نقشے کے نچلے حصے میں عمر کی مختلف منزلوں پر دونوں گروہوں کی رفتار نشوونما کا فرق دکھایا گیا ہے۔ یہ فرق بھی اسی نتیجے کی تصدیق کرتا ہے جس کی طرف نقشے کا بالائی حصہ اشارہ کرتا ہے۔

چند اہم نکات

زیر نظر مطالعہ صرف لڑکوں تک محدود رکھا گیا ہے، حالاں کہ یونیورسٹی کے ابتدائی مدرسے میں لڑکیاں بھی پڑھتی ہیں، وجہ یہ ہے کہ ایسی لڑکیوں کی تعداد نسبتاً کم تھی۔ جنہوں نے دیر سے پڑھنا سیکھا ہو۔ نیز مطالعہ کے نتائج کو زیادہ فیصلہ کن بنانے کے لیے یہ ضروری خیال کیا گیا کہ جنسی تفاوت کو بیچ میں نہ لایا جائے۔

نقشے پر نگاہ ڈالنے سے پتہ چلتا ہے کہ زود خواں بچے عمر کی ہر منزل پر جسمانی نشو و نما کے معاملے میں سست خواں بچوں سے آگے رہے، اور یہ سبقت زیر مطالعہ بدنی خصائص میں ہر جگہ نمایاں ہے۔

زود خواں بچوں نے ۷٫۰۵ ماہ کی اوسط عمر میں دودھ کے دانت نکالنے شروع کیے۔ اس کے مقابلے میں سست خواں بچوں نے ۸٫۳۰ ماہ کی اوسط عمر میں پہلا دودھ کا دانت نکالا۔ پیدائش کے وقت زود خواں بچوں کا اوسط وزن ۸٫۱۳ پونڈ تھا۔ جبکہ سست خواں بچوں کا پیدائش کے وقت اوسط وزن صرف ۷٫۴۰ پونڈ تھا۔ سست خواں بچوں میں سے پانچ ایسے تھے جو قبل از وقت پیدا ہو گئے تھے۔ زود خواں بچوں میں سے کسی ایک کی پیدائش بھی قبل از وقت نہ ہوئی تھی۔ زود خواں بچوں کی مائیں ۱۲٫۸۹ سال کی اوسط عمر میں سن بلوغت کو پہنچی تھیں۔ جبکہ سست خواں بچوں کی ماؤں نے ۱۳٫۸۹ سال کی اوسط عمر میں سن بلوغت میں قدم رکھا تھا۔ چلنا سیکھنے اور باتیں کرنا سیکھنے کے معاملے میں زود خواں اور سست خواں گروہوں میں کوئی اختلاف نہیں دیکھا گیا۔

ہمہ جہتی نشو و نما کی اہمیت

یہ شہادت بڑی وضاحت کے ساتھ اس امر کی تصدیق کرتی ہے کہ پڑھنے کی استعداد بچے کی ہمہ جہتی بدنی نشو و نما ہی کا ایک حصہ ہے۔ اس سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ کسی ایک مخصوص صلاحیت کے مقابلے میں ہمہ جہتی نشو و نما زیادہ اہم ہے۔ اس سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ جو بچے اوسط درجے سے زیادہ ذہنی خارج قسمت رکھنے باوجود دیر سے پڑھنا سیکھنے میں اس کی وجہ صرف یہ ہوتی ہے کہ وہ عام بدنی نشو و نما کے معاملہ میں اپنے ہمجولیوں سے پیچھے رہ جاتے ہیں۔ یکساں ذہنی صلاحیت کے بچوں میں سے جو بچے بدنی پختگی کی منزلیں جلد تر طے کر لیں گے۔ وہ جلد ہی پڑھنا سیکھ لیں گے۔ قراءت کی استعداد کا انحصار محض ذہنی خارج قسمت پر نہیں

بلکہ اس کا زیادہ مدار ہمہ جہتی بدنی نشو و نما پر ہے۔

ایک اہم نکتہ

مندرجہ بالا حقیقت ایک اور اہم نکتہ کی وضاحت بھی کر دیتی ہے۔ یہ ایک عام مشاہدہ ہے کہ زندگی کے ابتدائی سالوں میں لڑکیوں کی جسمانی نشو و نما ہم عمر لڑکوں کے مقابلہ میں تیز تر ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ لڑکیاں عموماً ہم عمر لڑکوں سے زیادہ جلدی پڑھنا سیکھ جاتی ہیں۔ اس سے یہ مراد نہیں کہ لڑکیوں میں سست خوانوں کا وجود ہی نہیں۔ جن لڑکیوں کی بدنی نشو و نما کسی وجہ سے سست پڑ جائے وہ دیر سے پڑھنا سیکھتی ہیں لیکن لڑکوں کے مقابلے میں لڑکیوں میں سست خوانوں کی تعداد بہت کم ہے۔ وجہ یہ کہ ان کی بدنی نشو و نما کی تیز تر شرح انہیں ہم عمر لڑکوں پر فوقیت دیتی ہے۔

ایک ضروری انتباہ

اوپر جن حقائق کا ذکر گذر چکا ہے۔ ان سے ایک اہم نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ جب تک بچہ بدنی پختگی کے لحاظ سے پڑھنا سیکھنے کے لیے تیار نہ ہو، اس وقت تک اسے پڑھنا سکھایا نہیں جا سکتا۔ طریقہ ہائے تدریس، اور دوسرے سازگار حالات اسی صورت میں کام دے سکتے ہیں، جب بچے میں استعداد موجود ہو۔ مطلوبہ پختگی کے زمانے کو پہنچنے کے بعد جو طریقہ ہائے تدریس بھی استعمال کیے جائیں گے، وہ کامیاب ہو جائیں گے عدم استعداد اور عدم پختگی کی صورت میں کوئی طریقہ بھی کارگر نہ ہوگا۔

مطالعہ سے یہ بھی ثابت کیا جا چکا ہے کہ جو بچے دیر سے پڑھنا سیکھتے ہیں، وہ چند سالوں کے اندر ہی اندر اس تاخیر کی کمی پوری کر لیتے ہیں۔ مثلاً جن ستائیس سست خواں بچوں کا ذکر اس مضمون میں کیا گیا ہے۔ وہ چھٹی جماعت میں پہنچنے تک اوسط درجہ کے قاری بن چکے تھے۔ بعد ازاں ان میں سے ۲۲ لڑکے کالج میں داخل ہوئے اور بالآخر ایک نے طب کی ڈگری حاصل کی۔ اور دوسرے نے پی۔ ایچ۔ ڈی کی۔ غرض عمر کے ساتھ نشو و نما کی آمد کا آنا یقینی ہے۔ جو ابتدائی اختلافات کا خاتمہ کر دیتی ہے ۔

افریقی اساتذہ کی مشکلات

زبیدہ بانو

تاریک براعظم میں علم کی پہلی کرنیں

اسلام جن جن ملکوں اور قوموں میں گیا۔ اس نے انہیں علم و حکمت کا اجالا عطا کیا۔ مگر اسلام کا ریلا تاریک براعظم کے شمالی کنارے سے پیچھے جنوب میں زیادہ آگے نہ بڑھ سکا۔ اس نے اپنا راستہ ناقابل عبور دلدلی جنگلوں، پہاڑوں اور آبشاروں سے مسدود پایا۔ براعظم کی باقی تین اطراف پر بھی جغرافیائی رکاوٹیں تقریباً ایسی ہی بھیانک اور ناقابل عبور تھیں۔ ان قدرتی سدراہوں کا نتیجہ یہ نکلا کہ شمالی افریقہ کو چھوڑ کر اس براعظم کے باقی تمام حصوں میں گھٹاٹوپ اندھیرا بدستور چھایا رہا۔ جس طرح اس کے گھنے جنگلوں اور زیر درختی نے سینکڑوں ہزاروں مربع میلوں میں ایک سبز چھتری تان کر زمین کو سورج کی روشنی سے محروم کر رکھا تھا۔ بالکل اسی طرح اس کے ساحلوں پر بلند و بالا پہاڑی دیواروں اور دلدلوں نے سارے براعظم کو علم و تہذیب کی روشنی سے مکمل طور پر محروم کیے رکھا۔

افریقہ کے ساتھ مہذب دنیا کو پہلی بار دلچسپی اس وقت پیدا ہوئی جب نئی دنیا کے لامحدود قدرتی وسائل کی ترقی کے لیے غلاموں کی بے پناہ مانگ پیدا ہو گئی۔ گوری قوموں نے اس تجارت سے خوب ہاتھ رنگے۔ یورپی جہاز مغربی افریقہ کے ساحلی علاقوں سے حبشیوں کو بھیڑ بکریوں کی طرح پکڑ کر لاد لیتے اور امریکہ میں جا کر بیچ دیتے۔ لیکن اس تجارت میں بھی یورپی اقوام کو جلد ہی عربوں کی مدد کی ضرورت محسوس ہوئی۔ گولڈ کوسٹ اور بنوگنی وغیرہ کے ساحلی علاقوں کی بے حد مرطوب آب و ہوا اہل فرنگ کے لیے پیام موت تھی وہ بندرگاہوں سے آگے اندرونی جنگلات کے اندھیرے میں قدم رکھنے کی جرأت نہ رکھتے تھے۔ چنانچہ اہل فرنگ نے یہ خدمت اپنے پٹے ہوئے حریف عرب کے سپرد کی۔ عرب اندھیرے جنگلوں اور [illegible] براعظم کے بیچ اور اندھیروں میں جاتا اور حبشی غلاموں کو خرید کر

ساحلی منڈیوں میں گورے سوداگروں کے ہاتھ بیچ دیتا۔

ہرچند کہ غلاموں کی یہ تجارت انسانیت کے نام پر ایک کالا دھبہ بنی رہے گی لیکن اس کا ایک مدھم پہلو بھی ہے۔ وہ یہ کہ اس کے طفیل افریقہ کے گھٹا ٹوپ اندھیروں میں پہلی بار علم و تہذیب کی کرنیں پہنچیں۔ تاریک براعظم کے کالے کلوٹے اور سیاہ بخت باشندوں نے حیرت و استعجاب کے ساتھ آنکھیں ملتے ہوئے یہ دیکھا کہ گندمی اور گوری رنگت کے انسان ایک عجیب و غریب قوت کے مالک ہیں۔ ایک ایسی قوت جو ان کے صدیوں پرانے تعویذوں گنڈوں اور جادو ٹونوں میں بھی نہیں۔ یہ قوت علم کی قوت تھی۔ گندمی اور گوری رنگت کے انسان کتابیں پڑھ سکتے تھے۔ صرف اس ایک جادو نے انہیں بے پناہ قوت عطا کر رکھی تھی۔ اس قوت کے سامنے افریقی جادوگروں اور پروہتوں کی ساری فسوں سازیاں بے کار تھیں۔

غرض مہذب دنیا کے ساتھ اس ناخوش گوار رابطے نے افریقہ کو تاریخ میں پہلی بار خواندگی کی قوت سے آشنا کیا۔ رفتہ رفتہ حبشیوں کے دلوں میں بھی یہ شوق چٹکیاں لینے لگا کہ وہ لکھنا پڑھنا سیکھیں اور اس کی بدولت ایک بے پناہ قوت کے مالک بن جائیں۔

پادریوں کی آمد

مغربی استعمار کی تاریخ افریقہ میں بھی بالکل وہی ہے جو پسماندہ ایشیائی ملکوں میں۔ گوری قومیں پہلے یہاں تجارت سے ہاتھ رنگنے کے لیے آئیں۔ جب دیکھا کہ اس تجارت سے وارے نیارے ہو رہے ہیں تو ساحلی علاقوں پر چند اڈے بنا لیے۔ اس کے فوراً بعد پادریوں کی فوجیں آن وارد ہوئیں۔ جنہوں نے انعام و تحریص اور جبر و اکراہ کے تمام ممکن طریقوں سے مقامی باشندوں کو عیسائیت کے دائرے میں گھسیٹنا شروع کیا۔ اس جال کو زیادہ ہمہ گیر بنانے کے لیے اسے اشاعت تعلیم کی شکل دی گئی۔ پادری جگہ جگہ مدرسے کھول کر بیٹھ گئے۔ اب تک مقامی آبادی مغربی استعمار کے چنگل میں آ چکی تھی۔ حکومت کی ساری باگ ڈور مغربی قوموں کے ہاتھ میں تھی۔ حکومتی کام چلانے کے لیے چھوٹے موٹے مقامی کارندوں کی ضرورت تھی۔ آقاؤں کی حکم برداری کے لیے ضروری تھا کہ یہ کارندے پڑھنا لکھنا جانتے ہوں۔ پادریوں نے بچوں کو لکھنا پڑھنا سکھانا شروع کیا۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ ان بچوں کو مسیحی دین کی تعلیم دی گئی۔ اس طرح خواندگی اور مسیحی دین تقریباً لازم و ملزوم بن گئے۔ مدرسے کے

فارغ التحصیل طلبہ کو فوراً چھوٹی موٹی نوکری ملنے لگی۔ اس طرح علم اور اس کے ساتھ ہی مسیحی دین کی قوت کا ایک جیتا جاگتا ثبوت نظر آنے لگا۔ وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ ان دونوں چیزوں کی کشش بھی بڑھتی گئی۔

عالمگیر معاشی عوامل

اہل فرنگ نے اوّل اوّل محض غلاموں کی تجارت کی خاطر افریقہ کا رُخ کیا تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب صنعتی انقلاب صدیوں پرانے معاشی نظام میں بنیادی تبدیلیاں پیدا کر رہا تھا۔ مشینی پیداوار بڑی تیزی سے دستی صنعت کی جگہ لے رہی تھی۔ پیداوار کے نئے انوکھے طریقہ نے جہاں نئی نئی قسم کی سستی چیزیں فراوانی کے ساتھ پیدا کی تھیں وہاں خام اشیاء کی مانگ بے تحاشہ بڑھا دی تھی۔ تاریک براعظم میں کئی ایک بنیادی خام اشیا کے لامحدود خزانے موجود تھے۔ گوری قوموں نے اب اس براعظم کے قدرتی خزانوں کا رُخ کیا۔

لیکن یہاں بھی وہی پہلی دقت پیش آئی۔ افریقہ کے اندھیرے جنگلوں اور مغرصحت دلدلوں کو چیر کر اندرونی حصوں میں جانا اور خام اشیا فراہم کرنا گوری قوموں کے بس کی بات نہ تھی۔ یہاں پھر عرب آڑے آئے۔ یہ مشکل خدمت پھر عرب تاجروں نے اپنے ذمے لی۔ وہ افریقہ کے اندھیروں میں گم ہو جاتے اور گاؤں گاؤں میں پھر کر خام اشیا، جمع کر کے ساحلی منڈیوں تک پہنچا دیتے۔

تاریخ عرب کے اس کارنامے کو ہمیشہ یاد رکھے گی کہ جہاں جہاں وہ افریقہ کے ظلمت کدوں میں تجارتی کاروبار کے لیے گیا، وہاں دین فطرت کا پیغام بھی ساتھ لیتا گیا۔ اس کی پشت پر نہ کسی حکومت کی سیاسی قوت تھی اور نہ کسی سرمایہ دارانہ نظام کی بے پناہ مالی قوت۔ ہاں اسے اسلام کی حقانیت اور اس کی سادہ فطری تعلیمات کی بے پناہ کشش کا یقین تھا۔ عرب تاجروں نے اسلام کا پیغام افریقہ کے اندرونی حصوں تک پہنچایا اور علم و تہذیب کے پیاسے حبشیوں نے اس دولت کو ہاتھوں ہاتھ لیا۔

بادی النظر میں یہ بات بہت عجیب معلوم ہوتی ہے کہ افریقہ پر مغرب کا استعماری غلبہ اسلام کی اشاعت کا سبب بنے۔ لیکن یہ ایک تاریخی حقیقت ہے جس کی مختصر شرح اوپر گذر چکی ہے۔ براعظم کے ساحلی علاقے مغربی استعمار کے مرکز تھے۔ یہی وہ علاقے تھے جہاں پادریوں نے اڈے قائم کر رکھے تھے ان علاقوں میں مسیحی دین کی اشاعت ہوئی۔ لیکن اندرون ملک کے وسیع و عریض رقبوں میں اسلام کی

تیزی سے پھیلی۔ اور آخری گنتی پر معلوم ہوا کہ اسلام اپنے حریف کے مقابلے میں بالکل تنہا ہونے کے باوجود بازی لے گیا ہے۔ آج افریقہ میں مغربی قوتوں کے لیے سب سے بڑا دردِ سر اسلام کی یہی کامیابی ہے مغرب کی ساری طاقتیں ایک مرکز پر جمع ہو کر اسلام کے سیلاب کا راستہ بند کر دینا چاہتی ہیں۔ ان کی کوشش یہ ہے کہ اندرونی علاقوں کے جو حبشی جوق در جوق حلقہ بگوش اسلام ہو چکے ہیں۔ وہ بھی اپنے ساحلی بھائیوں کی پیروی کرتے ہوئے مسیحی دین کی آغوش میں آجائیں۔ مغربی افریقہ میں آج یہ رسہ کشی بڑی شدت سے جاری ہے۔

خواندگی کی اشاعت

افریقہ میں خواندگی کی اشاعت کا کام انیسویں صدی کی آخری دہائیوں میں شروع ہوا سب سے پہلے مدرسے پادریوں نے کھولے۔ یہ مدرسے نہ صرف لکھنا پڑھنا سکھانے کا ذریعہ تھے، بلکہ مغربی تہذیب (مسیحی دین اس کا ایک لازمی جزو تھا) کی اشاعت کا ذریعہ بھی۔ ان مدرسوں کی تعلیم افریقی قبائل کی مروجہ تعلیم سے بالکل مختلف تھی۔ قدیم قبائلی تعلیم صرف عملی کام اور مہارت سکھاتی تھی۔ پادری اپنے مدرسوں میں کتابیں پڑھنا سکھاتے تھے۔ خواندگی سیکھ لینے والوں کو دفعتہً غیر معمولی اقتدار حاصل ہو جاتا تھا۔ گورے حکمرانوں کے درباروں میں جو درجہ انہیں حاصل تھا وہ قبائلی جادوگروں بلکہ با اقتدار قبائلی سرداروں سے بھی زیادہ تھا۔ گورے حکمرانوں کو جو بات مقامی آبادی سے ممتاز کرتی تھی وہ کتابیں پڑھنے کی استعداد تھی۔ خود حبشیوں میں سے جو لوگ یہ استعداد حاصل کر لیتے تھے، انہیں غیر معمولی قوت حاصل ہو جاتی تھی۔

اس صورت حال نے قبائلی سرداروں کے دلوں میں خدشات پیدا کر دیے تاآں کہ ۱۸۸۵ء میں گنڈا کے سردار کباکا مانگا نے کھلم کھلا ان خدشات کا اظہار کیا۔ وہ پادریوں کی سرگرمیوں سے سخت برہم تھا۔ اس نے صاف الفاظ میں اعلان کیا کہ وہ ایسے تمام لوگوں کو موت کے گھاٹ اتار دینا چاہتا ہے جو پادریوں کے مدرسوں میں لکھنا پڑھنا سیکھ چکے ہیں۔ اس کا غصہ خواندگی اور مسیحی دین دونوں کے خلاف یکساں تھا۔

قبائلی سرداروں کی اس مخالفت کے باوجود خواندگی کی اشاعت میں کچھ فرق نہ آیا۔ کتابیں پڑھنے کی استعداد کو حکومت کے دربار میں غیر معمولی احترام حاصل تھا۔ خواندگی کی اس واضح قوت نے افریقی نوجوانوں اور ان کے والدین کے لیے بے پناہ کشش پیدا کر دی۔ یہ کشش اس قدر زیادہ تھی کہ تبدیلی دین اور دوسرے خطرات اس کے

مقابلے میں ہیچ تھے۔ حکمرانوں کا علم اور ان کا دین اختیار کر کے ایک اچھی نوکری اور باوقار مقام حاصل کر لینا ایک ایسا سودا ہے جس کے لیے ہر افریقی ہمیشہ تیار رہا ہے۔

سیاسی ذمہ داری اور آزادی کی آمد

دوسری عالمی جنگ نے عوامی تحریکوں کو جو عالمگیر قوت عطا کی ہے، اس سے تاریک براعظم بھی پوری طرح متاثر ہوا ہے۔ آج اس براعظم کے اندھیرے سے اندھیرے جنگلوں کا کوئی گوشہ بھی ایسا نہیں، جہاں آزادی اور خود اختیاری کا جذبہ کروٹیں نہ لے رہا ہو۔ جنوبی اور مشرقی افریقہ میں اسی جذبے نے سفید فام آبادکاروں کی چیرہ دستیوں کے خلاف بغاوت کا جھنڈا کھڑا کر رکھا ہے۔ مغربی افریقہ میں یہی جذبہ آزادی کی تحریکوں کی صورت اختیار کیے ہوئے ہے۔ ان تحریکوں کے طفیل مغربی افریقہ کے بعض علاقے مغربی استعمار کا جوا اتار پھینکنے میں کامیاب ہو چکے ہیں۔ نائجیریا جو افریقہ میں سب سے بڑی نوآبادی ہے، اب آزادی کی دہلیز پر کھڑا ہے۔ اور اگر عالمی حالات موجودہ ڈگر پر چلتے رہے تو چند سالوں میں یہ برطانوی نوآبادی بھی ایک آزاد ملک بن جائے گی۔ کم و بیش یہی حال افریقہ کے دوسرے یوروپی مقبوضات کا ہے۔

آزادی کی تحریکوں نے خواندگی کی اشاعت کو اور تقویت دی ہے۔ مغربی حکمران جس حد تک اس بات پر مجبور ہوتے ہیں کہ اقتدار اہل ملک کو سونپیں اسی حد تک مغربی تعلیم کی بالادستی اور زیادہ وضاحت سے ثابت ہوتی ہے۔ کیوں کہ اقتدار ہمیشہ ایسے لوگوں کو سونپا جاتا ہے جو مغربی تعلیم اور مغربی تہذیب سے بہرہ ور ہوں۔ نمائندہ پارلیمنٹ ہو یا ملکی وزارت.....

ان میں جگہ مغربی تعلیم و تہذیب سے فیض یافتہ لوگوں ہی کو ملتی ہے۔ مغربی حکمرانوں کی ساحری کا یہ ایک عجیب کرشمہ ہے کہ جوں جوں ان کے سیاسی اقتدار کا سورج ڈھلتا جا رہا ہے۔ اسی قدر ان کی تعلیم اور ان کی تہذیب کا سورج بلندی کی منزلیں طے کرتا نظر آتا ہے۔

سیاسی آزادی اور ذمہ داری کی آمد کے ساتھ ساتھ مغربی تعلیم و تہذیب کے روز افزوں غلبہ کا ایک نتیجہ یہ ہے کہ ملکی امور کی باگ ڈور زیادہ تر ساحلی آبادیوں کے ہاتھ میں ہے۔ کیوں کہ یہ وہ آبادیاں ہیں۔ جہاں مغربی مدرسے اور یونیورسٹیاں قائم ہیں۔ اسی جگہ پادریوں کے قائم کردہ مذہبی اور تعلیمی مرکز ہیں۔ اندرون ملک میں جہاں

مسلمانوں کی اکثریت ہے۔ تعلیم کا ذریعہ زیادہ تر وہ مکتب ہیں جہاں قرآن مجید پڑھایا جاتا ہے۔ ان مکتبوں کے فارغ التحصیل طلبہ کو اس وقت تک سرکاری نوکری یا سیاسی وقار حاصل نہیں ہو سکتا، جب تک وہ مغربی تعلیم حاصل نہ کریں، یہ صورت حال اسلام کے لیے ایک حقیقی خطرہ ہے۔ جس کا تدارک فوری طور پر ہونا چاہیے، اس خطرے کو دور کرنے کی دو ہی صورتیں ہیں۔ پہلی یہ کہ مکتبوں میں بھی مغربی تعلیم رائج کر دی جائے لیکن ان مکتبوں کے پاس نہ اتنے وسائل ہیں نہ ان میں پڑھانے والے علماء میں اتنی وقت نگاہ کہ وقت کی اس ضرورت کو پورا کر سکیں۔ دوسری صورت صرف یہ ہے کہ حکومت اندرون ملک میں بھی مغربی وضع کے مدرسے کافی تعداد میں کھولے۔ یہ کام کیا جا رہا ہے لیکن بے حد سست رفتار سے، ان دونوں شکلوں کے علاوہ ایک تیسری صورت بھی موجود ہے وہ یہ کہ جس طرح مغربی مبلغوں نے ساحلی علاقوں میں تعلیمی ادارے کھول رکھے ہیں۔ اسی طرح اسلامی ملکوں کی تبلیغی جماعتیں افریقہ کے اندرونی حصوں میں مغربی وضع کے مدرسے قائم کریں۔ اگر ایسا نہیں ہوگا تو غالباً مسیحی تبلیغی ادارے اس تعلیمی خلا کو پورا کرنے کی کوشش کریں گے، اور اس تعلیمی خدمت کی قیمت اشاعت مسیحیت کی شکل میں وصول کریں گے۔

طلبہ کا ذہنی پس منظر

کم از کم ساحلی علاقوں میں مغربی تہذیب اور مغربی تعلیم کی جڑیں اب اس قدر گہری ہیں کہ دیکھنے والے کو یہ گمان گذرتا ہے کہ ایک اوسط افریقی طالب علم کا ذہنی پس منظر مغربی اقدار کا حامل ہوگا لیکن ذرا قریب سے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ خیال غلط ہے۔ جو افریقی گھرانے مدتا سے مسیحی دین کے پیرو چلے آتے ہیں وہ بھی مظاہر قدرت کی پرستش کی روایات سے آزاد نہیں ہو سکے۔ افریقہ کے قدیم دین میں پراسرار قوتوں کی ہمہ گیر حکمرانی کا جو تصور موجود تھا وہ تبدیلی دین کے بعد بھی جوں کا توں باقی ہے، افریقہ میں یہ عقیدہ صدیوں سے چلا آیا ہے کہ جادو ٹونوں کی مدد سے ہر طرح کا مقصد پورا ہو سکتا ہے۔ خواہ جنگل میں کسی جانور کو پکڑنا مقصود ہو یا کسی چور کا کھوج لگانا ہو، یا کسی عورت کے دل کو قابو میں لانا ہو ان تمام مقاصد کے حصول کے لیے تعویذ اور جادو ٹونے سب سے زیادہ قابل اعتماد وسیلہ ہیں۔ حالات زندگی پر طلسماتی قابو حاصل کرنا ہمیشہ ممکن رہتا ہے۔

ایک افریقی خواہ پیدائشی عیسائی ہو یا مغربی مدرسوں اور کالجوں کا تعلیم یافتہ، اس کا ذہن اس توہم پرستی سے کلی طور پر آزاد نہیں ہو سکتا۔ یہ توہم پرستی اس کے اعصاب پر عجب طور پر سوار رہتی ہے۔ وہ مشکلات پر کوشش اور محنت سے قابو پانے کا قائل نہیں ہو سکتا۔ وہ تقدیر پرستی کا ایسا گہرا عقیدہ رکھتا ہے جو اسے اپنی تقدیر کا خود مالک بننے سے روکتا ہے۔ یہ ذہنی پس منظر تعلیمی کوشش پر بھی اثر انداز ہوتا ہے ایک عام افریقی طالب علم یہ یقین کیے بغیر نہیں رہ سکتا کہ اس کی تعلیمی کامیابی کا مدار اس کی ذاتی کوشش کی بجائے اس کی تقدیر پر ہے۔ جو لوگ پہلے پہل افریقی مدرسوں میں پڑھانے کی ذمہ داری قبول کرتے ہیں۔ ان کے لیے یہ باور کرنا مشکل ہوتا ہے کہ ان کے طلبہ اپنے ذہنی پس منظر میں ایسے قوی عناصر رکھتے ہیں جو محنت اور ذاتی کوشش کے خلاف صف آرا ہیں، اور جن پر قابو پانا استاد کے بس کی بات نہیں۔

نظر فریب سرگرمی

افریقی کمرہ جماعت کا ملاحظہ کرنے والے کو وہاں ایک ایسی خوش گوار علمی سرگرمی نظر آتی ہے جو مقابلے کے برطانوی مدرسے میں دکھائی نہیں دیتی۔ طالب علم بڑے شوق اور جوش و خروش سے استاد پر سوالوں کی بوچھاڑ کرتے ہیں۔ وہ معلومات کے پیاسے اور علم کے بھوکے نظر آتے ہیں۔ وہ چھوٹے چھوٹے نکات پر بھی استاد کے ساتھ بحث کرتے سنائی دیتے ہیں۔ ان کا یہ طرز عمل تدریس کے کام کو زیادہ بارونق اور عموماً زیادہ دلچسپ بنا دیتا ہے۔ طلبہ کے سوالات بظاہر حسب موقع دکھائی دیتے ہیں ان کی علمی پیاس کا یہ حال ہے کہ کسی طالب علم [illegible] اس سے زیادہ بڑی سزا اور کوئی نہیں خیال کی جاتی کہ استاد اسے کمرہ جماعت سے باہر نکال دے [illegible] جو استاد کچھ عرصے افریقی مدرسوں میں پڑھا چکے ہیں وہ جانتے ہیں کہ یہ ساری [illegible] کے مقابلے میں افریقی طلبہ میں احترام نفس کا [illegible] ایسے سوالات [illegible] پوچھتے ہیں جن کے جواب [illegible] ہیں۔ بسا اوقات انہیں اپنے سوالوں کے جواب پہلے سے معلوم [illegible] وہ چاہتے ہیں کہ یہ جواب استاد کی زبانی بھی سن لیں، تاکہ ان کو

اپنی معلومات کی کمزور تصدیق ہو جائے۔

غرض یہ طلبہ معلومات بہم پہنچانے کی ذمہ داری کلی طور پر استاد کے کندھوں پر ڈالنے کے عادی ہیں جو معلومات ایک برطانوی مدرسے کا طالب علم ذاتی کوشش اور تلاش سے فراہم کر لیتا ہے۔ افریقی طالب علم اسے استاد کی زبانی سننا چاہتا ہے، وہ ذاتی کوشش میں کوئی لذت یا فخر محسوس نہیں کرتا۔ اس کی سب سے بڑی مسرت اس بات میں ہے کہ استاد تختہ سیاہ پر تفصیلی نوٹ لکھ دے، اور وہ اسے من وعن نقل کرے نتیجہ یہ ہے کہ وہ اعتماد نفس کے اس جذبے سے بے خبر رہتا ہے، جو آزاد قوموں کی تعلیم کا سب سے ممتاز پہلو ہے۔

افریقی طلبہ کا یہ رویہ اجنبیوں کے لیے ایک عجیب معمہ بن جاتا ہے۔ ایک طرف وہ معلومات کے اتنے پیاسے نظر آتے ہیں کہ دنیا میں شاید ہی کسی اور جگہ معلومات کی یہ پیاس نظر آئے۔ دوسری طرف وہ ان معلومات کو بن ہاتھ ہلائے حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ استاد ان کے لیے سب کچھ کرے اور انہیں اپنے مطالعہ اور تلاش کے نتائج سے آگاہ کرتا رہے۔ ان کا کام اخذ وجذب ہے۔ تلاش وجستجو نہیں۔ تعلیم کے متعلق یہ نظریہ دراصل اس تقدیر پرستی کا براہ راست نتیجہ ہے جو صدیوں پرانی افریقی روایات کی پیداوار ہے اور جو ہر افریقی کے ذہنی پس منظر کا ایک لازمی جزو ہے۔

اجنبی نصاب تعلیم

افریقی ثانوی مدرسے کی دوسری بڑی دشواری اس کا اجنبی نصاب تعلیم ہے۔ یہ نصاب قریباً قریباً وہی ہے جو برطانوی گرامر سکولوں میں مروج ہے۔ بظاہر اس نصاب کو افریقی رنگ دینے کی کوشش کی گئی ہے۔ لیکن یہ کوشش تاریخ اور جغرافیہ کے علاوہ دوسرے مضامین چنداں نتیجہ خیز نظر نہیں آتی۔ انگریزی زبان کو نصاب میں مرکزی حیثیت حاصل ہے، اور ثانوی مدرسے کے دوسرے مضامین بھی اسی کے ذریعے پڑھائے جاتے ہیں۔

غیر ملکی ذریعہ تعلیم نے طلبہ کے لیے چند در چند دشواریاں پیدا کر رکھی ہیں۔ اس کے باوجود ثانوی نصاب کے خاتمہ پر جو امتحان لیا جاتا ہے وہ معلومات اور ذہنی پختگی کے اعتبار سے اسی معیار کا مطالبہ کرتا ہے جس کا مطالبہ برطانوی مدارس کے آخری امتحان میں کیا جاتا ہے۔

ایک افریقی خواہ پیدائشی عیسائی ہو یا مغربی مدرسوں اور کالجوں کا تعلیم یافتہ، اس کا ذہن اس پرستی سے کلی طور پر آزاد نہیں ہو سکتا۔ یہ توہم پرستی اس کے اعصاب پر عجب طور پر سوار رہتی ہے۔ وہ بات پر کوشش اور محنت سے قابو پانے کا قائل نہیں ہو سکتا۔ وہ تقدیر پرستی کا ایسا گہرا عقیدہ رکھتا ہے جو اسے اپنی تقدیر کا خود مالک بننے سے روکتا ہے۔ یہ ذہنی پس منظر تعلیمی کوشش پر بھی اثر انداز ہوتا ہے ایک عام افریقی طالب علم یہ یقین کیے بغیر نہیں رہ سکتا کہ اس کی تعلیمی کامیابی کا مدار اس کی ذاتی کوشش کی بجائے اس کی تقدیر پر ہے۔ جو لوگ پہلے پہل افریقی مدرسوں میں پڑھانے کی ذمہ داری قبول کرتے ہیں۔ ان کے لیے یہ باور کرنا مشکل ہوتا ہے کہ ان کے طلبہ اپنے ذہنی پس منظر میں ایسے قوی عناصر رکھتے ہیں جو محنت اور ذاتی کوشش کے خلاف صف آرا ہیں، اور جن پر قابو پانا استاد کے بس کی بات نہیں۔

نظر فریب سرگرمی

افریقی کمرہ جماعت کا ملاحظہ کرنے والے کو وہاں ایک ایسی خوش گوار علمی سرگرمی نظر آتی ہے جو مقابلے کے برطانوی مدرسے میں دکھائی نہیں دیتی۔ طالب علم بڑے شوق اور جوش وخروش سے استاد پر سوالوں کی بوچھاڑ کرتے ہیں۔ وہ معلومات کے پیاسے اور علم کے بھوکے نظر آتے ہیں۔ وہ چھوٹے چھوٹے نکات پر بھی استاد کے ساتھ بحث کرتے سنائی دیتے ہیں۔ ان کا یہ طرز عمل تدریس کے کام کو زیادہ بارونق اور عموماً زیادہ دلچسپ بنا دیتا ہے۔ طلبہ کے سوالات بظاہر حسب موقع دکھائی دیتے ہیں ان کی علمی پیاس کا یہ حال ہے کہ کسی طالب علم کے لیے اس سے زیادہ بڑی سزا اور کوئی نہیں خیال کی جاتی کہ استاد اسے کمرہ جماعت سے باہر نکال دے۔

یہ سب کچھ ہے مگر جو استاد کچھ عرصہ سے افریقی مدرسوں میں پڑھا رہے ہیں وہ جانتے ہیں کہ یہ ساری سرگرمی سطحی اور بالکل نظر فریب ہے۔ دوسرے ملکوں کے طلبہ کے مقابلے میں افریقی طلبہ میں احترام نفس کی افسوس ناک کمی ہے۔ وہ اپنے ساتھیوں کی تنقید سے کم متاثر ہوتے ہیں۔ وہ استاد سے عموماً ایسے سوالات پوچھتے ہیں جو ان کی قابل رحم لاعلمی کے آئینہ دار ہوتے ہیں۔ وہ اس قسم کے سوال پوچھتے ہیں جن کے جواب وہ تھوڑی کوشش سے خود بھی معلوم کر سکتے ہیں۔ بسا اوقات انہیں اپنے سوالوں کے جواب پہلے سے معلوم ہوتے ہیں، لیکن اعتماد نفس کی کمی کے باعث وہ چاہتے ہیں کہ یہ جواب استاد کی زبانی بھی سن لیں، تاکہ ان کو

اپنی معلومات کی کمرتہ تصدیق ہو جائے ۔

غرض یہ طلبہ معلومات بہم پہنچانے کی ذمہ داری کلی طور پر استاد کے کندھوں پر ڈالنے کے عادی ہیں جو معلومات ایک برطانوی مدرسے کا طالب علم ذاتی کوشش اور تلاش سے فراہم کر لیتا ہے۔ افریقی طالب علم اسے استاد کی زبانی سننا چاہتا ہے، وہ ذاتی کوشش میں کوئی لذت یا فخر محسوس نہیں کرتا۔ اس کی سب سے بڑی مسرت اس بات میں ہے کہ استاد تختہ سیاہ پر تفصیلی نوٹ لکھ دے، اور وہ اسے من وعن نقل کرے نتیجہ یہ ہے کہ وہ اعتماد نفس کے اس جذبے سے بے خبر رہتا ہے، جو آزاد قوموں کی تعلیم کا سب سے ممتاز پہلو ہے۔

افریقی طلبہ کا یہ رویہ اجنبیوں کے لیے ایک عجیب معمہ بن جاتا ہے۔ ایک طرف وہ معلومات کے اتنے پیاسے نظر آتے ہیں کہ دنیا میں شاید ہی کسی اور جگہ معلومات کی یہ پیاس نظر آئے۔ دوسری طرف وہ ان معلومات کو بن ہاتھ ہلائے حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ استاد ان کے لیے سب کچھ کرے اور انہیں اپنے مطالعہ اور تلاش کے نتائج سے آگاہ کرتا رہے۔ ان کا کام اخذ و جذب ہے: تلاش و جستجو نہیں۔ تعلیم کے متعلق یہ نظریہ دراصل اس تقدیر پرستی کا براہ راست نتیجہ ہے جو صدیوں پرانی افریقی روایات کی پیداوار ہے اور جو ہر افریقی کے ذہنی پس منظر کا ایک لازمی جزو ہے۔

اجنبی نصاب تعلیم

افریقی ثانوی مدرسے کی دوسری بڑی دشواری اس کا اجنبی نصاب تعلیم ہے۔ یہ نصاب قریباً قریباً وہی ہے جو برطانوی گرامر سکولوں میں مروج ہے۔ بظاہر اس نصاب کو افریقی رنگ دینے کی کوشش کی گئی ہے۔ لیکن یہ کوشش تاریخ اور جغرافیہ کے علاوہ دوسرے مضامین چنداں نتیجہ خیز نظر نہیں آتی۔ انگریزی زبان کو نصاب میں مرکزی حیثیت حاصل ہے، اور ثانوی مدرسے کے دوسرے مضامین بھی اسی کے ذریعے پڑھائے جاتے ہیں ۔

غیر ملکی ذریعۂ تعلیم نے طلبہ کے لیے چند در چند دشواریاں پیدا کر رکھی ہیں۔ اس کے باوجود ثانوی نصاب کے خاتمہ پر جو امتحان لیا جاتا ہے وہ معلومات اور ذہنی پختگی کے معیار سے اسی معیار کا مطالبہ کرتا ہے جس کا مطالبہ برطانوی مدارس کے آخری امتحان میں کیا جاتا ہے ۔

یہ صورت حال استاد کے لیے بہت سی مشکلات پیدا کرتی ہے۔ استاد محسوس کرتا ہے کہ طلبہ میں مضمون کا ضروری علم پیدا کرنے کے لیے تدریس میں کافی گہرائی ہونی چاہیے۔ اس کام کے لیے وقت مہیا کیا گیا ہے۔ "جنرل سرٹیفکیٹ" کے لیے جو نصاب مقرر ہے وہ دو سال میں ختم کیا جاتا ہے۔ اس وقت سے زیادہ سے زیادہ فائدہ حاصل کیے بغیر استاد مجوزہ نصاب کو اچھی طرح ختم نہیں کر سکتا۔

معاشرتی پس منظر کا افلاس

افریقی مدرسوں میں پڑھانے والے استادوں کو سب سے بڑی مایوسی اس وقت ہوتی ہے جب وہ دیکھتے ہیں کہ وہ بدیہی سے بدیہی سچائی اور عام سے عام واقفیت کے متعلق بھی یہ یقین نہیں کر سکتے کہ طلبہ کو اس کا پہلے سے علم ہے۔ ترقی یافتہ ملکوں میں استاد کسی نکتے کی شرح بیان کرتے وقت اہم اشاروں پر اکتفا کرتا ہے۔ ان اشاروں کی شرح طلبہ کا سابقہ علم خود بخود بہم پہنچا دیتا ہے۔ افریقی مدرسوں میں یہ طریق تشریح کام نہیں دے سکتا۔ یہاں چھوٹی سے چھوٹی بات بھی پوری تفصیل اور جزئیات کے ساتھ بیان کرنا پڑتی ہے ورنہ طلبہ منہ تکتے رہ جاتے ہیں، اور ان کے پلّے کچھ نہیں پڑتا۔ اس کی وجہ افریقی طلبہ کے معاشرتی پس منظر کا افلاس ہے، جو معلومات مہذب دنیا کے بچوں کے لیے بدیہی یا افتادہ حقائق کا درجہ رکھتی ہیں وہ افریقی طلبہ کے لیے سربستہ راز ہیں۔

استاد کو زیادہ حیرانی اسوقت ہوتی ہے جب وہ دیکھتا ہے کہ یہ طلبہ بیان کردہ تشریح اور استدلال کو کمال صحت کے ساتھ دہرا سکتے ہیں۔ وہ ان معلومات اور حقائق کو بنا قرار دے کر نتائج بھی اخذ کر لیتے ہیں مگر یہ معلومات صرف ذہنی سطح پر معلّق رہتی ہیں۔ وہ طلبہ کی عملی زندگی کا جزو نہیں بننے پاتیں۔ جب کبھی ذرا سی مشکل، یا معمولی سی آزمائش کا سامنا ہوتا ہے تو افریقی نوجوان سائنسی معلومات کی روشنی میں اس کا حل تلاش نہیں کرتا۔ وہ فوراً قبائلی کاہن کے جنتر منتر اور تعویذ گنڈوں کا سہارا ڈھونڈتا ہے۔ تعلیم اسے کائنات کا معقول سائنسی تصور دینے سے قاصر رہتی ہے۔ کائنات کے متعلق اس کا تصور وہی پرانا تصور باقی رہتا ہے جو صدیوں سے افریقہ میں حکمران ہے۔ اس طرح افریقی طلبہ دوہرا انداز فکر پیدا کر لیتے ہیں۔ ایک انداز فکر صرف کمرۂ جماعت تک محدود رہتا ہے، دوسرا زندگی پر حکمرانی کرتا ہے۔

توہم پرستی کو مغربی سہارا

افریقہ میں آزادی اور جمہوریت کے تصورات مغرب سے آئے ہیں۔ ان خیالات اور تصورات کی اشاعت مغربی تعلیم کا ایک بہت بڑا کارنامہ ہے۔ مگر مصیبت یہ ہے کہ افریقی نوجوانوں کے سامنے دو متضاد تصورات پیش کی جارہی ہیں۔ ایک طرف مغربی فلسفہ اور سائنس کی تعلیم ہے جو سراسر معقولیت پسندی اور معروضیت کو سند قرار دیتی ہے۔ اس کے پہلو بہ پہلو یوروپی پادریوں کا دعظ ہے جو مدرسے کے گرجے میں منبر پر کھڑا عہد نامہ عتیق پڑھ پڑھ کر سناتا ہے۔ قدیم افریقی روایات کے مطابق انسان حیوانوں کی شکل میں تبدیل کیے جاسکتے ہیں مدرسے کی عام تعلیم اس قسم کے اعتقادات کو لغو قرار دیتی ہے۔ مگر پادری صاحب اپنے پورے زور بیان اور مذہبی وجاہت کے ساتھ خروج کا واقعہ بیان کرتے ہیں۔ اور بنی اسرائیل کے مجرموں کا بندروں وغیرہ کی شکل میں تبدیل ہو جانے کا حال بیان کرتے ہیں تو افریقی توہم پرستی کو ایک تازہ سہارا ملتا ہے۔ افریقی نوجوان بجا طور پر یہ خیال کرنے میں حق بجانب محسوس کرتے ہیں کہ ان کے صدیوں پرانے اعتقادات فی الواقعہ درست ہیں۔ اور مغربی علوم و سائنس کے کارنامے مادی دنیا میں خواہ کتنے ہی بڑے ہوں، نظام کائنات کی آخری باگ ڈور ان کے ہاتھ میں نہیں۔ بلکہ ان پر اسرار قوتوں کے ہاتھ میں ہے۔ جنہیں خوش کرنے کے طریقے ان کے باپ دادا نے معلوم کر رکھے ہیں۔ یہ صورت حال استاد کی دشواری کو بڑھا دیتی ہے۔ اس کے لیے یہ بات بے حد مشکل ہو جاتی ہے کہ اپنے طلبہ کو ان نظریات کا دلی طور پر قائل کرے جن کی تعلیم وہ دے رہا ہوتا ہے۔

"مگر میں اس کا تصور نہیں کرسکتا"

افریقی کمرہ جماعت میں جب کسی پرانے تاریخی واقعہ، کسی غیر ملک کی موجودہ زندگی یا سائنسی انکشافات کا حال بیان کیا جا رہا ہو، تو ایک عام جواب جو سننے میں آتا ہے یہ ہے: "مگر میں اس کا تصور نہیں کرسکتا۔"

حقیقت یہ ہے کہ کسی استدلال یا تشریح کو ذہن نشین کرنے کے لیے ایک موزوں ذہنی پس منظر کی ضرورت ہوا کرتی ہے، جس کے حوالے سے پیش کردہ حقائق و معلومات کو ذہنی ساخت کا جزو بنایا جاسکے۔ افریقی زندگی کسی شخص کو اس قسم کا ذہنی پس منظر عطا نہیں کرتی۔ افریقی طلبہ جب استاد کی زبانی یا کتاب میں سے سائنسی انکشافات، جغرافیائی سیاحتوں یا معاشی اور معاشرتی انقلابوں کی کہانیاں سنتے ہیں تو ان کا ذہن ان باتوں کی

یہ صورت حال استاد کے لیے بہت سی مشکلات پیدا کرتی ہے۔ استاد محسوس کرتا ہے کہ طلبہ میں مضمون کا ضروری علم پیدا کرنے کے لیے تدریس میں کافی گہرائی ہونی چاہیے۔ اس کام کے لیے وقت مہیا کیا گیا ہے۔ "جنرل سرٹیفکیٹ" کے لیے جو نصاب مقرر ہے وہ دو سال میں ختم کیا جاتا ہے۔ اس وقت سے زیادہ سے زیادہ فائدہ حاصل کیے بغیر استاد مجوزہ نصاب کو اچھی طرح ختم نہیں کر سکتا۔

معاشرتی پس منظر کا افلاس

افریقی مدرسوں میں پڑھانے والے استادوں کو سب سے بڑی مایوسی اس وقت ہوتی ہے جب وہ دیکھتے ہیں کہ وہ بدیہی سے بدیہی سچائی اور عام سے عام واقفیت کے متعلق بھی یہ یقین نہیں کر سکتے کہ طلبہ کو اس کا پہلے سے علم ہے۔ ترقی یافتہ ملکوں میں استاد کسی نکتے کی شرح بیان کرتے وقت اہم اشاروں پر اکتفا کرتا ہے۔ ان اشاروں کی شرح طلبہ کا سابقہ علم خود بخود بہم پہونچا دیتا ہے۔ افریقی مدرسوں میں یہ طریق تشریح کام نہیں دے سکتا۔ یہاں چھوٹی سے چھوٹی بات بھی پوری تفصیل اور جزئیات کے ساتھ بیان کرنا پڑتی ہے ورنہ طلبہ منہ تکتے رہ جاتے ہیں، اور ان کے پلّے کچھ نہیں پڑتا۔ اس کی وجہ افریقی طلبہ کے معاشرتی پس منظر کا افلاس ہے، جو معلومات مہذب دنیا کے بچوں کے لیے پیش پا افتادہ حقائق کا درجہ رکھتی ہیں وہ افریقی طلبہ کے لیے سربستہ راز ہیں۔

استاد کو زیادہ حیرانی اسوقت ہوتی ہے جب وہ دیکھتا ہے کہ یہ طلبہ بیان کردہ تشریح اور استدلال کو کمال صحت کے ساتھ دہرا سکتے ہیں۔ وہ ان معلومات اور حقائق کو بنا قرار دے کر نتائج بھی اخذ کر لیتے ہیں مگر یہ معلومات صرف ذہنی سطح پر معلق رہتی ہیں۔ وہ طلبہ کی عملی زندگی کا جزو نہیں بننے پاتیں۔ جب کبھی ذرا سی مشکل، یا معمولی سی آزمائش کا سامنا ہوتا ہے تو افریقی نوجوان سائنسی معلومات کی روشنی میں اس کا حل تلاش نہیں کرتا۔ وہ فوراً قبائلی کاہن کے جنتر منتر اور تعویذ گنڈوں کا سہارا ڈھونڈتا ہے۔ تعلیم اسے کائنات کا معقول سائنسی تصوّر دینے سے قاصر رہتی ہے۔ کائنات کے متعلق اس کا تصور وہی پرانا تصوّر باقی رہتا ہے جو صدیوں سے افریقہ میں حکمران ہے۔ اس طرح افریقی طلبہ دوہرا انداز فکر پیدا کر لیتے ہیں۔ ایک انداز فکر صرف کمرۂ جماعت تک محدود رہتا ہے، دوسرا زندگی پر حکمرانی کرتا ہے۔

توہم پرستی کو مغربی سہارا

افریقہ میں آزادی اور جمہوریت کے تصورات مغرب سے آئے ہیں۔ ان خیالات اور تصورات کی اشاعت مغربی تعلیم کا ایک بہت بڑا کارنامہ ہے۔ مگر مصیبت یہ ہے کہ افریقی نوجوانوں کے سامنے دو متضاد آوازیں پیش کی جا رہی ہیں۔ ایک طرف مغربی فلسفہ اور سائنس کی تعلیم ہے جو سراسر معقولیت پسندی اور معروضیت کو سند قرار دیتی ہے۔ اس کے پہلو بہ پہلو یورپی پادریوں کا وعظ ہے جو مدرسے کے گرجے میں منبر پر کھڑا عہد نامہ عتیق پڑھ پڑھ کر سناتا ہے۔ قدیم افریقی روایات کے مطابق انسان حیوانوں کی شکل میں تبدیل کیے جا سکتے ہیں مدرسے کی عام تعلیم اس قسم کے اعتقادات کو لغو قرار دیتی ہے۔ مگر پادری صاحب اپنے پورے زور بیان اور مذہبی وجاہت کے ساتھ خروج کا واقعہ بیان کرتے ہیں۔ اور بنی اسرائیل کے مجرموں کا بندروں وغیرہ کی شکل میں تبدیل ہو جانے کا حال بیان کرتے ہیں تو افریقی توہم پرستی کو ایک تازہ سہارا ملتا ہے۔ افریقی نوجوان یہ خیال کرنے میں حق بجانب محسوس کرتے ہیں کہ ان کے صدیوں پرانے اعتقادات فی الواقعہ درست ہیں۔ اور مغربی علوم و سائنس کے کارنامے مادی دنیا میں خواہ کتنے ہی بڑے ہوں، نظام کائنات کی آخری باگ ڈور ان کے ہاتھ میں نہیں۔ بلکہ ان پر اسرار قوتوں کے ہاتھ میں ہے۔ جنہیں خوش کرنے کے طریقے ان کے باپ دادا نے معلوم کر رکھے ہیں۔ یہ صورت حال استاد کی دشواری کو بڑھا دیتی ہے۔ اس کے لیے یہ بات بے حد مشکل ہو جاتی ہے کہ اپنے طلبہ کو ان نظریات کا دلی طور پر قائل کرے جن کی تعلیم وہ دے رہا ہوتا ہے۔

"مگر میں اس کا تصور نہیں کر سکتا"

افریقی کمرۂ جماعت میں جب کسی پرانے تاریخی واقعہ، کسی غیر ملک کی موجودہ زندگی، یا سائنسی انکشافات کا حال بیان کیا جا رہا ہو، تو ایک عام جواب جو سننے میں آتا ہے یہ ہے: "مگر میں اس کا تصور نہیں کر سکتا"۔ حقیقت یہ ہے کہ کسی استدلال یا تشریح کو ذہن نشین کرنے کے لیے ایک موزوں ذہنی پس منظر کی ضرورت ہوا کرتی ہے، جس کے حوالے سے پیش کردہ حقائق و معلومات کو ذہنی ساخت کا جزو بنایا جا سکے۔ افریقی زندگی کسی شخص کو اس قسم کا ذہنی پس منظر عطا نہیں کرتی۔ افریقی طلبہ جب استاد کی زبانی یا کتاب میں سے سائنسی انکشافات، جغرافیائی سیاحتوں یا معاشی اور معاشرتی انقلابوں کی کہانیاں سنتے ہیں تو ان کا ذہن ان باتوں کی

یہ صورت حال استاد کے لیے بہت سی مشکلات پیدا کرتی ہے۔ استاد محسوس کرتا ہے کہ طلبہ میں مضمون کا ضروری علم پیدا کرنے کے لیے تدریس میں کافی گہرائی ہونی چاہیے۔ اس کام کے لیے وقت مہیا کیا گیا ہے۔ "ٹیچرز سرٹیفکیٹ" کے لیے جو نصاب مقرر ہے وہ دو سال میں ختم کیا جاتا ہے۔ اس وقت سے زیادہ سے زیادہ فائدہ حاصل کیے بغیر استاد مجوزہ نصاب کو اچھی طرح ختم نہیں کر سکتا۔

معاشرتی پس منظر کا افلاس

افریقی مدرسوں میں پڑھانے والے استادوں کو سب سے بڑی مایوسی اس وقت ہوتی ہے جب وہ دیکھتے ہیں کہ وہ بدیہی سے بدیہی سچائی اور عام سے عام واقفیت کے متعلق بھی یہ یقین نہیں کر سکتے کہ طلبہ کو اس کا پہلے سے علم ہے۔ ترقی یافتہ ملکوں میں استاد کسی نکتے کی شرح بیان کرتے وقت اہم اشاروں پر اکتفا کرتا ہے۔ ان اشاروں کی شرح طلبہ کا سابقہ علم خود بخود بہم پہونچا دیتا ہے۔ افریقی مدرسوں میں یہ طریق تشریح کام نہیں دے سکتا۔ یہاں چھوٹی سے چھوٹی بات بھی پوری تفصیل اور جزئیات کے ساتھ بیان کرنا پڑتی ہے ورنہ طلبہ منہ تکتے رہ جاتے ہیں، اور ان کے پلّے کچھ نہیں پڑتا۔ اس کی وجہ افریقی طلبہ کے معاشرتی پس منظر کا افلاس ہے، جو معلومات مہذب دنیا کے بچوں کے لیے پیش پا افتادہ حقائق کا درجہ رکھتی ہیں وہ افریقی طلبہ کے لیے سربستہ راز ہیں۔

استاد کو زیادہ حیرانی اس وقت ہوتی ہے جب وہ دیکھتا ہے کہ یہ طلبہ بیان کردہ تشریح اور استدلال کو کمال صحت کے ساتھ دہرا سکتے ہیں۔ وہ ان معلومات اور حقائق کو بنا قرار دے کر نتائج بھی اخذ کر لیتے ہیں مگر یہ معلومات صرف ذہنی سطح پر معلّق رہتی ہیں۔ وہ طلبہ کی عملی زندگی کا جزو نہیں بننے پاتیں۔ جب کبھی ذرا سی مشکل، یا معمولی سی آزمائش کا سامنا ہوتا ہے تو افریقی نوجوان سائنسی معلومات کی روشنی میں اس کا حل تلاش نہیں کرتا۔ وہ فوراً قبائلی کاہن کے جنتر منتر اور تعویذ گنڈوں کا سہارا ڈھونڈتا ہے۔ تعلیم اسے کائنات کا معقول سائنسی تصوّر دینے سے قاصر رہتی ہے۔ کائنات کے متعلق اس کا تصور وہی پرانا تصور باقی رہتا ہے جو صدیوں سے افریقہ میں حکمران ہے۔ اس طرح افریقی طلبہ دوہرا انداز فکر پیدا کر لیتے ہیں۔ ایک انداز فکر صرف کمرۂ جماعت تک محدود رہتا ہے، دوسرا زندگی پر حکمرانی کرتا ہے۔

توہم پرستی کو مغربی سہارا

افریقہ میں آزادی اور جمہوریت کے تصورات مغرب سے آئے ہیں۔ ان خیالات اور تصورات کی اشاعت مغربی تعلیم کا ایک بہت بڑا کارنامہ ہے۔ مگر مصیبت یہ ہے کہ افریقی نوجوانوں کے سامنے دو متضاد نظریات پیش کیے جا رہے ہیں۔ ایک طرف مغربی فلسفہ اور سائنس کی تعلیم ہے جو سراسر معقولیت پسندی اور معروضیت کو سند قرار دیتی ہے۔ اس کے پہلو بہ پہلو یورپی پادریوں کا دعویٰ ہے جو مدرسے کے گرجے میں منبر پر کھڑا عہد نامہ عتیق پڑھ پڑھ کر سناتا ہے۔ قدیم افریقی روایات کے مطابق انسان حیوانوں کی شکل میں تبدیل کیے جا سکتے ہیں مدرسے کی عام تعلیم اس قسم کے اعتقادات کو لغو قرار دیتی ہے۔ مگر پادری صاحب اپنے پورے زور بیان اور مذہبی وجاہت کے ساتھ خروج کا واقعہ بیان کرتے ہیں۔ اور بنی اسرائیل کے مجرموں کا بندروں وغیرہ کی شکل میں تبدیل ہو جانے کا حال بیان کرتے ہیں تو افریقی توہم پرستی کو ایک تازہ سہارا ملتا ہے۔ افریقی نوجوان یہ خیال کرنے میں حق بجانب محسوس کرتے ہیں کہ ان کے صدیوں پرانے اعتقادات فی الواقعہ درست ہیں۔ اور مغربی علوم و سائنس کے کارنامے مادی دنیا میں خواہ کتنے ہی بڑے ہوں، نظام کائنات کی آخری باگ ڈور ان کے ہاتھ میں نہیں۔ بلکہ ان پر اسرار قوتوں کے ہاتھ میں ہے۔ جنہیں خوش کرنے کے طریقے ان کے باپ دادا نے معلوم کر رکھے ہیں۔ یہ صورت حال استاد کی دشواری کو بڑھا دیتی ہے۔ اس کے لیے یہ بات بے حد مشکل ہو جاتی ہے کہ اپنے طلبہ کو ان نظریات کا دلی طور پر قائل کرے جن کی تعلیم وہ دے رہا ہوتا ہے۔

"مگر میں اس کا تصور نہیں کر سکتا"

افریقی کمرۂ جماعت میں جب کسی پرانے تاریخی واقعہ، کسی غیر ملک کی موجودہ زندگی، یا سائنسی انکشافات کا حال بیان کیا جا رہا ہو، تو ایک عام جواب جو سننے میں آتا ہے یہ ہے: "مگر میں اس کا تصور نہیں کر سکتا۔"

حقیقت یہ ہے کہ کسی استدلال یا تشریح کو ذہن نشین کرنے کے لیے ایک موزوں ذہنی پس منظر کی ضرورت ہوا کرتی ہے، جس کے حوالے سے پیش کردہ حقائق و معلومات کو ذہنی ساخت کا جزو بنایا جا سکے۔ افریقی زندگی کسی شخص کو اس قسم کا ذہنی پس منظر عطا نہیں کرتی۔ افریقی طلبہ جب استاد کی زبانی یا کتاب میں سے سائنسی انکشافات، جغرافیائی سیاحتوں یا معاشی اور معاشرتی انقلابوں کی کہانیاں سنتے ہیں تو ان کا ذہن ان باتوں کی

تشکیک نہیں کرتا۔ ان کی قومی یا نجی زندگی کو اس قسم کا کوئی تجربہ حاصل نہیں۔ اساتذہ کتاب کی تشریح ان کے ذہنوں کو مطمئن نہیں کر سکتی۔ وہ اس شرح کی شرح تلاش کرتے ہیں۔ یہ کام استاد کے لیے بے حد صبر آزما ہے لیکن طلبہ کا سلسلہ بالکل قدرتی اور جائز ہے۔ وہ پیش کردہ تشریح کی تشریح جانے بغیر اس کے قائل نہیں ہو سکتے

اعتماد نفس کی کمی

ترقی یافتہ ملکوں سے آنے والے لوگ افریقی طلبہ کے متعلق سب سے پہلا تاثر یہ لیتے ہیں کہ ان میں اعتماد نفس کی کمی ہے۔ اس میں کلام نہیں کہ افریقی نظام تعلیم کی سب سے بنیادی خامی یہی ہے۔ افریقی طلبہ کو یہ احساس ہمیشہ ستاتا رہتا ہے کہ وہ اپنے آپ کچھ نہیں کر سکتے۔ خواہ تیرنا سیکھنے کا معاملہ ہو یا ہندسہ کے کسی مسئلہ کے حل کرنے کا سوال۔ عدم یقین اور بے اعتمادی افریقی طلبہ کا پیچھا نہیں چھوڑتی۔

اس افسوس ناک ذہنی مرض کا ایک نتیجہ یہ ہے کہ مدرسہ چھوڑ دینے کا رجحان بہت عام ہے۔ حد یہ ہے کہ طلبہ عموماً نظام مدرسہ میں ذمہ داری کا کوئی عہدہ قبول کرنے کے شائق نہیں۔ تعلیم حاصل کرنے کے بعد بھی ان کی آخری تمنا کوئی بلند ذمہ داری قبول کرنے کی بجائے کوئی ماتحت اسامی پر کرنا ہوتی ہے۔ وہ اسی بات کو ترجیح دیتے ہیں کہ ذمہ داری کسی اور کے کندھوں پر ہو اور وہ اس کی زیر ہدایت کام کرتے رہیں۔ تعلیم ختم کرنے کے بعد اکثر نوجوان یہ پسند کرتے ہیں کہ کچھ عرصہ نوکری کا بوجھ قبول کرنے کے بعد اس قدر روپیہ پیدا کرلیں کہ بعد میں اپنے کھیت یا دوکان یا چھوٹے موٹے کارخانے میں اپنا کاروبار چلالیں، اور اس طرح انہیں کسی اور کے سامنے جواب دہ نہ ہونا پڑے۔

غرض ذمہ داری سے فرار افریقی زندگی کا سب سے نمایاں خاصہ ہے۔ مدرسہ ہو یا بالغ زندگی کے کاروبار ایک افریقی کے لیے دوسرے کے سامنے جوابدہ ہونے سے زیادہ تلخ چیز شاید ہی کوئی ہو۔ لہٰذا افریقہ میں استاد کے ذمے سب سے زیادہ ذمے داری یہ ہے کہ وہ اپنے شاگردوں میں خود اعتمادی کو ترقی دے۔ وہ ان کے لیے ایسی سرگرمیوں کا بندوبست کرے جن میں حصہ لینے سے اعتماد نفس کی پرورش ہو۔ طلبہ میں یہ احساس ترقی پائے کہ وہ خود بلا سہارا بھی کچھ کر سکتے ہیں۔ لیکن اس کام میں بھی استاد کو جلد احساس ہونے لگے گا کہ مذہبی تعلیمات اس کی کوششوں پر پانی پھیر رہی ہیں۔ مسیحی دین کی تبلیغ و اشاعت سے افریقی زندگی کا کوئی گوشہ خالی نہیں، اور اس دین کی تعلیمات میں عجز و انکسار اور انسانی کمزوریوں پر جو زور دیا گیا ہے وہ خود اعتمادی کی تعمیر کے لیے ممد ہونے کی بجائے مخالف ثابت ہوتا ہے

معقول اور منضبط ذہنی پس منظر کی ضرورت

افریقی ثانوی مدرسے میں پڑھانے والے استاد کو سب سے زیادہ حیرت اس بات پر ہوتی ہے کہ جہاں اس کے طلبہ غیر معمولی قوت حافظہ کا ثبوت دیتے ہیں وہاں دوسرے ممالک کے ہم عمر بچوں کے مقابلے میں ان کی قوتِ استدلال مضحکہ خیز حد تک کمزور دکھائی دیتی ہے۔ یہ صورت بظاہر خواہ کتنی ہی عجیب دکھائی دے، افریقی زندگی کی مخصوص روایات میں یہ بالکل ایک قدرتی چیز ہے۔ علم خوشبخت کا جامہ صرف اسی صورت میں پہن سکتا ہے جب یہ سابقہ معلومات کے تانے بانے میں اچھی طرح ٹھکانے بیٹھ جائے۔ ان کا یوں ٹھکانے بیٹھنا ہی اس کی صداقت کا ثبوت ہوا کرتا ہے اور یہی وہ عمل ہے جو تحصیل علم کو ایک لطف انگیز ذہنی سرگرمی بناتا ہے۔ جب تک افریقی نوجوانوں کا ذہن ان بدیہی علمی اور سائنسی حقائق کا کافی ذخیرہ جمع نہیں کر لیتا جن کے حوالے سے علم و سائنس کا آگے مطالعہ کیا جا سکتا ہے، اس وقت تک افریقی ثانوی مدرسے کا کام حقیقت کے رنگ سے عاری رہے گا۔ ایک معقول اور منضبط ذہنی پس منظر کی تعمیر نہ صرف فہم مضامین کی ضامن ہو سکتی ہے۔ بلکہ منطقی اور استدلالی قوتوں کی ترقی کا وسیلہ بھی۔

افریقی ثانوی مدرسوں کے طلبہ آج ذہنی پختگی کی جس سطح پر نظر آتے ہیں وہ بہت کچھ ترقی یافتہ ملکوں کے سات سے گیارہ سالہ بچے کی ذہنی کیفیت سے مشابہ ہے۔ ان بچوں کی قوت حافظہ بھی غیر معمولی طور پر تیز دکھائی دیتی ہے۔ لیکن قوت استدلال کافی کمزور۔ دونوں صورتوں میں علت غائی ایک ہی ہے۔ یعنی ایک ایسے ذہنی پس منظر کا فقدان جس میں نہ صرف بنیادی حقائق و معلومات کا اچھا خاصہ ذخیرہ موجود ہو بلکہ ان حقائق و معلومات کے درمیان علت و معلول کے رشتے بھی اچھی طرح استوار ہوں۔ چھوٹے بچے اس قسم کے ذہنی منظر کے فقدان کے سبب ہی جنوں اور پریوں کی کہانیوں اور اس قسم کی دوسری ناممکن باتوں پر فوراً یقین لے آیا کرتے ہیں۔ افریقی ثانوی مدرسوں کے طلبہ ان بچوں سے اس بات میں مختلف ہیں کہ وہ زود یقین ہونے کی بجائے ہٹ دھرم ہیں، وجہ یہ کہ ثانوی مدرسے میں آنے کے وقت تک ان کا ذہنی پس منظر ادھورا اور کورا نہیں ہوتا، بلکہ واقعات و حقائق کے مسخ شدہ تصورات سے اٹا پڑا ہوتا ہے۔ وہ کائنات کا ایک غیر معقول اور باطل تصور ساتھ لے کر آتے ہیں، یہ فوراً ہی ہر اس چیز کو جھٹلاتا ہے جو علم و سائنس کی طرف سے پیش کی جائے۔

یہ صورت حال استاد کے لیے کافی حوصلہ فرسا سہی لیکن ناقابل علاج نہیں۔ دنیا کے بڑے بڑے معلموں کو اسی قسم کے غلط اور غیر معقول ذہنی پس منظر سے سابقہ پڑتا رہا ہے۔ ان عظیم معلموں نے عموماً طریق سوال سے کام لے کر اپنے سامعین کے سابقہ تصورات کا بودا پن ظاہر کیا اور ان کی معلومات کو نئے رشتوں میں منسلک کیا۔ افریقی استاد کو بھی یہی طریق کار اختیار کرنا چاہیے۔ اسے چاہیے کہ تدریس کے دوران میں لگاتار طلبہ کی سابقہ معلومات کا تجزیہ کرتا رہے۔ اور یوں اسباب و نتائج کی ایک نئی زنجیر تیار کرتا چلا جائے۔ مختلف مضامین کا باہمی ارتباط اس طریق کار کے لیے بہت کارآمد ثابت ہو سکتا ہے۔ اس مطلب کے لیے جغرافیہ جیسے مضمون کو مرکزی حیثیت دینا بڑے مفید نتائج پیدا کر سکتا ہے۔ کیوں کہ یہ وہ مضمون ہے جو قدرتی سائنسوں اور معاشرتی علوم کا مرکب ہونے کے باعث الگ تھلگ تصورات کو ایک لڑی میں پرونے کا ذریعہ ثابت ہو سکتا ہے ؂

تعلیمی سیاحتیں اور برطانوی مدرسے

فضل الرحمان ناصر

"کاش ہم جغرافیے کے تمام سبق ہوائی جہاز میں بیٹھ کر ہی پڑھا کریں" - یہ ہے وہ فقرہ جو برمنگھم کے تقریباً ایک ہزار بچوں کی زبان پر ہے۔ ان بچوں کو پڑھانے والے استاد بھی یہی کہتے سنے جاتے ہیں۔ پچھلے سال برطانوی یورپی ہوائی کمپنی کی تعلیم دوستی اور فیاضی نے ان بچوں اور استادوں کو یہ موقع بہم پہنچایا تھا کہ وہ اپنے کمرۂ جماعت کو ہوائی جہاز میں منتقل کرلیں۔

برمنگھم سے بذریعہ طیارہ لندن جانے میں کوئی پچاس منٹ صرف ہوتے ہیں۔ پچھلی گرمیوں میں برطانوی یوروپی ہوائی کمپنی کے مالکوں نے فیصلہ کیا کہ برمنگھم کے بچوں کو لندن دیکھنے اور درمیانی علاقے کے تفصیلی جغرافیائی مطالعہ کی سہولتیں بہم پہونچائی جائیں۔ چناں چہ فیصلہ کیا گیا کہ جو بچے تعلیمی سیاحت کی اس سہولت سے فائدہ اٹھانا چاہیں ان سے عام واپسی ٹکٹ کا صرف پانچواں حصہ قیمت وصول کی جائے۔ اس تعلیمی منصوبے کی افادیت بڑھانے کے لیے ہوائی کمپنی نے برمنگھم اور لندن کے درمیانی رقبے کے خاص نقشے تیار کرائے۔ ان نقشوں میں اس علاقے کی سطح اور دوسرے جغرافیائی حالات کو بڑے واضح اور دل چسپ انداز میں ظاہر کیا گیا تھا۔

ہوائی کمپنی کی طرف سے ہفتے میں تین دن اس تعلیمی سیاحت کے لیے مخصوص تھے۔ اس روز بچے اور ان کے استاد ہوائی جہاز کو کمرۂ جماعت بنا لیتے۔ کمپنی کی طرف سے ہر طالب علم کو خصوصی طور پر تیار کردہ نقشہ مہیا کردیا جاتا جب جہاز اڑنے لگتا تو پہلے جہاز کا کپتان ایک چھوٹی سی توضیحی تقریر کرتا۔ بعد ازاں استاد سبق شروع کردیتا۔ کپتان اور استاد کے تقریری بیان کی توضیح نہ صرف خصوصی نقشے کی مدد سے ہوتی جاتی۔ بلکہ طالب علم جہاز کی بلندی سے نیچے جھانک کر تمام جغرافیائی کوائف کو خود اپنی آنکھوں سے دیکھتے۔ لندن پہنچنے پر طلبہ کو پہلے ہوائی اڈے کی سیر کرائی جاتی۔ پھر لندن کے تمام قابل دید مقامات کی۔ اس طرح بیش قیمت جغرافیائی اور تاریخی معلومات کا ایک اچھا خاصہ اور جیتا جاگتا ذخیرہ حاصل کرلینے کے بعد بچے شام کو واپس برمنگھم آجاتے۔ لطف کی بات یہ کہ اس ساری سیاحت پر صرف

ــــ

دس شلنگ (قریباً سات روپے) فی بچہ خرچ آتا۔

تعلیمی سیاحتوں کا یہ پروگرام بے حد مقبول ثابت ہوا۔ استاد، بچے اور والدین تمام ان کی افادیت کے قائل
سے مداح تھے۔ تاہم برطانوی یورپی ہوائی کمپنی کو اس تعلیمی افادیت کے مقابلے میں اپنے اخراجات اور آمدنی کے
توازن کو پونڈوں شلنگوں کی صورت میں تولنا تھا۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ اس ترازو میں یہ سودا نفع بخش نہ تھا
تاہم برطانوی یورپی ہوائی کمپنی نے اس سودے کے بعید المدت قومی منافع کو پیش نگاہ رکھتے ہوئے فیصلہ کیا
کہ یہ مفید تعلیمی سیاحتیں، آئندہ موسم گرما میں بھی جاری رکھی جائیں گی۔

تدریجی ترقی

کوئی ساٹھ سال گذرے جب برطانوی مدرسوں نے اوّل اوّل تعلیمی سیاحتوں سے کام لینا شروع کیا۔ پچھلے ساٹھ
برس میں ان سیاحتوں کے پروگرام میں بے حد وسیع ترقی ہوئی ہے تعلیمی سیاحتوں کا آغاز انیسویں صدی کی آخری چوتھائی
میں ہوا تھا۔ جب لندن شہر کے مدرسوں نے ہفتے کے آخری دن باہر دیہات میں اپنے بچوں کو مشاہدۂ فطرت اور مطالعہ
جغرافیہ کے لیے لے جانا شروع کیا۔ ان سیاحتوں کا رواج رفتہ رفتہ بڑھتا گیا، اور لندن سے باہر کے مدرسوں نے بھی
ان سے کام لینا شروع کیا۔ سنہ ۱۹۱۱ء تک ان کا رواج اس قدر بڑھ گیا کہ ان کی حوصلہ افزائی کے لیے ایک انجمن
قائم کی گئی۔ یہ انجمن رضاکارانہ خدمت کے لیے قائم کی گئی تھی۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ مدرسوں کو تعلیمی سیاحتوں کے معاملے میں
سہولتیں بہم پہنچائی جائیں۔

تعلیمی سیاحتیں اب اس حد تک ترقی کر چکی ہیں کہ کوئی ہی برطانوی مدرسہ ہوگا، جو ان سے کام نہ لیتا
ہو۔ اس ہمہ گیر استعمال کے ساتھ ہی تعلیمی سیاحتوں کے مفہوم اور ان کی مدت میں بھی بے حد وسعت پیدا ہو چکی ہے
تین مدرسے انگلستان کے جنوبی ساحل پر دو ہفتے گذار لے یا رود بار انگلستان کے اس پار یورپ میں چند ہفتے
گزارنے پر اکتفا کر لیتے ہیں تو بعض مدرسے ایسے بھی موجود ہیں جو اپنے بچوں کو چند مہینوں کے لیے فرانسیسی مدرسوں
میں بھیج دیتے ہیں۔ غرض کوئی سیاحت ایسی نہیں جو برطانوی مدرسوں کی نگاہ میں بعید از امکان ہو۔ یونیسکو تعلیمی سیاحتوں
کی بڑی حوصلہ افزائی کرتی ہے۔ مختلف یورپی ملکوں کی وزارت ہائے تعلیم بھی باہر سے آنے والے طالب علم سیاحوں
کی کافی مدد اور حوصلہ افزائی کرتی ہیں۔ یہ تعلیمی سیاحتیں تمام تر موسم گرما میں منظم کی جاتی ہیں۔ جونہی سردی ختم ہوئی اور بہار کا

موسم آیا، برطانوی بچے گروہ در گروہ تعلیمی سیاحتوں کے لیے نکل کھڑے ہوئے

تعلیمی کام کے ساتھ ربط

اوپر کی سطور سے یہ خیال نہ کر لینا چاہیے کہ برطانوی مدرسوں کی تعلیمی سیاحتیں تمام تر بہت بڑے پیمانے پر انجام پاتی ہیں۔ یہ قدرتی طور پر زیادہ تر سیاحتیں مدرسے کے قرب و جوار کے ساتھ متعلق اور مدرسے کے روزمرہ کام کے ساتھ ربط رکھتی جاتی ہیں۔

برطانوی مدرسوں کی سیاحتوں کو دو بڑی بڑی قسموں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے:-

(۱) **داخلی سیاحتیں:-** یہ وہ سیاحتیں ہیں جو روزمرہ کے تدریسی کام کا ہی جزو ہوتی ہیں۔ یہ سیاحتیں ایام کار میں ہی انجام پاتی ہیں۔ انہیں رسمی تدریسی کام سے الگ تصور نہ کرنا چاہیے۔

(۲) **غیر ملکی سیاحتیں:-** ان سیاحتوں کا اہتمام تعطیلات کے دوران میں کیا جاتا ہے۔ ان کی غرض رسمی تعلیم نہیں بلکہ زندگی کا عام تجربہ اور علم بہم پہنچانا ہوتا ہے، ان کے دوران میں رسمی تدریس بند رہتی ہے۔

داخلی سیاحتوں کی اوسط مدت دو ہفتے ہوتی ہے۔ اور ان کے پیش نظر دو بڑے مقاصد ہوتے ہیں۔

(الف) بچہ روزمرہ سے مختلف ماحول میں کچھ وقت گزارے، اور اس ماحول کے متعلق معلومات حاصل کرے۔ اس اصول کے پیش نظر شہری بچے دیہات میں یا ساحل سمندر پر بھیجے جاتے ہیں۔ اس کے برعکس دیہاتی بچوں کو لندن یا دوسرے بڑے صنعتی شہروں کو دیکھنے کا موقع دیا جاتا ہے۔

(ب) دوسرا بڑا مقصد یہ ہوتا ہے کہ بچے کی قوت مشاہدہ ترقی پائے اور اسے دوسرے لوگوں کے ساتھ نباہ کرنے کا ڈھنگ آ جائے۔

استادوں کا عام طور پر اس بات پر اتفاق ہے کہ اگر کوئی اجنبی کمرہ جماعت میں داخل ہو تو وہ ایک ہی نگاہ میں بتا دے گا کہ کون سے بچے سیاحت کر چکے ہیں۔ اس کی وجہ یہ نہیں کہ باہر کھلی ہوا میں گھومنے پھرنے سے جلد کی رنگت میں ایک صحت مند سانولا پن پیدا ہو جاتا ہے، بلکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ جو بچہ باہر کی دنیا سے باخبر ہو جاتا ہے وہ غیر معمولی طور پر چوکس اور چوبند ہو جاتا ہے۔ سیاحت کا ایک اور بڑا فائدہ وہ جذبہ اشتراک عمل ہے جو اس کے نتیجہ کے طور پر جنم لیتا ہے۔ یہ جذبہ استاد کے نقطہ نگاہ سے سب سے کارآمد ہے۔ یہ درست ہے کہ تیس چالیس بچوں کو باہر سیاحت کے لیے

لے جانا اور چودہ دن تک لگاتار دن رات ان کی دیکھ بھال کرنا ایک مشکل اور صبر آزما کام ہے۔ لیکن اس محنت کا پھل بہت میٹھا ہے۔ استادوں کا عام مشاہدہ یہ ہے کہ وہ بچے جو کمرۂ جماعت میں ہمیشہ درد سر بنے رہتے تھے۔ سیاحت سے واپسی پر ان کی زبان سے بھی یہ جملہ سنا گیا۔ "ماسٹر صاحب ابا جان سے چنداں مختلف نہیں ہیں"

نیشنل کیمپس کارپوریشن

برطانوی نظام تعلیم میں تعلیمی سیاحتوں کو نصاب کا ایک ناگزیر جزو بنا دیا گیا ہے۔ اس اہم تعلیمی ضرورت کا پورا کرنا ایک قومی مسئلہ ہے، اور اسے قومی سطح پر حل کیا گیا ہے۔ چناں چہ نیشنل کیمپس کارپوریشن ایک ایسی جماعت ہے، جس نے طالب علموں کے لیے ملک بھر میں جگہ جگہ سیاحتی مرکز قائم کر رکھے ہیں۔ یہ مرکز کیا ہیں گویا کھلی ہوا میں تعمیر شدہ درس گاہیں ہیں۔ ان کے کمرے کینیڈا سے لائی گئی ہلکی پھلکی لکڑی سے تعمیر کیے گئے ہیں ان کمروں کو گرم رکھنے کا پورا انتظام ہے، ساتھ کھیل کے میدان ہیں۔

تعلیمی سیاحتوں کے دوران میں بعض بچے ان کیمپوں میں اقامت اختیار کرتے ہیں۔ ہر تعلیمی حکومت اپنے بچوں کے لیے باہر کھلی دیہاتی فضا میں اس قسم کے سیاحتی مرکز قائم کرتی ہے۔ مثلاً لندن کاؤنٹی کونسل نے جو لندن کے میونسپل رقبہ کی تعلیمی حکومت ہے۔ اپنے بچوں کے لیے اس طرح کے چند ایک سیاحتی مرکز تعمیر کر رکھے ہیں۔ مارچ سے نومبر کے مہینے تک بچوں کے گروہوں کو ان مرکزوں میں چودہ چودہ دن کے لیے بھیجا جاتا ہے۔

بعض تعلیمی حکومتیں ان مرکزوں کو بچوں کی بحالی صحت کے لیے استعمال کرتی ہیں۔ یہاں ایسے بچوں کو بھیجا جاتا ہے جو بدنی طور پر نحیف و نازک ہوں۔ یہاں انہیں تین ماہ کے عرصہ سے لے کر ایک سال تک رکھا جاتا ہے۔ تاکہ کھلی زندگی کے باعث ان کے نازک قوائے بدنی مضبوط و توانا ہو جائیں۔

مدرسوں کی بعض سیاحتی جماعتیں ہوسٹلوں۔ چھوٹے چھوٹے ہوٹلوں اور بورڈنگ ہاؤسوں کو رہائش کے لیے استعمال کرتی ہیں۔ ایسے مدرسے بھی ہیں جو سیاحت کے لیے خیموں سے کام لیتے ہیں لیکن برطانیہ کی آب و ہوا میں خیموں میں رہائش اختیار کرنا بہت صبر آزما چیز ہے۔

ملاحی کی ابتدائی تربیت

برطانیہ ایک جزیرہ ہے اور اس کی زندگی کا بہت کچھ مدار اس ملک کے ملاحوں اور جہاز رانوں پر ہے۔ کئی ایک مدرسے تعلیمی سیاحت کو ملاحی کی ابتدائی تربیت کی شکل دے دیتے ہیں۔ ملے جلے مدرسے جہاں لڑکے لڑکیاں ایک ساتھ پڑھتے ہیں۔ اس کی یہ صورت اختیار کرتے ہیں کہ ہفتہ بھر کے لیے لڑکوں کو کسی تربیتی جہاز پر بھیج دیتے ہیں۔ اور پھر اگلے ہفتے لڑکیوں کو یہ تربیت دلا دیتے ہیں۔ جنوبی انگلستان کی بندرگاہوں میں ایسے تربیتی جہاز مل جاتے ہیں۔ ان تربیتی بحری مرکزوں میں برطانیہ کے مہنگے پبلک مدرسوں کے لڑکے عام مدرسوں کے لڑکوں کے ساتھ مل کر ابتدائی بحری تربیت حاصل کرتے ہیں۔

تبادلہ طلبہ

تعلیمی سیاحت کی ایک اور عام صورت بچوں کا تبادلہ ہے۔ اس کی صورت یہ ہے کہ دو مدرسے کسی ایک جماعت کے طلبہ کا باہمی تبادلہ کر لیتے ہیں۔ مثلاً مدرسہ ا کی جماعت ہفتم کے کچھ بچے کسی دوسرے شہر کے مدرسہ ب کی جماعت ہفتم میں جا بیٹھیں گے اور مدرسہ ب کی اسی جماعت کے بچے مدرسہ ا کی جماعت ہفتم میں آ شامل ہوں گے۔ استاد اور مدرسے کے نقطۂ نگاہ سے تعلیمی سیاحت کی یہ آسان ترین شکل ہے۔ اس کے لیے نہ استاد کو کوئی خاص منصوبہ بندی کرنا پڑتی ہے اور نہ ہی مدرسے کے نظام کار میں کوئی ردو بدل کی ضرورت پیش آتی ہے۔

اس کے برعکس جس استاد کو اپنی جماعت کہیں باہر لے جانی پڑے، اسے کافی ہوشمندی کے ساتھ منصوبہ بندی کرنا پڑتی ہے تاکہ سیاحت سے نہ صرف زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھایا جا سکے۔ بلکہ انسپکٹر مدارس کو بھی اس کی افادیت کا قائل کیا جا سکے۔ اس کے بغیر انسپکٹر مدارس کی طرف سے یہ اعتراض کیا جا سکتا ہے کہ بچے اور استاد محض تفریحی سیر گشت میں وقت ضائع کر کے واپس آ گئے ہیں۔

لائحہ عمل

تفریحی سیاحتوں کا لائحہ عمل کسی خاص مقررہ شکل میں مقید نہیں رکھا جاتا۔ اس کا انحصار زیادہ تر اسی مقام کی نوعیت پر ہے، جسے سیاحت کے لیے چناں جائے۔ جس مقام پر تاریخی یادگاریں کثرت سے ہوں

جیسے لندن میں، وہاں مطالعہ تاریخ کو ایک اہم مقام دیا جانا ایک قدرتی بات ہے، دیہاتی بچے جب کسی شہر کی سیاحت کے لیے آتے ہیں تو وہ وہاں کی حکومت خود اختیاری کے نظام کا مطالعہ کرتے ہیں۔ اگر کسی مصنف یا شاعر کا کوئی تعلق کسی مقام سے ہو تو اس مقام کی سیاحت کے سلسلے میں اس کی تصنیفات کا مطالعہ کیا جاتا ہے۔ شہری بچے جب دیہاتی علاقوں کی سیاحت کو نکلتے ہیں تو جغرافیے، علم نباتات، اور علم الارض کو قدرتی طور پر پہلا مقام ملتا ہے۔

تعلیمی سیاحتوں میں ایک بات کا خاص طور پر خیال رکھا جاتا ہے، وہ یہ کہ بچہ خود اپنی جرات عمل سے کام لے۔ سیاحت کے لیے روانگی سے پہلے استاد ایک چھوٹا سا کتابچہ بطور ہدایت نامہ تیار کرتا ہے، اس میں سیاحت کی تفصیلیں درج ہوتی ہیں۔ اس میں نہ صرف یہ بتایا گیا ہوتا ہے کہ سفر میں کون کون سی چیزوں کی ضرورت پیش آئے گی، بلکہ ان مقامات پر مختصر نوٹ اور ان کے متعلق اہم سوالات بھی درج ہوتے ہیں۔ جن مقامات کی سیاحت کے لیے روانگی ہو رہی ہے۔ بعض اوقات استاد پہلے ہی کسی مقامی کسان سے ملاقات کر کے اس سے یہ اجازت حاصل کر لیتا ہے کہ زراعت کے اسباق کے لیے اس کی کھیتیوں کو بنا قرار دیا جا سکے۔ اس قسم کی اجازت عموماً مل جاتی ہے، اور بچے کھیتوں میں ادھر ادھر گھوم پھر کر اپنے سوالوں کے جواب خود تلاش کرتے ہیں۔

غیر ملکی سفر

غیر ملکی سفر جو لمبی چھٹیوں کے دوران میں اختیار کیے جاتے ہیں اپنی نوعیت میں بہت مختلف ہیں۔ ان کا پروگرام زیادہ لچکدار اور زیادہ پُر ہنگامہ رکھا جاتا ہے۔ دوسری عالمی جنگ کے بعد سے غیر ملکی سیاحت میں بے حد اضافہ ہوا ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ سرکاری اور غیر سرکاری ادارے یکساں طور پر یہ محسوس کرنے لگے ہیں کہ یہ سیاحتیں یورپ میں ایک ایسی نسل پیدا کر سکتی ہیں جس کے افراد الگ الگ ملکوں میں بستے ہوئے بھی اپنے آباؤ اجداد کے مقابلے میں ایک دوسرے کو بہتر طور پر سمجھتے ہوں۔ اس غایت کو بہتر طور پر پورا کرنے کی کوشش یہ کی جاتی ہے کہ بچوں کی جماعتیں ہوٹلوں میں ٹھہرنے کی بجائے ایسی اقامت گاہوں میں ٹھہریں جو انہیں دوسرے ملک کے بچوں اور شہریوں کے ساتھ گہرے رابطے پیدا کرنے کے مواقع ملیں۔ اگر وہ صرف ہوٹلوں میں ہی ٹھہریں تو زیادہ امکان اس بات کا ہے کہ ان کا واسطہ ان پر طانوی سیاحوں سے پڑے جو ان ہوٹلوں

ٹھہرے ہوئے ہیں۔ اب بھی ایسے مدرسے ضرور موجود ہیں جو اپنے بچوں کو ہوٹلوں میں ٹھہراتے ہیں۔ مگر اس طریق کار کی اب حوصلہ افزائی نہیں کی جاتی۔

مدارس کا بھائی چارہ

غیر ملکی سیاحتوں کے راستے میں سب سے بڑی رکاوٹ اخراجات کی ہے۔ آنے جانے کے کرائے کے علاوہ ہوٹلوں میں ٹھہرنے اور کھانے کے اخراجات عموماً اتنے بھاری ہوتے ہیں کہ بہت سے طلبہ ان کو برداشت نہیں کر سکتے اس مشکل پر قابو پانے کے لیے بعض برطانوی مدارس نے یورپی مدرسوں کے ساتھ غیر رسمی مراسم قائم کرنا شروع کیے تھے۔ بالآخر ۱۹۱۵ء میں برطانیہ اور فرانس کی تعلیمی وزارتوں نے اس اہم تعلیمی ضرورت کو سرکاری سطح پر پورا کرنے کا ایک جامع منصوبہ تیار کیا۔ اس منصوبے کی رُو سے ہر برطانوی مدرسے کو ایک فرانسیسی مدرسے کے ساتھ سرکاری طور پر منسلک کر دیا گیا۔ اس طرح ان دونوں مدرسوں کے درمیان ایک طرح کی مواخاۃ قائم ہو گئی۔ ان دونوں کے طلبہ اور اساتذہ باقاعدہ ایک دوسرے کے ساتھ رابطہ قائم رکھتے ہیں۔ ان کے درمیان خط و کتابت ہوتی رہتی ہے۔ اخبارات کا تبادلہ ہوتا رہتا ہے، اور یوں دونوں ایک دوسرے کی روزمرہ زندگی میں دلچسپی پیدا کر لیتے ہیں۔ زیادہ صورتوں میں یہ دونوں مدرسے بچوں کے باہمی تبادلے بھی کرتے ہیں۔ بعض اوقات صرف چند بچوں کا تبادلہ کیا جاتا ہے، اور بعض اوقات کسی ساری کی ساری جماعت کا۔ آخری صورت میں جماعت کے ساتھ متعلقہ اساتذہ کا بھی تبادلہ ہو جاتا ہے۔ اس قسم کے تبادلے زیادہ تر لمبی چھٹیوں میں کیے جاتے ہیں لیکن کئی مدرسے پڑھائی کے دنوں میں بھی ایک پورے تعلیمی وقفے کے لیے اس قسم کے تبادلے کر لیتے ہیں۔

مدرسے کی یہ مواخاۃ پہلے صرف برطانیہ اور فرانس کے درمیان قائم ہوئی تھی۔ لیکن اب اس قسم کا بھائی چارہ برطانوی اور جرمنی مدارس۔ اور برطانوی اور آسٹروی مدارس کے درمیان بھی قائم ہو چکا ہے۔

بچوں کے تبادلے کے متعلق استادوں کی رائے یہ ہے کہ اس سے ریاضی اور سائنس کو نقصان پہنچتا ہے۔ لیکن غیر ملکی زبان کے علم کو بہت فائدہ حاصل ہوتا ہے۔ وجہ ظاہر ہے۔ جو بچہ انگلستان سے فرانس میں منتقل ہو گا، وہ فرانسیسی زبان میں پڑھائے جانے والے الجبرا اور علم کیمیا کو کافی دیر تک سمجھ نہیں سکے گا البتہ فرانسیسی زبان میں وہ چند ہفتوں میں ایسی دستگاہ پیدا کر لے گا جو انگلستان میں رہتے ہوئے اسے

کئی سالوں میں بھی حاصل نہ ہوتی۔ اس کے باوجود اساتذہ کا اس بارے میں اتفاق ہے کہ غیر ملکی سیاحت بچوں کو عام سوجھ بوجھ اور ان کی مجموعی شخصیت کو بہت ترقی دیتی ہے، ریاضی اور سائنس کے مضامین میں جو تھوڑی بہت کمی بھی پیدا ہو جاتی ہے، وہ اسے بہت جلد پورا کر لیتے ہیں۔

بین الاقوامی کیمپ

بچوں کے تبادلے کے تعلیمی فوائد قطعی طور پر ناقابلِ انکار ہیں۔ لیکن بھائی چاروں کی سکیم کے باوجود اس قسم کے تبادلے ایک محدود دائرے کے اندر ہی رہ سکتے ہیں، ان میں حصہ لینے والے بچوں اور استادوں کی تعداد لازمی طور پر محدود رہتی ہے۔ لہٰذا طلبہ کے تبادلے کا ایک مفید بدل نکالا گیا ہے اور وہ بدل ہے بین الاقوامی کیمپ یہ کیمپ لمبی چھٹیوں میں قائم کیے جاتے ہیں۔ برطانیہ، فرانس، اور جرمنی میں اب یہ کیمپ باقاعدگی کے ساتھ قائم ہونے لگے ہیں۔ بعض اوقات ان کا انعقاد دوسرے یورپی ملکوں میں بھی ہو جاتا ہے۔ ان کیمپوں میں مختلف قوموں کے بچے جمع ہوتے اور کچھ ہفتے ایک ساتھ گذارتے ہیں۔ عموماً وہ باہم مل کر کوئی تعلیمی منصوبہ بھی پایۂ تکمیل کو پہنچاتے ہیں۔ اس طرح مختلف قوموں کے درمیان اشتراکِ عمل کا جذبہ پرورش پاتا ہے۔

مہم جوئی اور خطر پسندی کی تربیت

سب سے آخر میں سیاحت کی اس قسم کا ذکر مناسب ہوگا، جو ابھی زیادہ عام نہیں، لیکن جس کا مقصد مہم جوئی اور خطر پسندی کے اس جذبے کو زندہ رکھنا ہے جس نے مغرب کو اس کی ترقی کا موجودہ معراج عطا کیا ہے، اس قسم کی تعلیمی سیاحت کی بہترین مثال واٹ فورڈ گرامر سکول نے پیش کی ہے۔ یہ مدرسہ لندن کے شمال میں واقع ہے۔ سنہ ۱۹۵۳ء اور سنہ ۱۹۵۴ء میں اس مدرسے کے لڑکوں نے ٹرک کے ذریعہ یورپ کی سیاحت کی، انہوں نے کوئی چار پانچ ہفتوں میں یورپ کا سفر ختم کیا، اور اس سارے عرصے میں ان کا گھر صرف ایک ٹرک اور چند خیمے تھے۔ سیاحوں کی اس جماعت میں سے ایک نوجوان سیاح نے مدرسے کے رسالے میں اپنے سفر کی حقیقت ان الفاظ میں بیان کی:-

> اٹھارھویں صدی میں یہ دستور تھا کہ ہر صاحبِ حیثیت شریف آدمی سارے یورپ کا دورہ کیا کرتا تھا۔ عرصہ ہوا کہ وقت اور روپے کی کمی کے باعث یہ رواج ختم ہو گیا۔ لیکن موجودہ زمانہ شرفاء کی بجائے عوام کے اقتدار کا زمانہ ہے۔ اس زمانے میں ایک گرامر سکول کے عام لڑکوں نے

ایک منظر دکت میں یورپ کا چکر لگایا ہے۔ اس پر جو لاگت آئی ہے وہ عام آدمی کی حیثیت سے
باہر ہیں اور سفر کا دور یک طرفہ تھا جو ایک جمہوری ذریعہ ہے۔"

برٹش سکولز ایکسپلورنگ سوسائٹی

سب سے زیادہ خوش نصیب اور رشک سے دیکھے جانے والے نوجوان سیاح وہ ساٹھ یا ستر برطانوی لڑکے ہوتے ہیں جو ہر سال برطانوی مدرسوں سے اس غرض سے چنے جاتے ہیں کہ وہ برٹش سکولز ایکسپلورنگ سوسائٹی کی کسی مہم میں شریک ہوں۔ اس انجمن کی بنیاد ۱۹۳۲ء میں سرجورج مرے لیوک نے رکھی تھی۔ سکاٹ جنوبی قطب کو جو آخری مہم لے گیا تھا لیوک اس کا ایک رکن تھا۔ اس نے یہ انجمن اس غرض سے قائم کی تھی کہ برطانوی نوجوانوں میں خود اعتمادی قوت برداشت اور خطر پسندی کی صفات کو ترقی دی جائے۔

اب تک یہ انجمن برطانوی نوجوانوں کو پندرہ ایسی مہموں پر لے جا چکی ہے جو مفید سائنسی تحقیقات کے کام میں معروف تھیں۔ یہ مہمیں لیپ لینڈ آئس لینڈ شمالی ناروے۔ نافونڈلینڈ شمالی کوئیبک اور برٹش کولمبیا میں معروف کار تھیں۔

جو لڑکے ان مہموں میں حصہ لینے کے لیے چنے جاتے ہیں وہ مختلف مدرسوں اور مختلف قسم کے معاشرتی پس منظر سے آتے ہیں۔ ان کی نامزدگی مدرسے کے صدر معلموں کی طرف سے کی جاتی ہے۔ صدر معلم جس لڑکے کو اس قابل سمجھے کہ وہ بدنی اور ذہنی لحاظ سے مہم کے کام میں حصہ لینے کے لیے سب سے زیادہ موزوں ہے وہ اس کا نام انجمن کو بھیج دیتا ہے۔

برٹش سکولز ایکسپلورنگ سوسائٹی ایک پرائیویٹ ادارہ ہے۔ موجودہ گرانی نے اس انجمن کی راہ میں بہت سی دشواریاں پیدا کر دی ہیں۔ زمانہ قبل از جنگ کے مقابلے میں اب قیمتوں کی عام سطح چار یا پانچ گنا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اب ہر مہم پر پہلے سے چار پانچ گنا لاگت آتی ہے۔ برطانوی قوم اس حقیقت سے پوری طرح آگاہ ہے۔ اسے اس بات کا بھی شدید احساس ہے کہ یہ انجمن کتنی مفید قومی خدمت انجام دے رہی ہے اس احساس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہر سال جو لڑکے چنے جاتے ہیں۔ ان میں سے جن کے والدین مہم کے اخراجات خود ادا کرنے کے قابل ہوں۔ وہ اپنے بیٹے کے اخراجات خود برداشت کرتے ہیں۔ جو لڑکے اس قابل نہ ہوں ان کی تعداد ہمیشہ ایسے ہی

لڑکوں کی ہوتی ہے) ان کے اخراجات کے لیے عطیے وصول ہو جاتے ہیں۔

لامحدود وسعت

برطانوی مدرسوں کی تعلیمی سیاحتوں کا جو مختصر سا خاکہ اوپر دیا گیا ہے اس سے یہ بات بالکل صاف نظر آتی ہے کہ مدرسے کے اردگرد گھومنے پھرنے اور مشاہدہ کرنے سے لے کر پُرخطر مہموں اور سنجیدہ قسم کی علمی تحقیق میں سے کوئی چیز ایسی نہیں جو تعلیمی سیاحتوں کے دائرے میں نہ آجاتی ہو۔ چاند کے سفر کو چھوڑ کر باقی شاید ہی کوئی ایسا سفر ہو جو اب تک برطانوی مدرسوں کے طلبہ نے اختیار نہ کیا ہو تعلیمی سیاحت کا یہ وسیع مفہوم حیرت انگیز بھی ہے اور سبق آموز بھی۔ مدرسے کے ذمّہ اہم ترین فرض یہ ہوا کرتا ہے کہ وہ قومی عظمت کی پرانی روایات کو برقرار رکھے اور جدید تقاضوں کی روشنی میں قومی سربلندی کی نئی نئی راہیں تلاش کرے۔ برطانیہ کی موجودہ عظمت کا بہت کچھ دارومدار اس کے سیاحوں اور محققوں کی ہمت، استقلال اور خطرپسندی پر ہے۔ برطانیہ نے طرح طرح کے سیاحتی پروگراموں کی مدد سے اس بات کا اہتمام کیا ہے کہ یہ بلند قومی اوصاف معدوم نہ ہونے پائیں۔

ہمارے لیے سبق

برطانوی مدرسوں کے سیاحتی کارناموں سے ہم بہت کچھ سیکھ سکتے ہیں، ان پروگراموں کے متعلق سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ یہ پورے طور پر قابلِ عمل بھی ہیں اور بالکفایت بھی۔ انگریز قوم اپنی ہوشمندی کے طفیل اپنے محدود ذرائع سے وہ خدمت لے رہی ہے جو دوسروں کو خطیر رقمیں خرچ کیے بغیر میسر نہیں آتی۔ برطانیہ کی یہ مثال پسماندہ ملکوں کے لیے بہت کارآمد ثابت ہو سکتی ہے۔

آج پاکستان کی پہلی ضرورت دوسرے ملکوں کے ساتھ برادرانہ مراسم قائم کرنا نہیں بلکہ خود ملک کے مختلف حصوں کے درمیان محبت کے رشتے استوار کرنا۔ علاقائی اور صوبائی تنگ نظری کے جو مظاہرے قدم قدم پر دکھائی دیتے ہیں وہ یقیناً ہر سچے محبِ وطن کے لیے سب سے بڑی ذہنی اذیت کا باعث ہوتے ہیں۔ اس قومی مرض کو جو ہماری عظمت کو گھن کی طرح کھائے جا رہا ہے، دور کرنے کی اس سے بہتر تدبیر اور کوئی نہیں کہ ملک کے پڑھے لکھے طبقے کے درمیان ایک دوسرے کا بہتر فہم پیدا کیا جائے۔ ملک کے مختلف حصوں کے درمیان طلبہ اور اساتذہ کا تبادلہ اس سمت میں سب سے مؤثر قدم ثابت ہو سکتا ہے۔

پاکستان کے مختلف حصوں میں لمبی چھٹیاں مختلف اوقات میں ہوتی ہیں۔ یہ چیز اساتذہ اور طلبہ کے باہمی تبادلہ میں بڑی سہولت پیدا کر سکتی ہے۔ مغربی اور مشرقی پاکستان کے جغرافیائی بُعد نے جو نازک ملکی مسائل پیدا کر رکھے ہیں ان سے کون بے خبر ہے! اس جغرافیائی بُعد کا توڑ اگر کوئی چیز ہو سکتی ہے تو وہ ذہنی قرب ہے، اور طلبہ کا وسیع پیمانے پر تبادلہ اس قرب کی سب سے آسان اور سب سے مؤثر صورت ہے۔ یہ تبادلہ تعلیمی نظام کی ہر سطح پر ہونا چاہیے۔ مدرسہ کی سطح پر بھی اور کالج اور یونیورسٹی کی سطح پر بھی اگر ہماری وزارت تعلیم مختلف علاقوں کے مدرسوں کے درمیان اسی قسم کا ایک بھائی چارہ قائم کر دے، جو برطانیہ اور فرانس کے مدرسوں کے درمیان قائم ہے تو وہ ایک اہم تعلیمی اور قومی خدمت انجام دے۔

(ترجمہ)

ــدید فنِ تدریس کے
بُنیادی
ظریات اور مسائل

مد سلیم کیانی

یہ ایک جانی پہچانی حقیقت ہے کہ انسان تنوع پسند ہے۔ کسی ایک ہی چیز سے وہ زیادہ لمبے عرصے
ـب چھٹکارہ نہیں سکتا۔ بلکہ نئی نئی چیزوں کی تلاش میں رہتا ہے۔ نئے خیالات۔ نئی عادات و اطوار اور ہر نیا طریقۂ
ندگی۔ انسان کی توجہ کو کسی نہ کسی حد تک ضرور اپنی طرف مبذول کراتے رہتے ہیں۔ مگر اس کے باوجود یہ ضروری نہیں
جس چیز یا جس طریقہ کو انسان "نیا" سمجھے وہ فی الواقع ایسا ہی ہو۔ کیوں کہ اکثر ایسا ہوا ہے کہ کسی طریقے کو نیا
سمجھ کر انسان نے اپنایا۔ مگر تاریخ کی ورق گردانی سے اسے معلوم ہوا کہ یہی طریقہ انسانیت پہلے بھی کئی بار اختیار کر
لی ہے۔ یہ بات جس طرح زندگی کے دوسرے شعبوں کے متعلق صحیح ہے، اسی طرح تعلیم کے میدان میں بھی اسکی
د فرمائی نظر آتی ہے۔ انسانی تاریخ کا اگر ذرا گہرا مطالعہ کیا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ کسی چیز کا جدید یا قدیم ہونا محض
نسانی اصطلاحات ہیں، اس لحاظ سے ایک ہی چیز قدیم ترین دور میں ظاہر ہو چکنے کے باوجود "جدید ترین"
بھی ہو سکتی ہے۔ ایک قدیم کلاسکی شاہکار کو ہر نئے دور سے روشناس کرانے کے لیے اس کے ایک نئے
جمے کی ضرورت ہوتی ہے، ورنہ اس نئے دور کے لوگ اس شاہکار کی صحیح قدر و قیمت کا اندازہ لگانے سے
محروم جاتے ہیں، ٹھیک یہی حال تعلیم کا ہے۔ جدید تعلیمی نظریات ان معنوں میں جدید نہیں ہیں کہ انسانیت
نے انہیں پہلی مرتبہ جانا ہے۔ بلکہ ان نظریات کی یہ "جدیدیت" نئے دور کے تقاضوں سے زیادہ سے زیادہ
ہم آہنگ ہونے کی صلاحیت کی بدولت ہے۔ نئی تعلیمی تحریکات زندگی میں ولولہ اور تازہ جوش پیدا کرتی ہیں
ور اسی وجہ سے ان کی اصلی قدر و قیمت ہے۔ پرانی اقدارِ حیات میں سے جنم لینے کی بدولت یا زیادہ صحیح
لفاظ میں انہی نظریات کے ظہور کی نئی صورت ہونے کے لحاظ سے نئے نظریات تعلیم، قدیم اقدار
کے لیے کسی قسم کے خطرے کا باعث نہیں ہو سکتے۔ ہمیشہ ایسا ہی ہوتا رہا ہے کہ کوئی نیا طریق تعلیم پیش ہوا

اس پر تنقید ہوئی جو آخر کار انسانیت کو علم کے نئے نئے راستے سمجھانے کا بہترین ذریعہ ثابت ہوئی۔ انسانی تاریخ میں مختلف تعلیمی نظریات اور طریق تدریس کی تکرار اس قدر زیادہ نظر آتی ہے کہ جدید ترین نظریات کو بھی "جدید" کہتے ہوئے ڈر لگتا ہے کہ کہیں کوئی مورخ قدیم ادوار میں بھی ان کا وجود ثابت نہ کر دے۔

تعلیم میں اب تک جو ارتقا ہوا ہے وہ تمام تر ان مٹھی بھر لوگوں کی وجہ سے ہوا ہے جنھوں نے ہر قسم کی مشکلات کے باوجود اس کام کے لیے اپنی زندگیاں وقف کر دیں اور جو ہر دور میں پائے جاتے رہے ہیں۔ موجودہ دور کی تعلیم کو ملک کی عام آبادی کے لیے عام اور سستا بنانے کا فیصلہ کیا گیا، اور انگلستان میں سنہ ۱۸۷۰ء کے ایجوکیشن ایکٹ کی رو سے ابتدائی تعلیم کو تمام آبادی کے لیے لازمی قرار دے دیا گیا، اور مدرسوں اور درسگاہوں میں طلبہ کی تعداد پہلے سے بڑھ گئی۔ اس بڑھتی ہوئی تعداد کے لیے تربیت یافتہ اساتذہ کی مانگ بھی بڑھتی گئی۔ یہیں سے طریق تدریس کی اصلاح کا خیال پیدا ہوا، اور اسی مقصد کے لیے تربیت اساتذہ کے لیے کئی ایک تربیتی ادارے قائم ہوئے۔ ڈاکٹر آر۔ آسٹن فری مین اپنی کتاب "اجتماعی انتشار اور ہیئت جدید" میں لکھتے ہیں کہ مشین کی ایجاد نے ہر شعبۂ زندگی میں ہونے والی تبدیلیوں کی رفتار کو پہلے سے کئی گنا بڑھا دیا۔ عوامی تعلیم "یا تعلیم برائے عوام" کا نظریہ اسی حقیقی انقلاب کا ایک بالواسطہ نتیجہ تھا۔ تعلیم برائے عوام کے اس جدید نظریے نے قدیم طریق تدریس میں گہری تبدیلیاں پیدا کیں، اور ان کو نئی قوت، نئی صورت اور نئی صلاحیت سے روشناس کیا۔

تعلیم کے زیادہ سے زیادہ عام ہو جانے کے بعد مدرسوں میں جوں جوں طلبہ کی تعداد بڑھتی گئی۔ اسی لحاظ سے ان بچوں کا خالص انسانی نقطۂ نظر سے مطالعہ ناگزیر ہوتا گیا۔ طلبہ کی بڑھتی ہوئی تعداد کو قابو میں رکھنا خاص اہم ثابت ہوا۔ اور ضرورت محسوس کی جانے لگی کہ اساتذہ کو اپنی جماعت کو قابو میں رکھنے کی خاص طور پر تربیت دی جائے یہی وجہ ہے کہ اس دور کے تربیتی اداروں کی زیادہ تر کوشش یہ ہوتی تھی کہ آسان سے آسان طریقے سے اور کم سے کم مدت میں ایسے اساتذہ تیار کر دیے جائیں جو کلاس کو کنٹرول کر سکتے ہوں۔ اس سے قبل ایک کامیاب معلم کے لیے اپنے مخصوص مضمون کا علم رکھنا ہی کافی سمجھا جاتا تھا۔ کبھی کبھی طبعی زندہ دلی کو ایک اچھے معلم کی خصوصیات میں شامل کر لیا جاتا، مگر جماعت پر کنٹرول کرنے کی صلاحیت اور اپنے مضمون کی سائنٹفک تیاری کو چنداں اہمیت اس سے پہلے شاید کبھی نہیں دی گئی۔ اساتذہ کو اس طرز پر تربیت دینے سے ان کے دو گروہ بن گئے۔ پہلی قسم کے

(ترجمہ)

جدید فنِ تدریس کے بنیادی نظریات اور مسائل

محمد سلیم کیانی

یہ ایک جانی پہچانی حقیقت ہے کہ انسان تنوع پسند ہے۔ کسی ایک ہی چیز سے وہ زیادہ لمبے عرصے تک چپکا رہ نہیں سکتا۔ بلکہ نئی نئی چیزوں کی تلاش میں رہتا ہے۔ نئے خیالات۔ نئی عادات و اطوار اور ہر نیا طریقۂ زندگی۔ انسان کی توجہ کو کسی نہ کسی حد تک ضرور اپنی طرف مبذول کراتے رہتے ہیں۔ مگر اس کے باوجود یہ ضروری نہیں کہ جس چیز یا جس طریقہ کو انسان "نیا" سمجھے وہ فی الواقع ایسا ہی ہو۔ کیونکہ اکثر ایسا ہوا ہے کہ کسی طریقے کو نیا سمجھ کر انسان نے اپنایا۔ مگر تاریخ کی ورق گردانی سے اسے معلوم ہوا کہ یہی طریقہ انسانیت پہلے بھی کئی بار اختیار کر چکی ہے۔ یہ بات جس طرح زندگی کے دوسرے شعبوں کے متعلق صحیح ہے، اسی طرح تعلیم کے میدان میں بھی اسکی کارفرمائی نظر آتی ہے۔ انسانی تاریخ کا اگر ذرا گہرا مطالعہ کیا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ کسی چیز کا جدید یا قدیم ہونا محض انسانی اصطلاحات ہیں، اس لحاظ سے ایک ہی چیز قدیم ترین دور میں ظاہر ہو چکنے کے باوجود "جدید ترین" بھی ہو سکتی ہے۔ ایک قدیم کلاسکی شاہکار کو ہر نئے دور سے روشناس کرانے کے لیے اس کے ایک نئے ترجمے کی ضرورت ہوتی ہے، ورنہ اس نئے دور کے لوگ اس شاہکار کی صحیح قدر و قیمت کا اندازہ لگانے سے قاصر رہ جاتے ہیں، ٹھیک یہی حال تعلیم کا ہے۔ جدید تعلیمی نظریات ان معنوں میں جدید نہیں ہیں کہ انسانیت نے انہیں پہلی مرتبہ جانا ہے۔ بلکہ ان نظریات کی یہ "جدیدیت" نئے دور کے تقاضوں سے زیادہ سے زیادہ ہم آہنگ ہونے کی صلاحیت کی بدولت ہے۔ نئی تعلیمی تحریکات زندگی میں ولولہ اور تازہ جوش پیدا کرتی ہیں اور اسی وجہ سے ان کی اصلی قدر و قیمت ہے۔ پرانی اقدارِ حیات میں سے جنم لینے کی بدولت یا زیادہ صحیح الفاظ میں انہی نظریات کے ظہور کی نئی صورت ہونے کے لحاظ سے نئے نظریاتِ تعلیم، قدیم اقدار کے لیے کسی قسم کے خطرے کا باعث نہیں ہو سکتے۔ ہمیشہ ایسا ہی ہوتا رہا ہے کہ کوئی نیا طریقِ تعلیم پیش ہوا

اس پر تنقید ہوئی جو بالآخر انسانیت کو علم کے نئے نئے راستے سمجھانے کا بہترین ذریعہ ثابت ہوئی۔ انسانی تاریخ میں مختلف تعلیمی نظریات اور طریقِ تدریس کی تکرار اس قدر زیادہ نظر آتی ہے کہ جدید ترین نظریات کو بھی "جدید" کہتے ہوئے ڈر لگتا ہے کہ کہیں کوئی مؤرخ قدیم ادوار میں بھی ان کا وجود ثابت نہ کر دے۔

تعلیم میں اب تک جو ارتقا ہوا ہے وہ تمام تر ان مٹھی بھر لوگوں کی وجہ سے ہوا ہے جنھوں نے ہر قسم کی مشکلات کے باوجود اس کام کے لیے اپنی زندگیاں وقف کر دیں اور جو ہر دور میں پائے جاتے رہے ہیں۔ موجودہ دور کی تعلیم کو ملک کی عام آبادی کے لیے عام اور سستا بنانے کا فیصلہ کیا گیا، اور انگلستان میں سنہ ۱۸۷۰ء کے ایجوکیشن ایکٹ کی رو سے ابتدائی تعلیم کو تمام آبادی کے لیے لازمی قرار دے دیا گیا، اور مدرسوں اور درس گاہوں میں طلبہ کی تعداد پہلے سے بڑھ گئی۔ اس بڑھتی ہوئی تعداد کے لیے تربیت یافتہ اساتذہ کی مانگ بھی بڑھتی گئی یہیں سے طریقِ تدریس کی اصلاح کا خیال پیدا ہوا، اور اسی مقصد کے لیے تربیتِ اساتذہ کے لیے کئی ایک تربیتی ادارے قائم ہوئے۔ ڈاکٹر آر۔ آسٹن فری مین اپنی کتاب "اجتماعی انتشار اور ہیئت جدید" میں لکھتے ہیں کہ مشین کی ایجاد نے ہر شعبۂ زندگی میں ہونے والی تبدیلیوں کی رفتار کو پہلے سے کئی گنا بڑھا دیا۔ عوامی تعلیم یا "تعلیم برائے عوام" کا نظریہ اسی حقیقی انقلاب کا ایک بالواسطہ نتیجہ تھا۔ تعلیم برائے عوام کے اس جدید نظریے نے قدیم طریقِ تدریس میں گہری تبدیلیاں پیدا کیں، اور ان کو نئی قوت، نئی صورت اور نئی صلاحیت سے روشناس کیا۔

تعلیم کے زیادہ سے زیادہ عام ہو جانے کے بعد مدرسوں میں جوں جوں طلبہ کی تعداد بڑھتی گئی۔ اسی لحاظ سے ان بچوں کا خالص انسانی نقطۂ نظر سے مطالعہ ناگزیر ہوتا گیا۔ طلبہ کی بڑھتی ہوئی تعداد کو قابو میں رکھنا خاص اہم ثابت ہوا۔ اور ضرورت محسوس کی جانے لگی کہ اساتذہ کو اپنی جماعت کو قابو میں رکھنے کی خاص طور پر تربیت دی جائے یہی وجہ ہے کہ اس دور کے تربیتی اداروں کی زیادہ تر کوشش یہ ہوتی تھی کہ آسان سے آسان طریقے سے اور کم سے کم مدت میں ایسے اساتذہ تیار کر دیے جائیں جو کلاس کو کنٹرول کر سکتے ہوں۔ اس سے قبل ایک کامیاب معلم کے لیے اپنے مخصوص مضمون کا علم رکھنا ہی کافی سمجھا جاتا تھا۔ کبھی کبھی طبعی زندہ دلی کو ایک اچھے معلم کی خصوصیات میں شامل کر لیا جاتا، مگر جماعت پر کنٹرول کرنے کی صلاحیت اور اپنے مضمون کی سائنٹیفک تیاری کو چنداں اہمیت اس سے پہلے شاید کبھی نہیں دی گئی۔ اساتذہ کو اس طرز پر تربیت دینے سے ان کے دو گروہ بن گئے۔ پہلی قسم کے

ساتذہ جو پبلک اور سیکنڈری سکولوں میں پڑھاتے تھے۔ یہ لوگ طریقِ تدریس کا کوئی علم نہ رکھتے تھے۔ مگر اس کے وجود اکثر اوقات اپنی اس لاعلمی پر یہ لوگ فخر کیا کرتے تھے۔ دوسری قسم کے اساتذہ پرائمری اور ابتدائی مدرسوں میں پڑھاتے تھے، اور طریقِ تدریس کے بڑے ماہر ہوا کرتے تھے۔ مگر اپنے محدود علم کی بدولت یہ لوگ سیکنڈری سکولوں میں پڑھانے والے اساتذہ کے مذاق کا نشانہ بنتے رہتے تھے۔ مگر جوں جوں علمی بیداری پھیلتی گئی عوام زیادہ سے زیادہ تربیت یافتہ اساتذہ کا تقاضہ کرنے لگے، اس عوامی تقاضے کے نتیجے کے طور پر طریقِ تدریس کی تعلیم دینے کے لیے یونیورسٹیوں میں باقاعدہ پروفیسروں کا تقرر کیا گیا، اور آئندہ کے لیے پبلک اور سیکنڈری سکولوں میں بھی تربیت یافتہ اساتذہ کو ترجیح دی جانے لگی۔

تدریسی طریقوں میں اب تک جو کچھ اصلاح ہوئی ہے اس میں شک نہیں کہ بیرونی عوامل کا بھی بہت بڑا حصّہ رہا ہے۔ مگر ان تمام اصلاحات میں جو شخصیت ہمیشہ بنیادی اہمیت کی حامل رہی ہے وہ معلم ہے۔ کوئی تعلیمی انقلاب اس وقت تک ادھورا رہتا ہے، جب تک اساتذہ اس کا ساتھ نہ دیں، کوئی بھی تعلیمی اصلاح بالجبر کہیں باہر سے لا کر تعلیمی نظام پر ٹھونسی نہیں جا سکتی۔ ہر کامیاب اصلاح کے لیے معلم کا دلی تعاون حاصل کرنا ناگزیر ہے۔ اسی سلسلے میں اصلاح کے علمبرداروں کو یہ بات بھی یاد رکھنی چاہیے کہ انسان کی فکری زندگی میں مختلف نظریات کا ابھرنا اور مٹنا ایک ایسا عمل ہے جو ہمیشہ سے ہر تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد ظہور پذیر ہوتا رہا ہے۔ علم طب جن لوگوں نے پڑھا ہے وہ جانتے ہیں کہ کس طرح علاج کے مختلف طریقے مختلف زمانوں میں ظاہر ہوئے اور قبول عام حاصل کرنے میں کامیاب بھی ہوئے، مگر پھر اچانک غائب ہو گئے اور کسی بعد کے دور میں کچھ تھوڑی سی ترمیمات کے بعد پھر ظہور پذیر ہو گئے۔ یہی حال تعلیمی نظریات کا نظر آتا ہے۔ مگر تعلیمی نظریات کے بار بار مٹ کر بار بار ظاہر ہونے کے نتیجے کے طور پر اگر تعلیمی تحریک میں کوئی ترقی نظر نہ آئے تو اس "نظریاتی اعادے" کا کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔ ہر نئی ظاہر ہونے والی تعلیمی لہر اگر پچھلی لہروں سے زیادہ اونچی نہیں اٹھتی تو تعلیمی تحریک کی پیش قدمی اور ترقی بے معنی ہو کر رہ جاتی ہے۔ لیکن یہ بہر حال حقیقت ہے کہ تمام موجودہ تعلیمی منصوبے اور تدریسی طریقے بنیادی طور پر ایک دوسرے سے گہرا رابطہ رکھتے ہیں۔ یہ کہنا سخت غلطی ہو گی کہ جدید نظریاتِ تعلیم آپس میں ایک دوسرے سے بالکل علیحدہ ہیں اور ان میں کوئی مشترک قدر نہیں ہے۔ اس کے برعکس جدید نظریاتِ تعلیم

ایک دوسرے سے بالکل علیحدہ ہیں اور ان میں کوئی مشترک قدر نہیں ہے۔ اس کے برعکس جدید نظریات تعلیم آپس میں کچھ اس طرح سے ملے جلے ہیں کہ ایک کا خیال کرتے ہی خود بخود دوسرے کا خیال آتا ہے۔ اس لحاظ سے ان مختلف تعلیمی نظریات میں ایک ایسی طبعی وحدت اور مشترک قدر پائی جاتی ہے جو ان مختلف النوع نظریات کو ایک ہی لڑی میں پرو دیتی ہے۔

مختلف تعلیمی نظریات میں مشترک پائے جانے والے اس اصول کی تلاش اس رجحان میں کرنی چاہیے جو صدیوں سے ارتقا کرتا آرہا ہے۔ یہ مشترک قدر کہیں سے اچانک ہی نہیں ابھرتی بلکہ اس کا ارتقا سالہا سال کے انسانی تجربات کا مرہون منت ہے۔ ایڈنبرگ اکیڈیمی کی شائع کردہ لاطینی زبان کی گرائمر کا مطالعہ کرتے ہوئے ایک دن اچانک مجھے اس مشترک اصول سے آگاہی ہوئی۔ اس گرائمر میں لکھا تھا:۔

"تدریس کے تول کے لیے دو چیزیں ضروری ہیں ایک فرد اور دوسرے وہ چیز جس پر یہ فعل کیا جائے مثلاً ماسٹر نے جان کو لاطینی پڑھائی"۔ یعنی تعلیم کا اساسی تصور جان (شاگرد) اور لاطینی (مضمون یا علم) کے ملنے سے وجود پاتا ہے۔ یہ جس طرح پرانی تعلیم کے متعلق صحیح ہے۔ اسی طرح "جدید تعلیم" کے متعلق بھی صحیح ہے جدید اور قدیم تعلیم میں اگر فرق ہے تو صرف اتنا کہ قدیم تعلیم میں زیادہ زور لاطینی کے سیکھنے یعنی حصول علم پر دیا جاتا تھا۔ اور جان (شاگرد) کی شخصیت کو بالکل نظر انداز کر دیا جاتا تھا۔ مگر جدید تعلیم میں جان کی شخصیت کا ارتقاء مرکزی اہمیت رکھتا ہے۔ یہی وہ محور ہے جس پر جدید تعلیم کا سارا نظام گھومتا ہے۔ جدید تعلیم میں استاد جان کو نظر انداز کر سکتا ہے اور نہ لاطینی کو، بلکہ وہ چاہتا ہے کہ ان دونوں کے درمیان ایک ایسا صحیح توازن پیدا ہو جو ان کو پہلو بہ پہلو ترقی دے سکے۔ جدید تعلیم میں مرکز توجہ لاطینی یا کوئی اور کسی قسم کا علم نہیں بلکہ شاگرد کی شخصیت ہے۔ اور ہر علم جس جس حد تک بچے کی شخصیت کے ارتقاء میں مدد و معاون ثابت ہوتا ہے، اسی نسبت سے اس کی قدر و قیمت معین ہوتی ہے۔ یہی اصول جدید تعلیمی نظریات میں مشترک پایا جاتا ہے۔

جو لوگ تعلیم کی گذشتہ تاریخ سے واقف ہیں وہ جانتے ہیں کہ مشترک اصول کا پیش کردہ تخیل کوئی نئی چیز ہرگز نہیں ہے۔ آج سے کئی سو سال پہلے فرانس کا مایۂ ناز مفکر روسو یہی تخیل اپنی کتاب "ایمائیل" (EMAIL) میں پیش کر چکا ہے۔ اور اس لحاظ سے وہی اس خیال کا اصل بانی (بجا طور پر) کہلا سکتا ہے۔

تھا ایمائیل اپنے خالق (روسو) کی بہترین تخلیق ہے۔ روسو اس نتیجے کی تعلیم کو فطرت کے ساتھ زیادہ سے زیادہ مطابق بنانے کا پرجوش داعی [redacted] اس کے نزدیک یہ تعلیم کے پیشروں سے کہیں زیادہ اہمیت کا حامل تھا۔ چناں چہ روسو کو ہم بجا طور پر تمام ایسے ماہرین تعلیم کا پیش رو کہہ سکتے ہیں جو اپنی توجہات کا مرکز بچے کو بناتے ہیں۔ مگر اس سلسلے میں یہ بات غور کرنے کی ہے کہ اتنی سی حقیقت تک دوبارہ پہنچنے کے لیے انسانیت کو [redacted] ۱۷۶۲ء (جب ایمیل پہلی بار شائع ہوئی) سے اب تک کا وقت لگا ہے۔ اس نئے نظریہ تعلیم کے لیے اب تک جتنے نام تجویز کیے گئے ہیں ان میں ڈاکٹر سٹینلے ہال کا تجویز کردہ نام سب سے زیادہ موزوں ہے ڈاکٹر سٹینلے نے اس نظریے کا نام رکھا ہے۔ چناں چہ جدید تعلیم کا یہ اہم ترین نظریہ آج اسی نام سے موسوم ہے۔ مونٹی سوری طریقۂ تدریس ہو یا ڈالٹن پلان تعلیم بذریعہ کھیل کا طریقہ ہو۔ یا پروجیکٹ طریقۂ تدریس۔ تمام کے تمام جدید تدریسی طریقوں میں بچے کی شخصیت کے ارتقا کا یہ اساسی نظریہ کام کرتا نظر آتا ہے۔ اس جدید رجحان کا نتیجہ ہے کہ بیسویں صدی بچوں کی صدی کہی جانے لگی ہے۔ اس سے قبل انیسویں صدی کے متعلق بھی بعض لوگوں نے اس قسم کا دعویٰ کیا تھا۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ عالم گیر جنگ نے اس نظریے کو سب سے بڑھ چڑھ کر فروغ دیا۔ اس جنگ کی تباہی کو دیکھ کر انسان میں کمزوروں کے لیے رحم و شفقت کے جذبات ابھرے۔ جنھوں نے چھوٹے چھوٹے بچوں کی حفاظت کے لیے مختلف قسم کے سکولوں کو بھی متاثر کیا ہے۔ چناں چہ اب اکثر اس قسم کے خیالات سننے میں آتے ہیں:-

"نفسیاتی امتحانات کا مقصد بچے کی کمزوریوں کو معلوم کر کے انھیں دور کرنا ہے۔ اس طرح سے بچہ ہی تمام سرگرمیوں کا مقصد و مرکز بن جاتا ہے۔ اب مدرسے کے ضابطے اہم نہیں ہیں، بلکہ اصل اہمیت ان بچوں کی ہے جو اس میں تعلیم پاتے ہیں۔ اس طرح نفسیاتی امتحانات کے استعمال میں بھی یہ امر ایک حقیقت بن چکا ہے کہ بچہ ہی تمام توجہات کا اصل مرکز ہے جو یہ ظاہر کرنے کے لیے بالکل کافی ہے کہ خدمت کا جذبہ اور ترقی کی روح ہی جدید تعلیم کا سنگ بنیاد ہیں۔"

تعلیم کو بچے کی ضروریات سے ہم آہنگ کرنے کے لیے جو نیا رجحان ابھرتا نظر آتا ہے، وہ فرانس کی

جدید تعلیمی تحریک میں بھی نمایاں ہے۔ فرانس کی یہ تعلیمی تحریک جس چیز پر زیادہ زور دیتی ہے وہ یہ ہے کہ بچے کو وہی کچھ پڑھایا جائے جو اس کی آئندہ زندگی میں کام آنیوالا ہے۔ اکثر اوقات سکولوں میں کچھ پڑھایا جاتا ہے، اس کا بیشتر حصہ سکولوں کی چار دیواری سے نکلتے ہی بچے بھول جاتے ہیں، اور صرف ایک قلیل حصہ، جو دلچسپ اور اہم ہوتا ہے انھیں یاد رہ جاتا ہے۔ فرانس کی اس تعلیمی تحریک کے علم برداروں کے نزدیک یہی قلیل اور دلچسپ حصۂ معلومات دراصل اس قابل ہے کہ اسے سکولوں میں باقاعدہ بچوں میں پڑھایا جائے۔ اس طرح وقت بھی بچے گا اور بچے جو علم حاصل کریں گے وہ فی الواقع ان کے لیے مفید بھی ثابت ہو سکے گا۔ مگر اس تحریک کے بعض دانشمند سربراہ اس خیال کی مخالفت کرتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ تعلیم کے عمل میں استعمال ہونے والے مختلف عناصر، نصاب، متعلم و معلم کو باہم اس طرح مربوط کر دیا جائے کہ ان کے مجموعی امتزاج سے ایک ایسا نظام وجود میں آئے جو زندگی سے پوری طرح ہم آہنگ ہو۔ آج کل کی درس گاہوں میں مختلف مضامین جس طرح پڑھائے جاتے ہیں، اس سے ان کی طبعی وحدت کا احساس نہیں پیدا ہوتا، بلکہ طالب علم کو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جیسے یہ مختلف مضامین آپس میں کوئی قدر مشترک نہیں رکھتے۔ ان درس گاہوں میں پڑھانے والے اساتذہ اس بات کی کوئی فکر نہیں کرتے کہ اپنے طلبہ کے سامنے تدریسی مضامین کی کسی مشترک بنیاد کو پیش کریں۔ اس صورت حال پر تبصرہ کرتے ہوئے فرانس کے ایک مشہور و معروف ماہر تعلیم نے ایک دفعہ کہا تھا۔ "موجودہ تعلیم کو دیکھ کر یوں محسوس ہوتا ہے کہ جیسے استاد کی شخصیت کا ایک چھوٹا سا جزو متعلم کی شخصیت کے ایک نہایت ہی حقیر پہلو سے مخاطب ہے۔" فرانس کا یہ ماہر تعلیم آگے بڑھ کر بجا طور پر کہہ سکتا تھا کہ وہ معلم اور متعلم کسی مضمون کے ایک نہایت ہی حقیر پہلو سے بحث کرتے ہیں۔ اور اس کے ایک بہت بڑے اور اہم ترین حصے کو نظر انداز کر جاتے ہیں۔ فرانس کے یہ ماہرین تعلیم مختلف مضامین کی باہمی وحدت کے اس حد تک قائل ہیں کہ اب ان کے نزدیک نظام تعلیم کی اصلاح تمام تر نصاب تعلیم کے مضامین کے زیادہ سے زیادہ باہمی ربط پر منحصر ہو کر رہ گئی ہے۔ مگر ان ماہرین تعلیم میں ایسے لوگ بھی موجود ہیں جن کے نزدیک تعلیم کی اصلاح کے لیے نصاب تعلیم کے مضامین کا ربط ہی کافی نہیں۔ بلکہ تعلیم کے ہمہ گیر اور مسلسل عمل کی ایک طبعی وحدت بھی ناگزیر ضرورت ہے۔ ان ماہرین تعلیم کے نزدیک

درس گاہوں میں پڑھائے جانے والے مختلف مضامین کا زیادہ سے زیادہ اشتراک ہی اس مقصد کو حاصل نہیں کر سکتا۔ بلکہ اس کے لیے ضرورت ہے کہ درس گاہیں پڑھانے والے اساتذہ بھی ایک تعلیمی وحدت کا تصور رکھتے ہوں۔ جس پر ان کا اتفاق ہو تاکہ مختلف مضامین کا باہمی ربط صحیح معنوں میں درس گاہوں کے ماحول میں پھیل سکے اور ان کو ایک تعلیمی وحدت کی روح سے بھرپور کر دے۔

جدید تعلیم کا اہم ترین مسئلہ مضامین کی اس قدرتی وحدت کے تخیل کو عملی جامہ پہنانے کے لیے عملی طریقہ کار کی تلاش کا ہے۔ ایک ایسا طریقہ کار جس کی بدولت مختلف نوعیت کی تعلیمی قوتوں اور عوامل میں ہم آہنگی پیدا ہو سکے۔ جان ڈیوی کی کتاب "سکول اور معاشرہ"۔ اسی تحریک کے ایک پہلو کو ظاہر کرتی ہے جہاں ڈیوی کا نظریہ مختلف مضامین کا آمیزہ بنانے کی صورت میں نمودار ہو رہا ہے۔ موجودہ تعلیم کی پیدا کردہ پیچیدگیاں اور بے اطمینانی بڑھتی جا رہی ہے۔ جہاں جدید ماہر تعلیم کسی نہ کسی حد تک اس کی موافقت بھی کرتا ہے وہیں ان کی ترقی کے لیے کچھ تجاویز پیش کرنے پر مجبور ہوتا ہے۔ یہ رجحان جے۔ پی۔ سمز کی کتاب "تعلیم میں انسان کا عنصر" کے مندرجہ ذیل اقتباس سے بخوبی نمایاں ہے۔ یہ اقتباس سکولوں کی طرف سے ایک اپیل ہے جو والدین کے نام ہے۔"

چوں کہ ایک اوسط درجے کا مدرسہ ہمارے بیٹوں اور بیٹیوں کی صحت کو خراب کرنے کا باعث بنتا ہے اس لیے ہمیں چاہیے کہ زیادہ سے زیادہ اس صحت کے تحفظ کی طرف توجہ کریں۔ اس طرح موجودہ مدرسے میں چوں کہ بچے کا جسم، روح اور دماغ کمزور کھٹے ہو کر رہ جاتے ہیں، اس لیے ہمیں ان کی ترقی و افزائش کی فکر کرنی چاہیے، آج بھی ہمارے مدرسوں میں قدیم اور فرسودہ نظریۂ تقابل کی بنیاد پر بچے کی امتحان ہوتا ہے۔ اس لیے ہمیں چاہیے کہ ہم زیادہ سے زیادہ اور باہمی تعاون فرد معاشرے کے لیے اور معاشرہ فرد کے لیے کے اساسی نظریات کے حسن و خوبی پیدا کریں۔ پھر ہمارے مدرسوں میں چوں کہ زیادہ سے زیادہ توجہ ذہن کی نشوونما پر دی جاتی ہے۔ اس لیے ہمیں چاہیے کہ ہم زیادہ سے زیادہ جسم اور ہاتھوں کی مناسب اور ضروری نور و پرداخت کا انتظام کریں، وعلیٰ ہذا القیاس۔ یہ ماہیت ان لوگوں میں بھی اب پوری طرح نمایاں ہے جو تعلیم سے براہ راست متعلق ہیں۔ دوسرے لوگوں کے مقابلے میں ماہرین تعلیم کے اس ردعمل میں انقلابی رنگ

ہو چکا ہے۔ مسٹر کاڈویل کک اپنی کتاب تعلیم بذریعہ کھیل میں لکھتے ہیں:۔

"ہمارا نظام تعلیم جامد ہو کر رہ گیا ہے۔ اور تقاضوں کو پورا نہیں کر سکتا [illegible] ابھی اس میں نظر نہیں آتا۔ حالانکہ یہ نظام تعلیم و تنظیم تعلیم کی روح سے بھی خالی ہو چکا ہے۔ اس کے موجودہ ڈھانچے میں جزوی ترمیمات یا اضافوں سے کوئی اصلاح نہیں ہو سکتی اور اس طرح کی [illegible] کوئی اثر بھی پیدا نہیں کر سکتیں۔ اگر نظام تعلیم میں ہمیں واقعی کوئی اصلاح مطلوب ہے تو اس کے لیے ایک اجتماعی انقلاب ناگزیر ہے۔"

نظام تعلیم میں ہمہ گیر انقلاب کا یہ رجحان اب آہستہ آہستہ بہت زور پکڑ چکا ہے اور وہ دن دور نہیں جب پورے انگلستان میں اس کی فرمانروائی نظر آئے گی۔ مگر موجودہ حالات میں اس اصلاحی کوشش کے رستے میں جو سب سے بڑی رکاوٹ ہے وہ بیرونی امتحانات کی نوعیت ہے، جب تک یہ امتحانات اپنی موجودہ صورت میں باقی ہیں، یہ امید نہیں کی جا سکتی کہ ملکی تعلیم میں کوئی بڑی تبدیلی پیدا کرنے کی کوشش کامیاب ہو سکے گی، جن لوگوں نے مدرسوں اور دوسری درس گاہوں کی کارکردگی کا جائزہ لینے کے لیے فی نفسہٖ امتحان کوئی بُری چیز نہیں ہے۔ مگر اس قسم کے تمام امتحانات کو درس گاہ کے اصل کام، تدریس کا تابع ہونا چاہیے کیونکہ اس کے برعکس، درس و تدریس کے کام کو اگر امتحانات کے تابع کر دیا جائے تو تعلیم کی اصل روح ختم ہو کر رہ جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اب تک کی تمام اصلاحی جدوجہد کے باوجود بیرونی امتحانات کا پاس کرنا ہی سب درس گاہوں کا اصل مقصد بنا ہوا ہے جس کی وجہ سے ان تعلیمی اداروں کے نظام میں کوئی بنیادی تبدیلی نہیں کی جا سکی۔ اور آئندہ بھی جب تک بیرونی امتحانات کا یہ ہوّا ہماری ان درس گاہوں کے سروں پر سوار ہے تدریسی طریقوں میں کوئی اہم اور بنیادی اصلاح نہیں کی جا سکے گی۔ ہر اصلاحی اقدام کے راستے میں جو چیز بار بار ابھر کر سامنے آتی ہے، وہ یہی امتحانات ہیں۔

نظری بحث سے قطع نظر اتنی بات بہر حال ہمیں تسلیم کرنی پڑے گی کہ خالص عملی نقطۂ نگاہ سے اساتذہ کی کارکردگی کو جانچنے کے لیے کسی نہ کسی معیار کی ضرورت ہر حالت میں موجود رہتی ہے۔ ذرا غور سے دیکھنے سے تو معلوم ہو سکتا ہے کہ کسی استاد کی کامیابی یا ناکامی اس کے شاگردوں کے امتحانی نتائج پر ہی پرکھی جا سکتی ہے۔

مگر اس طرح کے کسی ہمہ گیر جائزے سے بھی شاگردوں کی آئندہ ناکامی یا کامیابی کا تجزیہ کر کے استاد کی کامیابی و ناکامی کو جانچنا بہت کٹھن بلکہ مثلاً قریب قریب محال ہے۔ اس صورت حال میں صرف امتحانات ہی ایک ایسی کسوٹی رہ جاتے ہیں، جن کے ذریعہ زیادہ سے زیادہ استاد کی کارکردگی کا جائزہ لیا جا سکتا ہے اور بس۔ انگلستان میں بسنے والی تاجر قوم اگر اس قسم کے امتحانات کا مطالبہ کرتی ہے تو چنداں تعجب خیز نہیں۔ کیوں کہ پیسوں کے صلے میں وہ کوئی ٹھوس مادی منافع چاہتی ہے۔ لو پیریڈ (LOWPERIOD) کے متنوں کے پیش نظر بھی افادی نظریہ تھا جس پر جب انھوں نے اپنے ہاں کے نظام تعلیم کو پرکھ کر دیکھا تو وہ سخت بودا نکلا۔ جب امتحانات کا عام طریقہ نتیجتہً سخت ناکام ہوا تو امتحانات کا جدید ترقی یافتہ طریقہ رائج کیا گیا، جو بڑی حد تک معقولیت پر مبنی ہے۔ بورڈ آف ایجوکیشن کے نقطۂ نظر میں بھی دریں اثنا نمایاں تبدیلی آئی ہے۔ چناں چہ اب اٹھارہ سال کی عمر میں سکول کی تعلیم سے فارغ التحصیل ہونے والے ایک اوسط طالب علم کے لیے صرف دو امتحانات لازمی رکھے گئے ہیں۔ مگر امتحانات کے کم ہو جانے کے باوجود استاد کی مکمل آزادی کا تصور ابھی تک شرمندۂ تعبیر نہیں ہو سکا میرے خیال میں تو کوئی بھی اچھا سکول اس چیز کی مخالفت نہیں کرے گا کہ اس کے نتائج کارکردگی کو کوئی بیرونی ادارہ پرکھے، بشرطیکہ اس قسم کے امتحانات کو (جیسا کہ اوپر عرض کیا جا چکا ہے) سکول کے اصل کام، درس و تدریس کے تابع رکھا جائے۔ ان امتحانات کی نوعیت ایسی ہونی چاہیے کہ جس کے ذریعہ درس گاہوں کی کارکردگی کا ٹھیک ٹھیک جائزہ لینے کے ساتھ ساتھ اساتذہ کو زیادہ سے زیادہ بہتر "عملی نتائج" پیدا کرنے کی غرض سے اپنی مرضیات کے مطابق موزوں ترین طریق تدریس کو اختیار کرنے کا حق بھی حاصل رہے۔

امتحانات کے اس موجودہ نظام میں تبدیلی لانے کی ایک زیادہ اغلب صورت یہ ہے کہ کوئی بیرونی ادارہ کسی سکول یا درس گاہ کی کارکردگی کا جائزہ لینے کے لیے رسمی امتحانات کے طریقہ کو چھوڑ کر معائنے کو معیار بنائے درس گاہ کے معائنے میں ذمہ دار افراد کا یہ فرض ہونا چاہیے کہ وہ دیکھیں کہ معاشرے کی مجموعی بہتری کے لیے ضروری مضامین کو اس درس گاہ میں باقاعدگی سے پڑھایا جاتا ہے یا نہیں۔ اس قسم کی درس گاہ کے فارغ التحصیل طلبہ کو بغیر کسی مزید امتحان کے یونیورسٹی میں اعلیٰ تعلیم کے لیے داخلہ لینے کی پوری پوری اجازت ہونی چاہیے۔ یا اگر وہ چاہیں تو کوئی سا اپنا پسندیدہ پیشہ انتخاب کر سکیں، جو طلبہ مدرسے کی تعلیم کے بعد کسی پیشے میں داخل ہونا

جائیں گے۔ انہیں لامحالہ اس پیشے کے لیے قابلیت کا ثبوت دینے کے لیے کسی نہ کسی درجے کا امتحان دینا پڑے گا کیوں کہ اس قسم کے امتحانات ہر حالت میں ایک ناگزیر ضرورت ہیں۔ مگر اس خاص پس منظر میں ان کی حیثیت محض صنعتی یا پیشوں کے امتحانات کی ہوگی، اور سکولوں میں پڑھائے جانے والے مضامین کے سلسلے میں امتحانات کی موجودہ صورت ختم ہو کر رہ جائے گی جس کی بدولت اساتذہ کے سامنے سے وہ تمام عملی مشکلات ہٹ جائیں گی، جو اس وقت نظام تعلیم میں کوئی اہم اور بنیادی تبدیلی لانے کی راہ میں حائل ہیں مگر اس سلسلے میں یہ خیال کرنا سخت غلطی ہوگی کہ بیرونی امتحانات کی رکاوٹ کے دور ہوتے ہی طریق تدریس یکسر بدل کر رہ جائیں گے، اس لیے پرانے تدریسی طریقوں سے دلچسپی رکھنے والے اساتذہ کو یہ ڈر دل سے نکال دینا چاہیے کہ آئندہ کے کسی تعلیمی انقلاب میں ان کے محبوب اور پسندیدہ طریق تعلیم ختم ہو جائیں گے ان تمام باتوں کے باوجود یہ حقیقت ہمیں تسلیم کرنی پڑے گی کہ بیرونی امتحانات کے ختم ہونے سے تعلیم کے طریقوں میں ایک صحیح قسم کے "تدریسی انقلاب" کی بنیاد ضرور پڑ جائے گی۔ مگر طریق تعلیم میں جتنا کچھ ارتقا ہو رہا ہے اس کو بڑھا چڑھا کر بیان کرنا خود تعلیم کے حق میں مضر ثابت ہو سکتا ہے۔ اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مسٹر سیک مین نے اپنی کتاب "بچے کی راہ آزادی" میں لکھا ہے:۔

> اس سے زیادہ تکلیف دہ اور کوئی چیز نہیں ہو سکتی کہ اچھے خاصے سمجھدار آدمی موجودہ مدرسوں کو ایسی درس گاہوں کی حیثیت سے پیش کرنے پر اصرار کریں، جہاں کے اساتذہ خلوص دل کے ساتھ نئے نئے تجربات کرنے کے دل دادہ ہیں۔ اس کتاب کے مصنف پر اس سے پہلے کئی دفعہ یہ الزام لگایا گیا ہے کہ اس نے موجودہ زمانے میں طریق تدریس کی ترقی کو بہت کم کر کے دکھایا ہے۔ مگر حقیقت میں یہ ایک بہت ہی "معصوم" دھوکہ ہے، کیوں کہ ہر معمولی سے معمولی سمجھ بوجھ رکھنے والا آدمی جو طلبہ اور اساتذہ سے میل جول رکھتا رہا ہو یہ جانے بغیر نہیں رہ سکتا کہ تجرباتی طریق تدریس" اتنے کم استعمال ہوتے ہیں کہ بچوں کی ایک بہت بڑی اکثریت ان کے فیض سے بالکل ہی محروم رہتی ہے۔" صفحہ ۱۶

مندرجہ بالا اقتباس سے یہ نتیجہ ہرگز نہیں نکالنا چاہیے کہ موجودہ تعلیم میں سرے سے کوئی نئی روح

انقلاب سے ہی نہیں۔ تعلیم کے اس پہلو کو مسٹر ارنسٹ ینگ کی کتاب "تعلیم میں جدت" بڑی خوب صورتی سے پیش کرتی ہے۔ اس کتاب کو پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ نہ صرف پرائیویٹ مدرسوں بلکہ حکومت کے زیر اثر ابتدائی اور ثانوی میونسپل سکولوں میں بھی طریق تدریس کی اصلاح کے لیے نئے نئے تجربات کیے جا رہے ہیں۔ اس لحاظ سے یہ کہنا شاید غلط نہ ہوگا کہ موجودہ بورڈ آف ایجوکیشن کے سربراہ بھی تعلیم کی اصلاح کے لیے اساتذہ سے کچھ کم کوشاں نہیں۔ تعلیم کے موضوع پر ماضی قریب میں جو ادب تیار ہوا ہے وہ قنوطیت اور رجائیت دو مختلف نقطہ ہائے نظر کی نمائندگی کرتا ہے۔ مجموعی طور پر دیکھا جائے تو قنوطیت کا پہلو غالب نظر آتا ہے۔ ہمارے پاس تعلیم پر لکھی گئی ایسی کتابوں کا ایک اچھا خاصہ ذخیرہ موجود ہے جو یاس اور قنوطیت کے نقطۂ نظر کو پیش کرتی ہیں۔ مثلاً "تعلیم کا المیہ" "تعلیم کی لعنت"۔ "جہاں تعلیم ناکام ہو جاتی ہے" "حماقۂ تمدن"، "مضامین بغاوت" اس کے برعکس رجائیت پسند مصنفین کی کتابوں کے عنوانات اتنے انتہا پسندانہ نہیں ہوتے، چناں چہ اس سلسلے میں مسٹر ولیم پلیٹ کی کتاب "تعلیم کی مسرت" سب سے نمایاں ہے۔ بغاوت پسندانہ اور قنوطی نقطۂ نظر رکھنے والے ماہرین تعلیم کا زیادہ تر کام محض فکری اور نظری ہے۔ رجائیت کے علم برداروں میں زیادہ زور عمل اور تعمیر پر نظر آتا ہے۔ مگر اس عمل اور تعمیر سے بھی پہلے تخریب کا مرحلہ ہے جس سے گذرے بغیر "تعمیر" کا کوئی کام نہیں کیا جا سکتا۔ کیوں کہ تعلیم کے میدان میں صاف اور ہموار علاقے ہمیشہ سے نایاب رہے ہیں بہرحال یہ بات واضح ہے کہ موجودہ دور کی تعلیمی تحریکوں کی نمایاں خصوصیت عملی اور تعمیری پہلو ہے، جس کی اٹھان ایک ایسے فلسفے پر ہوئی ہے جو بڑا ہی پُر امید ہے ٭

("فن تدریس میں جدید ترقی" مصنفہ، سر جان آرمز، کے پہلے باب کا ترجمہ)

ابتدائی جماعتوں میں حساب

انور علی قریشی

حساب کا انسان کے ساتھ چولی دامن کا ساتھ ہے۔ اس کے بغیر زندگی کے مشاغل ادھورے اور نامکمل ہیں اس لیے اس کی ابتدا جماعت اول سے ہونی چاہیے جس میں گنتی اور پہاڑے مستعمل ہیں۔ یہ تجربہ ہے کہ پرائمری میں جو بچے حساب میں کمزور پائے جاتے ہیں، وہ محض ابتدائی حساب کی ادھوری تعلیم اور پہاڑوں کی کمی کا نتیجہ ہیں۔ اگر انہیں مندرجہ ذیل طریقہ سے حساب کی تعلیم دی جائے تو ان میں حساب کی ابتدائی کمزوریاں پیدا نہ ہوں گی۔

زبانی گنتی :۔ جب بچے ابتدائی جماعت میں داخل ہوں۔ انہیں مختلف اشیا (مثلاً ریٹھے کی گولیاں مٹی کے گولے، شیشے کی گولیاں، بیروں کی گٹھلیاں یا اور بہت سی ایسی چیزیں ہیں) کے ذریعے گنتی سکھائی جا سکتی ہے اس طرح سے یہ ایک کھیل بھی بن جاتا ہے جس سے بچے دلچسپی لیتے ہیں اور زبانی گننا بھی سیکھ جاتے ہیں کیونکہ جب بچے گھر سے سکول میں آتے ہیں تو وہ ایسی چیزوں سے کھیلتے آتے ہیں۔ انہیں اس طرح گھر اور سکول میں فرق معلوم نہیں ہوتا۔ اگر بچے مٹی کے گولے خود ہی بنائیں اور انہیں گنیں، یا ریٹھوں اور شیشوں کی گولیاں، بیروں کی گٹھلیاں خود ہی فراہم کریں اور گنیں، تو زیادہ بہتر رہے گا۔ اس کے علاوہ بالفریم کا بھی استعمال ہو سکتا ہے۔

جب بچے کچھ گنتی سیکھ جائیں تو سکول بند ہونے سے کچھ وقت پہلے استاد بلند آواز سے گنتی کہتا جائے۔ اور بعد میں تمام طلبا اجتماعی طور پر دہراتے رہیں جب کچھ بچوں کو سو تک گنتی زبانی یاد ہو جائے تو پھر ہر روز چھٹی ہونے سے ایک گھنٹہ پہلے دو لڑکے ترنم سے گنتی کہاتے جایا کریں۔ اور باقی تمام بچے ان کی اجتماعی تقلید کرتے جائیں۔ ہر روز اسی طرح یاد کرانے سے تمام بچوں کو گنتی زبانی یاد ہو جائے گی۔

گنتی لکھنا :۔ زبانی گنتی سکھانے کے ساتھ ہی بچوں کو گنتی لکھنا بھی شروع کرا دینا چاہیے۔ جس کا طریقہ یہ ہے کہ جب بچے تختیاں دھو کر گاچنی لگالیں تو بچوں کی تمام گیلی تختیوں پر ایک سے دس تک استاد

او کر سے (پوڑنے) ڈال دے۔ جب تختیاں سوکھ جائیں تو پھر بچے تختی کے تمام اعداد پر قلم کو سیاہی لگا کر بول بول کر لکھیں۔ یا استاد پنسل سے خشک اور صاف تختیوں پر ایک سے دس تک تمام تختی پر پوڑنے ڈال دے اور بعد میں بچے ان پوڑنوں پر قلم کو سیاہی لگا کر شروع سے بول بول کر لکھیں، جب بچوں کو ایک سے دس تک گنتی لکھنا آ جائے تو پھر ایک سے بیس تک۔ اس کے بعد ایک سے تیس تک، حتیٰ کہ ایک سے سو تک مندرجہ بالا طریقہ سے گنتی لکھنا سکھائی جا سکتی ہے۔ جب بچے سو تک گنتی لکھنا اچھی طرح سیکھ جائیں تو ٹوکویں (ڈکٹویں) سے بھی لکھنا سکھانا چاہیے۔ اس سے بچوں پر سو سے پہلی کی رقم لکھنا آ جائے گی۔ جب بچوں کو ٹوکویں سے لکھنا آ جائیں تو پھر روزانہ ان کی مشق کرائی جائے۔

پہاڑے:۔ جب بچے زبانی گنتی یاد کر چکیں تو انہیں پہاڑے بھی مترادف اشیاء کی مدد سے سکھائے جائیں مثلاً دو کوڑیوں کا ایک گچھا بچوں کے سامنے پیش کیا جائے اور ان سے پوچھا جائے کہ اس گچھے میں کتنی کوڑیاں ہیں لڑکے خود ہی بتا دیں گے کہ دو کوڑیاں ہیں۔ اس کے بعد استاد بچوں کو بتائے کہ جب دو چیزوں کا ایک گچھا ہو تو اسے ایک دونی کہیں گے علیٰ ہٰذا القیاس اسی طرح دو دو کوڑیوں کے دو گچھے بچوں کو دکھائے جائیں اور کہا جائے کہ یہ دو دونی یعنی چار کوڑیاں ہوئیں۔ اس کے بعد پھر دہرایا جائے کہ ایک دونی میں کتنی کوڑیاں اور دو دونی میں کتنی۔ اسی طرح دونی کے مکمل پہاڑے کا تصور بچوں کے ذہن نشین کرایا جا سکتا ہے۔ یا اور بھی کئی ایسی چیزیں ہیں مثلاً سیپیوں کی گولیاں یا بالفریم کی مدد سے بھی دونی کا پہاڑہ سکھایا جا سکتا ہے۔ اس کے بعد بچوں کے سامنے ایک ایسا چارٹ پیش کیا جائے جس پر دونی کے پہاڑے کا تصور رنگین شکل میں ہو اور دونی کا پہاڑہ ہندسوں میں بھی لکھا ہوا ہو۔ جب بچے دونی کا تمام پہاڑہ یاد کر لیں، تو پھر اسی طریقہ سے تین کا پہاڑہ اور پھر چار کا پہاڑہ اور پانچ کا پہاڑہ بھی یاد کرایا جا سکتا ہے۔ پہاڑوں کے رنگین چارٹ کمرے میں آویزاں ہونے چاہئیں ایک تو بچے ان کی مدد سے پہاڑے آسانی سے یاد کر لیں گے، دوسرے چارٹ بچوں کے دماغ میں پہاڑوں کے تصور کی پختگی کا باعث بنیں گے۔ تیسرے چارٹ کمرے کی زیبائش کا سبب بھی ہوں گے۔

جب جماعت اول کے بچے دونی سے دس تک پہاڑے یاد کر لیں تو ان سے کٹھے یا ٹوکویں پہاڑے بھی پوچھنے چاہئیں اگر کوئی لڑکا ٹوکواں پہاڑہ بتانے سے قاصر رہے گا تو دوسرے لڑکے سے پوچھا جا سکتا ہے اسطرح

م بچے پہاڑوں کو اچھی طرح یاد کرتے رہیں گے تاکہ ڈوکویں پہاڑے بتانے سے قاصر نہ رہیں۔

جب بچوں کو تمام پہاڑے یاد ہو جائیں تو وہ گنتی اور پہاڑے ہر روز اس طریقہ سے یاد کرتے رہیں کہ سکول
ہونے سے پہلے دو لڑکے آگے آگے بلند آواز سے گنتی کہتے جائیں۔ اور باقی تمام جماعت اجتماعی مہارتی کہتی جائے
ب وہ سو تک گنتی کہہ چکیں تو بعد میں اسی طریقہ سے دو لڑکے آگے آگے پہاڑے بلند آواز سے کہاتے جائیں، اور
قی تمام طلبہ ان کے پیچھے کہتے جائیں، بعد میں استاد بچوں سے ڈوکویں گنتی اور ڈوکویں پہاڑے پوچھے۔

ڈوکویں ہندسے لکھنے میں اکثر بچے انیس ۱۹۔ انتیس ۲۹۔ انتالیس ۳۹۔ انچاس ۴۹۔ انسٹھ ۵۹۔ انہتر ۶۹۔ اناسی ۷۹۔ نواسی ۸۹
ننانوے ۹۹ لکھنے میں غلطی کرتے ہیں۔ ان کی مشق زبانی گنتی کہنے کے بعد ہر روز مہارتی سے کرائی جائے اور بعد میں پہاڑوں
کی مہارتی کی مشق کرائی جایا کرے تو مذکورہ ہندسے لکھنا بھی بہت جلد ٹھیک ہو جائیں گے، کیونکہ ایک سال تک
کافی مشق ہو جاتی ہے۔

جب بچے تختیوں پر سو تک گنتی لکھ لیں تو مذکورہ ہندسے بھی لکھیں، تاکہ ان کی مشق بھی ہر روز ہوتی رہے
تختیوں کے علاوہ بچوں کو سلیٹ یا زمین پر تمام ہندسوں کے لکھنے کی ہر روز مزید مشق کرانی چاہیے، جو بچوں کے لیے
سال کے آخر تک نہایت مفید ثابت ہو گی۔ اس کے علاوہ ڈوکویں ہندسوں کی مضبوطی کے لیے اور بھی کئی قسم کی مشقیں ہو
سکتی ہیں جنہیں استاد خود اپنے دماغ سے سوچ کر کرا سکتا ہے۔

حساب جماعت دوم:۔ پہلے بچوں کو ڈوکویں ہندسوں کا اعادہ کرایا جائے کیونکہ بچے سو سے نیچے کے ہندسوں
کو لکھنا جانتے ہیں، جس میں اکائی اور دہائی شامل ہوتی ہے، صرف اکائی اور دہائی کا تصور پختہ کرنا باقی ہے، جو ٹھوس
اشیاء کی مدد سے اکائی و دہائی کا تصور بچوں کے ذہن نشین کیا جا سکتا ہے۔ مثلاً ایک سے نو تک تو اکائیاں ہی رہتی
ہیں، جب دس اکائیاں ہو جائیں گی تو پھر ایک دہائی بن جائے گی۔ جب بچوں کو اس کا تصور پختہ ہو جائے تو پھر
بچوں سے امتحانی طور پر پوچھا جائے کہ بیالیس ۴۲ میں کتنی اکائیاں اور کتنی دہائیاں ہیں۔ یا انسٹھ ۵۹ میں کتنی اکائیاں اور
کتنی دہائیاں ہیں وغیرہ وغیرہ۔ جب بچوں کو یہ کافی مشق کرائی جائے گی تو اکائی اور دہائی کا تصور پختہ ہو جائے گا
اب بچوں کو معلوم ہونے سے نامعلوم کی طرف لے جانا ہے، یعنی بچوں کو سینکڑوں کا تصور دلانا ہے، جو مذکورہ طریقہ
کی طرح بتایا جا سکتا ہے کہ سینکڑہ میں ایک سو اکائیاں ہوتی ہیں، یا انہیں دس دہائیاں بھی کہہ سکتے ہیں۔ اسی طرح

ہزار کا تصور، دو ہزار کا تصور وغیرہ۔ بعد میں بچوں کو بلیک بورڈ پر رقمیں لکھ کر رقمیں بتا دینا چاہیے۔ اور بچوں کو یہ بھی بتانا چاہیے کہ رقمیں لکھتے وقت اس بات کا خیال رکھیں کہ ہزار کا ہندسہ ہزار کے درجے کے نیچے سینکڑہ کا ہندسہ سینکڑہ کے درجہ کے نیچے اور دہائی کا ہندسہ دہائی کے درجہ کے نیچے اور اکائی کا ہندسہ اکائی کے درجہ کے نیچے لکھیں بلکہ اگر بچے پہلے مندرجہ ذیل کی طرح یوں خانے بنا کر لکھیں تو بہت اچھا رہے گا۔

ہزار	سینکڑہ	دہائی	اکائی
۳	۴	۲	۵
۱	۲	۱	۷
۴	۵	۰	۹

جب بچے تین چار یوم تک رقوم لکھنے کی مشق کر چکیں تو پھر انہیں جمع بلا حاصل سکھانی چاہیے اور جمع کا مطلب بھی بتا دیا جائے کہ کسی ایک ہی چیز کے اکٹھا کرنے کو جمع کہتے ہیں۔ یعنی تمام اکائیوں کو اکٹھا کر کے ان کے نیچے لکھ دو۔ اسی طرح تمام دہائیوں کو اکٹھا کر کے ان کے نیچے۔ اسی طرح سینکڑوں کو اکٹھا کر کے سینکڑے کے نیچے، اور ہزار کے ہندسوں کو اکٹھا کر کے ہزار کے نیچے جمع بلا حاصل میں بنایا گیا ہے۔

جمع بلا حاصل

	ہزار	سینکڑہ	دہائی	اکائی
	۲	۱	۳	۴
	۳	۲	۱	۳
	۱	۳	۴	۰
حاصل جمع	۷	۶	۸	۷

جمع باحاصل

	ہزار	سینکڑہ	دہائی	اکائی
	۶	۷	۱	۹
	۲	۴	۶	۱
	۸	۳	۸	۶
حاصل جمع	۷	۵	۶	۶

جمع بلا حاصل کی کچھ روز مسلسل مشق کرانی چاہیے، اس کے بعد جمع باحاصل سکھا دی جائے۔ جمع بلا حاصل اور جمع باحاصل کا فرق بھی بچوں کو بتا دیا جائے اور اچھی طرح ذہن نشین کرا دیا جائے۔ اس کے بعد تفریق کسے کہتے ہیں۔ تفریق بلا حاصل، اور تفریق باحاصل سکھانی چاہیے، اس کی بھی دیر تک کافی مشق کرانی چاہیے۔ اس کے بعد بچے بغیر خانوں کے سوالات لکھیں، کیوں کہ وہ اب رقم لکھنے میں غلطی نہیں کریں گے۔ اور اکائی دہائی، سینکڑہ، ہزار، لفظوں کی بجائے صرف گول نشان ڈالا جائے اور نیچے

•	•	•	•
[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]
۲	۲	۳	۹
۷	۶	۲	۲
۱۵	۳	۳	۷

اس کے بعد ضرب کسے کہتے ہیں یعنی ایک ہی ہندسے کو بار بار جمع کرنے کا نام ضرب ہے۔ پھر ضرب بلا حاصل اور ضرب باحاصل۔ پھر چھوٹی ضرب اور لمبی ضرب وغیرہ کا طریقہ سکھا کر دو ماہ تک اس کی مشق کرائی جائے۔

یعنی اکتوبر کے اخیر یا نومبر کے شروع تک کافی ہو سکتی ہے۔

تقسیم:۔ یعنی ایک ہی چیز کو برابر کئی حصوں میں بانٹنے کا نام تقسیم ہے۔ تقسیم با حاصل۔ تقسیم با حاصل۔ چھوٹی تقسیم لبی تقسیم وغیرہ کا طریقہ سکھا کر دسمبر تک مشق کرانی چاہیے۔ اس کے بعد جنوری سے مارچ کے شروع تک حساب کا کافی اعادہ ہو جائے گا۔ جہاں تک ہو سکے بچوں کو عبارتی سوالات لکھوائے جائیں، جب بچے کوئی طریقہ سیکھ چکیں تو اس طریقہ کے سوالات سکول میں حل کرائے جائیں اور وہی سوال گھر پر حل کرنے کے لیے دیے جائیں، اور اگلے روز تمام بچوں کی حساب کی کاپیوں کے سوالات کی پڑتال کی جائے جو کئی طریقوں سے کی جاتی ہے۔ مثلاً استاد کا کام بچوں کی کاپیوں کے سوالات دیکھنا، یا اگلے روز سکول میں گھر کے سوالات لکھوا کر دیکھنا۔ جو لڑکا درست سوالات حل نہیں کر سکے گا، اس نے گھر پر کام نہیں کیا۔ اس کی کاپی دیکھی جائے اگر اس کی کاپی پر سوال درست ہے اور جماعت میں غلط حل کر رہا ہے تو صاف ظاہر ہے کہ لڑکے نے کسی اور لڑکے کی کاپی سے سوال نقل کر لیا ہے۔ جب ایسے طریقوں سے پڑتال کی جائے گی تو طلبا میں نقل کی عادت دور ہونے لگے گی، اور تمام بچے صحیح کام کرنے کے عادی بھی ہو جائیں گے اور ان میں حساب کے مضمون میں کمزوری بھی پیدا نہیں ہو گی۔

جب بچے تمام طریقے سیکھ جائیں تو پھر سکول میں بھی تمام طریقوں کے سوالات نکلوائے جائیں، اور گھر میں بھی تمام طریقوں کے سوالات حل کرنے کے لیے دیے جائیں۔ اور مذکورہ طریقوں کے مطابق ان کے گھر کے کام کی پڑتال کی جائے جو لڑکے اچھا کام کرنے والے ہوں ان کی کاپیوں پر کبھی کبھی شاباش بھی لکھی جائے۔ تاکہ ہوشیار طلبہ کی حوصلہ افزائی ہو، اور کمزور بچے بھی شاباش حاصل کرنے کی کوشش کریں گے۔ کمزور بچے جب ذرا سا بھی اچھا کام کر کے دکھائیں تو ان کی کاپیوں پر بھی شاباش لکھنا چاہیے، تاکہ وہ خوب محنت سے کام کریں۔

حساب جماعت سوم ۔ جماعت سوم کے حساب میں بھی یہی چاروں طریقے ہیں۔ جمع۔ تفریق۔ ضرب۔ تقسیم وغیرہ۔ جمع تفریق تو بچوں کو دوسری جماعت کی طرح خانوں میں لکھ کر بتائی جائے، اور اس کی مشق بھی کرائی جائے کیونکہ اس میں روپے۔ آنے۔ پائیوں کی جمع۔ تفریق ہوتی ہے، جو خانوں میں لکھنے سے سوال کو دلکش بنا دیتی ہے، اور بچے خانوں میں روپے آنے پائی لکھنے میں غلطی بھی نہیں کرتے۔ بغیر خانوں کے رقمیں لکھنے میں اکثر بچے غلطی کر جاتے ہیں۔ جب بچوں کو ایسے طریقہ سے کام کرنے کی مشق ہو جائے تو پھر ضرب تقسیم بچوں کو سکھائی جائے

اس میں غلطی بنانے کی کوئی ضرورت نہیں۔ ان چاروں طریقوں کے علاوہ جماعت سوم میں تحویل نزولی اور تحویل صعودی ہے، جو ان چاروں طریقوں سے پہلے سکھائی جاتی ہے۔ کیوں کہ جماعت سوم کے لیے یہ ایک نیا قاعدہ ہے۔ جو بچوں کو بذریعہ کھیل سکھانا چاہیے، تاکہ بچے اس کے سیکھنے میں دل چسپی لیں، اس کے ہر قسم (روپے، آنے، پائیاں) کے بہت سے سکے فراہم کرنا ضروری ہیں جو گتے کے بنائے جا سکتے ہیں۔ جن سکوں کا رنگ سفید ہے ان گتے کے سکوں پر سگریٹ کی ڈبی کا سفید ورق لگا دو۔ سکے خوب صورت بھی ہو جائیں گے، اور آنہ، دونی، چونی، روپیہ وغیرہ بھی ویسا ہی بنا ہوا معلوم ہوگا جیسا کہ اصلی ہے، پیسہ یا اور اسی قسم کے سکے پر سنہری ورق لگا دیجیے۔

پہاڑے دو تی سے سولہ تک تو بچوں کو پہلے ہی یاد ہیں۔ ان کے علاوہ اب سوایا، ڈیوڑھا، پونا، ادھا، پا کے پہاڑوں کا تصور مٹی کے گولوں یا پہاڑوں کے رنگین چارٹ کی مدد سے دلایا جا سکتا ہے اور پہاڑے بھی یاد کرائے جا سکتے ہیں۔ پہاڑوں کے تصور کے لیے مٹی کے گولے یا رنگین چارٹ بچوں سے بنوائے جائیں۔

جماعت چہارم میں حساب سکھاتے وقت طلبا میں دل چسپی پیدا کی جا سکتی ہے۔ مثلاً مربع انچ، مربع فٹ، مربع گز کا تصور بذریعہ رنگین چارٹ کی مدد سے دلایا جا سکتا ہے، اور وہ رنگین چارٹ کمرہ میں آویزاں ہونے چاہئیں، تاکہ ان کا تصور اچھی طرح بچوں کے ذہن نشین ہو جائے۔ اور ایسے چارٹ بچوں سے بنوائے جائیں پچھلی جماعتوں کے پہاڑوں کے علاوہ اب انہیں ڈھائے اور ونٹے کا پہاڑہ مندرجہ بالا طریقوں پر یاد کروایا جائے۔

ہر جماعت اور ہر مضمون میں بچے تین قسم کی حالتوں میں ہوتے ہیں ۱ ہوشیار طلبہ ۲ درمیانے طلبہ ۳ کمزور طلبہ۔ ان کو گروہوں میں تقسیم کر کے ان کے کئی گروہ بنا دینے چاہئیں، تاکہ وہ گروہوں میں کام کرتے وقت اپنے کمزور ساتھیوں کی مدد کر سکیں۔ ہوشیار طلبہ جب کمزور بچوں کو اپنے ساتھ کام کرائیں گے اور انہیں سوال سمجھائیں گے یا پہاڑے یاد کرائیں گے تو ہوشیار طلبہ کی ذہانت میں اضافہ ہوگا۔ کمزور بچے اپنے ساتھیوں سے کام سیکھنے میں دل چسپی بھی لیں گے اور کام بھی سیکھ جائیں گے جس سے کمزور بچوں کی حالت بہتر ہو جائے گی اور استاد کو بھی کام کرانے یا سکھانے میں آسانی ہو جائے گی۔

معلومات عامہ

دنیا کی آبادی میں روزانہ ایک لاکھ بیس ہزار کا اضافہ

اقوام متحدہ کا سالنامہ پیدائش و اموات شائع ہوا ہے، اس پر نظر ڈالنے سے پتہ چلتا ہے کہ دنیا کی آبادی میں جو اس وقت تقریباً دو ارب ستر کروڑ ہے، ہر ایک گھنٹے میں ۵ ہزار نفوس کا اضافہ ہو جاتا ہے، اس حساب سے روزانہ تقریباً ایک لاکھ بیس ہزار کا یا ہر سال ۴ کروڑ تیس لاکھ کا اضافہ ہو جاتا ہے۔ اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ ایک طرف شرح اموات میں زبردست کمی ہو گئی ہے، اور دوسری طرف رفتار پیدائش جوں کی توں ہے۔

اقوام متحدہ کے ماہرین نے ۱۹۵۵ء میں اندازہ لگایا تھا کہ ہر سال پیدائش کی رفتار ۳۴ فی ہزار ہے جبکہ اعداد اموات ۱۸ فی ہزار کے قریب ہے۔ اس طرح ۱،۶ فی صد سالانہ کا حساب پھیلتا ہے۔ اس لحاظ سے صدی کے آخر تک دنیا کی آبادی دوگنی ہو جائے گی۔

سالنامہ پیدائش و اموات بابت ۱۹۵۶ء کی ضخامت ۷۰۰ صفحات ہے جس میں نقشے اور نما کے بھی شامل ہیں۔ کتاب میں دنیا کے تقریباً دو سو الگ الگ علاقوں کی مردم شماری کے نتائج درج کیے گئے، ان علاقوں میں دو ارب تنیس کروڑ ۵۰ لاکھ انسان آباد ہیں۔ روس کے اعداد و شمار اس لیے شریک اشاعت نہیں ہیں کہ پچھلے دس سال میں وہاں مردم شماری نہیں ہوئی ہے۔

البتہ پچھلے سال روس نے پیدائش و اموات سے متعلق کچھ اعداد و شمار شائع کیے تھے۔ ان کو ملحوظ رکھتے ہوئے تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ آبادی کے اعتبار سے روس دنیا کا تیسرا بڑا ملک ہے۔ اعداد و شمار سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہاں پیدائش کی رفتار استوار اور ۲۵ فی ہزار کے لگ بھگ ہے، نیز رفتار اموات ۹،۶ سے گھٹ کر ۸،۴ فی ہزار رہ گئی ہے۔ مشرقی یورپ کے چھپے اور ملکوں کی اطلاعات بھی اب دستیاب ہو گئی ہیں۔ جو پہلے ممکن نہیں تھیں۔ ان سے پتہ چلتا ہے کہ غیر طبعی شرح پیدائش ۱۶ تا ۱۹ اور رفتار اموات ۸ تا ۱۲ سے جو یورپ کے باقی ملکوں، ریاست ہائے متحدہ، کنیڈا، آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ کے برابر ہے۔ البتہ مغربی یورپ کی بہ نسبت مشرقی یورپ کے ملکوں میں اموات اطفال کی رفتار غیر معمولی طور پر زیادہ ہے۔ بلغاریہ، چیکوسلواکیہ، مشرقی جرمنی، ہنگری، پولینڈ اور یوگوسلاویہ میں

ایک سال سے کم عمر بچوں کی شرح اموات ۲۲ تا ۱۱۳ فی ہزار ہے۔ اس سے نتیجہ نکلتا ہے کہ ۱۹۵۹ء میں جو بچے پیدا ہوئے تھے، ان میں سے اوسطاً ۷ء۰ فی صد اب تک مر چکے ہیں، جبکہ یورپ کے دوسرے ۱۲ ملکوں میں یہ اوسط ۲ء۴ فی صد کے قریب ہے۔

وسطی اور جنوبی امریکہ کے چھ چھ ملکوں سے اطلاعات مل سکی ہیں، وہاں علی الترتیب رفتار ۳ء۱۸ اور ۹ء۸ فی صد ہے۔ ریاست ہائے متحدہ اور کنیڈا میں بچوں کی رفتار اموات صرف ۷ء۲ فی صد ہے، اور آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ میں دو فی صد سے کچھ ہی زیادہ ہے۔

اقوامِ متحدہ کے اعداد و شمار کے مطابق دنیا بھر کی آبادی میں جو اضافہ ہو رہا ہے اس کا دس فی صد حصہ جنوبی امریکہ سے متعلق ہے، وہاں ۷ء۲ فی صد کے حساب سے یا تقریباً ۴۴ لاکھ نفوس کا ہر سال اضافہ ہو رہا ہے افریقہ، جنوب مشرقی ایشیا، اور اوشیانہ میں بھی تقریباً یہی رفتار ہے۔ وہاں دو فی صد کے حساب سے اضافہ ہو رہا ہے۔ شمالی امریکہ اور روس میں رفتار کا اوسط ۷ء۱ فی صد فی سال ہے، سب سے کم اضافہ یورپ میں ہے یعنی ۷ء۰ سے ایک فی صد تک ہے۔

ایشیا تیز رفتاری کے علاوہ اس بات کا بھی دعویدار ہے کہ وہاں دنیا کے نصف باشندے آباد ہیں اور ہر سال آبادی میں ۲ کروڑ ۴ لاکھ نفوس کا اضافہ ہو جاتا ہے۔ سالنامے میں خاکوں کے ذریعہ واضح کیا گیا ہے کہ اس براعظم کے ۷۰ ملکوں میں ۱۹۵۵ء–۱۹۶۰ء کی بہ نسبت ۱۹۵۰ء–۱۹۵۵ء میں اضافے کا تناسب زیادہ رہا، جن ملکوں میں اضافے کی رفتار شروع میں کم تھی وہاں اب بھی وہی حال ہے۔ اسی طرح تیز رفتار ملکوں میں اضافے کی رفتار شرح ہنوز زیادہ ہے۔ اس صورت حال کو دیکھتے ہوئے غور کرنا پڑتا ہے کہ اقتصادی اور معاشرتی ترقیوں کے پروگراموں کو کس طرح عمل میں لایا جائے کہ آبادی کے موجودہ رجحانات کا ساتھ دیا جا سکے۔ افریقہ، وسطی امریکہ اور جنوب مشرقی ایشیا میں رفتارِ پیدائش ۴۵ فی ہزار ہے، اور اس کے برعکس یورپ میں ۱۸ سے ۲۱ فی ہزار ہے۔

اعداد و شمار سے پتہ چلتا ہے کہ بلا استثنیٰ رفتارِ اموات ۱۹۴۵ء–۴۹ء کی بہ نسبت ۱۹۵۰ء–۵۴ء میں کم تھی ایشیا اور افریقہ کے بیشتر ملکوں میں جن کے ابتدائی دور میں رفتار سب سے زیادہ تھی، سب سے زیادہ کمی ہوئی۔ پچھلے دس سال میں اموات کی کمی خاص اہمیت رکھتی ہے، اس کا اثر اب محسوس ہونا شروع ہوا ہے، اور آئندہ اس سے کچھ

پیچیدگیاں پیدا ہوں گی۔ اموات میں کمی کا سبب یہ ہے کہ حفظانِ صحت کے اصولوں پر خاص توجہ دی گئی ہے اور طبی اور صحتی طریقوں کو عمل میں لا کر بیماریوں کی روک تھام کی گئی ہے، خصوصاً نمونیہ، تپ دق، اور ایسی ہی دوسری بیماریوں میں مبتلا ہونے والوں کی تعداد گھٹ گئی ہے۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد ڈی۔ڈی۔ٹی اور دوسری کیڑے مار ادویات کے استعمال نے بعض وبائی امراض کے اثرات بھی کم کر دیے ہیں۔

رفتارِ اموات میں انقلاب کا ایک یہ نتیجہ برآمد ہوا کہ توقعِ حیات بھی بڑھ گئی۔ سالناموں پر نظر ڈالنے سے پتہ چلتا ہے کہ ریاست ہائے متحدہ میں ۱۹۳۰ء اور ۱۹۵۲ء کے درمیان سفید نسل کے باشندوں میں توقعِ حیات بقدر ۳ سال زیادہ ہو گئی۔ سیاہ اقوام کے مردوں میں ۵ سال کا اضافہ ہوا، عورتوں میں اضافے کی رفتار علی الترتیب ۴ سال اور ۶ سال ہو گئی۔ ۱۹۴۱ء اور ۱۹۵۵ء کے درمیان ہنگری میں توقعِ حیات مردوں میں بقدر ۱۰ سال اور عورتوں میں ۱۱ سال زیادہ ہو گئی۔ چلی میں ۱۹۳۰ء کا مقابلہ ۱۹۵۲ء سے کیا گیا تو معلوم ہوا کہ مردوں میں توقعِ حیات ۱۲ سال اور عورتوں میں ۱۴ سال زیادہ ہو گئی ہے۔ پرتگال میں ۱۹۴۰-۵۲ء کے دوران میں علی الترتیب ۷ اور ۸ سال کا اضافہ ہوا۔

غیر طبعی رفتارِ اموات میں سب سے زیادہ کمی نیدرلینڈز میں ہوئی۔ اسی ملک میں توقعِ حیات کا اوسط بھی سب سے زیادہ یعنی مردوں میں ۷۱ اور عورتوں میں ۷۳ سال بتایا گیا ہے۔ سب سے کم توقعِ حیات بھارت میں ہے وہاں مردوں اور عورتوں کے لیے اوسط عمر ۳۲ سال ہے۔ یہ نتیجہ ۱۹۴۱ء اور ۱۹۵۱ء کی مردم شماری سے نکالا گیا ہے۔

بلحاظ جنس توقعِ حیات کی تعدادوں میں جو فرق رونما ہو رہا ہے وہ خالی از دلچسپی نہیں ہے۔ اعداد و شمار سے پتہ چلتا ہے کہ اب جو (مرد) بچے پیدا ہوتے ہیں وہ اوسطاً ۷۰ سال تک زندہ رہ سکتے ہیں، اور ایک ملک یعنی نیدرلینڈ میں اس سے بھی زیادہ مدت تک۔ اس کے برعکس بارہ ملک ایسے ہیں جہاں طویل تر اوسط عمر عورتوں کے لیے مخصوص ہے۔ انہی اعداد و شمار کی بنیاد پر مردوں اور عورتوں کی رفتارِ اموات کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔ بچپن کا زمانہ ختم ہونے کے بعد مردوں کے لیے ہر عمر میں موت کا زیادہ خطرہ لاحق رہتا ہے۔

افریقہ، وسطی امریکہ اور جنوب مشرقی ایشیا کی آبادی میں بچوں کی تعداد سب سے زیادہ ہے۔ ان علاقوں میں ۴۰ فی صد سے زیادہ باشندوں کی عمریں ۱۵ سال سے کم ہیں، جبکہ یورپ اور شمالی امریکہ میں ۲۰ فی صد کی عمریں

..۳۰ سال سے کچھ کم ہیں۔ تاہم ان علاقوں میں لوگوں کا کام کرنے کی عمر مختلف ہے۔ افریقہ، وسطی امریکہ اور جنوب مشرقی ایشیا میں ۵۰ فی صد سے کچھ زیادہ لوگوں کی عمریں ۱۵ اور ۵۹ کے درمیان ہیں، جبکہ شمالی امریکہ، یورپ اور اوشیانا میں ۶۰ سال کے بالغ سے بھی کام کاج میں معروف رہتے ہیں۔ غالباً عمدہ صحت کی بنا پر شمالی امریکہ، یورپ اور اوشیانا میں بھی بیشتر باشندوں کی عمریں ۶۰ سال سے تجاوز کر گئی ہیں۔

پاکستان کے لیے یونی سیف کے وظائف

اقوام متحدہ کے بچوں کے فنڈ (یونی سیف) نے مشرقی اور مغربی پاکستان کے ڈاکٹروں اور نرسوں کے لیے چھ وظیفے دیے ہیں۔ منتخب ہونے والوں کو آل انڈیا انسٹی ٹیوٹ آف ہائی جین اینڈ پبلک ہیلتھ، کلکتہ میں تربیت کے بعد ماؤں اور بچوں کی فلاح و بہبود کے کام کا ڈپلوما اور پبلک ہیلتھ نرسنگ کا سرٹیفکیٹ دیا جائے گا۔ کامیاب امیدواروں کے نام یہ ہیں۔

(۱) ڈاکٹر ایس۔ اے قاضی (ریلوے ہسپتال کوئٹہ)، (۲) ڈاکٹر مس منورہ بنت رحمان (ماؤں اور بچوں کی فلاح و بہبود کا مرکز، ڈھاکہ (۳) ڈاکٹر مسز شمس النہار (ماؤں اور بچوں کی فلاح و بہبود کا مرکز ڈھاکہ (۴) مس سلطانہ تیمور ری (نرس ڈفرن ہسپتال کراچی (۵) مس کوٹلڈ اور گھینز (نرس ڈفرن ہسپتال کراچی (۶) مسز ایس۔ اے۔ قریشی (نرس ریلوے ہسپتال لاہور)

عالمی ادارہ صحت اور یونی سیف نے ایشیا، افریقہ اور مشرق وسطیٰ کے ملکوں سے ۲۳ ڈاکٹروں اور نرسوں کو منتخب کیا ہے جن میں پاکستانی امیدوار بھی شامل ہیں۔ وہ سب ایک سال تک کلکتہ کے مذکورہ بالا ادارے میں تربیت [illegible] ماؤں اور بچوں کی صحت سے متعلق ادارے کے شعبے کو حال ہی میں وسیع کیا گیا ہے، جس کے لیے یونی سیف [illegible] ایشیائی ملکوں کے لیے ایک علاقائی تربیتی مرکز ثابت ہوگا۔ [illegible] اس کے بعد جب کلکتہ میں تربیت پانے والے [illegible] کہ وہ اس ملک میں ماؤں اور بچوں کی [illegible]

Regd. No. L. 5327

پنجاب ایجوکیشنل جرنل

اور

آموزش (اردو)

۱ - پاکستان بھر میں یہ دو ھی تعلیمی رسالے ھیں۔ جنکو سرکاری سرپرستی اور امداد حاصل ہے۔

۲ - پاکستان بھر میں یہی دو تعلیمی رسالے ھیں۔ جو مرکزی اور صوبائی درسگاھوں اور تعلیمی حلقوں میں مقبول ھیں۔

۳ - ان رسالوں کے متعلق ادارتی خطوط اور چھپنے والے مضامین ایڈیٹر (پرنسپل) سنٹرل ٹریننگ کالج لاھور کو بھیجے جائیں۔ ان رسالوں میں چھپے ھوئے مضامین کیلئے معاوضہ دیا جاتا ہے۔

۴ - یہ رسالے ھر مہینے کے دوسرے ھفتہ میں چھپتے ھیں اور ان کا چندہ آٹھ روپیہ (انگریزی) اور چھ روپیہ (اردو) ہے۔ جو کہ منیجر کو بھیجنا چاھئے۔

۵ - ان رسالوں میں اشتہار دینے سے آپکی اشیاء مقبول ھونگی۔ تجارتی معاملات کیلئے خط و کتابت منیجر سے کریں۔

منیجر پنجاب ایجوکیشنل جرنل / اموزش

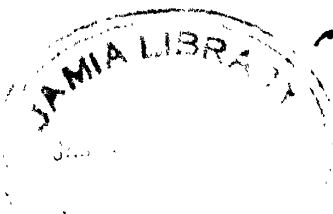
۲ کچہری روڈ۔ لاھور (پاکستان)

آموزش

جلد ۱۰ شمارہ ۵] لاہور [اگست ۵۷ء

اس شمارہ میں

تعلیمی ماہنامہ



آموزش

لاہور

اگست ۱۹۵۷ء

جلد ۱۰

شمارہ ۵

سالانہ چندہ

پاکستان کے لیے ۶ روپے

غیر ممالک کے لیے ۸ روپے

قیمت فی پرچہ دس آنے

پبلشرز

یونیورسٹی بک ایجنسی لاہور

آر۔ ایچ۔ ڈی خالد پرنٹر پبلشر نے دین محمدی پریس لاہور میں طبع کرا کے
یونی ورسٹی بک ایجنسی ۲ کچہری روڈ لاہور سے شائع کیا

ابتدائی تعلیم

ایم۔ اے مخدومی

ابتدائی تعلیم کو بجا طور پر ہر ملک میں نظامِ تعلیم کی بنیاد خیال کیا جاتا ہے۔ اور تعلیم کی تعمیر نو کے ہر منصوبے میں اسے ہمیشہ پہلی توجہ دی جاتی ہے۔ حکومت پاکستان کو تعلیم کی اہمیت کا جو شدید احساس ہے اس کا اندازہ صرف ایک بات سے ہو سکتا ہے کہ آزادی ملنے کے جلد بعد جب ملک ابھی طرح طرح کی ہوش ربا مشکلوں میں گھرا ہوا تھا۔ حکومت نے ایک تعلیمی کانفرنس کراچی میں بلائی۔ اس کانفرنس کا ایک فیصلہ یہ بھی تھا کہ ملک سے ناخواندگی دور کرنے کے لیے فوری اور مؤثر قدم اٹھائے جائیں۔ اس وقت سے لے کر اب تک ابتدائی مدرسوں کی تعداد میں جس تیزی سے اضافہ ہوا ہے وہ اس بات کا کھلا ہوا ثبوت ہے کہ حکومت ابتدائی تعلیم کی اہمیت سے پوری طرح آگاہ ہے۔ لیکن اس کے باوجود ابتدائی تعلیم کے میدان میں ابھی بہت کچھ کرنا باقی ہے۔ ملک کے کوئی ایک تہائی بچے ابھی ابتدائی تعلیم کی سہولتوں سے محروم ہیں۔ ابتدائی تعلیم کلی طور پر میونسپل اور ڈسٹرکٹ بورڈوں کے ہاتھ میں ہے۔ حکومت خود اختیاری کے یہ ادارے اکثر حالتوں میں ابتدائی تعلیم کو مناسب توجہ نہیں دیتے اس سے ابتدائی تعلیم میں طرح طرح کی خامیاں پیدا ہو چکی ہیں۔ جوں جوں زیادہ بچے ابتدائی مدرسوں کا رُخ کرتے ہیں، ابتدائی تعلیم کی یہ خامیاں بڑھتی جا رہی ہیں۔

بعض لوگوں کے نزدیک اس صورت حال کا علاج یہ ہے کہ حکومت ابتدائی تعلیم کو براہِ راست اپنے ہاتھ میں لے لے۔ ابتدائی تعلیم کے مسئلہ کا یہ ایک حل ضرور ہے، گو یہ اس کا واحد حل نہیں۔ لیکن اس حل کو قبول کرنے سے پہلے حکومت کے لیے اپنی دوسری تعلیمی ذمہ داریوں کا جائزہ لینا بھی ضروری ہے۔ پاکستان ایک نیا ملک ہے اور اس کی قومی زندگی زیرِ تعمیر ہے۔ اس نے یہ عمارت جمہوری اصولوں پر استوار کرنے کا فیصلہ کر رکھا ہے۔ اس کا قدرتی نتیجہ یہ ہے یہ ملک اپنے آپ کو بہ یک وقت دو اہم تعلیمی ضرورتوں سے دوچار

پاتا ہے۔ ایک طرف اسے پڑھے لکھے شہریوں کی ضرورت ہے جو ملکی زندگی میں سوجھ بوجھ کے ساتھ حصہ لے سکیں اور جمہوری زندگی کی شہری ذمہ داریوں کو فہم و فراست کے ساتھ پورا کر سکیں۔ دوسری طرف اسے کافی تعداد میں ایسے فنی ماہرین کی ضرورت ہے جو تعمیر و ترقی کے مختلف میدانوں میں رہنمائی کے فرائض انجام دے سکیں۔ اگر پہلی ضرورت ناخواندگی کو ملک بدر کرنے سے پوری ہوتی ہے تو دوسری اعلیٰ تعلیم کو فروغ دینے سے۔ ان دونوں ضرورتوں میں سے کسی ایک کو نظر انداز کرنا قومی زندگی کے بنیادی تقاضوں کو نظر انداز کرنے کے برابر ہوگا۔

ہماری بیشتر آبادی وسیع و عریض دیہاتی علاقوں میں بکھری پڑی ہے۔ اس لیے بیشتر ابتدائی مدرسے دیہاتی علاقوں میں واقع ہیں۔ ان تمام مدرسوں کے حکومت کی تحویل میں آجانے سے ان کی حالت بے شک بہتر ہو گی لیکن مشکل یہ ہے کہ اس مطلب کے لیے حکومت کے پاس روپیہ کہاں سے آئے؟ اگر صوبے کے تعلیمی بجٹ کا بیشتر حصہ ابتدائی تعلیم پر خرچ ہو جائے تو ثانوی اور اعلیٰ تعلیم کا کیا بنے؟ طرح طرح کے ترقیاتی منصوبوں کو عملی شکل دینے کے لیے جن تربیت یافتہ عالموں اور فنی ماہروں کی ضرورت ہے، ان کی تعلیم و تربیت کی ذمہ داری کون سنبھالے؟

یہ ہے دوہری دشواری جس نے حکومت کو ابتدائی تعلیم کی ساری ذمہ داری خود قبول کرنے سے روکے رکھا ہے۔ ایک پسماندہ زرعی معیشت تعلیم جیسی بنیادی ضرورت پر بھی ایک مقررہ حد سے زیادہ خرچ نہیں کر سکتی۔ اسے اپنی ساری تعلیمی ضرورتیں محدود مالی وسائل کے اندر ہی پوری کرنی پڑتی ہیں۔ بایں ہمہ مشرقی پاکستان کی حکومت نے ابتدائی تعلیم کے بارے میں ایک انقلاب آفرین قدم اٹھانے کا اعلان کیا ہے۔ اس صوبے کے وزیر اعلیٰ نے جو وزیر تعلیم بھی ہیں ۱۹ر اگست کو یہ اعلان کیا کہ صوبے کے تمام ابتدائی مدرسے میونسپل اور ڈسٹرکٹ بورڈوں کی بجائے حکومت کے ہاتھ میں آجائیں گے۔ مشرقی پاکستان نے ایک تعلیمی کمیشن بھی مقرر کر رکھا تھا جس کی بعض اہم سفارشیں منظر عام پر آچکی ہیں۔ یہ سفارشیں صوبے کے نظامِ تعلیم کو بنیاد سے چوٹی تک تبدیل کر دینا چاہتی ہیں۔ ابتدائی تعلیم کے متعلق حکومت کا فیصلہ اس ہمہ گیر تعلیمی منصوبے کا ہی ایک حصہ ہے۔

مغربی پاکستان ملک کے مشرقی حصے کے اس تعلیمی تجربے کا مطالعہ گہری توجہ اور دلچسپی سے کرے گا۔ اگر فی الواقع کوئی ایسی قابلِ عمل راہ نکل آئے جس سے حکومت دوسری تعلیمی ذمہ داریاں پوری کرنے کے ساتھ ہی ابتدائی تعلیم کی

[illegible]

تعلیمی نگرانی کس طرح کی ہو؟

فضل احمد

مشرقی اسلامی ثقافت میں تعلیم کو ہمیشہ ایک اونچا درجہ حاصل رہا ہے اور سلاطین و امرا علمی سرپرستی میں ایک دوسرے سے آگے بڑھ جانے کی کوشش کرتے رہے ہیں، مگر عامی تعلیم کا جو نظام اس وقت رائج ہے۔ قرون وسطیٰ میں اس کا وجود نہ تھا۔ انگریزوں کی آمد سے پہلے برصغیر پاک و ہند کے اکثر حصوں میں خواندگی کی شرح موجودہ وقت سے کہیں زیادہ تھی، مگر لکھنے پڑھنے کا یہ چرچا کسی رفاہ عامہ کی علمبردار ریاست کا کارنامہ نہ تھا بلکہ معاشرتی زندگی کی روحانی اور اخلاقی بنیادوں کی براہ راست پیداوار ثقافتی آب و ہوا، افراد کو اشاعت علم اور تلاش علم پر مجبور کرتی تھی۔ اس میں کسی مرکزی تحریک یا نگرانی کو نہ کچھ دخل تھا اور نہ اس کے لیے کچھ گنجائش۔

انگریزوں کی آمد نے یہ سارا نقشہ بدل دیا۔ ان کے اپنے ملک میں عوامی تعلیم کا تصور ابھی بالکل نیا تھا۔ برطانوی معاشرہ صدیوں سے تہ در تہ طبقوں میں بٹا چلا آرہا تھا جن میں سے صرف اوپر کے طبقے کو یہ حق تھا کہ انتظام امور کے لیے سوجھ بوجھ کی صلاحیت پیدا کرے۔ چنانچہ تعلیم اسی محدود گروہ کے لیے مخصوص تھی صنعتی انقلاب نے جب نچلے طبقے کے لوگوں کو انبوہ در انبوہ کارخانوں اور عدکشا پوں میں جمع کیا تو ان لوگوں کو پہلی دفعہ اپنی جماعتی قوت کا احساس ہوا، اور انہوں نے دوسرے حقوق کے ساتھ تعلیم کا مطالبہ بھی پیش کیا۔ غالب طبقہ نے اس مطالبے کو ہمدردی سے سنا کیوں کہ اس میں اس کا خود اپنا فائدہ تھا کہ نئے مشینی نظام کے ادنیٰ کارندے لکھنے پڑھنے کے قابل ہوں تاکہ وہ نظام کے بہتر پرزے بن سکیں، چنانچہ عوامی تعلیم رائج کر دی گئی مگر کیسی تعلیم؟ وہ تعلیم نہیں جو حکمران طبقہ کے لیے مخصوص تھی محض معمولی نوشت و خواند جو انہیں زیادہ مستعد مزدور بنا سکے۔

اس عوامی تعلیم کا قدرتی نتیجہ جگہ جگہ مدارس کا کھلنا تھا۔ ان کی دیکھ بھال اور ان کے پست معیاروں کی جانچ پڑتال کے لیے مرکزی نگرانی ضروری نظر آئی۔ اس طرح مدارس کے ناظر کا عہدہ وجود میں آیا۔ اس تعلیمی نگرانی کے

کوئی بلند تخلیقی مقصد نہ تھا۔ بلکہ اس کی ساری توجہ اس بات پر تھی کہ وہ بندھے ٹکے طریقے ہر جگہ استعمال کیے جائیں جو عوامی تعلیم کے نصب العین کو بہترین طور پر پورا کرنے والے خیال کیے جاتے تھے۔ ناظر کے لیے ان طریقوں میں ماہر ہونا یا کم سے کم اپنے آپ کو ان طریقوں کا ماہر خیال کرنا ضروری تھا۔ بہر صورت اساتذہ کے لیے یہ یقین رکھنا لازمی تھا کہ ناظر طریقہ ہائے تعلیم کا بے بدل علامہ ہے۔ جو اپنے برتر پُر اسرار علم کی وجہ سے یہ حق رکھتا ہے، کہ ان کے تدریسی طریقوں پر نکتہ چینی کرے، اور اصلاح کے لیے مشورے اور ہدایات دے۔

ہمارے ہاں تعلیمی نگرانی

تعلیمی نگرانی کا ہندوستانی تجربہ اس برطانوی نمونے سے کہیں زیادہ شوخ تر رنگوں میں تیار ہوا۔ یہاں نہ صرف یہ کہ سارا نظام تعلیم، ایک تنگ، مادی نصب العین کو سامنے رکھ کر گھڑا گیا تھا۔ بلکہ اس پر طرہ یہ کہ مدتوں تعلیمی نگرانی کی باگ ڈور انگریز افسروں کے ہاتھ میں رہی۔ محکوم قوم کے افراد کے لیے آگے بڑھنے کا آسان ترین راستہ غیر ملکی آقاؤں کی خوشنودی مزاج حاصل کرنا تھا ہی۔ تعلیمی میدان میں اس سیاسی مصلحت کو تعلیمی نظریوں کا کا سہارا ملا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ تعلیمی نگرانی بدترین قسم کی آمریت بنکر رہ گئی یہ غالباً اسی بات کا نتیجہ تھا کہ برطانوی ہندنے گو زندگی کے دوسرے شعبوں میں نمایاں اہلیت کے لوگ پیدا کیے، مگر اس کے جدید مدارس میں پڑھانے والوں میں سے کبھی کوئی شخص روایتی ملائے مکتبی کی حد سے آگے نہ بڑھنے پایا۔

آخر زمانے نے پلٹا کھایا، تعلیمی نگرانی رفتہ رفتہ غیر ملکی ہاتھوں سے نکل کر خود اہل ملک کے ہاتھوں میں آنے لگی اور بالآخر آزادی مل جانے پر یہ اہم کام کلی طور پر ہمارے اپنے ہاتھوں میں آگیا۔ مگر اس سیاسی انقلاب نے تعلیمی نگرانی کے تانے بانے پر بہت کم اثر ڈالا۔ ہمارے ہاں تعلیمی رہنمائی اب بھی اسی بات تک محدود ہے کہ مدرسے کے کام پر سال میں ایک آدھ بار نکتہ چینی کی جائے اور یہ نکتہ چینی ایسے دیوتائی رنگ میں ہو کہ اس غریب کو بات کرنے تک کا موقع نہ دیا جائے۔ ہفتوں پہلے انسپکٹر صاحب کی آمد آمد کا چرچا ہونے لگتا ہے شبانہ روز تیاریاں ہیں۔ آخروہ حضرت آئے اور ایک جھلک دکھا کر چلتے بنے۔ کچھ دنوں یا ہفتوں کے بعد ان کی رائے مبارک کتاب میں درج ہو کر آئی، اساتذہ سانس تھامے اس غیبی آواز کو سننے کے لیے جمع ہوئے ہر ایک نے اپنے کام سے متعلق نکتہ چینی کو روزنامچہ میں درج کیا، اور اس "ہدایت نامہ" کو حرزِ جاں

بنانے کا عہد کر کے رخصت ہوئے، چلو چھٹی ہوئی ..... تعلیمی رہ نمائی کا کام پورا ہوا۔

پرانے تصوّر کی کوتاہیاں

تعلیمی نگرانی کے اس فرسودہ تصوّر کی سب سے بڑی کمی غالباً یہ ہے کہ اس کی بدولت نگران ایک جعلی شخصیت اختیار کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ اس تصوّر کا بنیادی مفروضہ یہ ہے کہ نگران ایک ہمہ دان شخص ہے، جو مختلف استادوں کی خوبیوں اور کوتاہیوں کا جائزہ لینے کی پوری اہلیت رکھتا ہے۔ یہ مفروضہ سرے سے غلط ہے۔ مگر اس کی کرشمہ سازیاں کئی ایک نگران حضرات کو طرح طرح کی خود فریبیوں میں مبتلا کرتی ہیں۔ مجھے ایک بزرگوار کا علم ہے جو خوب تن کر یہ دعویٰ کیا کرتے تھے کہ مابدولت پیدائشی معلّم واقع ہوئے ہیں۔ مثلاً گو ہم ہندی سے نابلد ہیں لیکن اگر چاہیں تو بڑی آسانی سے ہندی پڑھا سکتے ہیں۔ حال ہی میں ایک دوست نے ایک دلچسپ واقعہ سنایا۔ ایک نگران حضرت جماعت کا معائنہ فرما رہے تھے۔ اس دوران میں جذبہ تعلّی میں جو جوش آیا تو فرمانے لگے یعنی کبھی مابدولت کو پڑھاتے دیکھتے تو تمہیں معلوم ہوتا کہ تدریس کس طرح ہوتی ہے۔ جماعت میں یوں سناٹا چھایا ہوتا تھا گویا کمرہ خالی ہے۔

خود فریبی کی ایسی مثالوں کے دفتر کے دفتر جمع کیے جا سکتے ہیں۔ یہاں سوال یہ ہے کہ جو شخص خود جہل مرکب کی موت سے جاں بلب ہو وہ دوسروں کو زندگی کی تر و تازگی کا پیغام کس طرح دے سکتا ہے؟ جو شخص اپنے آپ سے بے خبر ہو اور جس نے خود اپنے اوپر بالیدگی کے دروازے بند کر رکھے ہوں وہ دوسروں کو تحصیل خودی اور بالیدگی کا راستہ دکھائے تو کیوں کر؟

اس طریق نگرانی کی دوسری بڑی خامی عدم اعتماد اور بددلی کی وہ وسیع خلیج ہے جو نگران اور مدرسین کے درمیان حائل رہتی ہے۔ نگران چوں کہ بیشتر ایک جعلی روپ دھارے رہتا ہے، اس لیے اس کے دل میں عدم کفایت اور غیر معقولیت کے خطروں کا پیدا ہونا یقینی ہے۔ ماتحتوں کی ہر پیش قدمی اسے اپنے لیے ایک خوابیدہ خطرہ نظر آئے گی۔ وہ ان میں سے کسی کو اپنے برابر یا اپنے سے اونچا ہوتا دیکھنا پسند نہیں کرے گا، ان وجوہ کی بنا پر اس کی تنقید ہمیشہ منفی تنقید ہوگی، وہ اپنے آپ کو مثبت حوصلہ افزائی کے قابل ہی نہیں پائے گا۔

دوسری طرف اساتذہ نگران کی تحریروں اور اس کے منصوبوں کے لیے کوئی حقیقی سرگرمی نہیں دکھا سکتے۔

جو نگران حضرات استادوں کی بد دلی کا گلہ کیا کرتے ہیں وہ اس نفسیاتی نکتہ کو نہیں جانتے کہ ولولہ اور سرگرمی ہمیشہ اس مقصد کے لیے ہوا کرتے ہیں جس کا تعلق انسان کے اپنے مفاد کے ساتھ ہو۔ جو مقصد اوپر سے تھوپا جائے اس کے لیے کسی سچی تڑپ کی امید رکھنا غلط ہے۔ ایسے منصوبوں پر لفظی تائید و حمایت اور واہ واہ کی بارش تو ہو سکتی ہے لیکن انہیں دلی حمایت کا سہارا نہیں مل سکتا۔ غرض روائتی طریق نگرانی استادوں اور نگران کے درمیان مغائرت کی ایک ایسی نفسیاتی دیوار حائل کر دیتا ہے جو کسی طرح عبور نہیں کی جا سکتی۔

روائتی طریق نگرانی کی تیسری بڑی خامی اس کا منفی کردار ہے، یہ درست ہے کہ ماہر سے ماہر استاد کے طریق تدریس میں بھی اصلاح کی گنجائش ہوگی، مگر اصلاح ہمیشہ مثبت طریقوں سے ہوا کرتی ہے منفی طریقوں سے نہیں۔ اگر کسی شخص کو ہمیشہ یہی بتلایا جائے کہ تم میں فلاں کمی ہے اور فلاں کمی اور اسے عملی مثال یا کسی دوسرے مؤثر طریق سے یہ کبھی نہ سمجھایا جائے کہ ان کمیوں کو دور کرنے کی کیا صورت ہے، اور کسی دوسرے استاد کے تدریسی کمال تک پہنچنے کی کیا صورت ہو سکتی ہے ..... تو رفتہ رفتہ وہ شخص بد دلی کا شکار ہونے لگے گا۔ مثبت طریق کار کوتاہیوں کی بجائے خوبیوں سے آغاز کرتا ہے، وہ اس مفروضہ کو لے کر پہلا قدم اٹھاتا ہے کہ ہر استاد میں، خواہ وہ کتنا ہی نکما کیوں نہ ہو، کچھ نہ کچھ خوبیاں بھی ضرور ہوں گی۔ اور ان خوبیوں کی موزوں حوصلہ افزائی اور تربیت سے اکثر کوتاہیوں کا بڑی حد تک ازالہ کیا جا سکتا ہے، لیکن یہ مثبت طریق کار ایک جداگانہ قسم کی نگرانی چاہتا ہے۔ ایسی نگرانی جو روائتی طریق کی سراسر ضد ہے۔

نئے تصور کا جنم

نگرانی کے نئے تصور کی جھلک یوں تو تاریخ تعلیم میں کئی جگہ نظر آئے گی۔ مگر تعلیمی رہنمائی کا موجودہ قالب بالکل حال ہی کا پیداوار ہے۔ موجودہ صدی کی دو عالمگیر جنگوں نے جہاں بے محابا تباہی کے دروازے کھولے وہاں ان سے بہت سے خوش گوار تعلیمی نتائج بھی پیدا ہوئے، ان جنگوں نے صدیوں کے سوئے ہوئے عوام کو جھنجھوڑ کر انہیں خواص کے پہلو بہ پہلو لا کھڑا کیا۔ اب قومی اور ملکی زندگی کی گتھیاں سلجھانا اکیلے خواص کی اجارہ داری نہیں رہا، بلکہ عوام کو بھی اس کام میں شریک کرنا ضروری ہے، یہ شرکت اسی صورت میں معنی خیز ہو سکتی ہے، جب مدرسہ کی تعلیم میں آزاد زندگی کی ذمہ داریاں سنبھالنے کے لیے تربیت شامل ہو۔ ایسی تربیت فقط

انہی استادوں کے ہاتھوں انجام پائے گی جنھیں خود طلبہ قابل احترام افراد کے طور پر قبول کیا جا رہا ہو۔ استادوں کی توسیع نفس بھی بالیدگی، اور وجدان خودی کے لیے سب سے ضروری شرط یہ ہے کہ وہ اپنے مسائل کو ذمہ دار افراد کے طور پر خود سوچیں سمجھیں۔ انہیں کوئی دوسرا شخص کسی نصب العین کی طرف نہ ہانکے بلکہ وہ خود اپنا نصب العین متعین کریں اور بہ طیب خاطر اس کی طرف قدم اٹھائیں۔

عہد حاضر کے ان تقاضوں نے تعلیمی نگرانی کے مفہوم کو یکسر بدل دیا ہے۔ نگراں اب نگراں نہیں بلکہ رہ نما ہے جس کی سب سے بڑی کامیابی یہ ہے کہ وہ دوسروں کو ساتھ لے کر چلنا جانتا ہو۔ اس کے لیے فقط اسی قدر کافی نہیں کہ اسے کسی بلند تر منزل کا علم ہو، بلکہ یہ بھی لازمی ہے کہ وہ دوسرے دلوں میں اس منزل کے شوق کی چنگاری سلگا سکے، اور یہ کام اس خوش اسلوبی سے انجام دے کہ منزل کے کھوج لگانے اور راہ و رسم منزل کے طے کرنے کا کام خود انہی لوگوں کے ہاتھوں انجام پائے۔

تعلیمی رہ نمائی

تعلیمی رہ نمائی کا یہ تصور ان لوگوں پر بہت شاق گذرے گا جو روایتی جبر و تحکم کے سوا نگرانی کے کوئی دوسرے معانی نہیں سمجھتے۔ وہ اپنے نقطۂ نگاہ کی تائید میں استادوں کے کئی ایک قابل افسوس رویوں کو شہادت کے طور پر پیش کریں گے اور کہیں گے کہ ان حالات میں کوئی شخص ایسے لوگوں کو اپنے حال پر کس طرح چھوڑ سکتا ہے؟ اس بحث میں وہ ایک اہم نکتہ نظر انداز کر جاتے ہیں وہ یہ کہ استادوں کے جن رویوں کی ان کو شکایت ہے وہ خود ان کے اپنے رویے کی صدائے بازگشت ہے ع

اے بادِ صبا ایں ہمہ آوردۂ تست

جہاں انسانوں میں سے چند افراد یہ فرض کرلیں کہ انہیں ہدایت کاری اور قیادت کے لیے پیدا کیا گیا ہے، اور باقی انسان اس صلاحیت سے عاری ہیں۔ وہاں اکثریت اگر ذہنی افلاس اور زبوں حالی کا شکار ہو جائے تو اس میں تعجب کی کونسی بات ہے؟ اس کے علاج کی یہ صورت نہیں کہ استبداد کی گرفت کو اور مضبوط کیا جائے۔ بلکہ اس کا صحیح مداوا یہ ہے کہ جبر و اکراہ کا سرے سے خاتمہ ہو۔ تاکہ حالات کے سدھرنے کے لیے ضروری بنیاد استوار ہو سکے۔

اس سے یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ تعلیمی نگرانی کا خاتمہ ضروری ہے۔ نگرانی بہر صورت باقی رہے گی۔ البتہ اس کا رُخ مختلف ہوگا۔ اس کے مقاصد اور طریقہ ہائے کار جدا گانہ ہوں گے، اور اسے ایک نئی سطح پر کام کرنا ہوگا۔ ہر اجتماعی عمل کے لیے ضروری ہے کہ نتائج کی آخری ذمہ داری کسی ایک فرد کے کندھوں پر ہو تاکہ یہ عمل کسی بے راہ ونشان وادی میں کھو کر نہ رہ جائے، اور اس کے نتائج کی قدر و قیمت کا تنقیدی جائزہ مسلسل ہوتا رہے۔ یہ دونوں کام تعلیمی نگرانی کے کرنے کے ہیں۔ انہیں کوئی دوسری قوت انجام نہیں دے سکتی۔ اس لیے جدید حالات میں بھی نگرانی کا وجود بالکل اسی طرح ضروری ہے جس طرح قدیم حالات میں تھا۔

غالباً یہاں یہ پوچھا جائے گا کہ جب نصب العین اور راہِ عمل طے کرنے کا کام اکیلے نگران کے ہاتھوں میں نہیں تو پھر اسے اکیلے نتائج کا ذمہ دار ٹھہرانا کس طرح روا ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ قانونی طور پر بیشک ایک ہی شخص کو ذمہ دار ٹھہرایا جا سکتا ہے۔ لیکن یہ شخص اکیلا کوئی قابلِ ذکر نتائج پیدا نہیں کر سکتا لہٰذا وہ اپنی ذمہ داری میں دوسروں کو شریک کرنا چاہتا ہے۔ اب جب تک وہ ان کو اپنے اختیارات میں شریک نہیں کرتا یہ کیسے ممکن ہے کہ وہ اس کی ذمہ داریوں کا بوجھ بٹائیں؛ ذمہ داری اور اختیار دو لازم اور ملزوم چیزیں ہیں۔ جہاں ذمہ داری بغیر اختیارات کے سونپی جائے گی وہاں لازمی نتیجہ بددلی اور بداعتمادی ہوگا۔ لیکن جوں ہی نگران استادوں کو اپنے اختیارات میں شریک کرتا ہے وہ مثلاً انہیں اپنی ذمہ داریوں میں بھی شریک کر لیتا ہے۔ اگر خدانخواستہ کوئی معاملہ بگڑ جائے تو یہ لوگ اپنے آپ کو بالکل اسی طرح ذمہ دار گردانیں گے جس طرح خاطر خواہ نتائج کی شکل میں۔ بے شمار عملی شہادتیں اس امر کی گواہ ہیں کہ جہاں نگران نے استادوں کو اپنے اختیارات میں شریک کیا۔ وہاں فوراً ذمہ داریوں کا بوجھ بھی ان تمام لوگوں پر بٹ گیا، اور سب کی متفقہ کوششوں سے ایسے نتائج پیدا ہوئے جو پہلے وہم و گمان میں بھی نہ تھے۔

تعلیمی رہنمائی دراصل ایک متحرک تصور ہے جو جدید نظریہ تعلیم کی پیداوار ہے۔ یہ تصور عمل تعلیم کی ہر سطح پر تخلیقی قوتوں کی کارفرمائی دیکھنا چاہتا ہے۔ اس کا منشا صرف یہی نہیں کہ طلبہ یا اساتذہ میں مسلسل بالیدگی پیدا ہو بلکہ وہ اس نشو و نما میں نگران حضرات کو بھی اسی طرح شریک دیکھنا چاہتا ہے۔ طلبہ، اساتذہ اور نگران، تینوں یکساں طور پر مسلسل بالیدگی کے محتاج ہیں۔ اور ان میں سے ہر ایک کی بالیدگی دوسرے کی بالیدگی کے

ساتھ وابستہ ہے۔ جہاں کسی ایک کی پیش قدمی رکی اسی وقت دوسرے ساتھیوں کا قدم پیچھے پڑنے لگا۔ نگرانی کا پرانا تصور نگران کو نشو و ارتقا کے تمام مدارج طے کیے، خیال کرتا تھا۔ جدید تصور اس بات کو سختی سے جھٹلاتا ہے۔ وہ تقاضا کرتا ہے کہ نگران بھی اسی عجز و انکسار کے ساتھ پیہم تلاش حق میں لگا رہے جس طرح عمل تعلیم کے دوسرے کل پرزے۔

اس کا یہ مطلب نہیں کہ تعلیمی رہ نما کو کوئی امتیازی مقام حاصل نہیں۔ رہ نما کا مقام لامحالہ امتیاز رکھے گا۔ مگر یہ امتیاز محض سرکاری حیثیت کی بدولت حاصل نہیں ہوگا بلکہ بلند تر خدمت کی وجہ سے سرکاری تقرری نے نگران کو جو قدم دھرنے کو جگہ دی۔ اب یہ کام اس کے طبیعی علم، پختہ تجربہ، ولولۂ عمل اور جذبۂ انکسار کا ہے کہ وہ اس کے لیے ایک حقیقی رہ نما کی جگہ پیدا کریں، اس کے بلند تر علمی اور ذہنی کمالات استادوں کی انفرادی اور اجتماعی بلندی کے لیے وقف ہوں گے۔ کیوں کہ صرف اسی طرح تدریسی کام کی خوبی میں مسلسل اضافہ ہو سکتا ہے لیکن اساتذہ کی بالیدگی کا یہ کام وعظ و تلقین یا تہدید و تخویف سے انجام نہیں پائے گا۔ نگران ایسی آزاد اور ساز فضا پیدا کرے گا جس میں استاد خود مل جل کر اپنے مسائل کے حل سوچیں اور نگران کا کام یہ ہو کہ انھیں اس کام میں ہر ممکن مدد دے اور جو فیصلے اس طرح کیے جائیں انہیں پوری قابلیت کے ساتھ نافذ کر دے۔

نگرانی کا پرانا تصور اس یقین پر مبنی تھا کہ چند افراد کی بالاتر بصیرت اور بلند تر علم انہیں ایک ایسے پسندیدہ منزل کی خبر دیتے ہیں جہاں سے نچلے لوگوں کی حد نگاہ سے بہت آگے ہے۔ اس لیے ان افراد کو یہ حاصل ہے کہ اس ضعیف نگاہ انبوہ کو ہانک کر اس بلند منزل کی طرف لے جائیں۔ اس کے برعکس رہ نمائی جدید تصور یہ ہے کہ لوگوں کو اس طور پر متاثر کیا جائے کہ وہ ایک ایسے مقصد کے لیے تعاون کریں جو خود ان اپنی نگاہ میں پسندیدہ ہو۔ رہ نما کا بنیادی کام افراد کی خداداد تخلیقی قوتوں کو نفس کے گھٹیا بندھنوں سے آزاد کر کے انھیں تعمیر کے کام پر لگانا ہے۔ انسانی فطرت کا سب سے عجیب معمہ یہی ہے کہ وہ کم درجہ قریبی مفاد کی دل دادہ ہے۔ مگر اس کے ساتھ ہی ساتھ روح کی گہرائیوں میں ایک پاکیزہ تر قوت اسے کسی بلند تر منزل کی بھی اکساتی ہے۔ عام افراد میں بھی بلندی کی یہ امنگ اگرچہ کمزور اور غیر معین سہی مگر اس کی چبھن اتنی تلخ ہوتی ہے کہ وہ پست سطح کی اکثر کامیابیوں کا لطف ختم کر دیتی ہے۔ اس لیے عوام ایسی قوت کے بھو

ہوتے ہیں جو انہیں خود اپنے گھٹیا پن سے چھٹکارا دلا کر بلند تر سطح پر قدم رکھنے کے قابل بنا دے یہ چھٹکارا دلانے والی قوت رہنما ہے۔

عملی مثالیں

تعلیمی رہنما علم و بصیرت میں اپنے پیروؤں سے بے شک بہت آگے ہوگا۔ مگر عجز و انکسار میں سب کے برابر۔ وہ دوسروں کو تعمیر کے کام میں لگا کر خود ان کے سر پر محاسب بن کر کھڑا نہیں رہے گا۔ بلکہ خود بھی ان کے ساتھ مل کر کام کرے گا۔ اس کا علم و بصیرت سب کے راستہ کو روشن کرے گا۔ اور اس کی ذاتی مثال سے دوسروں کی ڈھارس بندھے گی۔

تعلیمی رہنمائی کا مندرجہ بالا تصور کوئی خیالی تصور ہی نہیں بلکہ اس کی بیسیوں مثالیں جمہوری ملکوں میں موجود ہیں۔ امریکی مدارس میں ورکشاپ کا کام اکثر و بیشتر جاری رہتا ہے۔ اس کام میں صرف مدرس شامل نہیں ہوتے بلکہ سپرنٹنڈنٹ مدارس اور پرنسپل بھی۔ یہ تعلیمی رہنما اس نکتہ کو اچھی طرح سمجھتے ہیں کہ استادوں سے کٹ کر کسی اونچے کونے میں بیٹھے رہنے سے وہ رہنمائی کا کام انجام نہیں دے سکتے۔ ان کی کامیابی اور ناکامی اس جماعت کی کامیابی اور ناکامی کے ساتھ وابستہ ہے۔ اس ضمن میں ایک مثال کا ذکر کر دینا شاید دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ ڈین ملبی (DEAN MELBY) جو ان دنوں نیو یارک کی ایک مشہور یونیورسٹی میں شعبۂ تعلیم کے ڈین ہیں، امریکی تعلیمی حلقوں میں ایک چوٹی کے رہنما شمار کیے جاتے ہیں، ان کے متعلق ایک روز ان کے ایک پرانے رفیق کار تذکرہ کر رہے تھے، کہنے لگے کہ میں ڈین ملبی کے ماتحت کام کر رہا تھا۔ وہ مدارس کے سپرنٹنڈنٹ تھے۔ سکول بورڈ نے ان کی کارکردگی سے خوش ہو کر ان کی تنخواہ میں ۳۰۰ ڈالر سالانہ کا اضافہ منظور کیا۔ یہ اطلاع انہیں پہنچا دی گئی۔ ملبی نے فوراً اساتذہ کا جلسہ طلب کیا اور کہا کہ سکول بورڈ نے ہماری تنخواہوں میں اس قدر سالانہ اضافہ منظور کیا ہے / اسے کس طرح تقسیم کیا جائے۔ اساتذہ کی ایک کمیٹی نے اس رقم کی تقسیم کے لیے سفارشیں مرتب کیں، اور ملبی کے حصے میں کوئی پچاس ساٹھ ڈالر سالانہ آئے۔ راوی نے بیان کیا کہ ملبی نے استادوں کو اس حقیقت سے بالکل آگاہ نہیں کیا کہ یہ ساری رقم حقیقتاً ان کے اپنے لیے منظور کی گئی تھی، اور وہ ایثار سے کام لے کر دوسروں کو

اس میں شریک کر رہے ہیں۔ یہ علم خود راوی کو کئی سالوں بعد ہوا۔

ڈین علمی کی مثال اس ملک میں کوئی اکیلی مثال نہیں۔ شاید ہی کوئی یونیورسٹی یا بڑا تعلیمی ادارہ ایسا ہو، جہاں اس قسم کی تعلیمی رہ نمائی کا زندہ ثبوت موجود نہ ہو۔ کئی ایک یونیورسٹی میں ڈین ایک ایسا شعبہ تعلیم کے ڈین ہیں۔ مگر کیا مجال جو عملہ کی رائے کے بغیر کوئی کام ہو۔ حال ہی میں ایک اہم مسئلہ پر عملہ اور ڈین کی رائے میں اختلاف تھا۔ ڈین کے راستے میں ایک ذاتی مجبوری حائل تھی۔ عملے نے متفقہ طور پر اپنی رائے ظاہر کر دی۔ یہ معاملہ اب آگے یونیورسٹی کے صدر کو بھیجا جانے والا تھا۔ اگر ڈین اپنے اختلافی نوٹ کے ساتھ عملے کی سفارش کو آگے بھیجتے تو لازمی طور پر ڈین کا نقطہ نگاہ درست تسلیم کیا جاتا۔ کیوں کہ شعبۂ تعلیم کی آخری ذمہ داری ان پر ہے۔ مگر ڈین نے جب دیکھا کہ عملہ سارے کا سارا ایک طرف ہے تو انھوں نے الگ رہنا پسند نہیں کیا، اور اپنی ذاتی پسند کو پیٹھ پیچھے ڈال کر عملے کی پسند کی تائید کر دی۔

اساتذہ کیا چاہتے ہیں؟

تعلیمی رہ نمائی کے لیے ضروری ہے کہ وہ ہر وقت کان لگا کر سنے کہ استاد کیا چاہتے ہیں۔ یہ خوف کہ استاد ایسی چیزوں کی خواہش کریں گے جو ناپسندیدہ اور تعلیمی مقاصد کے منافی ہوں سراسر بے بنیاد ثابت ہو چکا ہے۔ گو ابھی ہمارے ہاں اس موضوع پر کوئی تحقیقاتی مطالعہ نہیں ہوا۔ امریکہ میں اس قسم کے کئی مطالعے کیے جا چکے ہیں، جن کے نتائج ازبس سبق آموز ہیں۔ صرف یہی نہیں بلکہ بہت سے مطالعے اس قسم کے بھی کیے گئے ہیں کہ طلبا کیا چاہتے ہیں۔ جس طرح تعلیمی رہ نمائی کی کامیابی اساتذہ کو ساتھ لے کر چلنے پر ہے، بالکل اسی طرح عمل تدریس کی کامیابی اس بات پر موقوف ہے کہ وہ طلبہ کی پسند کے مطابق ہو۔ یہ خیال ہمارے اکثر اساتذہ کو چونکا دے گا۔ کیوں کہ ان کے خیال میں طلبہ مدرسے سے دور رہنے کے سوا اور کچھ نہیں چاہتے۔ مگر یہ مفروضہ بالکل اسی طرح غلط ہے جس طرح ہمارے اکثر نگران حضرات کا یہ مفروضہ کہ اساتذہ بے کار رہنے کے سوا اور کچھ نہیں چاہتے۔ خیر یہ جملہ معترضہ تھا، جس کی طرف محض اس لیے اشارہ کیا گیا ہے کہ جس طرح استادوں کو یہ حق حاصل ہے کہ ان کے ساتھ ذمہ دار، صاحب رائے، قابل احترام افراد کا سا سلوک کیا جائے

بالکل یہی حق طلبہ کو بھی حاصل ہے۔ یہ دونوں چیزیں ایک ہی تصویر کے دو رُخ ہیں۔ اگر اساتذہ یہ چاہتے ہیں کہ انھیں بھروسہ میں لیا جائے تو خود انہیں بھی طلبہ کو بھروسہ میں لینا ہوگا۔

ہاں تو اصل موضوع کی طرف لوٹتے ہوئے دیکھیں کہ اساتذہ کیا چاہتے ہیں۔ کچھ سال ہوئے ریاست الینائے کی نارتھ ویسٹرن یونیورسٹی کے پروفیسر جے۔ ایم ہیوگز (J.M. HUGHES) نے اپنے ایک ایسے مطالعہ کے نتائج شائع کیے تھے۔ پروفیسر موصوف شعبۂ تعلیم میں کام کرتے ہیں، اور انکے گرمائی نصابوں میں ہر سال بیسیوں استاد، پرنسپل اور سپرنٹنڈنٹ شرکت کرتے ہیں۔ ایک سال انھوں نے ان لوگوں کو ایک سوال نامہ جاری کیا۔ ان جوابوں سے جو موٹے موٹے نتائج اخذ کیے گئے انہیں ذیل میں درج کیا جاتا ہے:۔

(۱) مقاصد:۔ استادوں نے اپنے کام پر منفی تنقید اور اپنی درجہ بندی کو سخت ناپسند کیا۔ اس کے برعکس اساتذہ کی بھاری اکثریت نے یہ رائے ظاہر کی کہ وہ معائنہ کرنے والے افسروں اور نگران حضرات سے یہ توقع رکھتے ہیں کہ وہ عمل تدریس کو زیادہ موثر بنانے کے لیے تعمیری مشورے دیں۔ اس سے دوسرے درجہ پر جو پسند ظاہر کی گئی وہ یہ تھی کہ استادوں کو ایسی سہولتیں اور ایسا سواد بہم پہنچایا جائے جن کی مدد سے وہ مل جل کر اپنے مسائل کے حل سوچیں، تاکہ اس عمل میں حصہ لینے والوں کی تعلیمی اور فنی بالیدگی میں اضافہ ہو۔

(۲) نظام:۔ استادوں اور نگرانی کرنے والے افسروں ہر دو نے واضح طور پر نگرانی کی ضرورت کو تسلیم کیا۔ خواہ یہ نگرانی کسی رنگ میں کیوں نہ ہو، دونوں نے اس بات پر زور دیا کہ وہ اس کے قائل نہیں کہ عمل تعلیم کی ہدایت کاری کا سا اہم کام کسی شخص کو خاص طور پر ذمہ دار ٹھہرائے بغیر انجام پا سکتا ہے۔

(۳) طریق کار:۔ استادوں اور نگرانوں دونوں نے اتفاق کیا کہ استادوں کی درجہ بندی۔ ان کے کام پر تنقید اور تعمیری مشوروں کی بہترین صورت یہ ہے کہ کام دیکھنے کے بعد استادوں کے ساتھ بالمشافہ بات چیت ہو، تاکہ وہ اپنی مجبوریوں اور مخصوص حالات کی وضاحت کرسکیں، اور ان کی روشنی میں نگران کے مشوروں کو قبول کرسکیں۔ یہ امر بے حد دلچسپ ہے کہ نظری اعتراف کے باوجود بہت کم

نگران ایسے ہوں گے، جو عملی طور پر معائنہ کے بعد بالمشافہ بات چیت کا موقع دیتے ہوں۔ اس بات کو دیکھتے ہوئے یہ نتیجہ غالباً درست ہے کہ معائنوں سے کچھ زیادہ تعمیری فائدہ حاصل نہیں ہوتا طریق کار کے متعلق استادوں کی دوسری پسند یہ تھی کہ انہیں تازہ ترین تحقیقاتی اور فنی لٹریچر بہم پہنچایا جائے، اور انھیں ایسے موقعے دیے جائیں کہ وہ اپنے مخصوص مضمون میں جماعتی مطالعہ کا بندوبست کر سکیں تاکہ بہت سے ساتھیوں کے مختلف نقطہ ہائے نگاہ کے باہم ملنے سے نئے نئے نکتے پیدا ہوں اور تمام حصہ لینے والوں کی نگاہ میں کشادگی آئے۔

خاتمہ کلام

مندرجہ بالا تحقیقاتی مطالعہ سے یہ بات روشن ہوجاتی ہے کہ اساتذہ نگرانی کا خاتمہ نہیں چاہتے۔ وہ اس کے وجود کو ناگزیر سمجھتے ہیں۔ مگر اس کے مقاصد اور طریق کار میں تبدیلی چاہتے ہیں۔ وہ اس بات کو سخت ناپسند کرتے ہیں کہ نگران حضرات کی ساری کوشش اور توجہ صرف نکتہ چینی پر ہی صرف ہو، اور وہ اصلاح حال کے لیے نہ تو دوبدو بات کریں۔ نہ خود بہتر نمونہ تدریس پیش کرکے دکھائیں۔ اور نہ تعلیمی مواد اور لٹریچر کی بہم رسانی میں کوئی مدد دیں غرض جوں جوں تعلیم کے نئے تصور کا چرچا عام ہوتا جا رہا ہے، استادوں کا یہ مطالبہ شدت پکڑتا جا رہا ہے کہ نگرانی کا واحد مقصد تخلیقی رہ نمائی ہو، اور بس۔

ترقی یافتہ ملکوں میں تعلیمی نگرانی بہت بڑی حد تک تخلیقی رہ نمائی کی صورت اختیار کر چکی ہے۔ ہمارے ہاں ابھی صورت حال بہت مختلف ہے، اور نگرانی کا کام بہت کچھ پرانے ڈھب پر چل رہا ہے۔ اس کی ایک وجہ خود استادوں کی بےحسی ہے۔ وہ تعلیم کے جدید متحرک تصور سے بےخبر ہیں۔ وہ اپنے بلند معاشری مقام سے آگاہ نہیں۔ ان میں مسلسل بالیدگی کا ولولہ نہیں۔ یہ درست ہے کہ خود نگران حضرات کو عہد حاضر کے تقاضوں کا پاس کرنا چاہیے اور تعلیمی رہ نمائی کے میدان میں اولیت ان کی طرف سے ہونی چاہیے۔ لیکن اگر ایسا نہ ہو تو اساتذہ کی بیداری انہیں ایسا کرنے پر مجبور کر سکتی ہے۔

آج ہمیں تعلیم۔ تدریس اور تعلیمی رہ نمائی کے جدید نظریوں کو دوسرے ملکوں میں حکمران دیکھکر

ان ملکوں کی خوش بختی پر رشک آتا ہے، اور اپنے ذہنی افلاس پر افسوس۔ یہ افسوس اس لیے اور بھی زیادہ شدید ہو جاتا ہے کہ انسانی اخوت اور مساوات کا یہ سبق دنیا نے سب سے پہلے ہماری ہی زبان سے سنا تھا لیکن آج ہمارے ہاں جن اقدار کی عملی حکمرانی ہے، وہ اخوت و مساوات کی ضد ہیں۔ اور ہم دوسروں کی مثال سے اپنا بھولا ہوا سبق یاد کرنے کے لیے جتن کر رہے ہیں۔ ؎

غنی روزِ سیاہِ پیرِ کنعاں را تماشہ کن
کہ نورِ دیدہ اش روشن کند چشمِ زلیخا

ترقی یافتہ ملکوں میں ترقی پسند تعلیم کی راہ میں پہلا قدم اٹھانے والے لوگ مدرسوں کے استاد نہیں تھے بلکہ ان کے انتظامی افسر۔ امریکہ میں ترقی پسند تعلیم کو رواج دینے کا سہرا چند ایک سپرنٹنڈنٹ مدارس کے سر ہے جنہوں نے تعلیمی رہنمائی کے باطل تصور کو ٹھکرا کر اس جگہ حل جلی کر کام کرنے اور تخلیقی رہنمائی کے اصولوں کو رہنمائی کا اصل مقصد قرار دیا۔ پسماندہ معاشروں میں یہ بات اور بھی ضروری ہو جاتی ہے کہ اصلاح و تجدید کا کام چوٹی سے شروع ہو؟

اسلامیات کی تدریس

ادریس احمد

آج کل اسلامیات بطور ایک اختیاری مضمون کے ہماری یونیورسٹی تعلیم میں شامل ہے مڈل سکول کے نصاب میں بھی اسے جگہ دی گئی ہے، اس مضمون کے پڑھانے کی غایت یہ ہے کہ طلبہ کو اسلام کی بنیادی تعلیمات اور تاریخ کے بڑے بڑے واقعات سے آگاہ کر دیا جائے۔ پیشتر اس کے کہ اس نئے مضمون کے اغراض و مقاصد اور اس کے طریقۂ تدریس پر بحث کی جائے۔ ضروری ہوگا کہ معاملہ کے تاریخی پس منظر کو اچھی طرح دیکھ لیا جائے۔

عیسائیت۔ بدھ مت اور اسلام اس وقت تینوں عالمگیر مذاہب ہیں۔ مگر ان میں اسلام ہی صرف ایک ایسا مذہب ہے جو انسانی زندگی کے تمام گوشوں کو ایک جامع ضابطہ کے تحت لے آنا چاہتا ہے۔ عیسائیت نے پہلے دن سے ہی آسمانی بادشاہت سے سروکار رکھا۔ اور دنیاوی جھمیلوں کو درخور اعتنا نہ سمجھا۔ یہ اسی تعلیم کا نتیجہ تھا کہ اس مذہب کے دور اول میں ہی اس مشہور سیاسی عقیدہ نے جنم لیا جو دو تلواروں کے نظریے کے نام سے مشہور ہے، اور جس کا منشا یہ ہے کہ روحانی اور دنیاوی سیادت دو جداگانہ تلواریں ہیں جن میں سے ہر ایک کا مقام الگ ہے اور ایک کو دوسری سے کچھ علاقہ نہیں۔ لیکن گو نظری طور پر یہ تفریق تسلیم کر لی گئی۔ عملاً اس کا برقرار رکھنا کبھی ممکن نہ ہو سکا۔ پادریوں اور بادشاہوں کے درمیان تفوق کے لیے لگاتار جھگڑے چلتے رہے، اور ان کا خاتمہ صرف اس وقت ہوا جب دور حاضر کی مادی تہذیب نے مذہبی اور روحانی طاقتوں کو بظاہر ہمیشہ کے لیے اپاہج بنا کر انہیں ایک ثانوی درجہ دیدیا۔ قریباً قریباً یہی حال بدھ مت کا ہے۔ یہ درست ہے کہ عیسائیت کے برعکس یہ مذہب بہت جلد حکمرانوں کا مذہب بن گیا تھا۔ لیکن اس سے اس مذہب کی حقیقی روح میں کچھ فرق نہیں آنے پایا۔ اشوک جیسے باقتدار راجہ کی بیٹی بھی مذہب میں بلند مقام اسی وقت حاصل کر سکتی تھی

جب وہ دنیا کو تیاگ کر بھکشوؤں میں شامل ہو جاتی ہے۔ عہد حاضر میں جاپان نے بدھ مت کا پیرو ہونے کے باوجود حیرت انگیز مادی ترقی کی تھی۔ لیکن واقف حال لوگوں کو علم ہے کہ عسکریت نواز جاپان کے حکمرانوں کو بدھ مت سے کچھ لگاؤ نہ تھا۔

اس کے برعکس اسلام پہلے دن سے ہی روحانیت اور سیاست دونوں میدانوں پر حاوی تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نہ صرف مسلمانوں کے روحانی ہادی و پیشوا تھے۔ بلکہ ان کے سیاسی سردار اعلیٰ بھی۔ سچ یہ ہے کہ اسلام نے ساری اجتماعی زندگی کی بنیاد ان اخلاقی اور روحانی اقدار پر رکھی ہے جن کو وہ اٹل قرار دیتا ہے۔ آں حضرت صلعم کے بعد خلفاء نے بھی روحانی اور سیاسی زندگی کی وحدت کو قائم رکھا۔ اور گو خلفائے راشدین کے بعد خلافت بادشاہت میں بدل گئی۔ لیکن سیاسی اور روحانی زندگی کا اتحاد بدستور باقی رہا۔ کیوں کہ اس کے خلاف قدم اٹھانا اسلام کی روح کے خلاف بغاوت کرنا ہوتا۔ یہ اسی چیز کا صدقہ تھا کہ ہماری تاریخ کے جابر سے جابر اور بڑے سے بڑے حکمران بھی قرآن، حدیث اور فقہ سے باخبر ہونے پر مجبور تھے۔ عبدالملک اموی کے متعلق مشہور ہے کہ جب مروان مر گیا اور اسے مسند خلافت کی خوشخبری دینے کے لیے آدمی بھیجا گیا تو وہ مسجد میں بیٹھا قرآن مجید پڑھ رہا تھا۔ اسی طرح دوسرے بڑے بڑے اموی اور عباسی خلفاء کی دین سے آگہی تاریخی طور پر مسلم ہے۔ برصغیر پاک و ہند پر نگاہ ڈالیں تو یہاں بھی یہی شے نظر آتی ہے۔ محمود غزنوی کا سا بے عدیل سپہ سالار حافظ قرآن اور فقہ کا عالم ہے۔ علاؤالدین خلجی کا سا باجبروت بادشاہ بے چون و چرا علمائے دین کی رائے کے آگے گردن جھکا دیتا ہے۔ محمد تغلق کی دینداری کا یہ حال ہے کہ موت سے صرف کچھ دن پہلے باوجود کہ سندھ کی مہم میں مشغول ہے عاشورہ کا روزہ قضا نہیں ہونے دیتا۔ شیر شاہ سوری کو دیکھتے ہیں کہ جوانی کے کئی سال خانقاہوں اور دینی درس گاہوں میں صرف کرتا ہے۔ تاکہ علوم دینی کا اکتساب کر سکے۔ بابر کی اولاد میں اورنگ زیب عالمگیر کی دینداری سے کون بے خبر ہے؛ غرض اسلام نے دینی اور دنیاوی زندگی میں جو گہرا ربط پہلے دن سے قائم کیا تھا، وہ صدیوں تک باقی رہا۔ تاآں کہ مغرب سے مادیت کی ایک ایسی تیز و تند آندھی اٹھی جس نے اس شیرازے کو بری طرح منتشر کر دیا۔ کچھ عرصہ تک مسلمان نے کوشش کی کہ وہ بھی مغرب کی تقلید میں

اپنے دین اور دنیا کو الگ الگ کر سکے۔ لیکن یہ بات ان ہونی تھی کیوں کہ اسلام کو چھوڑے بغیر اس چیز پہ عمل محال تھا۔ رفتہ رفتہ حالات زمانہ نے کروٹ بدلی۔ آج مغرب کو بھی مذہب کی اہمیت کا احساس ہو رہا ہے اور آزادی کی فضا نے ہمیں پھر سے موقع دیا ہے کہ اپنی قومی زندگی کی تعمیر اپنی ثقافتی روح کے تقاضوں کے مطابق کر لیں۔ چناں چہ قیام پاکستان کے فوراً بعد کراچی میں جو تعلیمی کانفرنس منعقد ہوئی اس نے تعلیم کے نصب العین کا ذکر کرتے ہوئے کھلے کھلے الفاظ میں اس بات کی وضاحت کر دی تھی کہ ہم تعلیم کے ذریعہ سے سچی اسلامی اقدار کو پھر سے زندہ کرنا چاہتے ہیں۔ اگر چہ اس نصب العین کی طرف بڑی دھیمی رفتار سے پیش قدمی ہوئی ہے، لیکن اس میں کلام نہیں کہ پیش قدمی ہوئی ضرور ہے۔ ہمارے مدرسوں اور کالجوں میں دینیات کی تعلیم کا اجرا اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ اسی طرح جامعہ پنجاب میں شعبہ اسلامیات بھی اسی سمت میں ایک قدم ہے۔

دینی علوم کی اہمیت

اسلام نے ہر قسم کے علوم کا حاصل کرنا ہر مسلمان مرد اور عورت پر فرض قرار دیا ہے۔ لیکن چوں کہ وہ روحانی اور اخلاقی اقدار کو زندگی کی اٹل بنیادیں قرار دیتا ہے، اس لیے اس نے قدرتی طور پر دینی علوم پر زور دیا ہے۔ چناں چہ ایک مشہور حدیث میں مذکور ہے کہ علم کی دو شاخیں ازبس اہم ہیں۔ یعنی علم دین اور علم طب۔ فاروق اعظمؓ کے متعلق روایت ہے کہ فتوحات کے زمانے میں جب کسی کو مفتوحہ علاقہ میں دین کی اشاعت کے لیے روانہ فرماتے تو سختی سے تائید کرتے کہ دیکھو لوگوں کو قرآن کی سیدھی سادھی تعلیم کے سوا دوسرے بکھیڑوں میں مت الجھانا۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ دینی تعلیم ہی سب کچھ ہے اور اس کے علاوہ باقی علوم غیر ضروری ہیں۔ قرون اولیٰ کے مسلمانوں نے اس نکتہ کو جس طرح سمجھا اس کی عملی تفسیر اس قسم کے مفروضہ کو غلط ثابت کرنے کے لیے کافی ہے۔ بات اصل میں یہ ہے کہ دین فطرت ہونے کے باعث اسلام بنیادی امور پر زور دیتا ہے۔ کیوں کہ وہ جانتا ہے کہ اگر یہ اچھی طرح طے پا گئے تو ثانوی نتائج خود بخود برآمد ہوں گے۔ یہ اسی نکتہ کے سمجھنے کا نتیجہ تھا کہ صحرا نشین عرب صرف ایمان و یقین کی روشنی لے کر اٹھے، اور چند ہی سالوں میں تمام معلومہ علوم کے میدان میں باقی دنیا سے آگے نکل گئے۔ ان کی روز افزوں سیاسی قوت

جس حد تک ان کے جوش ایمان کا نتیجہ تھی اس حد تک ان کے بالاتر علم کا بھی۔ انہوں نے جلد ہی بری بحری فوجی قوت اور ملکی انتظام کے متعلق ایک ایسی تکنیک مکمل کر لی جو اس وقت کسی مخالف قوت کے پاس موجود نہ تھی۔

سیاسی غلبہ سے نظر اٹھا کر جب ہم علمی دنیا پر نگاہ ڈالتے ہیں تو یہاں بھی یہی کرشمہ کارفرما نظر آتا ہے عباسی عہد کے اوائل میں ہی اسلام یونانی علم و حکمت کے ذخیروں سے دوچار ہوتا ہے۔ لیکن ذہن انسانی کے یہ عظیم الشان کارنامے اسلام کی پریشانی کا باعث ہونے کی بجائے اس کی حقانیت کو واضح تر کرنے کا سبب بنتے ہیں۔ اس کی وجہ اس کے سوا کچھ نہ تھی کہ اس عہد کے مسلمان عقیدہ توحید میں زندہ ایمان رکھتے تھے، یہ یقین ان کی نس نس میں رچا ہوا تھا کہ کارخانہ عالم کی ہر شے حکمت الہی کی تفسیر ہے۔ اس لیے اس کا کھوج لگانا اور اسے موضوع بحث و تحقیق بنانا عین منشائے دین ہے۔ اس ضمن میں زیادہ لمبی چوڑی تفصیلات میں جانے کی ضرورت نہیں۔ صرف اسی قدر کہہ دینا کافی ہے کہ عین جس طرح مسلمانوں کو سیاسی غلبہ عطا کرنے والی اصل شے ان کا سچا دینی شعور تھا، اسی طرح انہیں علمی معراج پر پہنچانے والی قوت بھی یہی تھی۔ غرضیکہ سچی اسلامی زندگی کی بنیاد ایسی روحانی اور اخلاقی اقدار پر ہے جو ہر قسم کی بلندی کی مکمل طور پر ضامن ہیں۔ اگر خدانخواستہ ہماری زندگی اس بلندی سے محروم ہے تو سمجھ لینا چاہیے کہ ہم جن چیزوں کو اسلامی اقدار خیال کر رکھا ہے وہ فی الحقیقت کوئی اور شے ہیں۔ ایسی صورت میں یہ ازبس ضروری ہو جاتا ہے کہ قوم کے روشن دماغ لوگ دین کے سرچشموں کو خود اپنی آنکھوں سے دیکھیں، تاکہ اصلاح حال کی راہ آسان ہو جائے۔

بیسویں صدی کے تقاضے

یوں تو موجودہ صنعتی تمدن کے آغاز سے ہی دنیا میں دوررس معاشرتی انقلابات شروع ہو گئے تھے، لیکن موجودہ صدی کی پہلی چند دہائیوں میں ان کی رفتار اور ان کی گیرائی دونوں میں اس تیزی کے ساتھ اضافہ ہوا ہے کہ تاریخ عالم میں اس کی مثال موجود نہیں۔ اس کا نتیجہ ایسے الجھے ہوئے معاشرتی مسائل کی شکل میں نمودار ہوا ہے، جن کا حل ذہن انسانی کے لیے بہت بڑی آزمائش بن رہا ہے۔ ان مسائل میں سے ایک بہت بڑا مسئلہ ہر قسم کے انسانی تعلقات کی روز افزوں وسعت کا ہے۔ پہلے وقتوں میں شہروں کی آبادی ہزاروں تک پہنچا کرتی تھی۔ آج ایسے شہر بھی موجود ہیں جن کی آبادی لاکھوں چھوڑ کروڑ کے لگ بھگ پہنچی ہے۔

اس مسئلہ نے دوہری مشکل پیدا کر دی ہے۔ ایک طرف تو باہم کام کرنے والوں میں جذبات رفاقت اور ہمسائگی کی بجائے بیگانگی پیدا ہو گئی ہے اور دوسری طرف ان پُر ہیبت نظاموں کے چلانے والوں اور ان کے ماتحتوں کے درمیان انسانی رشتوں کی لطافت ختم ہوتی جا رہی ہے۔ اسی طور پر بڑے بڑے پُر ہجوم شہروں میں بسنے والے لوگ ان جذبات ہمسائگی سے بیگانہ ہوتے جا رہے ہیں جنہوں نے اب تک معاشری زندگی کے تانے بانے کو یکجا کیے رکھا تھا۔ آج حالت یہ ہے کہ ایک چھوٹے قصبے کے باشندے جس کی آبادی صرف چند ہزار پر مشتمل ہو ایک دوسرے کو اچھی طرح جانتے ہیں، اور باہمی ذمہ داریوں اور پرانی روایات کا احساس ان کے اعمال اور افعال کا قدم قدم پر محاسبہ کرنے کو موجود رہتا ہے۔ لیکن ایک بڑے شہر کا بسنے والا عموماً اپنے آپ کو بالکل اسی طرح یکا و تنہا محسوس کرتا ہے جس طرح صحرائے اعظم میں کھویا ہوا راہگیر۔ اس کے اعمال و افعال کے محاسبے کے لیے پولیس کے سوا کوئی اور قوت موجود نہیں اور چونکہ پولیس کی نگاہ زندگی کے ہر گوشے تک پہنچنی محال ہے۔ اس لیے آج صنعتی تمدن کے لیے یہ مسئلہ بہت بڑا درد سر بن رہا ہے کہ پُر ہجوم معاشروں کے شہریوں کو اخلاقی ذمہ داریوں کا احساس کیونکر دلایا جائے، تاکہ وہ اپنے حقوق کے ساتھ ساتھ اپنے فرائض اور دوسروں کے حقوق کا صحیح شعور بھی پیدا کر لیں۔

دور حاضر کا دوسرا مشکل مسئلہ صدیوں کے سوئے ہوئے عوام کی بیداری ہے۔ دنیا میں ہر جگہ اب آزادی اور حق خود ارادیت کا چرچا ہے۔ اور پسماندہ سے پسماندہ ملکوں کے لوگ بھی اپنے گھر کے خود مالک بننا چاہتے ہیں۔ یہ امر بذات خود بہت پسندیدہ ہے۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ عوام کے نام پر اقتدار کا مطالبہ کرنے والے لوگ ہر جگہ اقلیت میں ہوتے ہیں، اور جب تک عوام میں ایسی بیداری اور بے باکی پیدا نہ ہو کہ وہ ہر صاحب اقتدار سے جرأت کے ساتھ باز پرس کر سکیں، اس وقت تک یہ خطرہ بالکل حقیقی ہے کہ غیر ملکی حکمرانوں کے جانشین وہ مٹھی بھر ملکی لوگ بن جائیں گے جو عوام کو آلۂ کار بنا کر اپنی مخصوص اغراض کی نگہداشت کریں گے۔ جدید معاشری زندگی کے یہ خطرے کسی خاص ملک یا کسی خاص سیاسی نظام کے ساتھ وابستہ نہیں۔ یہ اشتراکی اور سرمایہ دارانہ نظام دونوں میں موجود ہیں۔ سیاسی اور معاشی قوت کا ارتکاز عہد حاضر کا ایک ایسا خاصہ ہے جس کی کارفرمائی ہر جگہ یکساں ہے۔ غیر صنعتی اور غیر ترقی یافتہ ملکوں میں گو یہ شے نمایاں نظر نہیں آتی۔

لیکن یہاں بھی اس کی پیش قدمی بالکل حقیقی ہے۔

ان خطروں کی روک تھام کے لیے مغرب نے جمہوری نظام کا نسخہ تجویز کیا ہے۔ لیکن تجربے نے یہ بات ثابت کر دکھائی ہے کہ اس نسخے کے شافی ہونے کے لیے بہت سی شرائط کا موجود ہونا ضروری ہے۔ اسے آنکھیں بند کیے ہر جگہ استعمال نہیں کیا جا سکتا۔

ہمارے لیے مسئلے کی نوعیت

جدید معاشری زندگی کے جن تقاضوں کا اوپر ذکر گزرا ہے وہ صرف مغربی ملکوں کے لیے ہی مخصوص نہیں دور حاضر کی سب سے نمایاں خصوصیت دنیا کے مختلف گوشوں کا بڑھتا ہوا قرب و انحصار ہے۔ مہذب دنیا کا کوئی حصہ ایسا نہیں جو عالمگیر معاشری رجحانات سے الگ تھلگ رہ سکتا ہو۔ سیاسی، معاشی اور صنعتی قوتیں ہر جگہ تیزی سے متحرک ہو رہی ہیں۔ اسی طرح عالم اسلام میں ہر جگہ آزادی کی تحریکیں زوروں پر ہیں۔ بعض اسلامی ممالک غلامی کی زنجیریں کاٹ چکے ہیں اور بعض اس کے لیے ہاتھ پاؤں مار رہے ہیں۔ لیکن آزادی حاصل کرنے سے زیادہ کٹھن کام عوام کو سچے معنوں میں اس آزادی میں شریک کرنا ہے۔ ان معاشری اور سیاسی مشکلوں کے حل کی ابتک یہی صورت رہی ہے کہ اسلامی ممالک نے مغربی جمہوری اداروں کو اپنے ہاں مروج کیا۔ مغربی سیاست دانوں کا عام عقیدہ یہ ہے کہ یہ جمہوری ادارے کسی قوم میں سچی جمہوری روح پھونکنے کا مؤثر ترین ذریعہ ہیں، اور پسماندہ اقوام بھی مغرب کی بالادستی سے اسقدر متاثر ہیں کہ وہ اس چیز کو عام طور پر سیاسی حکمت کا نچوڑ خیال کرتی ہیں۔ اسلامی ملکوں میں ہر جگہ یہی ہوا ہے، اور آج پاکستان بھی بڑی شد و مد سے مدعی ہے کہ وہ اپنے ہاں جمہوری طرز زندگی کو فروغ دینا چاہتا ہے۔

یہ بات ماننی پڑے گی کہ سچی جمہوری روح اسلام سے بہت قریب ہے کیونکہ اسلامی تعلیمات کا نچوڑ انسانی ہمدردی، اخوت، مساوات اور رواداری کے سوا کچھ نہیں۔ جمہوری نظام بھی قریباً قریباً انہی مقاصد کو پیش نظر رکھتا ہے۔ لیکن جہاں مغربی حکمت نے ان مقاصد کے حاصل کرنے کا ذریعہ بعض مخصوص قسم کے اداروں کو قرار دیا ہے، وہاں اسلام نے ان کے حصول کا واحد ذریعہ خوف خدا کو سمجھا ہے۔ خدائے واحد کی ربوبیت، اس کی رحمت اور اس کی عدالت پر زندہ ایمان پیدا کرنے سے اسلام انسان کی انفرادی اور

اجتماعی زندگی کی تمام گتھیوں کو بہترین طریق پر سلجھا دینا چاہتا ہے۔ گویا اسلام کو ہماری سیاسی زندگی کی ہیئت سے اس قدر واسطہ نہیں جس قدر اس کے مقاصد کے ساتھ۔ دانش مغرب نے جہاں ظاہری اشکال کو اہمیت دی ہے وہاں اسلام نے عملی روح کو۔ اسلام کا یہ دعویٰ کوئی لفظی دعویٰ نہیں، بلکہ اس کی عملی تفسیر تاریخ کے صفحوں میں موجود ہے۔ روم اور ایران کی جابر شہنشاہیتوں کو ختم کر کے اسلام نے جس پر عدل اور رواداری نظام زندگی کی بنیاد ڈالی تھی۔ اس کی مثال تاریخ نے آج تک نہیں دیکھی۔ اس ضمن میں یہ کہنا بالکل عبث ہے کہ اس زمانے کے معاشری حالات بالکل جداگانہ تھے، اس لیے جو نظام زندگی اس وقت کامیاب تھا وہ اس وقت کامیاب نہیں ہو سکتا، یہ وضاحت پیچھے گذر چکی ہے کہ اسلام نے سیاسی اداروں کی ہیئت کو متعین نہیں کیا۔ عرب کے صحرانشینوں نے روم و ایران کے سیاسی اداروں میں ہی کچھ ردوبدل کر کے ان میں روح انقلاب کو پھونک دیا تھا۔ اور نتائج پورے طور پر معجز نما تھے۔ آج اسلامی دنیا کو یہ بھولا ہوا سبق پھر سے ازبر کرنے کی ضرورت ہے۔ آج مسلمانوں کو یہ ذہن نشین کرنے کی ضرورت ہے کہ ان کی اجتماعی زندگی کی فلاح صرف مغربی اداروں کے اپنانے میں نہیں، بلکہ انھیں اپنانے کے بعد ان میں بھی روح پھونکنے میں ہے جب تک اسلامی دنیا یہ صلاحیت پیدا نہیں کر لیتی، اس وقت تک جمہوری یا اشتراکی نظام میں سے کسی ایک کے ساتھ دل بستگی پیدا کرنے سے کچھ نہ بنے گا۔

طلبہ کو اسلامی روح سے باخبر کرنے کی ضرورت

اس تجزیہ سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ آج دنیائے اسلام کی سب سے بڑی ضرورت یہ ہے کہ نئی پود کو اسلام کی سچی روح سے باخبر کیا جائے۔ انہیں یہ بات اچھی طرح ذہن نشین کرا دی جائے کہ دینی احکام اور عبادات کے پیچھے ایک خاص روح کام کر رہی ہے جو اصل مقصود ہے۔ جب تک ہم اس روح کو اپنے عملی کردار کا جزو نہیں بناتے۔ اس وقت تک عبادات کا اصل مقصد پورا نہیں ہوتا۔ اس اہم ضرورت کو پورا کرنے کے لیے ضروری ہے کہ دینی تعلیم نصاب تعلیم کا لازمی حصہ قرار پائے۔ لیکن یہ تعلیم محض چند عربی عبارات کے رٹوا دینے یا چند رسوم کا عادی بنا دینے پر ختم نہ ہونی چاہیے۔ بلکہ جیسا اوپر کہا جا چکا ہے اس کا مقصد ان الفاظ و رسوم کی روح تک پہنچنا ہونا چاہیے۔

اس وقت اسلامیات ہمارے اکثر مدارس میں پڑھائی جاتی ہے۔ لیکن امتحان میٹرک میں ابھی اسے کوئی جگہ نہیں ملی۔ ظاہر ہے کہ جب تک اسے ایک لازمی مضمون قرار نہیں دیا جائے گا اس وقت تک اسے وہ توجہ نہ ملے گی جس کے بغیر خاطر خواہ نتائج کا برآمد ہونا محال ہے۔ کالجوں میں اسلامیات کو بطور ایک اختیاری اور زائد مضمون کے رائج کیا گیا ہے، لیکن یہ صورت حال بالکل غیر تسلی بخش ہے۔ پہلے یہ حیثیت اردو کو حاصل ہوا کرتی تھی، اور کالجوں کا تجربہ رکھنے والے لوگوں کو معلوم ہے کہ کس طرح یہ امر اردو کے لیے فائدہ رساں ہونے کی بجائے الٹا اس کی تدریس کو پست بنانے کا موجب تھا۔ دینیات کے بارے میں یہ صورت حال ازحد افسوس ناک ہے۔

مقاصد اور طریق کار

اوپر یہ کہا جا چکا ہے کہ اسلام معاشری زندگی کے مختلف اداروں کے بارے میں کوئی بندھی ٹکی حدیں مقرر نہیں کرتا۔ وہ سیاسی اور معاشی نظاموں کی کسی مخصوص شکل کا دل دادہ نہیں۔ اسے محض اس بات سے سروکار ہے کہ ان نظاموں کو کس جذبہ اور کس نگاہ سے چلایا جاتا ہے۔ وہ انفرادی اور اجتماعی زندگی میں ایک مخصوص جذبہ کو کارفرما دیکھنا چاہتا ہے۔ وہ سارا زور اس بات پر صرف کرتا ہے کہ انسان تمام دنیاوی امور کو ایک خاص نقطہ نگاہ سے دیکھیں۔ جب یہ جذبہ اور یہ نگاہ پیدا ہو جاتی ہے تو انفرادی اور اجتماعی زندگی کے تمام معاملات خود بخود اعتدال کی راہ پر آ جاتے ہیں۔ یہ نتیجہ پیدا کرنے کے لیے ضروری ہے کہ معاشرے کے تمام یا کم از کم بیشتر افراد اس جذبہ اور اس نگاہ کے مالک ہوں۔ محض ایک مٹھی بھر جماعت پر بھروسہ کرنا بے کار ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام نے یہ کبھی نہیں چاہا کہ دین کو سمجھنے اور اس کی قیادت کرنے کے لیے کسی ایک فرقہ کو مخصوص کر دیا جائے۔ وہ اس فرض کو ساری قوم کے ذمہ لگاتا ہے۔ چناں چہ جن مومنوں کو دینی اور دنیوی سرخروئی کی بشارت دی گئی ہے، ان کے متعلق صاف صاف الفاظ میں وضاحت موجود ہے کہ "وہ لوگ ایسے ہوں گے جو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا حکم دیں گے۔ اور اللہ کی مقرر کی ہوئی حدوں کی حفاظت کریں گے"۔ گویا سربلندی اس قوم کے لیے مخصوص ہے جو نہ صرف اخلاقی اور روحانی طور پر پسندیدہ اور غیر پسندیدہ افعال سے اچھی طرح باخبر ہے۔ بلکہ جس کے افراد ہر وقت اس بات پر تلے رہتے ہیں کہ پسندیدہ اعمال کو نافذ کیا جائے اور

اور غیر پسندیدہ افعال کو دبا دیا جائے۔ اسلام کی اسی امتیازی تعلیم کا نتیجہ تھا کہ صدیوں تک مسلمانوں نے امور دنیا کے ساتھ ساتھ دین سے آگاہ رہنا بھی ضروری سمجھا۔ بدقسمتی سے دور انحطاط میں ہماری قومی زندگی یہ امتیازی وصف باقی نہ رکھ سکی۔ اس دور میں دینی علوم اور علوم جدیدہ کی تعلیم و تربیت الگ الگ نہجوں پر ہونے لگی، اور رفتہ رفتہ دونوں کے نقطہ ہائے نگاہ میں بُعد پیدا ہو گیا۔ یہ چیز ہماری قومی روح کی صحت مندی کے لیے ازبس نقصان دہ ہے کیونکہ اسلام میں دین و دنیا دو متضاد چیزیں نہیں، بلکہ ایک ہی تصور کے دو رُخ ہیں۔ ہمارے ہاں ایک کے بغیر دوسرے کا مکمل ہونا محال ہے۔ ان حالات میں یہ امر بعید ضروری ہے کہ جدید علوم کے طلبہ دینی سرچشموں سے آشنا ہوں اور دینی علوم کے طلبہ جدید سائنسی ترقیوں سے باخبر رہیں۔ امید ہے کہ مدرسوں اور کالجوں میں دینیات کے لازمی قرار دینے اور پاکستانی جامعات میں علماء کے لیے پوسٹ گریجوایٹ نصاب رائج کرنے سے یہ دونوں غائتیں حاصل ہو جائیں گی۔

طریق کار کے سلسلہ میں یہ بات بہت اہم ہے کہ طلبہ محض اسلامی تعلیمات کو الفاظ کی شکل میں ہی نہ سنیں، بلکہ مدرسہ کے ماحول میں انہیں ان کی کارفرمائی بھی نظر آئے۔ اسلامی اخوت، مساوات عدل و انصاف اور رواداری انہیں تعلیمی زندگی کے ہر پہلو میں نظر آئے۔ اس چیز کی ذمہ داری اساتذہ اور افسران انتظام ہر دو پر عائد ہوتی ہے۔ دینیات کی تدریس کے سلسلے میں دوسری ضروری احتیاط یہ ہونی چاہیے کہ یہ کام کسی مخصوص استاد کے ذمے نہ لگا دیا جائے۔ بلکہ مدرسہ کا ہر مسلم استاد دوسرے مضامین پڑھانے کے ساتھ دینیات بھی پڑھائے۔ اس سے نہ صرف تدریس میں تاثیر پیدا ہو گی، بلکہ یہ اقدام اس افسوسناک بُعد کو بھی ختم کرنے والا ہو گا، جو ہم نے دینی اور دنیاوی علوم میں مصنوعی طور پر پیدا کر رکھا ہے۔

غرض اسلامیات کی تدریس کو اگر مدرسوں اور کالجوں میں صحیح طور پر مروّج کر دیا گیا تو یہ امر نہ صرف ہماری ثقافتی سالمیت کے لیے ازبس مفید ہو گا۔ بلکہ یہ ہمارے ان بہت سے معاشرتی مسائل کا حل بھی کر دے گا جو جدید صنعتی تمدن کی وجہ سے پیدا ہو رہے ہیں۔ اور جن کے حل کے لیے ہم اکثر مغرب سے رہنمائی حاصل کرنے کے عادی ہو چکے ہیں۔ اس تعلیم سے ہمارے نوجوانوں میں وہ نگاہ پیدا ہو سکے گی جو انہیں جدید زندگی کے ساتھ اچھی طرح نباہ کرنے کے قابل بنا دے گی۔

ایک اہم سوال

دینیات کی تعلیم کے بارے میں ایک بہت بڑی احتیاط کی ضرورت ہے اور وہ ہے فرقہ بندی سے اجتناب۔ یہ امر ازحد ضروری ہے کہ نئی پود کو صرف ایسی بنیادی تعلیم دی جائے جو تمام فرقوں کے لیے یکساں اور پر خشت اول کا درجہ رکھتی ہو۔ اس ضمن میں ہمیں یہ بات نہ بھولنی چاہیے کہ مسلمانوں کے مختلف فرقوں میں جو اختلافات ہیں وہ زیادہ تر فروعی ہیں۔ توحید۔ رسالت۔ اخوت۔ مساوات اور رواداری جیسے بنیادی اصولوں کے بارے میں ہمارے درمیان کبھی کوئی اختلاف پیدا نہیں ہوا۔ چونکہ ہم اپنے مدرسوں اور کالجوں میں انہی بنیادی اسلامی اصولوں کی تعلیم دینا چاہتے ہیں۔ اس لیے یہاں فرقہ وارانہ دینیات کا سوال پیدا ہی نہیں ہوتا۔ اگر خدانخواستہ کسی طرف سے ایسا مطالبہ ہوا تو پھر سمجھ لینا چاہیے کہ ہم حقیقی مقصد کی طرف بڑھنے کی بجائے الٹا اس سے دور تر جا رہے ہیں۔ ماضی میں ہمارے تنزل کی سب سے بڑی وجہ ہمارا باہمی نفاق تھا۔ تنگ نظر ملاؤں نے ہمیشہ اس نفاق کو ہوا دی اور غیروں نے اس سے فائدہ اٹھایا آج اسلامی دنیا کی تعمیر نو کے لیے سب سے ضروری چیز اتحاد ہے۔ اگر خدانخواستہ ہم نے نئی پود کے سامنے بھی دین کو ایک اختلافی مسئلہ کے رنگ میں پیش کیا تو پھر ہماری قومی وحدت کا مضبوط ترین بنیادی پتھر پارہ پارہ ہو جائے گا۔ ایسی صورت میں ہماری قومیت کی عمارت اس قدر نازک بنیادوں پر رہ جائے گی جنھیں دشمن جس وقت چاہیں گے متزلزل کر دیں گے۔

یہاں یہ امر خاص طور پر قابل ذکر ہے کہ دوسرے مذاہب میں مختلف فرقوں کے باہمی اختلافات ہماری نسبت بہت زیادہ گہرے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود آج زمانے نے انہیں مجبور کر دیا ہے کہ ان اختلافات کو بھلا کر مدرسوں میں صرف ایسی دینیات کی تعلیم دیں جو تمام فرقوں کے لیے بنیادی درجہ رکھتی ہو انگلستان کی مثال ہمارے سامنے ہے ۱۹۴۴ء کے قانون تعلیم کی رو سے دینیات کی تعلیم وہاں لازمی ہو چکی ہے۔ مختلف عیسائی فرقوں کے اعتقادات میں جو بنیادی اختلاف ہے وہ کسی صاحب نظر سے پوشیدہ نہیں۔ لیکن انگلستان کو اچھی طرح معلوم ہے کہ آج جنگ مختلف فرقوں کے درمیان نہیں بلکہ مذہب اور لامذہبیت کے درمیان ہے۔ ایسی صورت میں سلامتی اسی میں ہے کہ مذہب اپنے

اندرونی اختلافات کو بھلا دے۔ اگر اس نے ایسا نہ کیا تو وہ سراپا مادی نظام جو مذہب کا دشمن ہے اور جس کی تمام تر بنیاد پیٹ پر ہے ایک ہی یورش میں مذہب کا نام و نشان مٹا دے گا۔

یہ خطرہ آج اس قدر حقیقی اور اس قدر قریب ہے کہ اس سے آنکھیں بند کرنا گویا تباہی کو دعوت دینا ہے۔ یہ مانی ہوئی حقیقت ہے کہ نئے تعلیم یافتہ طبقے کو مذہب سے دور لے جانے میں سب سے زیادہ ہاتھ علما کی باہمی تکفیر بازی کا تھا۔ ایک عام پڑھا لکھا آدمی مذہب کو معقولیت کی کسوٹی پر پرکھنا چاہتا ہے۔ اور چوں کہ اختلافی مسائل اس خواہش کی تشفی نہیں کرتے اس لیے وہ بنیادی چیزوں سے بھی غافل ہو جاتا ہے۔ پچھلے ڈیڑھ دو سو برس تک یہ چیز محض اس لیے چلتی رہی کہ ہمارے مغربی معلم خود مذہب کے نام کے سوا اس کی کسی اور چیز کے دلدادہ نہ تھے۔ آج کیفیت سراسر مختلف ہے۔ مذہب کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے مٹا دینے کے لیے جو پُر ہیبت قوتیں جمع ہو رہی ہیں ان کے خوف نے عیسائیت جیسے مذہب کو بھی ایک مرکز پر جمع کر دیا ہے۔ برطانوی مدرسوں میں ان دنوں دینیات کے "متفقہ" نصاب رائج ہیں۔ اگر مسیحی دنیا اتنا بڑا قدم اٹھا سکتی ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ مسلمان جن کے ہاں دینی بنیادوں کے متعلق کبھی جھگڑا پیدا ہی نہیں ہوا۔ کیوں اپنے تمام بچوں کے لیے دینیات کا متفقہ نصاب مقرر نہ کر سکیں۔ اس بنیادی نصاب میں سے گزرنے کے بعد مختلف فرقے اپنے بچوں کو اپنی مخصوص تعلیم دے سکتے ہیں دینی تعلیم کے بارے میں یہ بنیادی اتحاد آج وقت کی سب سے بڑی ضرورت ہے، اور ہر سچے مسلمان کو اس کے لیے پوری کوشش کرنی چاہیے۔

ہمہ گیر ثانوی مدرسہ اور اس کے امکانات

شاہد اشرف

ثانوی تعلیم کا مقصد | جدید تعلیم کا اہم ترین مقصد یہ بیان کیا گیا ہے کہ نئی پود کو زندگی کے چند در چند تقاضوں سے پوری طرح ہم آہنگ کر دے۔ یہ ہم آہنگی دو عناصر پر مشتمل تصور کی جائے گی۔

(۱) ماحول کے ساتھ اس حد تک مطابقت کہ زندگی ممکن ہو جائے۔ مثلاً مقام طبعی ماحول کے ساتھ مطابقت زندہ رہنے کی شرط اولین ہے۔ جو شخص جس مقام پر پیدا ہوا ہو، یا جس مقام میں اس نے سکونت اختیار کر لی ہو اسے اسی مقام کی آب و ہوا کو برداشت کرنا ہوگا۔ اس کے بغیر اس کی زندگی ممکن نہ رہے گی۔ طبعی ماحول کے سامنے گردن جھکائے بغیر اور کوئی چارہ کار ہی نہیں۔ طبعی ماحول کی طرح ہر مقام کا ایک معاشرتی ماحول بھی ہوتا ہے۔ یہ ان اقدار، رسم و رواج اور روایات پر مشتمل ہوتا ہے جو کسی معاشرے میں مدتوں کی اجتماعی زندگی کے نتیجہ کے طور پر پیدا ہوئے ہوں۔ یہ معاشرتی ماحول بھی ایک بڑی حد تک مطابقت چاہتا ہے۔ تاہم اس کی قوت قاہرہ اتنی شدید نہیں جتنی طبعی ماحول کی۔ معاشرتی ماحول کے خلاف بغاوت کرنا ہر وقت ممکن رہتا ہے۔ دنیا کے بڑے بڑے مصلحوں نے اپنے وقت کے معاشرتی ماحول کے خلاف بغاوت کر کے اپنے لیے نئی راہیں نکالی ہیں۔ لیکن یہ اجتہادی نگاہ اور انقلابی جذبہ ہر آدمی کے حصے میں نہیں آتا۔ عام انسان بالعموم معاشرتی ماحول کو جوں کا توں قبول کر لیتے ہیں۔ کم از کم آغاز کار میں ہر شخص کو معاشرتی ماحول کے ساتھ نباہ کرتے ہی بنتی ہے۔ اس کے بغیر کسی معاشرے میں جذب ہونا بہت مشکل کام بن جاتا ہے۔ معاشرہ جس فرد کو اپنے تقاضوں کے خلاف سر اٹھاتا دیکھے وہ اسے بڑی سختی کے ساتھ باہر نکال پھینکتا ہے۔

(۲) ماحول کے ساتھ ہم آہنگی کا دوسرا اہم جزو ماحول کی تعمیر نو ہے۔ ہر معاشرے کے بقا کی ایک

اہم عنصر اس کی لگاتار پیش قدمی ہے۔ اگر کوئی معاشرہ زندگی کی کسی منزل پر آکر یہ سمجھنے لگ جائے کہ اس نے کمال کی آخری سیڑھی پر قدم رکھ لیا ہے اور اس سے آگے بہتر زندگی کے کوئی میدان یا پاکیزہ تر اجتماعی تنظیم کے کوئی اور افق باقی نہیں تو وہ معاشرہ اسی منزل پر اٹک کر رہ جائے گا۔ اس اثنا میں دوسرے معاشرے آگے قدم بڑھاتے ہوئے اسے دور پیچھے چھوڑ جائیں گے۔ اور یوں وہ پسماندگی اور درماندگی کا شکار ہو کر رہ جائے گا۔ اس ذلت سے بچے رہنے کے لیے ضروری ہے کہ ہر معاشرہ اپنی معاشی اور معاشرتی زندگی کے مختلف گوشوں پر لگاتار تنقیدی نگاہ ڈالتا رہے۔ اور حالات کے بدلتے ہوئے تقاضوں کی روشنی میں ان کی تعمیر نو کا کام جاری رکھے۔ یہ اہم معاشرتی ضرورت اسی صورت میں پوری ہو سکتی ہے کہ تعلیم نئی پود میں یہ صلاحیت پیدا کرے کہ وہ اپنے طور پر سوچ سکے۔ نئی قدروں کا شعور پیدا کر سکے۔ اور نئے افقوں کی طرف جرأت کے ساتھ قدم اٹھا سکے۔ بعض لوگ اس استدلال کو تسلیم کرنے میں پس و پیش کرتے ہیں۔ ان کا خیال یہ ہے کہ مدرسہ معاشرے کا ایک خادم ہے اور بس۔ معاشرہ اسے محض اس لیے جنم دیتا اور برقرار رکھتا ہے کہ موجودہ قدروں کو من وعن نئی پود کے حوالے کیا جا سکے اس کے برخلاف کچھ کرنے کی کوشش کرنا تعلیم کے اصل مقصد کے ساتھ بے وفائی ہے۔ اگر ایسے لوگوں کا استدلال تسلیم کر لیا جائے تو اس کا صریح مطلب معاشرے پر ابدی جمود مسلط کرنا ہوگا۔ ظاہر ہے کہ کوئی معاشرہ جو زندگی کی دوڑ میں ایک باوقار مقام حاصل کرنا چاہتا ہو، ایسی حیثیت کو قبول نہیں کرے گا۔ اس سے ظاہر ہے کہ جہاں تعلیم کی ایک ذمہ داری یہ ہے کہ وہ نئی پود کو گرد و پیش کے ماحول کے ساتھ نباہ کرنا سکھائے وہاں اس کی یکساں طور پر اہم ذمہ داری یہ بھی ہے کہ وہ ایسی نگاہ بھی پیدا کرے جو اس ماحول کی کمزوریوں اور خرابیوں کو دیکھ سکے اور ان کو دور کرنے کی راہیں تلاش کر سکے۔

تعلیم کا یہ جامع مقصد ہر قسم کی تعلیم کو پیش نظر رکھنا چاہیے۔ مگر اس غالب مقصد کے تحت بعض دوسرے مقاصد بھی آتے ہیں۔ یہ ذیلی مقاصد مختلف قسم کی تعلیموں کے لیے مختلف ہیں۔ مثلاً اعلیٰ تعلیم کا اہم مقصد یہ ہے کہ قائدانہ صلاحیتوں کی تربیت کرے۔ تاکہ زندگی کا کوئی شعبہ موزوں قسم کی رہنمائی سے محروم نہ ہونے پائے۔ اس طرح ثانوی تعلیم کا بڑا مقصد یہ ہے کہ ملک و قوم کے لیے وفادار اور خودکفیل

شہری تیار کر سکے۔ ایسے شہری جو زندگی کے عام کاروبار کو خوبی اور قابلیت کے ساتھ سنبھال سکیں، اور اس کاروبار کو اجتماعی بہبود کا ذریعہ بنا سکیں۔

جدید معاشرہ کی پیچیدگیاں

جدید تہذیب سائنسی اور میکانکی تہذیب ہے۔ اس کی ٹک بوس عمارت اس پیچ در پیچ معاشی نظام پر قائم ہے، جسے صنعتی انقلاب اور قرون مابعد کی بورش ربا سائنسی اور میکانکی ایجادوں اور دریافتوں نے جنم دیا ہے قرون وسطیٰ کے آخر تک دنیا کا معاشی نظام از حد سادہ تھا۔ چھوٹے چھوٹے کاریگر اور صنعت کار اپنے مکانوں یا دکانوں میں بیٹھے طرح طرح کی چیزیں تیار کرتے۔ تاجر اور سوداگر لوگ ان چیزوں کو اکٹھا کر کے دنیا کی منڈیوں تک پہنچا دیتے۔ اس سادہ معاشی نظام کا ساتھ دینے کے لیے تعلیم کو کوئی لمبا چوڑا تردد کرنا پڑتا تھا۔ دست کار اور صنعت کار اپنی اولاد کو اپنے اپنے فن کی تعلیم خود دے دیتے۔ مدرسے کے ذمے صرف اتنا کام تھا کہ بچوں کو لکھنا پڑھنا سکھا دے۔ ان میں اخلاقی قدروں کا احساس پیدا کر دے اور بس۔

جدید مدرسے کی ذمہ داری قدیم مدرسے کے مقابلے میں کئی گنا بوجھل اور پیچیدہ ہو گئی ہے۔ ترقی یافتہ ملکوں میں بھی مدرسے کے لیے جدید ترقیوں کا ساتھ دینا مشکل ہے۔ آبادی میں ہر جگہ اتنی تیزی سے اضافہ ہو رہا ہے کہ مشینوں سے خدمت لیے بغیر ان روز افزوں آبادیوں کی ابتدائی ضرورتوں کو پورا کرنا بھی ممکن نہیں۔ ہر قسم کی پیداوار کے پرانے طریقے تقریباً بے کار ہو چکے ہیں۔ جدید مشینی طریقوں کا طرۂ امتیاز کام کی انتہائی حد تک تقسیم اور انتہائی طرز تنظیم ہے۔ اس معاشی نظام میں خصوصی فنی مہارت ایک ناگزیر شرط ہے۔ یہ خصوصی فنی مہارت گھر پر والدین سے نہیں سیکھی جا سکتی۔ مگر اسے حاصل کیے بغیر زندگی کے عام کاروبار میں جذب ہونا بھی محال ہے

اس پیچیدہ معاشی نظام نے مدرسے کے لیے یہ ممکن نہیں چھوڑا کہ وہ لکھنا پڑھنا سکھانے پر بس کر دے عام تعلیم بے شک مدرسے کا ایک اہم فرض ہے۔ لیکن اسی قدر اہم فرض یہ بھی ہے کہ طالب علموں کو کوئی نہ کوئی خصوصی فنی مہارت سکھائے۔ تاکہ وہ زندگی میں داخل ہو کر اپنے لیے اور دوسروں کے لیے مفید ہو سکیں۔ لیکن خواندگی اس قسم کی صلاحیت پیدا نہیں کر سکتی۔ دنیا کے بدلے ہوئے معاشی نظام نے تعلیم کے مفہوم میں بھی خواہ مخواہ کشادگی پیدا کر دی۔ ثانوی مدرسے کا نصاب وسیع تر کیا گیا۔ ثانوی تعلیم کے ذمہ یہ فرض

لایا گیا کہ وہ نوجوانوں کو ایک عام قسم کی تعلیم مہیا کرے۔ جس کی بدولت وہ اپنی صلاحیتوں اور دلچسپیوں دمعلوم کر سکیں۔ اور اس کے ساتھ ہی وہ ایسی خصوصی تعلیم کا اہتمام بھی کرے جو ہر طالب علم کی خصوصی صلاحیتوں ندفنی دلچسپیوں کے حسب حال ہو۔ ثانوی تعلیم کا یہ وسیع تر تصور موجودہ صدی کی پیداوار ہے اور اسے عملی شکل دینے کی کوشش صرف پچھلی چند دہائیوں میں کی گئی ہے۔

ہمہ گیر مدرسہ

جدید معاشی نظام نے مدرسے پر جو نئی ذمہ داری ڈالی تھی، اس کا سب سے پہلا احساس ترقی یافتہ ملکوں میں ہوا۔ یہ بات بالکل قدرتی تھی، کیوں کہ سائنس اور ٹکنالوجی کی برق رفتار ترقی نے ان ملکوں کی معاشی ایا پلٹ دی تھی۔ جو صنعتی انقلاب جیمز واٹ کے دخانی انجن نے پیدا کیا تھا وہ مدت سے فرسودہ ہو چکا تھا۔ بیسویں صدی کے آغاز سے ایک نئے صنعتی انقلاب کی داغ بیل پڑ چکی تھی۔ اس نئے انقلاب کا رہنما برطانیہ کے بجائے ریاستہائے متحدہ امریکہ تھا۔ انہوں ہی طریقہ ہائے پیداوار کی انتہائی حدوں تک لے جانے ورمشینی دماغوں سے کام لینے کی مہم اٹلانٹک کے اس پار بڑی شدت سے جاری تھی۔

انہیں ہی طریقہ ہائے پیداوار اور ٹکنالوجی کی ہوشربا ترقی نے جس نئے معاشی انقلاب کو جنم دیا اس سے سب سے زیادہ متاثر ہونے والا ملک امریکہ تھا۔ چناں چہ اس ملک کے تعلیمی نظام کو سب سے پہلے نئے معاشی تقاضوں کا تعلیمی جواب تلاش کرنا پڑا۔ اس کا نام "ہمہ گیر مدرسہ" رکھا گیا، ایک ایسا مدرسہ جس کا نصاب وسعت اور ہمہ گیری کے لحاظ سے زندگی کی سی وسعت رکھتا ہو جو نہ صرف عام تعلیم دیتا ہو، بلکہ اس قسم کے ابتدائی فنی تجربے کا اہتمام بھی کرتا ہو جس کی بدولت نوجوان طلبہ اور طالبات موزوں قسم کی فنی تربیت حاصل کر سکیں۔

ہمہ گیر مدرسے کا ذکر کرتے ہوئے ایک امریکی ماہر تعلیم لکھتا ہے:- ایک ہمہ گیر مدرسے کی نشوونما نہ صرف امریکی تعلیم کا ایک بڑا کام بلکہ اس کا ایک بہت بڑا کارنامہ ہے۔

ہمہ گیر مدرسے کے نصاب کی وسعت کا اندازہ اس بات سے ہو سکتا ہے کہ عام امریکی مدرسوں میں موٹر چلانا۔ ٹریکٹر مرمت کرنا۔ کپڑے سینا۔ لکڑی اور لوہے کا سامان تیار کرنا۔ بال تراشنا۔ کھانے تیار کرنا، اور اسی قسم کے دوسرے فنی مشاغل باقاعدہ مضامین کے طور پر نصاب میں داخل ہیں۔

ہمہ گیر مدرسے کے نصاب کی یہ وسعت دو اسباب کا نتیجہ ہے :-

(۱) مدرسے نے اپنی یہ ذمہ داری قبول کر لی ہے کہ اسے نوجوانوں کو اس قابل بنانا چاہیے کہ زندگی کے عام کاروبار میں آسانی سے مہذب ہو سکیں۔

(۲) امریکہ میں ثانوی درجہ تک تعلیم ہر لڑکے اور لڑکی کا قدرتی حق تسلیم کیا گیا ہے۔ ثانوی تعلیم گنے چنے بچوں کے لیے نہیں، بلکہ ہر بچے کے لیے لازمی اور مفت ہے۔ حکومت کی دوسری ذمہ داریوں کے علاوہ اس کی ایک ذمہ داری یہ بھی ہے کہ ہر بچے کو اس کے حسب حال ثانوی درجے تک تعلیم دے۔ جہاں ہر قسم کے بچوں کو ثانوی درجے تک تعلیم دینا ضروری ہو وہاں یہ بھی لازم آتا ہے کہ نصاب میں اتنی وسعت ہو کہ ہر بچے کو اپنے حسب حال کچھ نہ کچھ مضامین مل سکیں۔

کامیابی کا جائزہ

اس میں کلام نہیں کہ ہمہ گیر مدرسے کا تصور، جدید معاشی نظام کے قاہر تقاضوں کا ایک قدرتی جواب ہے۔ اس کے ساتھ ہی یہ بات بھی عام طور پر تسلیم کی جاتی ہے کہ ہمہ گیر مدرسہ امریکی تعلیم کا ایک بڑا کارنامہ ہے، لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آیا یہ تعلیمی کارنامہ بالکل مکمل ہو چکا ہے یا ابھی اس کے حصول کی کوششیں جاری ہیں؛ اس سوال کا فیصلہ کن جواب دینے کے لیے بعض امریکی عالموں نے تحقیقاتی مطالعے کیے ہیں۔ ان میں سے تازہ ترین مطالعہ غالباً فرینکلن جے کیلر کا ہے۔ اس عالم نے پچھلے سال ملک بھر کے ثانوی مدرسوں کی کوششوں کا جائزہ لیا۔ اس جائزہ کا مقصد یہ معلوم کرنا تھا کہ ریاستہائے متحدہ امریکہ کے ثانوی مدرسے نوجوانوں کی گوناگوں دلچسپیوں اور تعلیمی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے جو کوشش کر رہے ہیں وہ کس حد تک کامیاب ہے۔ اپنے مشاہدات سے نتیجہ اخذ کرتے ہوئے ڈاکٹر کیلر نے کہا کہ ملک میں بہت کم مدرسے ایسے ہیں جنھیں صحیح طور پر ہمہ گیر کہا جا سکے۔

ڈاکٹر کیلر نے ملک کے طول و عرض میں سے ستر ایسے ثانوی مدرسے چنے جنھیں نمائندہ مدرسے کہا جا سکتا ہے۔ ان کو دیکھنے کے بعد موصوف نے یہ رائے ظاہر کی

کسی مدرسے کا نصاب مرتب کرتے وقت یہ نکتہ یاد رکھنا چاہیے کہ گو معاشرتی ضرورتوں کا پورا کرنا ضروری ہے. طلبہ اور طالبات کی دلچسپیاں اور ضرورتوں کو بھی نظرانداز نہ کرنا چاہیے حقیقت یہ ہے کہ معاشرتی ضرورتیں اور انفرادی ضرورتیں ایک دوسرے کا عکس ہوا کرتی ہیں. دنیا کے جدید معاشی نظام کے تقاضے پورے کرنے کے لیے ثانوی مدرسے کے نصاب کو دو مقاصد پورے کرنے چاہئیں.

(۱) تمام نوجوانوں کو ایک وسیع قسم کی عام تعلیم بہم پہنچائی جائے.

(۲) ہر نوجوان کو ایسی مخصوص قسم کی تعلیم بہم پہنچائی جائے جو اس کی فنی اور حرفتی ضرورتوں کو پورا کرے.

جو نوجوان آگے کالج میں تعلیم جاری رکھنا چاہتے ہیں. ان کے لیے کالج کی تیاری کرنے والا نصاب ہی دوسری ضرورت کو پورا کر دیتا ہے. لیکن جو نوجوان ثانوی مدرسہ چھوڑنے کے بعد زندگی کے عام کاروبار میں جذب ہو جانا چاہتے ہوں، ان کے لیے مدرسے کو کوئی ایسا نصاب پیش کرنا چاہیے جو حرفتی تیاری کا درجہ رکھتا ہو. ایسے نصاب کے بغیر مدرسہ ہمہ گیر ہونے کا دعویٰ نہیں کر سکتا.

ایک اور جائزہ

۱۹۵۶ء میں دو امریکی پروفیسروں نے ریاست مشی گن کے ۲۷۰ ہائی سکولوں کے صدر معلموں کے نام ایک سوال نامہ جاری کیا. سوالنامے کا مقصد یہ معلوم کرنا تھا کہ ہر صدر معلم کے خیال میں اس کا مدرسہ کس حد تک ہمہ گیر ہے. سوالنامے کے آغاز میں ہمہ گیر مدرسے کی وہ تعریف دی گئی تھی جو اس مضمون کے شروع میں درج ہے. پھر یہ کہا گیا تھا کہ حقیقی معنوں میں بہت کم مدرسے ہمہ گیر ہیں. بعد ازاں یہ وضاحت کر دی گئی تھی کہ سوال نامے کا مقصد یہ معلوم کرنا ہے کہ ریاست مشی گن کے مدرسے کس حد تک ہمہ گیر ہیں.

کل ۱۹۸ صدر معلموں نے اس سوال نامے کا جواب دیا. ان میں سے صرف ۱۲ نے یہ کہا کہ ان کے مدرسے حقیقی معنوں میں ہمہ گیر ہیں. ۶۲ نے کہا کہ ان کے مدرسے بڑی حد تک ہمہ گیر ہیں. ۹۶ کا جواب یہ تھا کہ ان کے مدرسے خاصی حد تک ہمہ گیر ہیں. ۱۷ کا کہنا تھا کہ ان کے مدرسے کسی حد تک ہمہ گیر ہیں. دو صدر معلموں نے جواب دیا کہ ان کے مدرسے ہرگز ہمہ گیر نہیں ہیں. ۹ صدر معلموں نے اس سوال کا جواب نہیں دیا.

ان جوابوں سے ظاہر ہے کہ ۸۸ فی صد، صدر معلموں کی رائے میں ان کے مدرسے کسی حد تک اچھی

حد تک یا کلی طور پر ہمہ گیر تھے۔ صرف ۱۲ فیصد نے یہ اعتراف کیا کہ ان کے مدرسے معمولی طور پر ہمہ گیر تھے، یا سرے سے ہمہ گیر نہ تھے۔

سوال نامے کا ایک سوال یہ بھی تھا کہ کالج کی تیاری کرانے والے مضامین کے ساتھ آپ کے مدرسے میں حرفتی تیاری کے لیے کیا کیا مضامین شامل ہیں۔ اس سوال کے مندرجہ ذیل جوابات موصول ہوئے

(۱)	کالج کی تیاری کرنے والا نصاب	۱۹۷ مدرسوں میں
(۲)	حرفتی کاروبار کا نصاب	۱۷۷ " "
(۳)	زراعتی نصاب	۱۶۷ " "
(۴)	صنعتی نصاب	۱۱۴ " "
(۵)	خانہ داری کا نصاب	۱۳۰ " "
(۶)	امداد باہمی پر مبنی کاروبار کی تربیت	۱۶۸ " "

سوال نامے میں یہ بھی پوچھا گیا تھا: "کیا آپ چاہتے ہیں کہ آپ کا مدرسہ زیادہ ہمہ گیر نوعیت کا بن جائے"؟ اس سوال کا جواب ۱۷۵ صدر معلموں نے اثبات میں دیا اور ۶۲ نے نفی میں ۱۲ نے اس سوال کا جواب نہیں دیا۔ ان جوابوں سے ظاہر ہے کہ دو تہائی صدر معلموں کے خیال میں ان کے مدرسے اس حد تک ہمہ گیر نہ تھے جس حد تک وہ انہیں دیکھنے کے خواہاں تھے۔

سوال نامے کا ایک سوال یہ تھا کہ "آپ کے مدرسے کو زیادہ ہمہ گیر بنانے کے لیے کیا کرنا چاہیے"؟

اس سوال کے جو جوابات موصول ہوئے ان سے پوری طرح پتہ چلتا تھا کہ بہت سے صدر معلم اپنے تعلیمی نصاب کو وسیع تر کرنے اور حرفتی تعلیم کو زیادہ موثر طور پر داخل نصاب کرنے کے کس قدر خواہاں ہیں انہوں نے ان رکاوٹوں کا بھی ذکر کیا تھا جو ان کے مدرسے کو زیادہ ہمہ گیر بننے سے روک رہی ہیں۔ ان میں روپے کی کمی۔ ساز و سامان کا فقدان۔ موزوں استادوں کی نایابی اور بہت سے دوسرے اسباب کا ذکر کیا گیا ہے۔

بعض اہم نتائج

اس سوال نامے کے جوابوں نے جہاں امریکی ہمہ گیر مدرسے کے مختلف پہلوؤں پر دلچسپ روشنی

ڈالی ہے۔ وہاں نظم و نسق مدرسہ کے بعض اہم نکات کی طرف بھی توجہ دلائی ہے۔ ان میں سے زیادہ اہم نکات مندرجہ ذیل ہیں:-

(۱) کسی مدرسے کے ہمہ گیر ہونے کا انحصار بہت کچھ اس بات پر ہے کہ آیا مدرسے کو چلانے والے لوگ ہمہ گیر مدرسے کے صحیح مفہوم کو سمجھتے ہیں یا نہیں اور اس مفہوم کو عملی تشکیل دینے کے ذرائع کا علم رکھتے ہیں یا نہیں؛

(۲) ایک ہمہ گیر مدرسے کی کامیابی کے لیے صرف اتنا ہی کافی نہیں کہ مختلف علمی اور حرفتی مضامین پڑھانے کے لیے استاد دستیاب ہوں۔ اس کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ یہ استاد ان علمی اور حرفتی میدانوں میں طلبہ کی رہنمائی کر سکیں۔

(۳) یہ نکتہ اچھی طرح ذہن نشین کر لینا چاہیے کہ اس عام تعلیم کے درمیان جو مدرسے کے ہر طالب علم کے لیے ضروری ہو اور اس مخصوص حرفتی تربیت کے درمیان جو ہر طالب علم کی مخصوص صلاحیتوں کے حسب حال ہو بڑا فرق ہے۔

(۴) مدرسے کے حرفتی نصاب اور مقامی صنعت، زرعی اور کاروباری دنیا کے درمیان ایک گہرا رابطہ قائم رہنا چاہیے۔ یہ رابطہ مدرسے کی مختلف کمیٹیوں کی وساطت سے پیدا کیا اور برقرار رکھا جا سکتا ہے۔

(۵) مدرسے کے سارے نصاب میں صدر معلم یا اس کا متبادل انتظامی افسر کلیدی حیثیت رکھتا ہے۔ مدرسے کی زندگی پر کوئی دوسری چیز اس قدر اثر انداز نہیں ہوتی جس قدر صدر معلم کا ذاتی علم و تجربہ نوجوانوں کی فطرت اور ان کی ضروریات کے متعلق اس کا فہم، مقامی آبادی کی ضرورتوں کے متعلق اس کی رائے اور نوجوانوں اور مقامی آبادی کی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے اس کی مستعدی اور سرگرمی ہمہ گیر ثانوی مدرسے کے صدر معلم کے لیے اولیں لازمی ہے کہ وہ عام وسیع المشرب تعلیم اور مخصوص حرفتی تعلیم دونوں کے الگ الگ دائرہ عمل کا صحیح فہم رکھتا ہو۔ اگر اس کا ذاتی تجربہ دونوں قسم کی تعلیموں میں سے کسی ایک حد تک محدود رہا ہے تو اس کا اولین فرض یہ ہونا چاہیے کہ دوسری قسم کی تعلیم کے متعلق

قانی معلومات اور مشاہدات فراہم کر کے اپنی نگاہ میں توازن پیدا کرے۔ جب تک خود اس کی نگاہ میں توازن پیدا نہ ہوگا، وہ مدرسے کے نصاب میں توازن پیدا کرنے کے قابل نہ ہو سکے گا۔ علمی مضامین اور حرفتی تربیت کے درمیان صحت مند توازن پیدا کرنے کی اس سے زیادہ مؤثر اور کوئی صورت نہیں۔

ایک عام دشواری

ہمہ گیر مدرسے کے راستے میں ایک عام دشواری ایسے استادوں کی کم یابی ہے جو نہ صرف مختلف حرفتوں کے ماہر ہوں بلکہ فن تدریس میں بھی دست رس رکھتے ہوں۔ ان استادوں کی کم یابی کی بڑی وجہ یہ ہے کہ کاروباری ادارے صنعت اور زراعت ایسے لوگوں کو مدرسے کے مقابلے میں زیادہ اجرت پیش کرتے ہیں۔ ان دنوں چوں کہ افراطِ زر کا ہر جگہ دور دورہ ہے، قیمتیں آسمان سے باتیں کر رہی ہیں۔ کاروبار، صنعت اور زراعت کے وآخر نیارے ہیں اس لیے اہلِ حرفت کو ہاتھوں ہاتھ لیا جاتا ہے۔ ایسے لوگوں کو مدرسوں کی طرف کھینچنے کی واحد صورت یہ ہے کہ انہیں زیادہ مشاہرہ پیش کیا جائے۔ جس طرح کسی تجربہ کار استاد کو ملازم رکھتے وقت اس کے سابقہ تجربہ کی بنا پر زیادہ مشاہرہ پیش کیا جاتا ہے۔ بالکل اسی طرح کسی حرفت کے ماہر استاد کو بھی اس کی فنی مہارت کے حسبِ حال زیادہ تنخواہ ملنی چاہیے۔ جو استاد نہ صرف اپنے مخصوص فن کو اچھی طرح جانتا ہو، بلکہ فن تدریس سے بھی واقف ہو، مدرسے کو چاہیے کہ اسے معقول معاوضہ دے۔

صدر معلم کے ذمے صرف نظم و نسق مدرسہ کا کام ہی نہیں ہوتا، بلکہ اس کے ذمہ یہ فرض بھی عائد ہوتا ہے کہ تدریس کے مختلف میدانوں میں رہ نمائی کی خدمت انجام دے۔ مگر کیا ایک حقیقی طور پر "ہمہ گیر مدرسہ" کے صدر معلم کے لیے یہ بات عملی طور پر ممکن ہے کہ وہ پچاس ساٹھ استادوں کی رہ نمائی کرے۔ اس سوال کا جواب صریحاً نفی میں ہے۔ اگر صدر معلم مختلف فنی اور حرفتی میدانوں میں کافی دست گاہ بھی رکھتا ہو تو بھی انتظامی ذمہ داریاں اس کے پاس اتنا وقت نہیں چھوڑیں گی کہ وہ ان تمام مشاغل اور سرگرمیوں کی رہ نمائی کر سکے جن میں مدرسے کے طلبہ حصہ لے رہے ہیں۔ اس مشکل کے حل کی ایک صورت یہ ہے کہ صدر معلم کی مدد کے لیے کچھ نائب مقرر ہوں، جو مختلف علمی اور فنی میدانوں کے خصوصی ماہر ہوں۔ ان میں سے ہر ایک اپنے میدان میں رہ نمائی کے فرض انجام دے۔ مدرسوں کی عام نگرانی کے لیے اس اصول پر

عمل ہو رہا ہے کہ انسپکٹر مدارس کی مدد کے لیے چند ایک معاون انسپکٹر مقرر ہوتے ہیں جو اس کا ہاتھ بٹاتے ہیں۔ مدرسے میں ابھی اس طریق کار کو اپنایا نہیں گیا۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ ہمہ گیر مدرسے کو زود یا بدیر اس طریق کار سے کام لینا پڑے گا۔ اور صدر معلم کی مدد کے لیے نائب صدر معلموں کا تقرر بھی ہونے لگے گا۔

ایک ضروری انتباہ

اس مضمون میں متعدد بار یہ وضاحت گذر چکی ہے کہ ہمہ گیر مدرسے کا امتیازی نشان عام تعلیم اور مخصوص قسم کی حرفتی تعلیم کو یکجا کرنا ہے۔ بعض مدرسے اس بنیادی نکتے کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔ وہ اپنے نصاب میں عملی فنون یا لکڑی اور لوہے کے معمولی سے کام کو شامل کر کے یہ دعویٰ کرنے لگتے ہیں کہ وہ ہمہ گیر مدرسے ہیں۔ یہ صورت حال بہت گمراہ کن ہے۔ اس میں کلام نہیں کہ عملی فنون یا لکڑی اور لوہے کے کام میں کچھ دسترس پیدا کر لینے سے طالب علم کی عام استعداد میں اضافہ ہوتا ہے۔ لیکن استعداد میں اس قسم کا اضافہ ریاضی، سائنس زبان اور دوسرے علمی مضامین کے پڑھنے سے بھی ہوتا ہے۔ پس فیصلہ کن چیز یہ نہیں کہ کسی مضمون کی تدریس سے عام استعداد میں کیا اضافہ ہوا ہے۔ بلکہ فیصلہ کن امر یہ ہے کہ مدرسے نے جو فنی تربیت دی ہے وہ صنعت و حرفت کی ضرورتوں کو بھی پورا کرتی ہے۔ نصاب مدرسہ کے جو اجزا اس شرط کو پورا نہیں کریں گے وہ حرفتی تعلیم کے تحت نہیں آئیں گے، اور اسی حد تک مدرسے کی ہمہ گیری باطل ہو کر رہ جائے گی۔

پس ماندہ ملکوں میں جہاں نظری اور علمی مضامین کی حکمرانی میں ابھی سر مو فرق نہیں آیا مندرجہ بالا انتباہ کی ضرورت بے حد شدید ہے۔ ان ملکوں میں ٹیکنیکل دعویٰ کیا جا رہا ہے۔ مگر ان کے نصابوں میں ایسے اجزا بہت کم دیکھنے میں آتے ہیں، جو مقامی صنعت۔ زراعت یا کاروبار کی ضرورتوں کو پورا کریں۔ جب تک کسی مدرسے کا نصاب ان ضرورتوں کو پورا نہ کرے۔ اس وقت تک اسے حرفتی نصاب یا متوازن نصاب کا نام دینا خود فریبی کے سوا کچھ نہیں۔

حقیقی قسم کے حرفتی نصاب کی نشو و نما کے لیے مقامی صنعت، تجارت اور زراعت کے ساتھ گہرے روابط قائم کرنا ایک ضروری شرط ہے جو حرفتی نصاب کی پیداوار کو بالآخر انہی میدانوں میں جذب ہونا ہے۔ اس انجذاب کی بہترین صورت یہ ہے کہ مدرسہ مقامی زندگی سے کٹ کر لوہے کی بجائے اس زندگی کا مرکز بنا رہے۔ مدرسے کی

مشاورتی مجالس صنعت و تجارت اور زراعت کے رہنماؤں سے میل جول بڑھائیں. ان کی خدمتیں حاصل کریں. انہیں مدرسے میں آنے اور ان کے نصاب کو قریب سے دیکھنے کی دعوت دیں. اپنے نصاب تیار کرتے وقت ان سے مشورے حاصل کریں، اور اپنے طالب علموں کو گاہے بگاہے یہ مواقع دیں کہ اپنے مستقبل کے پیشے اور اس کے تقاضوں کو اپنی آنکھوں سے دیکھیں اور اس کا اچھا خاصہ تجربہ حاصل کریں.

خاتمہ کلام

ہمہ گیر مدرسہ جدید صنعتی تہذیب کے معاشی تقاضوں کا ایک تسلی بخش جواب ہے. تاہم یہ کوئی قطعی اور مکمل جواب نہیں. جیسا اوپر بیان کیے گئے مطالعوں سے ظاہر ہے. ہمہ گیر مدرسے میں اصلاح و ترقی کی کافی گنجائش باقی ہے. اگر ہمہ گیر مدرسہ جدید معاشی تقاضوں کا ساتھ نہیں دے گا تو یہ تقاضے کسی اور قسم کے تعلیمی ادارے کی وساطت سے پورے ہو کر رہیں گے. اگر مدرسہ اس بنیادی حقیقت کو تسلیم نہیں کرے گا تو خود اپنے وجود کو فنا کی دعوت دے گا.

کسی مدرسے کو ہمہ گیر بنانا اس کے صدر معلم اور استادوں کا کام ہے. بے شک مدرسے کو ہمہ گیر بنانے کے لیے موزوں قابلیت کے استادوں اور ساز و سامان کی ضرورت ہے. مگر ہر معاشرہ اپنے اندر بے شمار تعلیمی امکانات رکھتا ہے، جن سے کام لینا صدر معلم اور اس کے رفقائے کار کی بصیرت پر موقوف ہے. مقامی صنعت تجارت اور زراعت کو اس بات پر آمادہ کیا جا سکتا ہے کہ مدرسے کی سرگرمیوں میں دلچسپی لیں. ان مقامی وسائل سے بہت سی تعلیمی خدمت لی جا سکتی ہے. ان کے تعاون سے طالب علموں کو ایسی فنی مہارت بہم پہنچائی جا سکتی ہے. جس کی عام مانگ ہو. اور بالآخر یہ طریق کار فارغ التحصیل طلبہ کو موزوں کام تلاش کرنے میں صد درجہ ممد ثابت ہو سکتا ہے. امریکہ کے بہترین ہمہ گیر مدرسے اسی راہ پر چل رہے ہیں. دوسرے مدرسے جو ہمہ گیر مدرسے کا شوق رکھتے ہوں ان کے لیے بھی عمل کی یہ راہ بہترین نتائج پیدا کر سکتی ہے.

برفانی بیابانوں میں زندگی کی ایک جھلک

انیس احمد

گرم استوائی یا نیم استوائی علاقوں میں بسنے والوں کے لیے یہ یقین کرنا بہت مشکل ہے کہ برف کے لق ودق بیابانوں میں بھی کوئی نباتات اُگ سکتی ہے یا وہاں حیوان اور انسان زندہ رہ سکتے ہیں۔ لیکن علم الارض کے ماہرین جانتے ہیں کہ پچھلے دس لاکھ سالوں میں کئی ایسے دور آئے جب کرۂ زمین کا ایک بہت بڑا حصہ سفید برفانی چادر سے ڈھک گیا۔ جس سفید برفانی چادر نے آج دونوں قطبوں کو لپیٹ رکھا ہے۔ وہ مندرجہ بالا برفانی زمانوں میں قطبوں سے نیچے کی طرف پھیلنے لگی، اور دور نیچے تک تمام رقبے کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ اس طرح ایشیا کی وسطی سطوح مرتفع سے اوپر کے لمبے چوڑے میدان، یورپ، جزیرۂ انگلستان اور شمالی امریکہ کا نصف حصہ مدتوں برف کے نیچے چھپے رہے۔ لیکن یہ برفانی چادر ان علاقوں سے زندگی ختم نہ کر سکی۔ آج بھی کیفیت قطبوں کی ہے۔ ان برفانی بیابانوں میں زندگی کی بہار بدستور موجود ہے۔ ذیل میں قطب شمالی کے برفانی ویرانوں کی ایک جھلک پیش کی جائے گی۔

ایک نئی دنیا

جو لوگ یورپ اور امریکہ کے سرد علاقوں کے رہنے والے ہیں اور سردیوں کی برف کے عادی ہیں وہ بھی جب انتہائے شمال کے برفانی بیابانوں میں جاتے ہیں تو دفعتہً پکار اٹھتے ہیں کہ ہم بالکل ایک نئی دنیا میں آگئے۔ قطبی دائرے کے اندر ساحل سمندر سے کچھ دور ہٹ کر آگے نگاہ دوڑائیں تو ہر جگہ چٹانوں اور یخ کی حکمرانی نظر آتی ہے۔ اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس بے آب صحرائے یخ میں زندگی کا نام ونشان نہیں۔ سردی کا یہ عالم ہے سطح زمین سے صرف چند انچ نیچے زمین ہمیشہ ہمیشہ منجمد رہتی ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ یہاں نہ کوئی چشمہ ہے اور نہ دلدل۔ ہموار جگہ بہت شاذ ملتی ہے۔ سال کا بیشتر حصہ سطح زمین بالکل خشک رہتی ہے۔ خوفناک طور پر برفانی آندھیاں سارا سال چلتی رہتی ہیں۔ لیکن اس یخ بستہ بیابان میں بھی زندگی نہ صرف موجود ہے

جگہ خوب پھلتی پھولتی ہے۔

بہار زندگی کی آمد

جغرافیہ کے طلبہ یہ بات اچھی طرح جانتے ہیں کہ قطبوں پر دن اور رات کی لمبائی چھے، چھے مہینے کی ہے چناں چہ قطب شمالی پر ۲۱ مارچ سے ۲۲ ستمبر تک پورے چھے مہینے سورج لگاتار چمکتا ہے۔ اور پھر ۲۳ ستمبر سے ۲۰ مارچ تک اس جگمگائے ہوئے یخ بستہ بیابان کا سفید براق چہرہ یک دم اندھیرے کے پردے میں جا چھپتا ہے۔ قطبی علاقوں میں موسم گرما کی آمد دراصل زندگی کی آمد ہے۔ چھے مہینے لمبے دن کی پہلی کرنیں اس برفانی دنیا کے لیے زندگی کا پیغام لے کر آتی ہیں۔ سورج کے طلوع ہوتے ہی اس یخ بستہ بیابان کا سفید طور پر چہرہ منعکس ہونے والے نور سے جگمگا اٹھتا ہے۔ نباتاتی اور حیواناتی زندگی جو سخت جان رمق چھے ماہ لمبے گھٹا ٹوپ اندھیرے جاڑے کی بے پناہ چکی میں سے جان سلامت لے نکلتی ہے۔ اس کے پہلو میں دفعتہً زندگی کا طوفان کروٹیں لینے لگتا ہے۔ ہوا سے اس بات پر ابھارتا ہے کہ زندگی کی مختصر سی مہلت سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھائے۔

صناع قدرت نے اپنے کام میں بڑی حکمت چھپا رکھی ہے۔ خط استوا سے جوں جوں قطبین کی طرف بڑھیں، دن اور رات کی لمبائی کا فرق بڑھتا جاتا ہے۔ تاآں کہ قطبوں پر جا کر دن رات کی لمبائی پھر برابر ہو جاتی ہے۔ اور یہ برابر سال کو صرف دو حصوں میں تقسیم کرتی ہے۔ انتہائی شمالی اور جنوبی عرض بلدوں پر اگر دن کی لمبائی اتنی طویل نہ ہوتی تو ان علاقوں میں زندگی کے لیے یہ امر بے حد مشکل ہو جاتا کہ وہ موت کے بعد دوبارہ بہار کا سماں دیکھے۔

دائرہ قطب شمالی میں جانے والے سیاح اس یخ بستہ بیابان کا سفر دن کے زمانے میں کرتے ہیں کیونکہ سرما کی چھے ماہ لمبی بھیانک رات میں وہاں نہ صرف زندگی تقریباً تقریباً محال ہو جاتی ہے۔ بلکہ کچھ مشاہدہ کرنا بھی ممکن نہیں رہتا۔ سورج کے طلوع ہوتے ہی ہر جگہ امید کی فضا نظر آنے لگتی ہے۔ رفتہ رفتہ سورج کی کرنیں برفانی ندیاؤں کی یخ بستہ چادر میں جگہ جگہ سوراخ کرنے لگتی ہیں۔ اور برف جیسے سرد پانی کے چھوٹے چھوٹے جوہڑ پیدا ہو جاتے ہیں۔ سطح زمین کے اوپر چند انچ کی گہرائی تک یخ بستگی ختم ہو جاتی ہے۔ اور زمین کی اس چند انچ موٹی

نہ میں زندگی کو سہارا دینے کی استعداد پیدا ہو جاتی ہے۔

ایک جھلک

آئیے آپ کو قطبی بہار زندگی کی ایک جھلک دکھائیں۔ ہم ساحل سے صرف چند گز دور ایک چٹان کے دامن میں کھڑے ہیں۔ اس چٹان کے بہت بڑے بڑے ٹکڑے ٹوٹ پھوٹ کر نیچے گرے پڑے ہیں۔ ان دیوہیکل پتھروں نے چٹان کے نیچے سے بہنے والے برفانی دریا کا راستہ روک کر چند جوہڑ پیدا کر رکھے ہیں۔ ان جوہڑوں کا آئینے جیسا شفاف پانی برف سے زیادہ ٹھنڈا ہے۔ ان کے کناروں پر چاروں طرف کچھ گز کے فاصلہ پر کائی، لچین اور قسم قسم کے گھاس کا سبز حاشیہ کیسا شگفتہ اور نظر فریب ہے۔ اس سبزے میں جگہ جگہ رنگا رنگ جنگلی پھول رنگینی کا ایک عجیب سماں باندھ رہے ہیں۔ ان جوہڑوں پر مختلف رنگوں کے پرندے تیزی سے چکر کاٹتے اور چیختے نظر آتے ہیں۔ پانی کے کنارے جگہ جگہ بے شمار ٹانگوں والی چھپکلیاں اور طرح طرح کے کیڑے مکوڑے رینگتے پھرتے ہیں۔ مچھلیاں بھی تیزی سے تیرتی نظر آتی ہیں۔ غرض اس چند سو مربع گز جگہ میں فطرت کی رنگینی اور زندگی کی چہل پہل اپنے پورے جوبن پر ہے۔ ہر ذی حیات اس فکر میں معلوم ہوتا ہے کہ زندگی کے بے حد مختصر وقفے سے جی بھر کر لطف اٹھائیے۔ کیوں کہ وہ وقت دور نہیں جب یہ چھوٹے چھوٹے جوہڑ پھر سے منجمد ہو جائیں گے۔ اور اس کے ساتھ ہی زندگی کی یہ ساری رونق ایک خواب بن کر رہ جائے گی۔

دائرہ قطب شمالی میں گرین لینڈ ایک بہت بڑا جزیرہ ہے۔ نو صدیاں گذریں اہل یورپ نے اس جزیرے کے جنوبی حصے میں ایک نو آبادی قائم کی تھی۔ یہ نو آبادی کوئی پانچ سو برس قائم رہی۔ بالآخر یہ نو آبادی یورپ کے ساتھ سمندری رشتہ قائم نہ رکھ سکی اور رفتہ رفتہ محو ہو گئی۔ اس کے محو ہو جانے کے تقریباً نصف صدی بعد تحریک احیائے علوم نے اہل یورپ کو جب زندگی کا ایک نیا ولولہ دیا تو وہ دوبارہ گرین لینڈ میں پہنچے۔ پرانی نو آبادی کے مقام پر انہیں ایک انسانی پنجر کے سوا کچھ نہ ملا۔ مقامی لوگوں کی زبانی پتہ چلا کہ شمالی حملہ آوروں نے اس نو آبادی کے آخری ناقو مست آدمی کا خاتمہ کر دیا تھا۔ اس وقت سے لے کر اب تک گرین لینڈ پھر اہل مغرب کی آماجگاہ بنا ہوا ہے۔ یورپ اور امریکہ سے اب تک سینکڑوں سیاح اس جزیرے کو چھان چکے ہیں۔ ان کا مقصد نہ صرف اس ارض یخ کی قدرتی نباتات اور حیوانات کا مطالعہ کرنا ہے، بلکہ ان موسمی اسباب کا کھوج لگانا بھی جو اب تک

شمالی [illegible] سے اوجھل رہے ہیں، اور جن کو دنیا کی موسمی کیفیات کا فیصلہ کرنے میں بڑا دخل ہے۔

آج گرین لینڈ کے برفانی دریاؤں کے کنارے غالباً اسی قسم کی نباتات ملتی ہیں جو تقریباً پچیس ہزار سال پہلے شمالی ایشیا۔ یورپ اور شمالی امریکہ کے بڑے حصے میں پائی جاتی تھی۔ آج گرین لینڈ کے بڑے حصے کو جس یخ کی چادر نے ڈھانپا ہوا ہے، اس ہزاروں میل لمبی چوڑی برفانی چادر کا ایک چھوٹا سا بچا کھچا ٹکڑا ہے جس نے آج سے ۲۵ ہزار سال پہلے شمالی نصف کرہ کے ایک بڑے حصے کو لپیٹ رکھا تھا۔

یخ بستہ علاقوں میں سب سے پہلے پیدا ہونے والا پودا لچن ہے۔ یہ ادنیٰ قسم کی نباتات سردی کے مقابلے میں بے حد سخت جان واقع ہوئی ہے۔ لچن سے ایک قسم کا تیزاب پیدا ہوتا ہے جو سخت سے سخت چٹان کو بھی کاٹ کر رکھ دیتا ہے۔ اس طرح لچن کی بدولت یخ بستہ بیابانوں میں چٹانیں ٹوٹ پھوٹ کر مٹی میں تبدیل ہوتی رہتی ہیں۔

گرین لینڈ کے برفانی دریاؤں کے دہانوں پر جو چٹانی ٹیلے کھڑے ہیں وہ لچن سے سرسبز نظر آتے ہیں۔ کائی ان ٹیلوں کے درمیان نشیبی مقامات کو ڈھانپے ہوئے ہے، جہاں رطوبت جمع ہوتی رہتی ہے۔ لچن اور کائی سے ذرا آگے طرح طرح کی گھاس اُگی ہوئی نظر آتی ہے، اور سب سے آخری قطار جنگلی پھولوں کی ہے۔ ان میں سے بہت سے پھول وہ ہیں جو شمالی نصف کرہ کے معتدل خطوں میں ملتے ہیں۔ لیکن شدید سردی کے خلاف انہیں جو مسلسل جنگ لڑنا پڑتی ہے۔ اس نے ان کے قد کو بہت چھوٹا کر دیا ہے۔ مثلاً سُرخ آتشین پھول جس کا پودا معتدل خطوں میں چار فٹ کی لمبائی کو پہنچتا ہے۔ گرین لینڈ کے یخ بستہ بیابانوں میں صرف چار انچ رہ جاتا ہے۔

گرین لینڈ میں جنگلی پھولوں کے جھنڈ دیکھنے میں نہیں آتے۔ ایک دوسرے فاصلہ پر چٹانوں کی درزوں یا کسی ٹیلے کی اوٹ میں اُگے ہوئے نظر آتے ہیں، کئی پھولدار پودے جو معتدل خطوں میں خاصے اونچے ہو جاتے ہیں یہاں زمین پر جال کی شکل میں پھیلے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ان کی جڑیں حیرت انگیز قوت کے ساتھ سخت چٹانوں کو چیر کر نیچے سے نمی جذب کرتی ہیں۔ اس یخ بستہ بیابان میں روئیدگی کے راستے میں کئی ایک دشواریاں ہیں۔ ان میں سب سے بڑی دشواری رطوبت کی کمی ہے۔ اس کے بعد موزوں مٹی کی کمی اور گرمائی سورج کی

لگاتار تفاوت ہے۔ ان سب پر مستزاد سردی کی ناقابل بیان شدت ہے۔ ان باتوں کا ایک نتیجہ یہ بھی ہے، کہ آئس لینڈ میں کوئی درخت دیکھنے میں نہیں آتا۔ برفانی دریاؤں کے کناروں اور ان کے دہانوں پر صرف چھوٹے چھوٹے پودے اگ آتے ہیں اور بس۔

دائرۂ قطب شمالی میں جوں جوں شمال کو بڑھیں پودوں کا قد گھٹتا جاتا ہے۔ قطبی گلاب کا پودا ایک انچ سے زیادہ اونچا نہیں ہوتا۔ یہی حال باقی تمام پھولوں کا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ قطبی پھولدار پودوں میں سے اکثر ٹخنے سے زیادہ اونچائی کو نہیں پہنچتے۔ ایک ایسی وسیع یخ بستہ وسعت جس کے مقابلے میں نصف میل چوڑا یخ کا تودا بھی ایک حقیر سے تنکے کی حیثیت رکھتا ہو۔ وہاں نباتات کا اس قدر ٹھگنا قد قدرت کی ایک عجیب ستم ظریفی ہے۔

قطبی نباتات کی نشوونما کا زمانہ صرف چند ہفتوں تک محدود رہتا ہے۔ اس مختصر سی مدت میں یہ نباتات اپنی زندگی کے سارے مرحلے حیرت انگیز تیزی کے ساتھ طے کر لیتی ہے۔ اس سارے عرصے میں سورج لگاتار افق سے اوپر ہی اوپر چکر کاٹتا نظر آتا ہے۔ سورج کی روشنی کا یہ غیر منقطع تواتر یقینی طور پر پودوں کو بڑا ہونے سے روکتا ہے۔ لیکن ابھی اس بات کی سائنسی ماہیت معلوم نہیں ہو سکی کہ روشنی کا تواتر قوت نمو کا راستہ کس طرح روکتا ہے۔ سمندر، برف اور یخ سے روشنی کا مسلسل انعکاس روشنی کی مقدار کو مزید بڑھاتا ہے۔ روشنی کی یہ بے پناہ بہتات شگوفوں کے پھوٹنے کے عمل کو تیز تر کر دیتی ہے لیکن جس تیزی کے ساتھ نشوونما اپنی تمام منزلیں طے کر لیتی ہے۔ اس تیزی کے ساتھ خزاں بھی آتی ہے، اگست کے پہلے ہفتے تک تمام قطبی نباتات خزاں کے شوخ رنگ پتوں کا لباس پہن چکی ہوتی ہے۔

ہزاروں سال پرانی یخ

قطبی موسم گرما میں بارش بالکل برائے نام ہوتی ہے، جو تھوڑے بہت چھینٹے پڑتے بھی ہیں ان کا پانی بھی فوراً چٹانوں سے نیچے بہہ جاتا ہے۔ اس لیے اس بارش سے قطبی پھولوں کو کچھ خاص فائدہ نہیں پہنچتا موسم سرما میں معمولی سی برف گرتی ہے۔ اس کا کچھ حصہ وہ تند و تیز جھکڑ اڑا لے جاتے ہیں جو یہاں کثرت سے چلتے رہتے ہیں۔ پھر بھی کچھ برف چٹانوں اور ٹیلوں پر چپٹی رہتی ہے۔ یہی برف قطبی رُوئیدگی کا سبب ہے

انسانی نگاہ سے اوجھل رہے ہیں، اور جن کو دنیا کی موسمی کیفیات کا فیصلہ کرنے میں بڑا دخل ہے۔

آج گرین لینڈ کے برفانی دریاؤں کے کنارے غالباً اسی قسم کی نباتات ملتی ہیں جو تقریباً پچیس ہزار سال پہلے شمالی ایشیا۔ یورپ اور شمالی امریکہ کے بڑے حصے میں پائی جاتی تھی۔ آج گرین لینڈ کے بڑے حصے کو جس یخ کی چادر نے ڈھانپا ہوا ہے وہ اس ہزاروں میل لمبی چوڑی برفانی چادر کا ایک چھوٹا سا بچا کھچا ٹکڑا ہے جس نے آج سے ۲۵ ہزار سال پہلے شمالی نصف کرہ کے ایک بڑے حصے کو لپیٹ رکھا تھا۔

یخ بستہ علاقوں میں سب سے پہلے پیدا ہونے والا پودا لچن ہے۔ یہ ادنیٰ قسم کی نباتات سردی کے مقابلے میں بے حد سخت جان واقع ہوئی ہے۔ لچن سے ایک قسم کا تیزاب پیدا ہوتا ہے جو سخت سے سخت چٹان کو بھی کاٹ کر رکھ دیتا ہے۔ اس طرح لچن کی بدولت یخ بستہ بیابانوں میں چٹانیں ٹوٹ پھوٹ کر مٹی میں تبدیل ہوتی رہتی ہیں۔

گرین لینڈ کے برفانی دریاؤں کے دہانوں پر جو چٹانی ٹیلے کھڑے ہیں وہ لچن سے سرسبز نظر آتے ہیں کائی ان ٹیلوں کے درمیان نشیبی مقامات کو ڈھانپے ہوئے ہے، جہاں رطوبت جمع ہوتی رہتی ہے۔ لچن اور کائی سے ذرا آگے طرح طرح کی گھاس اُگی ہوئے نظر آتی ہے، اور سب سے آخری قطار جنگلی پھولوں کی ہے۔ ان میں سے بہت سے پھول وہ ہیں جو شمالی نصف کرہ کے معتدل خطوں میں ملتے ہیں۔ لیکن شدید سردی کے خلاف انہیں جو مسلسل جنگ لڑنا پڑتی ہے۔ اس نے ان کے قد کو بہت چھوٹا کر دیا ہے۔ مثلاً سُرخ آتشین پھول جس کا پودا معتدل خطوں میں چار فٹ کی لمبائی کو پہنچتا ہے۔ گرین لینڈ کے یخ بستہ بیابانوں میں صرف چار انچ رہ جاتا ہے۔

گرین لینڈ میں جنگلی پھولوں کے جھنڈ دیکھنے میں نہیں آتے۔ ایک دوسرے فاصلہ پر چٹانوں کی درزوں [illegible] میں اُگے ہوئے نظر آتے ہیں کئی پھول دار پودے جو معتدل خطوں میں خاصے اونچے ہو جاتے ہیں [illegible] نظر آتے ہیں ان کی جڑیں حیرت انگیز قوت کے ساتھ سخت چٹانوں [illegible] زندگی کے راستے میں کئی ایک دشواریاں [illegible] کے معتدل مٹی کی کمی اور گرمائی موسم کی

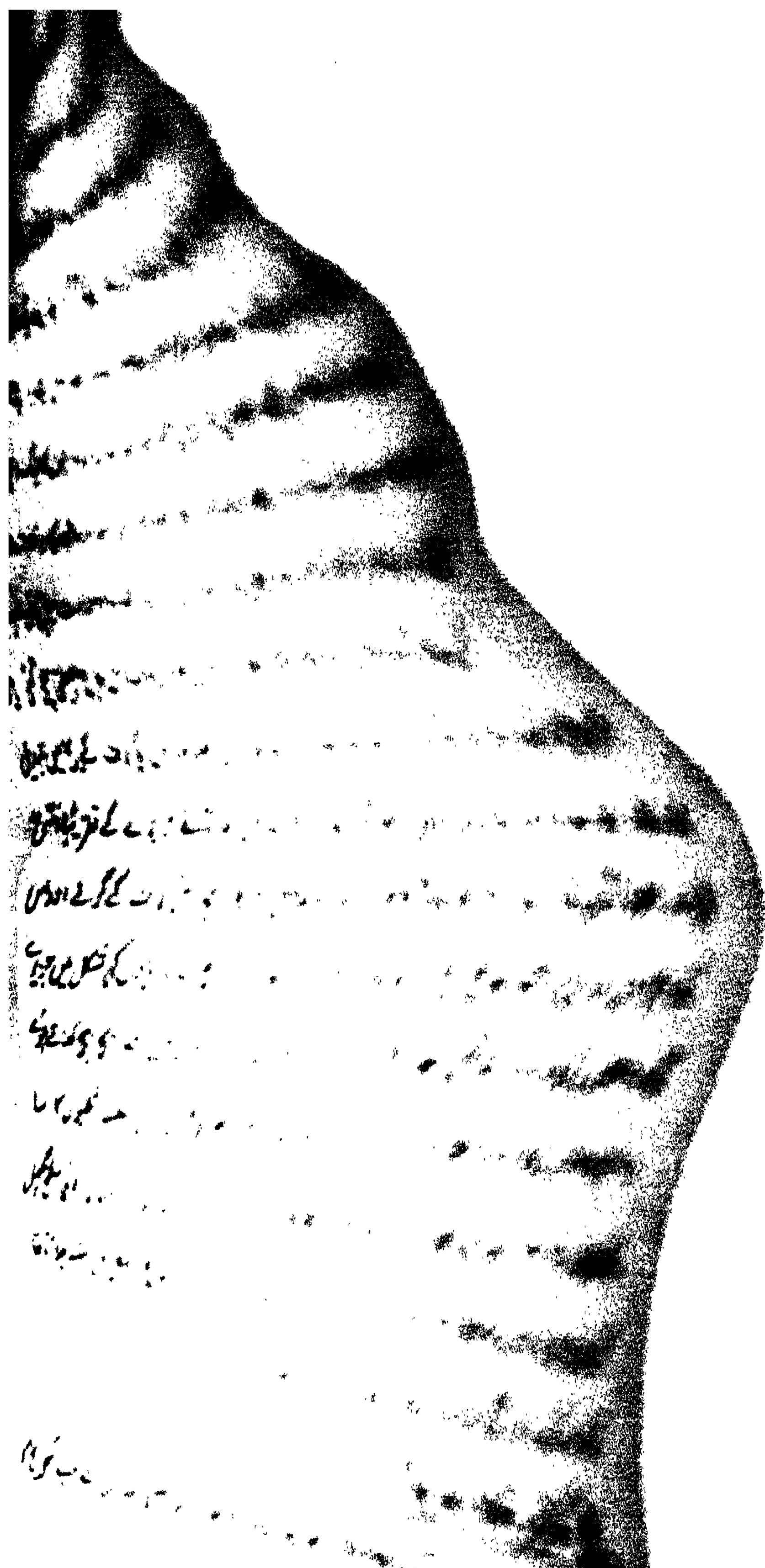
لگاتار تمازت ہے۔ ان سب پر مستزاد سردی کی ناقابل بیان شدت ہے۔ ان باتوں کا ایک نتیجہ یہ بھی ہے، کہ آئس لینڈ میں کوئی درخت دیکھنے میں نہیں آتا۔ برفانی دریاؤں کے کناروں اور ان کے دہانوں پر صرف چھوٹے چھوٹے پودے اگ آتے ہیں اور بس۔

دائرۂ قطب شمالی میں جوں جوں شمال کو بڑھیں پودوں کا قد گھٹتا جاتا ہے۔ قطبی گلاب کا پودا ایک انچ سے زیادہ اونچا نہیں ہوتا۔ یہی حال باقی تمام پھولوں کا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ قطبی پھولدار پودوں میں سے اکثر ٹخنے سے زیادہ اونچائی کو نہیں پہنچتے۔ ایک ایسی وسیع یخ بستہ وسعت جس کے مقابلے میں نصف میل چوڑا یخ کا تودا بھی ایک حقیر سے تنکے کی حیثیت رکھتا ہو۔ وہاں نباتات کا اس قدر ٹھگنا قدرت کی ایک عجیب ستم ظریفی ہے۔

قطبی نباتات کی نشوونما کا زمانہ صرف چند ہفتوں تک محدود رہتا ہے۔ اس مختصر سی مدت میں یہ نباتات اپنی زندگی کے سارے مرحلے حیرت انگیز تیزی کے ساتھ طے کر لیتی ہے۔ اس سارے عرصے میں سورج لگاتار افق سے اوپر ہی اوپر چکر کاٹتا نظر آتا ہے۔ سورج کی روشنی کا یہ غیر منقطع تواتر یقینی طور پر پودوں کو بڑا ہونے سے روکتا ہے۔ لیکن ابھی اس بات کی سائنسی ماہیت معلوم نہیں ہو سکی کہ روشنی کا فراواں تر تونت نمو کا راستہ کس طرح روکتا ہے۔ سمندر، برف اور یخ سے روشنی کا مسلسل انعکاس روشنی کی مقدار کو مزید بڑھاتا ہے۔ روشنی کی یہ بے پناہ بہتات شگوفوں کے پھوٹنے کے عمل کو تیز تر کر دیتی ہے لیکن جس تیزی کے ساتھ نشوونما اپنی تمام منزلیں طے کر لیتی ہے۔ اس تیزی کے ساتھ خزاں بھی آتی ہے، اگست کے پہلے ہفتے تک تمام قطبی نباتات خزاں کے شوخ رنگ پتوں کا لباس پہن چکی ہوتی ہے۔

ہزاروں سال پرانی یخ

قطبی موسم گرما میں بارش بالکل برائے نام ہوتی ہے، جو تھوڑے بہت چھینٹے پڑتے بھی ہیں ان کا پانی بھی فوراً چٹانوں سے نیچے بہہ جاتا ہے۔ اس لیے اس بارش سے قطبی پھولوں کو کچھ خاص فائدہ نہیں پہنچتا موسم سرما میں معمولی سی برف گرتی ہے۔ اس کا کچھ حصہ وہ تند و تیز جھکڑ اڑا لے جاتے ہیں جو یہاں کثرت سے چلتے رہتے ہیں۔ پھر بھی کچھ برف چٹانوں اور ٹیلوں پر چپٹی رہتی ہے۔ یہی برف قطبی روئیدگی کا سبب ہے



[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

بڑا سہارا ہے۔ گرمیوں میں سورج کی گرمی اس برف کو پگھلا کر پانی میں تبدیل کر دیتی ہے، اور یہ پانی سطح زمین کے بالائی پوست کے اوپر کے چند انچوں میں جذب ہو جاتا ہے۔ اس سے نیچے کی زمین مستقل طور پر یخ بستہ رہتی ہے۔ یہ چند انچ گہری مرطوب زمین ہر قسم کی روئیدگی کو پانی اور غذا بہم پہنچاتی ہے۔

گرین لینڈ میں ہموار زمین بہت کم ہے۔ اکثر پھلدار پودے جو سنگلاخ ٹیلوں پر جگہ جگہ سر اٹھائے نظر آتے ہیں، اپنے لیے خود زمین فراہم کرتے ہیں، ان کے پتے سال بہ سال نیچے گر گر کر اپنے لیے ایک چھوٹا سا گدا تیار کر لیتے ہیں۔ چوں کہ سردی کی شدت کے باعث فرسودگی کا عمل بہت سست رو ہے۔ اس لیے یہ پتے خشک ہو جانے کے باوجود تنے کے ساتھ ہی لٹکے رہتے ہیں۔ اس طرح ننھے سے تنے کے گرد مردہ پتوں کا ایک اچھا خاصہ غلاف تیار ہو جاتا ہے۔ جڑ کے ارد گرد اس غلاف کی موٹائی سب سے زیادہ ہوتی ہے۔ مردہ پتوں کا یہ غلاف رطوبت کو عین اس مقام پر محفوظ رکھتا ہے، جہاں پودے کو اس کی سب سے زیادہ ضرورت پیش آتی ہے۔

گرین لینڈ کے ساحلوں کے ساتھ ساتھ سنگلاخ چٹانیں چاروں طرف اس طرح پھیلتی چلی گئی ہیں جس طرح ایک پیالے کے گرد اس کے کنارے۔ جزیرے کا درمیانی حصہ صدیوں کی برف کے یخ میں تبدیل ہوتے رہنے سے اونٹ کے کوہان کی طرح ابھر گیا ہے۔ یخ کے اس پہاڑ نے جزیرے کے تقریباً اسّی فی صد حصے کو گھیر رکھا ہے۔ یخ کا یہ پہاڑ وسط میں تقریباً دو میل اونچا ہے۔ نئی برف کے گرنے اور اس کے یخ میں تبدیل ہو جانے سے نچلی یخ پر بے پناہ دباؤ پڑتا ہے، اور یہ یخ کے دریاؤں کی شکل میں جزیرے کے ساحلوں کی طرف سرکنے لگتی ہے۔ یخ کے یہ دریا نشیبوں اور وادیوں میں سے اینچ پیچ کھاتے ہوئے ساحلی علاقوں کی طرف بڑھتے ہیں۔ ہوائی جہاز سے ان کا منظر ہاتھ کی پھیلی ہوئی سفید انگلیوں کا سا دکھائی دیتا ہے۔ ان میں کچھ دریا سمندر تک پہنچ جاتے ہیں گرمیوں میں ان دریاؤں کی بالائی سطح پگھل کر پانی میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ اور اس طرح وہ پانی جو ان گنت صدیوں سے یخ کی شکل میں منجمد چلا آتا تھا، آزاد ہو کر روئیدگی کو سیراب کرنے میں صرف ہو جاتا ہے۔

یخ کے تیرتے ہوئے پہاڑ

یخ کا پہاڑ (آئس برگ) جہازرانوں کے لیے بہت بڑا خطرہ ہے۔ قطبی سمندروں سے جب کبھی یخ کا

کوئی پہاڑ تیرتا تیرتا قریب کے کسی سمندر مثلاً اوقیانوس میں بھی آ جاتا ہے، تو اس کا وجود جہازرانوں کے لیے ایک خطرہ بن جاتا ہے۔ لیکن گرین لینڈ کے اردگرد اس کے چٹانی ساحلوں کے ساتھ ساتھ برف کے یہ پہاڑ سینکڑوں کی تعداد میں تیرتے نظر آتے ہیں۔ گرین لینڈ کے ساحل دراصل دوسرے قطبی ساحلوں کی طرح برف کے پہاڑوں کی جنم بھومی ہیں۔

برف کے پہاڑ کس طرح وجود میں آتے ہیں؟ پیچھے ذکر آ چکا ہے کہ گرین لینڈ کے وسط سے برف کے دریا پھوٹ کر ہاتھ کی انگلیوں کی طرح چاروں سمتوں سے سمندر کا رخ کرتے ہیں۔ یہ صدیوں پرانی برف آہستہ آہستہ رینگتی رینگتی بالآخر سمندر میں جا داخل ہوتی ہے۔ برف کے دریا کا دہانہ قدرتی طور پر سطح سمندر سے نیچا ہوتا ہے۔ لہٰذا برف کی وہ دیو ہیکل انگلی جو جزیرے کے وسطی گنبد سے نکلی تھی، پانی کے نیچے ہی نیچے سمندر میں دور تک نکل جاتی ہے۔ برف چونکہ پانی سے ہلکی ہوتی ہے۔ اس لیے وہ اوپر ابھرنے کی کوشش کرتی ہے۔ ادھر برف کے وسطی گنبد سے ایک بے پناہ دباؤ اسے پانی سے نیچے رکھنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس کھینچا تانی میں برف کی اس دیو ہیکل انگلی کا اگلا سرا ٹوٹ جاتا ہے۔ دفعتہً ایک ایسی گرج سنائی دیتی ہے، جیسی ایک بہت بڑی توپ چلائی گئی ہو۔ ایک لمحہ بعد سطح سمندر پر برف کا ایک دیو ہیکل تودہ تیرتا نظر آتا ہے، اور سمندر کا پانی جو ایک لمحہ پہلے تک شیشے کی طرح ہموار تھا، اس تودے کے گرد گھومتا، بل کھاتا اور سفید جھاگ کی شکل میں گز دو گز اونچی اچھلتا دکھائی دیتا ہے۔ رفتہ رفتہ یہ طوفانی تلاطم ختم ہو جاتا ہے، اور برف کا یہ پہاڑ خراماں خراماں اپنے دوسرے ساتھیوں کی صف میں جا شامل ہوتا ہے۔

حضرت انسان بھی موجود ہے

قطبی دنیا کی عظیم وسعت اور اس کا پُرہیبت حسن انسان کو ورطۂ حیرت میں ڈال دیتا ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ فطرت کے اس نگارخانہ کو انسان نے اب تک چھوا نہیں۔ اس پُرشکوہ وسعت میں انسان بمشکل نظر آتا ہے۔ کارخانہ قدرت کے اس گوشے میں انسان اور اس کی بستیوں کا وجود چند حقیر سے نقطوں سے زیادہ نہیں ہے۔

تاہم حضرت انسان اس جگہ بھی موجود ہے۔ وہ صدیوں سے اس برف بستہ بیابان کے انتہائی شدید

موسمی حالات کا مقابلہ کر رہا ہے۔ اور اب تک زندہ ہے۔ مغربی ملاحوں کے گرین لینڈ میں پہنچنے سے پہلے ۷۸ درجہ عرض بلد کی شمالی ساحلی چٹانوں کے آس پاس اسکیمو لوگ آباد تھے۔ ۱۸۱۸ء میں جب مشہور انگریز جہاز راں سر جان راس نے راس یارک کے قریب پہلی بار قطبی اسکیمو دیکھے تو جس قدر تعجب اسے ہوا، اس سے زیادہ تعجب ان قطبی باشندوں کو ہوا۔ ان کا خیال تھا کہ دنیا صرف ان کے برخ بستہ بیابان تک محدود ہے، اور ان کے علاوہ دنیا میں اور کوئی لوگ نہیں بستے۔

گرین لینڈ کا جزیرہ ڈنمارک کے ماتحت ہے۔ لیکن حال ہی میں ریاست ہائے متحدہ امریکہ نے اس جزیرے میں سب سے بڑا ہوائی اڈہ قائم کرلیا ہے۔ جزیرے کے انتہائی شمال مغرب میں آج صرف کوئی تین سو قطبی اسکیمو آباد ہیں۔ امریکی ہوائی اڈہ ان کی قدیم بستی تھیولی کے قریب تعمیر کیا گیا ہے۔ ڈنمارک کی حکومت نے ان کی بستی ہوائی اڈے سے ۷۰ میل دور نیو تھیول کے نام سے قائم کردی ہے۔ تاکہ یہ لوگ ان وبائی امراض سے بچے رہیں جو گوری نسل کے لوگ اپنے ساتھ لے آتے ہیں۔ عام زکام جو باقی دنیا کے لیے ایک معمولی شکایت ہے، اسکیمو لوگوں کے لیے ایک مہلک مرض ثابت ہوتا ہے کیونکہ ان کا جسمانی نظام اس مرض کی قوت مدافعت سے یکسر عاری ہے۔

ہوائی آمد و رفت کے سلسلے نے قطبی اسکیموؤں کو جدید تہذیب کے لوازمات اور آسائشوں سے آشنا کردیا ہے۔ نیو تھیول میں مکانات پتھر اور مٹی کی بجائے لکڑی کے بنے ہیں۔ انہیں بھاپ سے گرم رکھنے کا انتظام ہے۔ بجلی موجود ہے۔ ایک مدرسہ اور ایک ہسپتال بھی قائم ہے۔ ان ساری باتوں کے باوجود قطبی اسکیمو کی زندگی آج بھی انہی مشاغل میں گذرتی ہے جن کا وہ صدیوں سے عادی ہے۔ اس کی زندگی کا مدار ہمیشہ سمندر اور شکار پر رہا ہے۔ آج بے شک وہ چمڑے کی کشتی کی بجائے موٹر بوٹ استعمال کرتا ہے اور بعد سے نیزوں کی بجائے بندوق سے کام لیتا ہے، لیکن وہ اب بھی مچھلی، سمندری جانوروں، اور قطبی ریچھ کا شکار کرکے پیٹ پالتا ہے۔ اس نے کبھی کھیتی باڑی نہیں کی۔ نہ وہ اناج اور سبزیاں کھانے کا عادی ہے، وہ صرف مجبوری کی حالت میں پودوں کے پتے کھانے پر آمادہ ہوتا ہے ❖

تدریس فارسی

عبدالستار

کسی زبان میں ظاہر کیے ہوئے خیالات کو دوسری زبان میں بیان کرنے کا نام ترجمہ ہے۔ ترجمہ کرنا بہت مشکل ہے۔ صحیح ترجمہ اسی صورت میں ہو سکتا ہے، جبکہ ترجمہ کرنے والے کو دونوں زبانوں پر عبور حاصل ہو۔ ملکہ اور استعداد حاصل کرنے کے لیے کچھ مدت درکار ہوتی ہے۔

اساتذۂ کرام کو چاہیے کہ سب سے پہلے ایسے فقروں کا ترجمہ کرائیں جن میں کلمہ رابطہ آئے۔ اس سے فائدہ یہ ہوگا کہ طلباء کو الفاظ بدلنے نہ پڑیں گے، اور فارسی سیکھنے کا شوق پیدا ہوگا۔ مثلاً:۔

(۱) رشید بیمار ہے — رشید بیمار است۔

(۲) اصغر غیر حاضر تھا — اصغر غیر حاضر بود

(۳) یہ میز ہے — ایں میز است

جب اس قسم کے سادہ اور آسان فقروں کی مشق ہو جائے تو جار مجرور کا تصوّر دلایا جائے ان کی تعریف کی ضرورت نہیں۔ صرف اتنا بتا دیا جائے کہ مجرور اسم ہوتا ہے اور جار حرف۔ اردو میں حرف جار پہلے آتا ہے اور مجرور بعد میں، لیکن فارسی میں اس کے برعکس۔

گھر میں — میز پر — سکول سے

در خانہ — بر میز — از مدرسہ

گھر میں = در خانہ   میز پر = بر میز   سکول سے = از مدرسہ

بچوں کی سابقہ واقفیت سے استفادہ کرتے ہوئے فقروں کو اور پھیلا دیا جائے، اور سیکھے ہوئے مرکبات پر خط کھینچ دیا جائے۔ تاکہ لڑکوں کے ذہن میں پچھلا سبق فوراً آجائے۔

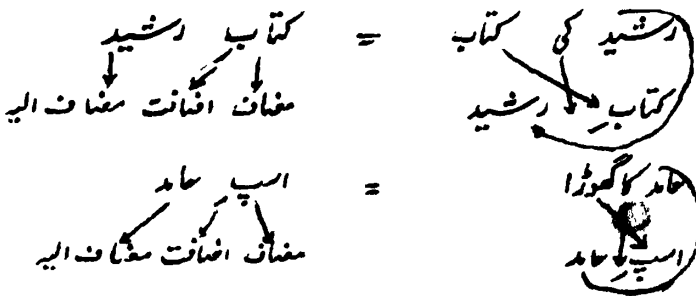
(۱) رشید گھر میں بیمار ہے — رشید در خانہ رنجور است

(۲) اصغر سکول سے غیر حاضر تھا — اصغر از مدرسہ غیر حاضر بود

(۳) میز کمرے میں ہے — میز در اطاق است

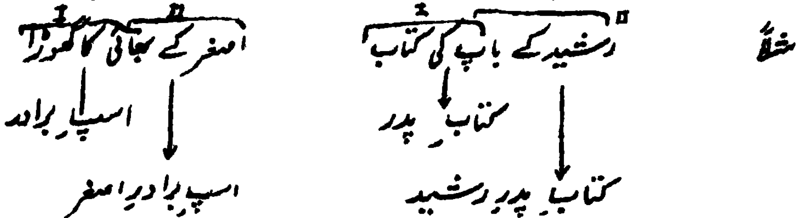
مرکبِ اضافی

سب سے زیادہ دقت مرکب اضافی کا ترجمہ کرتے وقت پیش آتی ہے۔ کالج اور منشی فاضل تک کے طلباء مرکب اضافی کا صحیح ترجمہ نہیں کر سکتے یہ دراصل ان کی بنیادی کمزوری ہے۔ ابتدائی جماعتوں میں مرکب اضافی کی خوب مشق کرائی جائے۔ اردو میں مضاف الیہ پہلے آتا ہے اور مضاف بعد میں۔ لیکن فارسی میں اس کے برعکس۔ مضاف کے نیچے اضافت کی یہ علامت " ِ " لگائی جاتی ہے جو کا۔ کے۔ کی کے معنی دیتی ہے۔ اردو کے مضاف اور مضاف الیہ کی ترتیب بدل دی جائے۔ اور مضاف کے نیچے اضافت کی علامت لگانا چاہیے۔ مثلاً۔



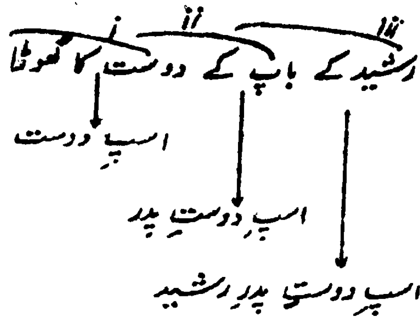
تواتر اضافت کا ترجمہ کرتے وقت ان کے مضاف اور مضاف الیہ کے الگ الگ حصے کر کے تختہ سیاہ پر سمجھائے جائیں۔ پہلے مضاف الیہ کو آخر میں لائیں اور دوسرے مضاف الیہ کے نیچے اضافت دیں۔ اگر زیادہ مضاف الیہ ہوں تو پہلے کو سب سے آخر میں دوسرے کو اس سے پہلے تیسرے کو اس سے پہلے

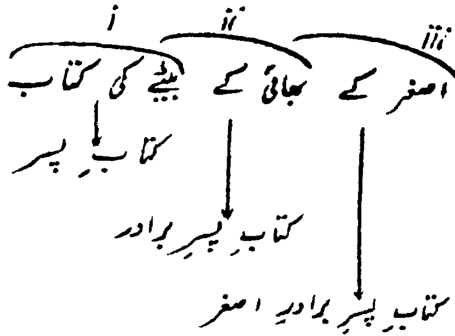
مثلاً



یعنی (۱) رشید کے باپ کی کتاب - کتابِ پدرِ رشید

(۲) اصغر کے بھائی کا گھوڑا - اسپِ برادرِ اصغر





(۱) رشید کے باپ کے دوست کا گھوڑا - اسپِ دوستِ پدرِ رشید

(۲) اصغر کے بھائی کے بیٹے کی کتاب - کتابِ پسرِ برادرِ اصغر

جب بچے مرکب اضافی سمجھ لیں تو مندرجہ ذیل قسم کے فقرے آسانی سے بنا سکیں گے -

(۱) نصیر کے باپ کی بکری گم ہو گئی — بزِ پدرِ نصیر گم شد

(۲) اصغر کے بھائی کے بیٹے کا گھوڑا گھر میں موجود ہے - اسپِ پسرِ برادرِ اصغر در خانہ موجود است

(۳) رشید کے باپ کے دوست کی کتاب میز پر ہے — کتابِ دوستِ پدرِ رشید بر میز است

مرکب توصیفی

اردو میں صفت پہلے اور موصوف بعد میں آتا ہے، اور فارسی میں اس کے برعکس - ترجمہ کرتے ہوئے ترتیب بدل دو۔ اور موصوف کے آخر میں اضافت لگاؤ - مثلاً :-

خوبصورت قلمدان — نیک لڑکا — مہربان مادر

قلمدانِ قشنگ — طفلِ نیک — مادرِ مہربان

فعل مجہول:- استاد تختہ سیاہ پر فعل مجہول کے بنانے کا طریقہ اس طرح سمجھائے۔ اصل فعل کا ماضی مطلق

صیغہ واحد غائب بنا کرہ زیادہ کرے اور شدن مصدر سے فعل مطلوبہ بنائے۔ مثلاً نوشتن سے فعل حال مجہول بنانا ہے۔

نوشتن سے ماضی مطلق صیغہ واحد غائب = نوشت

آخر میں ہ بڑھا کر = نوشتہ

شدن مصدر سے فعل حال = مے شود

فعل حال مجہول = نوشتہ مے شود

ترجمہ کے لیے مشق :۔

(۱) بھائی کے نام خط لکھا جائے گا — بنام برادر نامہ نوشتہ خواہد شد

(۲) لڑائی میں لوگ مارے جاتے ہیں — در جنگ مردماں کشتہ می شوند

(۳) جب تک عراق سے تریاق لایا جائے — تا تریاق از عراق آوردہ شود
سانپ کا ڈسا مر جائے — مارگزیدہ مردہ شود

(۴) تم سیدھے راستے سے بھٹک گئے ہو — شما از راہ راست گمراہ شدہ بودید

(۵) ہم ملاقات کے کمرے میں بلائے جائیں گے — ما در اطاقِ پذیرائی طلبیدہ خواہیم شد

دعائیہ جملے :۔ دعائیہ فقروں کا ترجمہ کرنے کے لیے فعل مضارع کے آخری حرف د سے پہلے آ زیادہ کرتے ہیں۔ مثلاً کند سے کناد۔ دارد سے داراد

(۱) خدا تجھے اپنی حفاظت میں رکھے۔ — خدا ترا در حفظِ خود داراد

(۲) خدا پاکستان کو سلامت رکھے — خدا پاکستان را سلامت داراد

(۳) دشمنوں کا نام و نشان نہ رہے — نام و نشانِ دشمناں نماناد

(۴) خدا تیری روزی میں نقصان نہ کرے — خدا بروزگارت خللے مرساد

(۵) خدا تجھے امتحان میں کامیابی دے — خدا ترا در امتحاں سرخرو کناد

فعل معاون :۔ (توانستن) ترجمہ کرتے وقت توانستن مصدر سے مطلوبہ فعل بناؤ اور اصلی

مصدر سے ماضی مطلق صیغہ واحد غائب بناؤ مثلاً

(۱) آج حمید وہاں نہیں پہنچ سکا۔ — امروز حمید آنجا نتوانست رسید

(۲) کیا تم فارسی میں گفتگو کر سکتے ہو۔ — آیا شما در پارسی گفتگو می توانید کرد

(۳) وہ کل لاہور نہیں جا سکا۔ — او دیروز بلاہور نتوانست رفت

فعل تاکیدی :۔ (بائستن) ایسا فعل جو کسی دوسرے فعل کی تاکید میں لایا جائے ترجمہ کرتے وقت فقرے کی بناوٹ کا خیال رکھا جائے۔ بائستن کا مضارع باید دو طرح استعمال ہوتا ہے۔ مثلاً

(۱) اس کو یہ کام کرنا چاہیے۔ — او را این کار باید کرد

اس کو چاہیے کہ یہ کام کرے — او را باید کہ این کار بکند

(۲) حمید کو خط لکھنا چاہیے — حمید را نامہ باید نوشت

حمید کو چاہیے کہ خط لکھے — حمید را باید کہ نامہ نویسد

(۳) ہم کو بازار جانا چاہیے — مارا ببازار باید رفت

ہم کو چاہیے کہ بازار جائیں — مارا باید کہ ببازار برویم

پہلی صورت میں باید ماضی مطلق صیغہ واحد غائب سے پہلے آتا ہے۔ اور دوسری صورت میں باید کے بعد لفظ کہ بڑھا کر آخر میں فعل مضارع واحد غائب کا صیغہ استعمال ہوتا ہے۔

فعل رخصتی :۔ (گذاشتن) ایسے فعل جن سے اجازت کی خواہش ظاہر ہو۔ ایسے افعال کا ترجمہ کرنے کے لیے مصدر گذاشتن سے فعل مطلوبہ بنا کر اس کے بعد لفظ کہ لگاؤ۔ پھر اصل فعل کا مضارع بناؤ

مثلاً (۱) ہم اسے جانے نہ دیں گے — نخواہیم گذاشت کہ برود

(۲) بھائی نے مجھے خط لکھنے نہ دیا — برادر نگذاشت کہ نامہ بنویسم

(۳) آج رات کتے نے بچے کو سونے نہ دیا — امشب سگ نگذاشت کہ بچہ بخسپد

خواستن کا استعمال :۔ اگر کسی کام کے کرنے کی خواہش پائی جائے تو اس کا ترجمہ دو طرح کیا جاتا

(۱) میں روٹی کھانا چاہتا ہوں — من نان خوردن مے خواہم

میں چاہتا ہوں کہ روٹی کھاؤں — مے خواہم کہ نان بخورم

(۲) ارشد خط لکھنا چاہتا ہے — ارشد نامہ نوشتن مے خواہد

ارشد چاہتا ہے کہ خط لکھے — ارشد مے خواہد کہ نامہ بنویسد

ہمینکہ (جونہی کہ کا استعمال) ایسے جملوں کا ترجمہ جن میں ایک فعل کے ختم ہوتے ہی دوسرا فعل شروع ہو جائے۔ اس قسم کے فقروں کا تین طرح ترجمہ ہو سکتا ہے۔ مثلاً:۔

(۱) شیر کو دیکھتے ہی جانور بھاگ گئے — دیدنِ شیر ہماں بود و دویدن جانوراں ہماں

(۲) جونہی کہ شیر کو دیکھا جانور بھاگ گئے — ہمچو دیدن شیر جانوراں دو یدند

قریب کا استعمال :۔ جب کوئی امر واقع ہونے والا ہو تو فارسی میں اس کے لیے قریب است یا قریب بود استعمال کرتے ہیں۔ مثلاً

(۱) چور بھاگا ہی چاہتا تھا کہ سپاہی نے اسے آلیا ؛ قریب بود کہ دزد بگریزد کہ سرباز اورا گرفت

(۲) ہم یہ کتاب خریدا چاہتے ہیں — قریب است کہ ما این کتاب بخریم

(۳) میں اپنے بھائی کو خط لکھا ہی چاہتا ہوں ؛ قریب است کہ برادرم را نامہ بنویسم

چندانکہ اور ہر چند :۔ فارسی میں "جتنا" اور "جوں جوں" کے لیے چندانکہ اور ہر چند الفاظ آتے ہیں۔ لیکن ووں ووں یا توں توں کے لیے کوئی لفظ نہیں، جیسے :۔

(۱) جتنا ہم نے اس کو سمجھایا اتنا ہی بدچلن ہو گیا — چندانکہ اورا فہمانیدیم بہ راہ زیادہ گشت۔

(۲) مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی — چندانکہ معالجہ نمودیم مرض بیفزود

(۳) جوں جوں آدمی بوڑھا ہوتا ہے توں توں اس کی عقل کم ہوتی جاتی ہے۔

چنداں کہ مرد سالخوردہ مے شود عقلش کم مے گردد

گرفتن کا استعمال :۔ کسی کام کے شروع کرنے کے لیے اردو میں لگنا یا لگنے کا استعمال ہوتا ہے فارسی میں گرفتن آتا ہے۔ اصل مصدر کے بعد گرفتن مصدر سے مطلوبہ فعل بنا کر ترجمہ کیا جاتا ہے۔ مثلاً۔

رشید کھانا کھانے لگا ؛ رشید طعام خوردن گرفت وغیرہ ؛

معذور بچوں کی تعلیم

نذیر احمد

جو بچے کوئی ایسا جسمانی نقص لے کر پیدا ہوئے ہوں یا جو پیدائش کے بعد کسی وجہ سے کسی ایسے جسمانی نقص کا شکار ہو جائیں جو انہیں عام بچوں کی سی جسمانی صلاحیتوں سے محروم کر دے، وہ بچے معذور بچے کہلاتے ہیں۔ اندھے گونگے، بہرے، مفلوج اور ضعیف العقل بچے تمام معذور بچوں کے زمرے میں شامل ہیں، یہ وہ بدنصیب بچے ہیں جو قدرت کی طرف سے بنیادی جسمانی نعمتوں سے محروم کر دیے گئے ہیں اور جن کے لیے زندگی کی لذتوں کے بہت سے دروازے بند ہیں۔

پرانا تصور

معذور بچوں کے متعلق لوگوں کا پرانا تصور بڑا افسوس ناک تھا۔ ماں باپ انہیں باعث ننگ خیال کرتے تھے اور معاشرہ انہیں اپنے لیے ایک بوجھ سمجھتا تھا۔ جب رفتہ رفتہ انسانی ضمیر کو ان بدنصیب معصوموں کی محرومی کا احساس ہوا تو ان کی خبر گیری اور تعلیم و تربیت کے لیے خاص ادارے قائم کیے گئے۔ مثلاً اندھوں، بہروں اور گونگوں کے مدرسے یا اقامت گاہیں۔ ان اداروں میں ان بچوں کو ایک ساتھ رکھا جاتا اور زندگی کے اکثر دن وہ اسی قسم کے اپاہج خانوں میں باقی دنیا سے کٹ کر گزار دیتے۔ مخیر لوگوں کی مالی مدد اور سرکاری خزانے کے عطیے ان اداروں کے کفیل تھے۔ مگر ایک تو ایسے اداروں کی تعداد اتنی کافی نہ ہوتی کہ تمام معذور بچوں کی خبر گیری کی جا سکے۔ دوسرے ان اداروں کی زندگی اس قدرتی بشاشت اور چہل پہل سے عموماً محروم رہتی، جو عام صحت مند زندگی کا خاصہ ہے۔

جدید نفسیات کا احسان

جدید نفسیاتی انکشافات نے جہاں علم التعلیم کے بنیادی تصورات میں انقلابی تبدیلی پیدا کی ہے، وہاں انہوں نے معذور بچوں پر بھی بڑا احسان کیا ہے۔ نفسیاتی تحقیقات نے یہ بات پوری طرح ثابت کر دی کہ

پوری اور متوازن نشوونما کے لیے ضروری ہے کہ اسے اپنے قدرتی ماحول میں اپنی فطری صلاحیتوں اور غالب میلانوں کو آزادی کے ساتھ معلوم کرنے اور ترقی دینے کے مواقع مہیا کیے جائیں۔ اس نفسیاتی انکشاف نے معذور بچوں کی محرومی کو دوگونہ رنگ میں پیش کیا۔ جسمانی محرومی تو ان پر نامہربان قدرت کی طرف سے مسلط کردہ تھی اور یہ محرومی اکثر صورتوں میں لا علاج نظر آتی۔ لیکن ایک اور محرومی ان پر والدین اور معاشرے کی طرف سے تھوپی گئی ہوتی۔ معاشرہ انہیں گھر کے پُرمحبت اور قدرتی ماحول سے گھسیٹ کر دور دراز اداروں کی چار دیواری میں لے جاتا اور یہ بدنصیب چاروناچار اس دوہری محرومی کا بوجھ اٹھائے ہوئے زندگی کے دن پورے کر جاتے۔

ہرچند کہ معذور بچوں کے لیے خصوصی ادارے قائم کرنے والوں کی نیت بہت نیک تھی، وہ ان کی محرومی کے بوجھ کو ہلکا کرنا چاہتے تھے۔ یا کم از کم وہ ان حرماں نصیب والدین کی مدد کرنا چاہتے تھے جن کے بچے کسی جسمانی معذوری کا شکار ہوتے۔ لیکن نیت کا یہ خلوص معذور بچوں کی سیاہ بختی میں اضافے کا موجب ہوتا وہ اس پیار اور فہم سے بھرپور ماحول سے محروم ہو جاتے جس کا نام گھر ہے، اور جس کا بدل اور کوئی شے نہیں ہو سکتی۔ وہ ماں باپ اور بھائی بہنوں سے کٹ جاتے۔ وہ ان مانوس در و دیوار اور گلی کوچوں کو ترستے جہاں انہوں نے بچپن کا سارا زمانہ گزارا تھا۔ وہ بچپن کے ان ساتھیوں کو یاد کرتے جن کے ساتھ وہ معصومیت کی کھیلوں میں شریک ہوا کرتے تھے۔ کسی ادارے کے استادوں اور کارکنوں کا بہتر سے بہتر سلوک بھی ماں باپ کی محبت کا بدل نہیں ہو سکتا تھا۔

ان ثابت شدہ نفسیاتی حقائق نے معذور بچوں کی تعلیم کے نظریے کو یکسر بدل دیا ہے۔ اب ترقی یافتہ ملکوں میں یہ اصول تسلیم کر لیا گیا ہے کہ انہیں مخصوص تربیتی اداروں میں بھیجنے کی بجائے حتی الامکان گھر سے قریب ترین مدرسے میں بھیجنا چاہیے۔ عام مدرسوں میں معذور بچوں کے لیے خاص جماعتیں جاری کرنی چاہئیں نہ کہ ان کے لیے خاص ادارے۔ معذور بچوں کی تعلیم و تربیت کے جدید نظریے کو برطانوی وزارت تعلیم کے ایک حالیہ کتابچے میں یوں بیان کیا گیا ہے۔

" ہمارے پیش نظر لگاتار یہ عام مقصد ہے کہ ہر معذور بچے کے لیے ایسی تعلیم کا بندوبست کیا جائے جو اُس کی عمر، قابلیت اور خصوصی میلان کے مطابق ہو۔ نیز جہاں تک ممکن ہو یہ تعلیم ایک قدرتی ماحول اور ایک قدرتی

پس منظر میں دی جائے۔"

برطانیہ میں ۱۹۴۴ء کے قانون تعلیم نے معذور بچوں کی تعلیم کے اس جدید نظریے کو آئینی حیثیت دی تھی برطانیہ میں اس جدید نظریے کو جس حد تک عملی طور پر اپنایا گیا ہے۔ اس کا کچھ اندازہ وزارت تعلیم کے ایک کتابچے سے ہو سکتا ہے جس میں ۱۹۴۵ء سے ۱۹۵۵ء تک کے دس سالہ عرصے میں معذور بچوں کی تعلیم کا جائزہ لیا گیا ہے۔ اس کتابچے میں کہا گیا ہے کہ:۔

"بجا یہ امر قابل ذکر ہے کہ ایک ایسے دور میں جب مقامی تعلیمی حکومتوں پر ابتدائی اور ثانوی تعلیم کا بوجھ بہت بڑھ چکا ہے اور زمانہ مابعد جنگ میں شرح پیدائش کے بڑھ جانے اور لازمی تعلیم کے عرصہ کے بڑھا دیے جانے کے سبب ان کے سامنے زیادہ بچوں کو تعلیم دینے اور ان کے لیے نئے مدرسے کھولنے کا بڑا مسئلہ درپیش ہے۔ یہ حکومتیں اس قابل ہو سکی ہیں کہ زیر نظر دہائی میں معذور بچوں کے لیے اتنی تعلیمی سہولتیں بہم پہنچائیں جو اس سے پہلے کسی اور دہائی میں فراہم نہ کی گئی تھیں۔"

غرض معذور بچوں کی تعلیم کا نیا نظریہ اس بات میں یقین نہیں رکھتا کہ انہیں دور دراز مخصوص اداروں میں چھپا کر رکھا جائے۔ گویا انہیں دنیا کے حملوں سے بچانا مقصود ہو۔ اس کے برعکس نیا نظریہ اس بات کا قائل ہے کہ معذور بچوں کو اس مقامی معاشرے میں زندگی بسر کرنے کی تربیت ملنی چاہیے، جہاں وہ پیدا ہوئے۔ نیز جہاں تک ہو سکے یہ تربیت عام مدارس میں ملنی چاہیے۔ خواہ ان مدارس میں خاص جماعتیں جاری کرنا پڑیں جدید نظریہ تعلیم اور طب دونوں میں یکساں طور پر تسلیم کر لیا گیا ہے کہ تعلیم اور علاج دونوں کے لیے لوگوں کو ان کے گھر سے قریب ترین مقام پر رکھنا چاہیے۔ بجائے اس کے کہ انہیں دور دراز اداروں میں بھیجا جائے، یہ اس نظریے کا نتیجہ ہے کہ مغربی ملکوں میں اب مفلوج بچوں کو سوائے ایسی صورتوں کے جب وہ بیحد معذور ہو چکے ہوں عام مدرسوں میں بھیجا جاتا ہے۔

تعلیم کی قومی ذمہ داری

موجودہ صدی معاشرتی علوم اور جمہوری تصورات دونوں کی متوازی ترقی کا زمانہ ہے۔ اس صدی میں یہ نہ صرف نفسیات اور عمرانیات کے نئے نئے انکشافات نے پرانے نظریات کی بنیادیں کھوکھلی

کردی ہیں، بلکہ سلطانی جمہور کے روز افزوں تقاضوں نے نئے نظریات کو فوری طور پر عملی شکل دیے جانے کا سامان بھی کر دیا ہے۔ یہ ان دو گونہ قوتوں کا نتیجہ ہے کہ ترقی یافتہ ملکوں میں ثانوی درجہ تک کی تعلیم کو ایک اہم قومی ذمہ داری تسلیم کر لیا گیا ہے۔ برطانیہ میں ۱۹۴۴ء کے قانون تعلیم کی رو سے ثانوی تعلیم ہر لڑکے اور لڑکی کے لیے مفت اور لازمی قرار دی گئی تھی۔ ریاست ہائے متحدہ امریکہ اس معاملے میں برطانیہ سے پہل کر چکا تھا امریکہ اور برطانیہ کے بعد روس نے بھی ثانوی تعلیم کو ہر بچے کے لیے مفت اور لازمی بنا دیا ہے۔

ثانوی تعلیم کے مفت اور لازمی قرار دینے کی تہ پر یہ جمہوری اصول کارفرما ہے کہ بین الاقوامیت کے موجودہ دور میں جب ہر قوم کو دنیا کی باقی تمام قوموں سے مقابلہ درپیش ہے۔ کوئی قوم اس وقت تک سربلندی کی امید نہیں رکھ سکتی جب تک وہ اپنے بہترین دماغوں سے خدمت نہ لے لے۔ مطالعہ اور مشاہدہ نے یہ بات ثابت کر دی ہے کہ بہترین دماغ اوپر کے طبقے کا اجارہ نہیں، بلکہ اس معاملے میں قدرت کی فیاضی، اونچے نیچے تمام طبقوں کے لیے یکساں ہے۔ آبادی کے تمام طبقوں سے بہترین دماغوں کی تلاش کرنا، اور انہیں موزوں تربیت دے کر اہم قومی ذمہ داریاں اٹھانے کے قابل بنانا تعلیم کا کام۔ نیز یہ ایک ایسا عظیم الشان اور اہم کام ہے جس پر قومی تقدیر کا مدار ہے۔ لہٰذا قوم کو اس کام کی مناسب انجام دہی کے لیے ہر قیمت ادا کرنی چاہیے۔ یہ قیمت مفت اور جبری ثانوی تعلیم کی شکل میں ادا کی جاتی ہے۔

ثانوی درجہ تک تعلیم دیے بغیر عام نوجوانوں کی مخصوص صلاحیتوں کا کھوج لگانا ممکن نہیں۔ لہٰذا جمہوری ملکوں میں ہر شہری کا یہ حق تسلیم کر لیا گیا ہے کہ حکومت اسے ثانوی درجے تک مفت اور لازمی تعلیم دے۔ اسی حق کا ایک قدرتی نتیجہ معذور بچوں کی تعلیم ہے۔ آزاد جمہوری معاشرے کے افراد کے طور پر ان کو بھی یہ حق حاصل ہے کہ اپنی مخصوص صلاحیتوں کو امکانی حد تک ترقی دیں۔ یہ ترقی پسندیدہ صورت میں اسی وقت ممکن ہو سکتی ہے جب یہ آزادی اور محبت کے ماحول میں انجام پذیر ہو۔ یہ ہیں وہ معاشرتی اور نفسیاتی عوامل جنہوں نے پچھلی چند دہائیوں میں معذور بچوں کی تعلیم کے تصور کو سرے سے بدل دیا ہے۔

ترقی یافتہ ملکوں میں اس بات پر بس نہیں کی جاتی کہ معذور بچوں کو عام قسم کی ثانوی تعلیم دے دی جائے بلکہ انہیں حرفتی تعلیم بھی دی جاتی ہے۔ برطانوی وزارت تعلیم کی جس رپورٹ کا ذکر اوپر گزرا ہے۔ اس میں

یہ حرفتی اور صنعتی تعلیم کا ذکر ہے جو اندھے اور نیم اندھے بچوں کو دی گئی۔ اسی طرح بہرے اور نیم بہرے بچوں کو اعلیٰ پایہ کی حرفتی تعلیم دی گئی اور بچوں کی حرفتی تعلیم کے بارے میں برطانیہ میں جو پیش قدمی پچھلے دس سالوں میں ہوئی ہے وہ اپنی مثال آپ ہے۔

تعلیمی طور پر کمزور اور غیر ہم آہنگ بچے

معذور بچوں کے مقابلے میں تعلیمی طور پر کمزور اور غیر ہم آہنگ بچوں کو کم توجہ ملی ہے۔ برطانوی وزارت تعلیم کی دس سالہ رپورٹ میں اس امر کا اعتراف کیا گیا ہے کہ ایسے بچوں کے لیے خاص انتظامات کرنے کے راستے میں ابھی سخت دشواریاں حائل ہیں۔ تاہم رپورٹ میں امید ظاہر کی گئی ہے کہ مستقبل قریب میں یہ ممکن ہوگا کہ چھوٹے مدرسوں میں تعلیمی طور پر کمزور اور جذباتی طور پر پریشان بچوں کے لیے الگ جماعتیں جاری کی جاسکیں۔

ایک رائے یہ ہے کہ ایسے بچوں کو کسی ہسپتال کے مدرسے میں بھیجنا زیادہ موزوں طریق کار ہے۔ جذباتی طور پر غیر ہم آہنگ بچوں کا مسئلہ کافی ٹیڑھا ہے۔ برطانیہ میں اب تک اس مسئلے کا کوئی ایک شافی حل معلوم نہیں ہو سکا۔ کئی ایک مقامی تعلیمی حکومتوں میں دستور یہ ہے کہ صحت عامہ کے ذمہ دار لوگ بچوں کی نفسیاتی علاج گاہوں کے ساتھ مل کر کام کرتے ہیں۔ لیکن جہاں مقامی تعلیمی حکومت اس کام کے لیے جی کھول کر روپیہ صرف کرے وہاں بھی کیفیت یہ ہے کہ نفسیاتی علاج گاہوں میں لمبی لمبی انتظاری فہرستیں بنی رہتی ہیں۔ بہت کم مقامی تعلیمی حکومتیں ایسی ہیں جو اس بارے میں فیاضی سے کام لیں۔ بیشتر مقامی تعلیمی حکومتیں نفسیاتی علاج گاہ کے کام کو زیادہ اہمیت نہیں دیتیں اور اس کے لیے زیادہ رقم وقف نہیں کرتیں۔

جو بچے جذباتی طور پر اس قدر مجروح ہو چکے ہوں کہ طبی علاج کے سوا نہیں کوئی دوسری شے فائدہ نہ دے سکے ان کے لیے مناسب طبی سہولتیں فراہم ہونی چاہئیں۔ لیکن یہ منزل ابھی دور ہے۔ کیونکہ برطانیہ جیسے ملک کو بھی ابھی شکایت ہے کہ وزارت صحت اس قسم کے بچوں کے علاج کے لیے مناسب انتظام نہیں کر سکی۔ حقیقت یہ ہے کہ ابھی تک طبی دنیا جذباتی غیر ہم آہنگی کے مسئلہ کا سائنسی احساس پیدا نہیں

کردی ہیں، بلکہ سلطانی جمہور کے روز افزوں تقاضوں نے نئے نظریات کو فوری طور پر عملی شکل دینے کا سامان بھی کر دیا ہے۔ یہ ان دو گونہ قوتوں کا نتیجہ ہے کہ ترقی یافتہ ملکوں میں ثانوی درجہ تک کی تعلیم کو ایک اہم قومی ذمہ داری تسلیم کر لیا گیا ہے۔ برطانیہ میں ۱۹۴۴ء کے قانون تعلیم کی رو سے ثانوی تعلیم ہر لڑکے اور لڑکی کے لیے مفت اور لازمی قرار دی گئی تھی۔ ریاست ہائے متحدہ امریکہ اس معاملے میں برطانیہ سے پہل کر چکا تھا۔ امریکہ اور برطانیہ کے بعد روس نے بھی ثانوی تعلیم کو ہر بچے کے لیے مفت اور لازمی بنا دیا ہے۔

ثانوی تعلیم کے مفت اور لازمی قرار دینے کی تہ میں یہ جمہوری اصول کارفرما ہے کہ بین الاقوامیت کے موجودہ دور میں جب ہر قوم کو دنیا کی باقی تمام قوموں سے مقابلہ درپیش ہے۔ کوئی قوم اس وقت تک سربلندی کی امید نہیں رکھ سکتی جب تک وہ اپنے بہترین دماغوں سے خدمت نہ لے لے۔ مطالعہ اور مشاہدہ نے یہ بات ثابت کر دی ہے کہ بہترین دماغ اوپر کے طبقے کا اجارہ نہیں، بلکہ اس معاملے میں قدرت کی فیاضی، اونچے نیچے تمام طبقوں کے لیے یکساں ہے۔ آبادی کے تمام طبقوں سے بہترین دماغوں کی تلاش کرنا اور انہیں موزوں تربیت دے کر اہم قومی ذمہ داریاں اٹھانے کے قابل بنانا تعلیم کا کام۔ نیز یہ ایک ایسا عظیم الشان اور اہم کام ہے جس پر قومی تقدیر کا مدار ہے۔ لہٰذا قوم کو اس کام کی مناسب انجام دہی کے لیے ہر قیمت ادا کرنی چاہیے، یہ قیمت مفت اور جبری ثانوی تعلیم کی شکل میں ادا کی جاتی ہے۔

ثانوی درجہ تک تعلیم دیے بغیر عام نوجوانوں کی مخصوص صلاحیتوں کا کھوج لگانا ممکن نہیں۔ لہٰذا جمہوری ملکوں میں ہر شہری کا یہ حق تسلیم کر لیا گیا ہے کہ حکومت اسے ثانوی درجے تک مفت اور لازمی تعلیم دے۔ اسی حق کا ایک قدرتی نتیجہ معذور بچوں کی تعلیم ہے۔ آزاد جمہوری معاشرے کے افراد کی طرح ان کو بھی یہ حق حاصل ہے کہ اپنی مخصوص صلاحیتوں کو امکانی حد تک ترقی دیں۔ یہ ترقی پسندیدہ صورت میں اسی وقت ممکن ہو سکتی ہے جب یہ آزادی اور محبت کے ماحول میں انجام پذیر ہو۔ یہ ہیں وہ معاشرتی اور نفسیاتی عوامل جنہوں نے پچھلی چند دہائیوں میں معذور بچوں کی تعلیم کے تصور کو سرے سے بدل دیا ہے۔

ترقی یافتہ ملکوں میں اس بات پر بس نہیں کی جاتی کہ معذور بچوں کو عام قسم کی ثانوی تعلیم دے دی جائے بلکہ انہیں حرفتی تعلیم بھی دی جاتی ہے۔ برطانوی وزارت تعلیم کی جس رپورٹ کا ذکر اوپر گزرا ہے۔ اس میں

اس حرفتی اور صنعتی تعلیم کا ذکر ہے جو اندھے اور نیم اندھے بچوں کو دی گئی۔ اسی طرح بہرے اور نیم بہرے بچوں کو اعلیٰ پایہ کی حرفتی تعلیم دی گئی اور بچوں کی حرفتی تعلیم کے بارے میں برطانیہ میں جو پیش قدمی پچھلے دس سالوں میں ہوئی ہے وہ اپنی مثال آپ ہے۔

تعلیمی طور پر کمزور اور غیر ہم آہنگ بچے

معذور بچوں کے مقابلے میں تعلیمی طور پر کمزور اور غیر ہم آہنگ بچوں کو کم توجہ ملی ہے۔ برطانوی وزارت تعلیم کی دس سالہ رپورٹ میں اس امر کا اعتراف کیا گیا ہے۔ کہ ایسے بچوں کے لیے خاص انتظامات کرنے کے راستے میں ابھی سخت دشواریاں حائل ہیں۔ تاہم رپورٹ میں امید ظاہر کی گئی ہے کہ مستقبل قریب میں یہ ممکن ہوگا کہ چھوٹے مدرسوں میں تعلیمی طور پر کمزور اور جذباتی طور پر پریشان بچوں کے لیے الگ جماعتیں جاری کی جاسکیں۔

ایک رائے یہ ہے کہ ایسے بچوں کو کسی ہسپتال کے مدرسے میں بھیجنا زیادہ موزوں طریق کار ہے۔

جذباتی طور پر غیر ہم آہنگ بچوں کا مسئلہ کافی ٹیڑھا ہے۔ برطانیہ میں اب تک اس مسئلے کا کوئی ایک شافی حل معلوم نہیں ہو سکا۔ کئی ایک مقامی تعلیمی حکومتوں میں دستور یہ ہے کہ صحت عامہ کے ذمہ دار لوگ بچوں کی نفسیاتی علاج گاہوں کے ساتھ مل کر کام کرتے ہیں۔ لیکن جہاں مقامی تعلیمی حکومت اس کام کے لیے جی کھول کر روپیہ صرف کرے وہاں بھی کیفیت یہ ہے کہ نفسیاتی علاج گاہوں میں لمبی لمبی انتظاری فہرستیں بنی رہتی ہیں۔ بہت کم مقامی تعلیمی حکومتیں ایسی ہیں جو اس بارے میں فیاضی سے کام لیں۔ بیشتر مقامی تعلیمی حکومتیں نفسیاتی علاج گاہ کے کام کو زیادہ اہمیت نہیں دیتیں اور اس کے لیے زیادہ رقم وقف نہیں کرتیں۔

جو بچے جذباتی طور پر اس قدر مجروح ہو چکے ہوں کہ طبی علاج کے سوا انہیں کوئی دوسری شے فائدہ نہ دے سکے ان کے لیے مناسب طبی سہولتیں فراہم ہونی چاہئیں۔ لیکن یہ منزل ابھی دور ہے۔ کیوں کہ برطانیہ جیسے ملک کو بھی ابھی شکایت ہے کہ وزارت صحت اس قسم کے بچوں کے علاج کے لیے مناسب انتظام نہیں کر سکی۔ حقیقت یہ ہے کہ ابھی تک طبی دنیا جذباتی غیر ہم آہنگی کے مسئلہ کا سائنسی احساس پیدا نہیں

کرسکا۔ عام حالت یہ ہے کہ اگر کسی بچے کو عصبی اکھیڑا کی شکایت ہو تو ڈاکٹر اور نفسیاتی معالج مل کر علاج کرنے سے انکار کر دیں گے۔ بلکہ اغلب یہ ہے کہ ان میں سے ہر ایک دوسرے کو کوسے گا۔ یہ صورت حال اس بات کا تقاضا کرتی ہے کہ تعلیم اور صحت کے ذمہ دار لوگوں کے درمیان بہتر فہم اور زیادہ سے زیادہ ہمدردانہ اشتراک عمل پیدا ہو۔

ایک اہم نکتہ

جدید نفسیات اور نئی نئی سائنسی ایجادوں نے معذور بچوں کی زندگیاں خوش گوار بنانے میں جو خدمت انجام دی ہے وہ ناقابل انکار ہے لیکن جسمانی معذوری کے علاوہ ایک اور قسم کی معذوری کا ذکر بھی اوپر کی سطروں میں ہوا ہے۔ اس معذوری کو جذباتی غیر ہم آہنگی کا نام دیا گیا ہے۔ اس کے ضمن میں یہ کہا گیا ہے کہ اس کا شافی علاج اب تک دستیاب نہیں ہو سکا۔ حقیقت نفس الامری یہ ہے کہ جذباتی غیر ہم آہنگی اس روحانی کیفیت کا نام ہے جو سکون دل کے فقدان کا دوسرا نام ہے۔ مغرب کی مادہ پرست تہذیب نے اس روحانی مرض کی تباہ کاریوں کو عام کر رکھا ہے، اور اب یہ بچوں تک کو متاثر کرنے لگی ہے۔ ستم بالائے ستم یہ ہے کہ مغرب اس روحانی مرض کا علاج بدنی دوا دارو اور ذہنی موشگافیوں میں تلاش کر رہا ہے۔ اسے اس امر کی حقیقت کا احساس ہونا ابھی باقی ہے کہ دلوں کو اطمینان کی دولت سے مالا مال کرنے والا شافی نسخہ صرف ایک ہے اور وہ ہے اللہ کا ذکر ؎

معلومات عامہ

عالمی صحت کی اسمبلی کی طرف سے دو عطیے

عالمی صحت کی اسمبلی نے جس کا دسواں اجلاس جنیوا میں ہو رہا ہے، طب کے میدان عمل میں غیر معمولی خدمات انجام دینے والے دو ماہرین کو عطیات پیش کیے ہیں:- ان میں سے ایک ریاست ہائے متحدہ کے ڈاکٹر پال ایف رسل ہیں جن کو اس سال کا ڈارلنگ فاؤنڈیشن میڈل اور ایک ہزار سوئٹزر لینڈ فرانک بطور انعام دیے گئے ہیں۔ کیوں کہ انھیں ملیریا کی روک تھام کے سلسلے میں غیر معمولی کامیابی ہوئی ہے۔ وہ ۱۹۲۳ء سے روک فیلر فاؤنڈیشن کی طرف سے فلپین، بھارت، وینی زوئیلا اور اٹلی میں ملیریا کے خلاف منصوبوں کو عمل میں لاتے رہے ہیں، انھوں نے دوسری جنگ عظیم سے پہلے ہی کیڑے مار ادویات چھڑکنے کا طریقہ تحقیق کر لیا تھا۔ وہ ۱۹۵۵ء سے ۱۹۵۶ء تک عالمی ادارۂ صحت میں خاص مشیر کی حیثیت سے متعین رہے ہیں۔ اس سال ڈارلنگ فاؤنڈیشن کی طرف سے پانچواں انعام دیا گیا ہے۔ یہ ادارہ ڈاکٹر ایس۔ ٹی۔ ڈارلنگ کی یاد میں مجی چندوں سے قائم ہوا تھا، وہ مجلس اقوام کے ماتحت ملیریا کمیشن میں کام کرتے ہوئے ایک حادثے میں فوت ہو گئے تھے دوسرا انعام لیون برنارڈ فاؤنڈیشن کی طرف سے پولینڈ کے پروفیسر مارسن کرزاک کو دیا گیا ہے، گویا معاشرتی ادویات کے ضمن میں ان کی مسلسل اور عالمگیر تحصیلات کو مدنظر رکھ کر ان کی خدمات کا اعتراف کیا گیا ہے۔ وہ وارسا میڈیکل اکاڈمی کے ریکٹر ہیں۔ ان کو انعام دیتے ہوئے اسمبلی کے صدر عراق کے نمائندے ڈاکٹر صبیح حسن الوہبی نے بیان کیا کہ پروفیسر موصوف پچھلے تین سال سے پولینڈ میں معاشرتی ادویات کے ضمن میں ایک مثالی اور قابل تقلید علمبردار سمجھے جاتے ہیں۔ معاشرتی ادویات ایسے امراض کے علاج کے لیے ہوتی ہیں، جن کا تعلق زیادہ تر مزدوروں سے ہوتا ہے اور ان کا مقصد یہی نہیں ہوتا کہ مریض اچھا ہو جائے، بلکہ یہ کہ مریض کی مادی اور معاشرتی حالت بھی سدھر جائے یہ انعام ڈاکٹر لیون برنارڈ کی یادگار ہے، جو مجلس اقوام کے ادارۂ صحت کے بانیوں میں شامل تھے۔ یہ ساتواں انعام دیا گیا ہے۔

یونی سیف کے لیے ۱۹ حکومتوں کی مالی امداد اقوام متحدہ کے بچوں کے فنڈ (یونی سیف) کے دفتر سے

اعلان ہوا ہے کہ اس سال فنڈ کو چندے دینے کے لیے سال میں اٹھارہ ملکوں اور ایک حکومت دیسیان نے وعدے کیے ہیں اور ان میں سے بعض نے رقمیں ادا بھی کر دی ہیں۔ اس طرح چندہ دینے والی حکومتوں کی تعداد ۸۵ ہو گئی ہے، اور اس سال کی مجموعی رقم اب تک کے وعدوں کے مطابق ایک کروڑ ۸۴ لاکھ ۴۷ ہزار ۲۳ ڈالر ہو گئی ہے۔ روس نے یونی سیف کو ۵ لاکھ ڈالر دیے ہیں۔ بھارت ۳ لاکھ ۴۲ ہزار ڈالر دے رہا ہے۔ جاپان ایک لاکھ ڈالر، نیدرلینڈز ۲۰ ہزار ۹ سو ۷۲ ڈالر، پاکستان ۵۰ ہزار ۴ سو ڈالر، اسپین ۳۲ ہزار ۸ سو ۹ ڈالر دے گا۔ ڈومینکن ری پبلک نے ۲۰ ہزار ڈالر، ہانگ کانگ نے ساڑھے تین ہزار ڈالر، موناکو نے ایک ہزار ۳ سو ۱۴ ڈالر ادا کر دیے ہیں۔ وٹیکان نے علامتی چندے کے طور پر ایک ہزار ڈالر بھیجے ہیں۔ کمبوڈیا، لیبیا، فلی پین اور ویت نام کے چندوں میں ۱۹۵۶ء کی بہ نسبت اضافہ ہوا ہے۔ فلی پین کا چندہ ۹۰ ہزار ڈالر ہے جو پچھلے سال کے مقابلے میں دوگنا ہے۔ لیبیا نے ۳ ہزار ڈالر دے کر گویا ۵۰ فی صد کا اضافہ کیا ہے۔ کمبوڈیا کا چندہ صرف ۲۰ فی صد زیادہ ہو جانے سے ڈھائی ہزار ڈالر ہوا ہے۔ ان کے علاوہ آئرلینڈ نے ۵ ہزار ایک سو دس ڈالر، اردن نے ایک ہزار ۳ سو ڈالر، لبنان نے ۳ ہزار ۴ سو ڈالر اور شام نے ۲ ہزار ۲ سو ۵۰ ڈالر دینے کے وعدے کیے ہیں۔

پاکستان کے لیے یونی سیف کے وظائف

اقوام متحدہ کے بچوں کے فنڈ نے مشرقی اور مغربی پاکستان کے ڈاکٹروں اور نرسوں کے لیے چھے وظیفے دیے ہیں۔ منتخب ہونے والوں کو آل انڈیا انسٹی ٹیوٹ آف ہائی جین اینڈ پبلک ہیلتھ، کلکتہ میں تربیت کے بعد ماؤں اور بچوں کی فلاح و بہبود کے کام کا ڈپلوما اور پبلک ہیلتھ نرسنگ کا سرٹیفکیٹ دیا جائے گا۔ کامیاب امیدواروں کے نام یہ ہیں۔

(۱) ڈاکٹر ایس۔ اے قاضی (ریلوے ہسپتال کوئٹہ)

(۲) ڈاکٹر مس منورہ بنت رحمان (ماؤں اور بچوں کی فلاح و بہبود کا مرکز، ڈھاکہ)

(۳) ڈاکٹر مسز شمس النہار (〃 〃 〃 〃)

(۴) مس سلطانہ تیموری (نرس ڈفرن ہسپتال کراچی)

(۵) مس کوشلا او رگمنیز (نرس ڈفرن ہسپتال کراچی)

(۶) مسز ایس۔ اے قریشی (نرس، ریلوے ہسپتال لاہور)

عالمی ادارۂ صحت اور یونی سیف نے ایشیا، افریقیہ اور مشرق وسطی کے ملکوں سے ۲۲ ڈاکٹروں اور نرسوں کو منتخب کیا ہے جن میں پاکستانی امیدوار بھی شامل ہیں، وہ سب ایک سال تک کلکتہ کے مذکورہ بالا ادارے میں تربیت حاصل کریں گے۔ ماؤں اور بچوں کی صحت سے متعلق ادارے کے شعبے کو حال ہی میں وسیع کیا گیا ہے جس کے لیے یونی سیف اور عالمی ادارۂ صحت نے امداد دی ہے۔ ایشیائی ملکوں کے لیے یہ ایک علاقائی تربیتی مرکز ثابت ہوگا۔ یونی سیف اور حکومت پاکستان کے مابین جو معاہدہ ہوا ہے، اس کے بموجب کلکتہ میں تربیت پانے والے نصاب ختم کرنے کے بعد سرکاری محکمہ صحتِ عامہ میں کام کریں گے، امید ہے کہ وہ اس ملک میں ماؤں اور بچوں کی صحتی خدمات کو ترقی دینے میں بہت ہی مفید ثابت ہوں گے۔

تیز رفتار فوٹو گرافی

برٹش فزیکل سوسائٹی کی نمائش گذشتہ دنوں لندن میں ہوئی تھی۔ اس میں ایک تیز رفتار کیمرہ دکھایا گیا تھا۔ جو برطانیہ کے گولہ بارود کے ترویج و تحقیق کے محکمہ نے پیش کیا ہے۔ انہوں نے یہ کیمرہ بلکہ یوں کہیے کہ بارہ کیمروں کا ایک سیٹ تیار کیا ہے جو ایک سیکنڈ میں ایک کروڑ تصویریں لیتا ہے۔ یہ کیمرہ (سیٹ) عام کیمروں کی طرح نہیں ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ تصویریں لیتے وقت بجلی کے ذریعہ کنٹرول کیا گیا ہے۔

اس کیمرہ کا اصل مقصد اس وقت کی تصویریں لینا ہے، جب ایٹم کو توڑا جاتا ہے اور اس میں بہت جلد جلد دھماکے ہوتے ہیں، ان دھماکوں کی تصویر لی جا سکتی ہے۔ ویسے اگر آپ کے پاس بھی کوئی دوسرا کام ہے جس میں تیز رفتار فوٹو گرافی کی ضرورت ہے تو آپ اس میں معمولی طریقے سے ایک بہت طاقت ور بجلی کا بلب لگا کر تصویریں لے سکتے ہیں۔

دوسری چیز برطانیہ کی قومی کوئلہ کمپنی کے انجینئروں نے ایک ایسا آلہ تیار کروایا ہے جو ہوا کے دباؤ کی خفیف سے خفیف تبدیلی کو بھی محسوس کر لیتا ہے، خیال چھپائی کی ایسی تہ جس کی موٹائی ۱/۱۰۰ انچ ہو اس میں اگر ذرا سی بھی تبدیلی ہو گئی تو یہ آلہ فوراً بتا دے گا۔

فیکٹریوں اور تحقیقاتی لیباریٹریوں کے لیے مختلف قسم کے جو نئے نئے آلے تیار کیے گئے ہیں ان میں سے ایک چھوٹی سی شیشی نما آلہ اس نمائش میں دکھایا گیا۔ یہ چھوٹی سی شیشی انچ کے ایک لاکھویں حصے کو بھی ناپ لیتی ہے۔ اسی کے ساتھ ایک چھوٹا سا آلہ لگا ہے جو ہر آدھ گھنٹہ کے بعد ناپنے کی مشین کو اپنی جگہ سے ہٹا دیتا ہے اور غلطیوں کو درست کرتا ہے۔ مشین کی صفائی کرنے کے بعد اگر اس میں کوئی خرابی پیدا ہو گئی ہو تو فوراً آپ ہی ظاہر کر دیتا ہے۔ اور اگر مشین سمجھتی ہے کہ خرابی کچھ زیادہ ہے تو فوراً بند ہو کر آپ کا انتظار شروع کر دیتی ہے کہ آ کر مجھے ٹھیک کیا جائے۔

اس نمائش کو دیکھ کر آپ پر دو باتیں واضح ہو جاتی ہیں، ایک وہ زمانہ جس سے نئے نئے تصورات اور طریق کار آلات کی شکل میں منتقل ہو رہے ہیں۔ دوسری یہ بات کہ آلات بنانے والے استعمال کرنے والوں کی ضروریات کو کس قدر آمادگی سے پورا کرنا چاہتے ہیں۔ بیشتر ضروریات فوراً پوری کی جا سکتی ہیں اور جو ضرورت اس وقت پوری نہیں ہو سکتی ہے، اس کے بارے میں لوگ سمجھتے ہیں کہ اسے پورا کرنے کے لیے کچھ ہی دنوں میں آلات بن کر آ جائیں گے۔

خون کے خلیوں کا شمار

کوئی کچھ بھی ناپنا چاہے۔ نمائش میں یا تو اس کے لیے کوئی آلہ پیش کیا گیا تھا۔ یا ہر چیز کو ناپنے کے لیے کوئی نہ کوئی آلہ مہیا کرنے کو لوگ تیار تھے۔ اگر کوئی ڈاکٹر اپنے مریض کے خون کے سرخ یا سفید خلیوں کو گننا چاہے تو اس کے لیے بھی نمائش میں آلہ موجود تھا جس کے ذریعے گننے میں وہ غلطیاں نہیں ہوتیں جو مروجہ آلوں کے ذریعے سے گننے میں ہوتی تھیں۔

بلینڈسٹن انسٹی ٹیوٹ آف پیتھالوجی، لندن کے ڈاکٹر کراس لینڈ ٹیلر نے سب سے پہلے اس آلے کے بنانے کا خیال ظاہر کیا۔ اس کے بعد یہ آلہ عالم وجود میں آیا۔ مناسب طریقے سے محلول کیا ہوا خون تیز دھار کے ذریعے بہایا جاتا ہے۔ اس دھار میں خون کے خلیے تیزی کے ساتھ بہتے ہیں۔ دس سکنڈ میں پانچ ہزار سرخ خلیے گنے جا سکتے ہیں، اور ایک منٹ سے کم میں چار مختلف آلے دو۔ دو سرخ، اور دو، دو سفید خلیے اس تعداد میں گنے جا سکتے ہیں۔ اس آلے کا تجربہ کیا جا چکا ہے، اور یہ مفید ثابت ہوا ہے۔

جوہری ذرات کے ماہروں کے لیے یہ ایک اہم مسئلہ ہوتا ہے، کہ بہت بڑی تعداد میں ایسے فوٹوجو ہر
ت کے محور کو ظاہر کرتے ہیں، کس طرح گنے جائیں، یہ تصویریں لاکھوں کی تعداد میں خود بخود اتر تی چلی جاتی ہیں۔ اور
رین پر یہ ظاہر کرتی ہیں کہ بجلی سے متاثر ہو کر ذرہ نے کونسا راستہ اختیار کیا ہے، چنانچہ یہ مشین ان لی گئی تصویروں کی
م تعداد بتا دیتی ہے۔

پہلے یہ ہوتا تھا کہ ان تصویروں کا معائنہ کر کے، ہر ایک کی لمبائی چوڑائی اور دیگر کئی قسم کی پیمائش الگ
ے کرنی پڑتی تھیں۔ ظاہر ہے کہ لاکھوں تصویروں کی پیمائش اور دیگر حسابات میں مہینوں لگ جاتے تھے، چنانچہ
ں مشکل کو حل کرنے کے لیے بنری کیونڈش لیبارٹری میں ایک مشین تیار ہو گئی ہے۔ اس مشین پر صرف ایک آدمی
م تیار کرنے والا ہوتا ہے جو مشین کے خاص خاص جگہوں میں پیمائش کی جانے والی تصویروں کو لگا دیتا ہے
ر پھر بٹن دباتے ہی ایک فیتے پر ہر وہ چیز چھپ کر آ جاتی ہے جس کی ماہرین کو حساب میں ضرورت پڑ سکتی
ہے۔ اسی فیتے کو ایک اور مشین میں لگا دیجیے۔ لیجیے ہر چیز کی پیمائش شدہ تصویر دوسرے فیتے پر چھپ گئی۔

نیا بھر میں بھنگ کو ممنوع قرار دینے کی درخواست

نشہ آور ادویات سے متعلق اقوام متحدہ کے کمیشن نے سفارش کی ہے کہ حکومتیں مخصوص مقاصد کے سوا
بھنگ کے ایسے استعمال کو جسے قانوناً ناجائز سمجھا گیا ہو ممنوع قرار دیدیں، بھنگ کو ماڑی اور حشیش کے نام سے بھی
موسوم کیا جاتا ہے۔ کمیشن نے ایک قرارداد "خط" نامی دوا کے بارے میں بھی منظور کی۔ نیز چند سفارشات اقوام متحدہ
کی اس تجربہ گاہ سے متعلق پیش کیں جو جنیوا میں قائم ہے۔

بھنگ سے متعلق مشورے ایک مسودہ ساز کمیٹی نے مرتب کیے ہیں اور وہ ان تجاویز پر مبنی ہیں جو بھارت
اور ایران نے بھیجی ہیں۔ اس دوا کے بارے میں تحقیقات کا مطالبہ کرتے ہوئے کثرت رائے سے منظور ہونے والی
تجویز میں درخواست کی گئی ہے کہ ان علاقوں میں جہاں اب تک بھنگ کا استعمال ترک نہیں کیا گیا ہے۔ ایک خاص
مدت میں ممنوع قرار دے دیا جائے۔

اس تجویز کے بموجب پاکستان۔ بھارت۔ نیپال اور برما جیسے بعض ملکوں میں جہاں بھنگ کا استعمال روایتی
طور پر بھی ہوتا ہے۔ رعایت رکھی گئی ہے، اس میں خواہش ظاہر کی گئی ہے کہ حکومتیں اس دوا کے عملی منشیاتی اصولوں

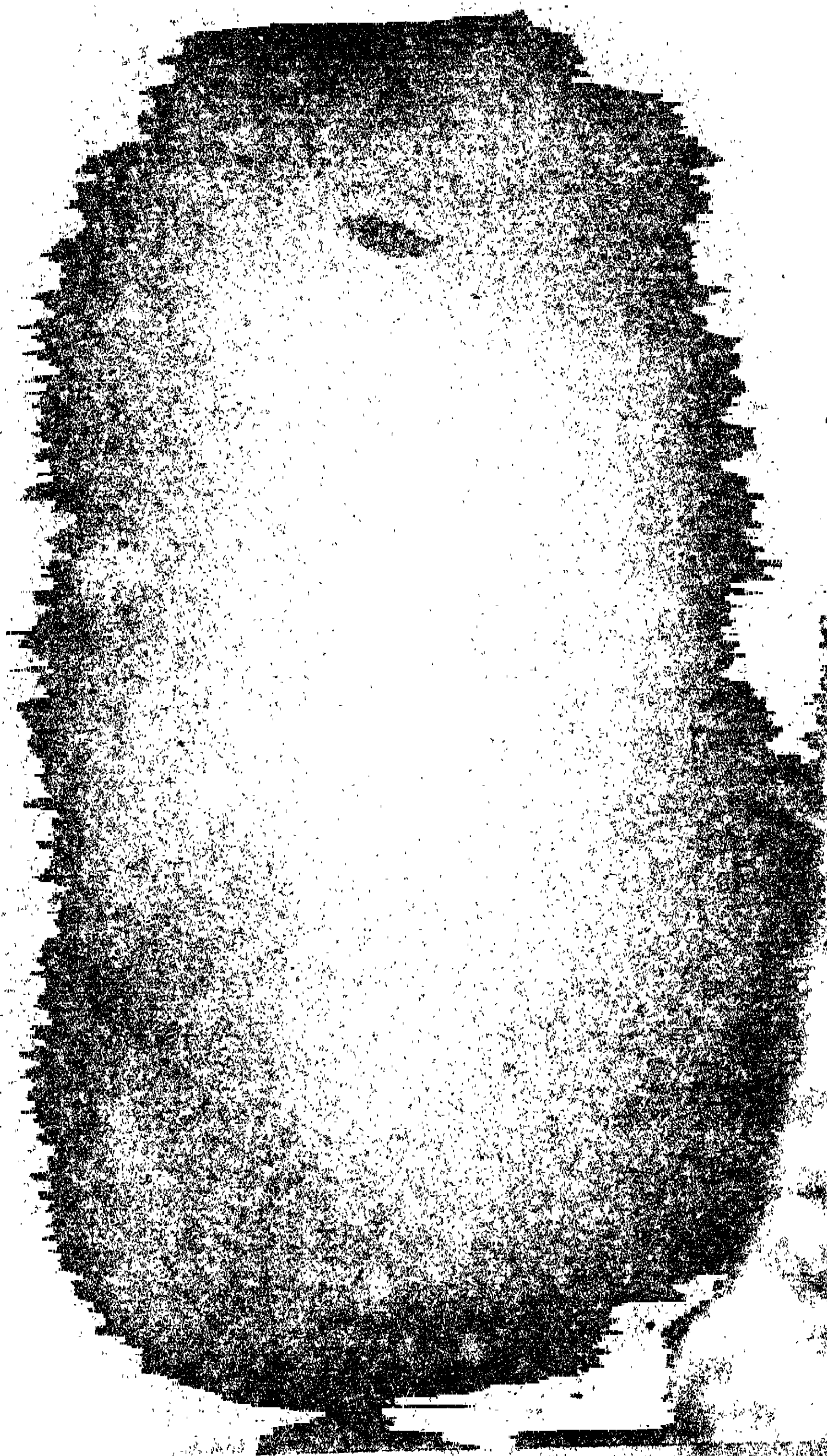
کا تحقیقات کریں، اور اگر ضرورت ہو تو اس موضوع پر معلومات کا تبادلہ کریں۔

حبشہ کے مبصر مسٹر حارث علیلہ ہو کا بیان سننے کے بعد، جس میں اس ملک کی حکومت کی طرف سے خط کی برآمد کے بارے میں اطلاعات دی گئی ہیں، کمیشن نے اس موضوع کے ایک مسودہ تجویز پر غور و خوض کیا۔ اس میں کہا گیا ہے کہ خط والے پودے کے پتے چبانے کی عادت بڑھ رہی ہے، اور یہ ایک اجتماعی معاشرتی مسئلہ بنتا جا رہا ہے۔ اس میں مطالبہ کیا گیا ہے کہ حکومتیں اس پودے کی کاشت، اس کی تجارت، اور اس کے استعمال کو ممنوع قرار دینے کے لیے تمام ضروری عملی تدابیر اختیار کریں۔

بہت سے ملکوں کے نمائندے اس لحاظ سے حبشہ کے مبصر کے ہم خیال تھے کہ مزید جائزہ لینا اور خاص طور پر عالمی ادارہ صحت کی طرف سے رپورٹ پیش ہونا ضروری ہے۔ بعض نمائندوں نے خیال ظاہر کیا کہ فوراً کارروائی شروع کی جائے۔ کمیشن نے ۷ موافق، ۱ مخالف اور ۵ غیر جانبدار ووٹوں سے فیصلہ کیا کہ اگلے اجلاس تک جو ۱۹۵۸ء میں منعقد ہوگا، خط کے موضوع پر غور و خوض کی کارروائی ملتوی کی جائے۔

افیون افیون کی تحقیقات سے متعلق سفارشات کثرت رائے سے منظور ہوئیں۔ فرانس کی پیش کردہ تجویز میں معمولی ترمیم ہوئی، اس کا مقصد یہ ہے کہ افیون کے مستند نمونوں کے جس قدر بھی تجزیے ممکن ہوں کیے جائیں، اس طرح ساری دنیا میں ایک ضابطہ حوالہ جات مرتب کرنے میں سہولت ہو جائے گی۔ اس موضوع پر تو سائنس دانوں پر مشتمل ایک علمی اجتماع میں تبادلہ خیالات کیا جائے گا، جو اقوام متحدہ کے زیر اہتمام جنوری ۱۹۵۸ء میں بمقام جنیوا منعقد ہوگا۔

تجویز میں حکومتوں پر زور دیا گیا ہے کہ وہ اپنے علاقوں میں پیدا ہونے والی افیون کے جملہ اقسام کے نمونے کافی تعداد میں اقوام متحدہ کی تجربہ گاہوں کو بھیجیں۔ جنیوا لیبارٹری کے کام کو ہلکا کرنے کے لیے کمیشن کے ارکان اس بات پر متفق تھے کہ کچھ کام جو غیر مستند نمونوں کی چھان بین سے متعلق ہے، عارضی طور پر کینیڈا میں قائم شدہ خطرناک ادویات کی تجربہ گاہ میں منتقل کر دیا جائے۔ یہ نمونے زیادہ تر اس افیون کے ہوتے ہیں جس پر ناجائز خرید و فروخت کے وقت قبضہ کیا گیا ہو۔



پنجاب ایجوکیشنل جرنل

اور

آموزش (اردو)

۱ - پاکستان بھر میں یہ دو ہی تعلیمی رسالے ہیں - جنکو سرکاری سرپرستی اور امداد حاصل ہے -

۲ - پاکستان بھر میں یہی دو تعلیمی رسالے ہیں - جو مرکزی اور صوبائی درسگاہوں اور تعلیمی حلقوں میں مقبول ہیں -

۳ - ان رسالوں کے متعلق ادارتی خطوط اور چھپنے والے مضامین ایڈیٹر (پرنسپل) سنٹرل ٹریننگ کالج لاہور کو بھیجے جائیں - ان رسالوں میں چھپے ہوئے مضامین کیلئے معاوضہ دیا جاتا ہے -

۴ - یہ رسالے ہر مہینے کے دوسرے ہفتہ میں چھپتے ہیں اور ان کا چندہ آٹھ روپیہ (انگریزی) اور چھ روپیہ (اردو) ہے - جو کہ منیجر کو بھیجنا چاہئے -

۵ - ان رسالوں میں اشتہار دینے سے آپکی اشیاء مقبول ہونگی - تجارتی معاملات کیلئے خط و کتابت منیجر سے کریں -

منیجر پنجاب ایجوکیشنل جرنل / آموزش

۲ کچہری روڈ - لاہور (پاکستان)

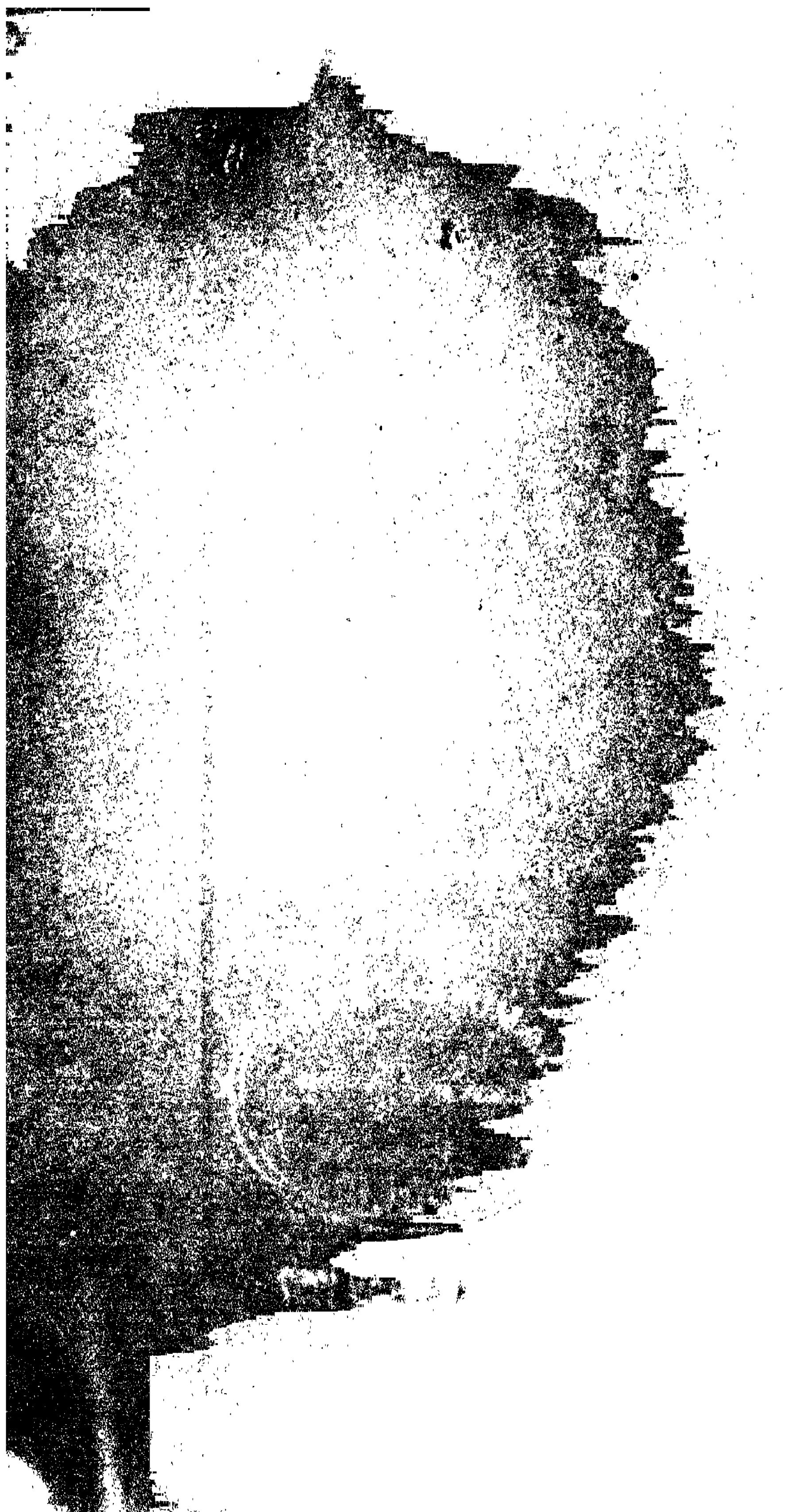
آموزش

لد ۱۰ شمارہ ٦] لاهور [ستمبر ١٥٧

اس شمارہ میں

ریر { پروفیسر سراج الدین
پروفیسر ایم ۔ اے ۔ مخدومی }

معاونین { عبدالغفور چوہدری
فضل احمد }



تعلیمی ماہ نامہ

آموزش

لاہور

ستمبر ۱۹۵۷ء

جلد —— ۱۰

شمارہ —— ۹

سالانہ چندہ

پاکستان کے لیے ۶ روپے

غیر ممالک کے لیے ۸ روپے

قیمت فی پرچہ دس آنے

یونی ورسٹی بک ایجنسی لاہور

آر۔ ایچ۔ ڈی خالد پرنٹر پبلشر نے دین محمدی پریس میں طبع کرا کے
یونی ورسٹی بک ایجنسی ۲ کچہری روڈ لاہور سے شائع کیا

کچھ "آموزش" کے متعلق

ایم۔ اے۔ مخدومی

قیام پاکستان سے پہلے محکمۂ تعلیم پنجاب کی براہ راست نگرانی میں صرف ایک تعلیمی رسالہ شائع ہوتا تھا یعنی پنجاب ایجوکیشنل جرنل۔ یہ رسالہ انگریزی میں چھپتا تھا، اور اس میں مفید اور معیاری تعلیمی مضامین شائع ہوتے تھے۔ آزادی کی آمد کے بعد بھی پنجاب ایجوکیشنل جرنل کو بدستور باقی رکھا گیا۔ مگر ساتھ ہی یہ ضرورت محسوس ہونے لگی کہ اس قسم کا ایک رسالہ اردو میں شائع کیا جائے۔ تاکہ اردو مدرسین بھی جدید تعلیمی ترقیوں سے باخبر رہیں۔ ملک میں اکثریت ایسے اساتذہ کی تھی جو انگریزی رسائل سے براہ راست استفادہ نہیں کر سکتے تھے۔ تعلیم کی اصلاح و ترقی کے لیے ضروری تھا کہ یہ لوگ بھی جدید تعلیمی تقاضوں کو سمجھیں۔ اس ضرورت کو پورا کرنے کے لیے محکمۂ تعلیم نے پنجاب ایجوکیشنل جرنل کے علاوہ ایک اردو رسالے کا بوجھ بھی اپنے ذمہ لیا اور "آموزش" وجود میں آ گیا۔

"آموزش" نے اب تک جو تعلیمی خدمات انجام دی ہیں، ان کے متعلق کچھ زیادہ کہنے کی ضرورت نہیں اس کی افادیت کا اندازہ صرف اس ایک بات سے ہو سکتا ہے کہ اس کی اشاعت بہت جلد پنجاب ایجوکیشنل جرنل سے بھی بڑھ گئی۔ صوبے کے بیشتر نارمل سکولوں نے اس رسالے کو اپنے ہاں رائج کیا۔ اس کے علاوہ ثانوی اور مڈل سکولوں میں بھی اس کی خاصی مانگ پیدا ہو گئی۔

یہ صورت حال تسلی بخش تھی، لیکن اب اس میں دفعتہً ایک ناخوش گوار تبدیلی پیدا ہو گئی ہے۔ آموزش کی اشاعت اس موسم گرما میں ایک دم گھٹ گئی ہے۔ اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ کئی ایک نارمل سکولوں کی طرف سے اس کی خریداری کی تجدید نہیں کی گئی۔ ان میں سے بعض نے غالباً خود اپنے رسالے نکال لیے ہیں اور وہ انہیں "آموزش" کا بدل سمجھنے لگے ہیں۔

اس میں کلام نہیں کہ کسی مدرسے میں رسالے کے تیار ہونے سے طالب علموں کو ایک مفید تعلیمی تربیت

حاصل ہوتی ہے۔ یہ تربیت مہیا کرنے کی خاطر کئی ثانوی مدرسے بھی وقتاً فوقتاً رسالے تیار کرتے ہیں۔ لیکن یہ تربیت جدید تعلیم کا فہم پیدا نہیں کر سکتی۔ جو نوجوان طلبہ اور طالبات کل کو تدریسی ذمہ داریاں سنبھالنے والے ہیں ان کے لیے صرف اتنا کافی نہیں کہ وہ کسی رسالے کی تدوین و ترتیب کا کام جانتے ہوں۔ ان کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ جدید تعلیمی تقاضوں کا ایک وسیع تر فہم پیدا کر چکے ہوں۔

استاد کے لیے سب سے زیادہ ضروری چیز دورانِ ملازمت بالیدگی ہے۔ اس بالیدگی کی قابلِ اعتماد ضمانت یہ ہے کہ زمانہ تربیت میں اسے مختلف تعلیمی مسائل کے ساتھ لگاؤ پیدا ہو جائے۔ جو استاد اس قسم کے لگاؤ سے محروم رہے گا۔ اغلب یہ ہے کہ وہ نہ جدید تعلیمی تقاضوں کو سمجھے گا، اور نہ تلاش و جستجو کی راہ اختیار کرے گا۔

ہمارے زیرِ تربیت استادوں میں آج بھی غالب اکثریت اردو مدرسین کی ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو انگریزی کتب و رسائل سے خود استفادہ نہیں کر سکتے۔ ان استادوں کی تربیت میں یہ بات بھی شامل ہونی چاہیے کہ ان کے دلوں میں معیاری تعلیمی لٹریچر کا ایک صحت مند ذوق پیدا کر دیا جائے۔ کوئی نارمل سکول یہ خدمت اپنے تیار کردہ رسالے سے نہیں لے سکتا۔ معیاری تعلیمی رسالوں کا اپنا ایک جداگانہ مقام ہے۔ جو نارمل مدرسے خود اپنے رسالے نکالتے ہیں، انہیں چاہیے کہ "آموزش" کی خریداری بھی جاری رکھیں، تاکہ ان کے طلبہ ایک معیاری تعلیمی رسالے کی خدمات سے محروم نہ ہو جائیں ؛

دورانِ ملازمت میں اساتذہ کی بالیدگی

فضل احمد

مسلسل ارتقا کیوں ضروری ہے؟

مختلف زمانوں میں تعلیم کا تصور مختلف رہا ہے۔ تاہم پچھلی صدی کے خاتمہ تک اس کے مختلف تصورات میں یہ خیال ہمیشہ غالب رہا کہ تعلیم کا مقصد ایک ایسی اچھی زندگی کی جستجو ہے جس کے خدوخال پہلے سے طے شدہ ہیں۔ اچھی زندگی کی یہ مکمل تصویر ازل سے [illegible] گھڑی میں موجود ہے اس میں کسی ردوبدل کی گنجائش نہیں۔ اس لیے تمام تعلیمی کوششیں اس طے شدہ مقصد کے تابع ہونی چاہئیں۔ بظاہر یہ نظریہ کیسا ہی بھلا کیوں نہ دکھائی دے حقیقت یہ ہے کہ اس کے زیر اثر ماہر تعلیم نے اپنی پسند کی زندگی کو مکمل نمونہ ٹھہرانے کی کوشش کی اور ایک ایسا تعلیمی نظام قائم کرنا چاہا جو [illegible] کی پسندیدہ زندگی کو بقا دینے کا ضامن ہو سکتا [illegible] اس چیز کی ابتدا یونانی حکمانے کی جن کی نگاہ میں ان کا [illegible] ذہنی معاشری نظام ہی بہترین زندگی کی شاہراہ تھی۔ اسی طرح بعد کے ماہرین تعلیم نے اچھی زندگی کو پانے کے لیے نئی نئی راہیں تجویز کیں، مگر یہ تمام راہیں ایک ایسی منزل کی طرف لے جانے والی تھیں جو پہلے سے مقررہ اور طے شدہ تھی۔

بیسویں صدی تغیر و انقلاب کا وہ پرآشوب دور ہے جس کی نظیر دنیا کی تاریخ میں نہیں ملتی۔ سائنس کی حیرت انگیز کامیابیاں یوں تو پچھلی چند صدیوں سے انسانی زندگی کے طور طریقوں پر گہرا اثر ڈال رہی تھیں مگر بیسویں صدی میں سائنس اور ٹکنالوجی نے ایک ایسے دور کی ابتدا کی جس میں نہ صرف انسان کی معاشی اور معاشرتی زندگی کا رخ ناقابل یقین تیزی سے بدلنے لگا بلکہ انسان کا اسلوب فکر بھی کچھ سے کچھ ہو گیا۔ صدیوں کے طے شدہ مفروضات دیکھتے دیکھتے ظن و قیاس بن کر رہ گئے اور کئی ایک مسلمہ حقیقتیں انسان کی محدود قوت مشاہدہ کے غلط نتائج قرار دے دی گئیں۔ ان تمام باتوں نے علم و سائنس کو اچھی طرح چوکنا کر دیا کہ کسی نتیجہ کو قطعی اور حتمی قرار دینا بہت بڑی بھول ہے۔

اس کا نتیجہ اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ انسان خود اپنے راستے میں ایک بھاری رکاوٹ قائم کرے۔ اچھی زندگی کا لب لباب بس یہ ہے کہ انسان پیہم جستجو میں لگا رہے۔ حقیقت کے چہرے پر اس قدر پردے ہیں اور وہ تہ در تہ اس طرح الجھے ہوئے ہیں کہ انسان کو یہ خیال ہی سرے سے چھوڑ دینا چاہیے کہ وہ کبھی ان سب کو ہٹا سکے گا۔ پس جس حد تک نگاہ کام کرے اس کی روشنی میں اچھی زندگی کے اجزا مرتب کرنے چاہئیں اور جونہی مزید روشنی حاصل ہو اس کی رہنمائی میں ان اجزا میں مناسب رد و بدل ہوتے رہنا چاہیے۔

دنیائے علم و سائنس کے اس فکری انقلاب سے تعلیم کا متاثر ہونا بھی یقینی تھا۔ چناں چہ پرانے جامد تصور کے برعکس تعلیم کا نیا متحرک تصور امریکہ کے مشہور ماہر تعلیم جان ڈیوی نے پیش کیا جس کی معرکۃ الآرا تصنیف "جمہوریت اور تعلیم" (DEMOCRACY AND EDUCATION) تعلیمی لٹریچر میں سنگ میل کا درجہ رکھتی ہے۔ ڈیوی کے الفاظ میں "تعلیم تجربہ کی اس تعمیر نو یا ترتیب نو کا نام ہے، جس سے اس کے معانی میں اضافہ ہوتا ہے، اور جس سے آئندہ تجربہ کے رخ پر قابو پانے کی صلاحیت بڑھ جاتی ہے"

تعلیم کے اس نئے تصور کا مرکزی نقطہ تجربہ کی لگاتار تعمیر ہے، ایسی تعمیر جو زندگی بھر جاری رہتی ہے یہ نظریہ تغیر اور جدت کو کھلے دل سے قبول کرتا ہے، اور انہیں ہر غیر معتدل مفروضے کی بندشوں سے آزاد کر دیتا ہے۔ اس کی رو سے تعلیم کا مقصد یہ نہیں رہتا کہ کسی نہائی حقیقت کا کھوج لگایا جائے یا خوابیدہ صلاحیتوں کو جگایا جائے۔ بلکہ اس کی ساری دوڑ دھوپ اس بات کے لیے وقف ہو جاتی ہے کہ زندگی کے مسائل کو حل کر کے سچائی کے اجزا کو جمع کیا جائے۔ تاکہ تیز رو انقلاب کے اچانک تقاضوں کو کامیابی کے ساتھ پورا کیا جا سکے۔ گویا ارتقا اور نشو و نما کے لیے کوئی مقررہ حد نہیں، جہاں پہنچ کر یہ فرض کر لیا جائے کہ بس اب آگے قدم اٹھانے کی گنجائش نہیں۔ ارتقا کا نتیجہ مزید ارتقا، اور تعلیم کا مقصد مزید تعلیم ہونا چاہیے۔ ترقی کی بس ایک یہی راہ ہے۔ نیز ترقی کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ افراد کے فطری اختلافات کو پوری طرح بڑھنے پھولنے کا موقع دیا جائے۔ کیوں کہ صداقت کی طرح ترقی بھی بہت سے اجزا سے مل کر ترتیب پاتی ہے، اس لیے افراد کی مخصوص صلاحیتوں کے اجاگر ہونے سے یہ مرکب زیادہ پر رنگ اور پربہار بن جاتا ہے۔

تعلیم کا یہ متحرک تصور تربیت اساتذہ کے لیے خاص معنی رکھتا ہے۔ کوئی نظام تعلیم خواہ کیسی ہی خوبی اور دور بینی سے

تیار کیا جائے۔ بالآخر اس کی بلندی کی سطح اساتذہ کی ذہنی بلندی سے کبھی زیادہ آگے نہ بڑھنے پائے گی۔ کسی نسل کی بلندی کا معیار بڑی حد تک اس کے اساتذہ کی بلندی کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ اس لیے اساتذہ کی بالیدگی ایک بنیادی ضرورت ہے۔ کسی نظام کو نظری طور پر درست مان لینے سے کبھی نتائج پیدا نہیں ہوا کرتے۔ عملی نتائج کے لیے پہلی شرط یہ ہے کہ یقین و اقدار میں تبدیلی واقع ہو۔ جب تک یقین و ایمان کی سنگلاخ بنیاد موجود نہ ہوگی اس وقت تک عمل کی کوئی پائدار عمارت اٹھائی نہ جاسکے گی۔ اساتذہ کی دوران ملازمت تعلیم کے لیے مندرجہ ذیل بنیادوں کا ہونا ضروری ہے:۔

(۱) اساتذہ کا صحیح نقطہ نگاہ

(۲) تعلیم اور نشو و نما کا موزوں طریق

(۳) تدریس اور نگرانی کے صحیح طریقے

(۴) سائنسی انکشافات کا استعمال۔

اب ہم ان بنیادوں میں سے ایک ایک پر مختصر نگاہ ڈالتے ہیں:۔

(۱) اساتذہ کا صحیح نقطہ نگاہ:۔ استادوں کے لیے ضروری ہے کہ اپنے اور مدرسہ کے مقام کو اچھی طرح سمجھیں۔ اکثر استاد اپنے پست معاشری مقام کا گلہ کرتے سنے جاتے ہیں، انہیں یہ معلوم نہیں کہ جس شخص کو خود اپنی خبر نہ ہو اسے کوئی دوسرا آدمی اونچا مقام نہیں دے سکتا۔ تعلیم کا پرانا تصور جو اپنے آپ کو صرف اس حد تک محدود رکھتا ہے کہ ثقافتی ورثہ کو نئی پود کے ہاتھوں میں منتقل کر دیا جائے یقینی طور پر رجعت پسند ہے۔ جدید تعلیم اپنے آپ کو طالب علم کی ہمہ گونہ ترقی کے لیے ذمہ دار سمجھتی ہے۔

اپنے صحیح مقام سے آگاہ ہونے کے لیے اساتذہ کے لیے ضروری ہے کہ عہد حاضر کے گوناگوں معاشی معاشرتی اور سیاسی مسائل سے اچھی طرح واقف ہوں۔ ان مسائل سے بے خبری کا ایک نتیجہ تو یہ ہوگا کہ وہ روائتی طریقوں کی بھول بھلیوں میں کھوئے رہیں گے، اور دوسرا یہ کہ وہ یہ سمجھنے لگ جائیں گے کہ موجودہ نظام کی اصلاح ان کے فرائض سے باہر ہے۔ خواہ یہ نظام کتنا ہی بوسیدہ کیوں نہ ہو۔ اہم مجلسی مسائل کے مطالعہ کے لیے اساتذہ مندرجہ ذیل طریقوں سے کام لے سکتے ہیں۔

(ا) ایسے منظم نصابوں میں شمولیت جو تعلیم کی مجلسی بنیادوں سے بحث کرتے ہوں۔
(ب) مجلسی مسائل پر بحث و تبصرہ کے لیے محفلوں مکالموں حلقوں کا قیام۔
(ج) ایسی سیاحت کا بندوبست جو اساتذہ کو ان مسائل کے عینی مشاہدہ کا موقع دے۔
(د) جدید ترین تعلیمی تحقیقات سے باخبر رہنے کے لیے مطالعہ کی محفلوں کا قیام۔
(ہ) مدرسہ میں اور مدرسہ سے باہر اہم مجلسی نظریوں اور تحریکوں میں شمولیت۔

(۲) تعلیم اور نشوونما کا موزوں طریق:۔ علم التعلیم اور دوسرے معاشری علوم میں جو تحقیقاتی مطالعے جاری ہیں، اساتذہ کو ان کے نتائج سے پوری طرح باخبر رہنا چاہیے۔ تدریس کا پرانا تصور جو عادہ کی مدد سے عادتوں کی تعمیر پر زور دیتا تھا، اب فرسودہ ہو چکا ہے، اور اس کی جگہ اس متحرک نظریے نے لی ہے جس کا ذکر اوپر گذر چکا ہے۔ یہ نظریہ طالب علم کی ہمہ گیر اور غیر منقطع نشوونما پر زور دیتا ہے۔ اس نظریے کے اختیار کرنے کا ایک لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ اساتذہ تعلیمی، نفسیاتی اور دوسرے معاشری مطالعوں سے آگاہ رہنے کے لیے فنی مطالعہ کو جاری رکھیں گے، اور اس طرح ان کا اپنا ارتقا مسدود نہیں ہوگا۔

(۳) تدریس اور نگرانی کے صحیح طریقے:۔ تعلیم کا متحرک تصور اس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ تعلیمی عمل میں حصہ لینے والے تمام افراد کی پوری صلاحیتیں بلا روک ٹوک بروئے کار آئیں۔ یہ اسی صورت میں ممکن ہے کہ اساتذہ اور طلبہ دونوں پوری آزادی اور ذمہ داری کی فضا میں کام کریں، تاکہ وہ کسی جھجک اور کھٹکے کے بغیر اپنے مسائل کے حل کے لیے نئے نئے طریقے آزمائیں، یہ سب کچھ اسی صورت میں ہوگا جب پرانی تحکم پسند نگرانی کا خاتمہ ہو جائے گا۔ اگر مدرسین کی تربیت گاہیں اور نگرانی کرنے والے افسر استادوں سے بلا چون و چرا اطاعت کا مطالبہ جاری رکھیں گے تو استاد قدرتی طور پر طلبہ سے اسی چیز کی توقع رکھیں گے، اور تعلیم کا زندگی بخش عمل روح کو کچلنے والا اور فکر کو جکڑنے اور پابند کرنے والا بن کر رہ جائے گا۔

(۴) سائنسی انکشافات کا استعمال:۔ تعلیمی میدان میں سائنسی تحقیقات نے جو انکشافات کیے ہیں انھوں نے پچھلی چند دہائیوں میں تعلیمی نظریوں اور عمل میں بہت کچھ اصلاح کی ہے۔ مگر اس ضمن میں ایک خطرے سے آگاہ رہنا ضروری ہے۔ سائنس کا خاصہ مسلسل جستجو اور پرکھ ہے۔ سائنس جن نتائج پر پہنچتی ہے، وہ انھیں

قطعی اور آخری جواب نہیں سمجھتی بلکہ محض عارضی حل خیال کرتی ہے۔ جونہی نئی شہادت اور نئے انکشافات ہاتھ لگتے ہیں سائنس اپنے پرانے مفروضات پر نظر ثانی کرنا ضروری سمجھتی ہے۔ کیوں کہ ایسا نہ کرنا سراسر سائنس کی ضد ہے۔ اساتذہ اور دوسرے تعلیمی کارکنوں کو یہ نکتہ اچھی طرح ذہن نشین کر لینا چاہیے۔ تاکہ ایسا نہ ہو کہ جو سائنسی انکشافات آج تعلیم کی ترقی اور اصلاح کا باعث ہوئے ہیں وہی کل اس کی آئندہ ترقی کا راستہ روک کر رہ جائیں۔

ہمارے ہاں یہ شرائط کہاں تک موجود ہیں

مندرجہ بالا ضروری بنیادیں ہمارے ہاں بہت حد تک غائب ہیں۔ اساتذہ کی تربیت گاہیں ابھی تک ان جامد تدریسی طریقوں سے چمٹی ہوئی ہیں، جو منحرک تصور تعلیم کی ضد قرار پا چکے ہیں۔ ملک میں تعلیمی تحقیقات کا سرے سے نام نہیں۔ دوسرے ملکوں میں جو تحقیقاتی کام ہوتا ہے وہ انگریزی رسائل میں مل سکتا ہے۔ مگر ہمارے اساتذہ بلکہ تعلیمی رہ نماؤں کو اس سے زیادہ دل چسپی معلوم نہیں ہوتی کیوں کہ وہ خود کسی ایسی تحقیق یا مطالعہ پر آمادہ نہیں ہوئے۔ ہمارے اساتذہ کا بیشتر حصہ اردو مدرسین پر مشتمل ہے، جو انگریزی سے نابلد اور شہری زندگی سے دور رہنے کے باعث جدید سائنسی انکشافات کی بھنک تک نہیں سن پاتے۔

مغرب کی طرح ہماری یونیورسٹیاں، توسیعی اور گرمائی نصابوں کی سہولتیں پیش نہیں کرتیں، جن سے اساتذہ کو مطالعہ جاری رکھنے کے لیے منظم مدد مل سکے۔ ملازمت میں داخل ہونے کے بعد اردو مدرسین عموماً بہت جلد اپنے اوپر یہ مطالعہ کے دروازے بند کر لیتے ہیں۔ انگریزی کے بغیر کسی یونیورسٹی امتحان کی تیاری محال ہے، اور ان کی اکثریت انگریزی سے بے بہرہ ہوتی ہے۔ صرف دے کر ایک منشی فاضل کا راستہ کھلا رہ جاتا ہے جس میں چنداں کشش نہیں۔ انگریزی مدرسین میں سے بعض سن چلے پرائیویٹ امتحانوں کی طرف راغب ہوتے ہیں۔ مگر چوں کہ بازاری خلاصوں کے علاوہ اور کسی قسم کی مدد دستیاب نہیں ہوتی۔ اس لیے اکثر بیچارے ایک آدھ ناکامی کے بعد جی چھوڑ بیٹھتے ہیں۔ اس لیے شہری سہولتوں میں کام کرنے والے اساتذہ کو چھوڑ کر بہت کم لوگ ایسے ہیں جو پرائیویٹ امتحان کے خیال سے مطالعہ جاری رکھتے ہوں۔ شہروں میں بھی ٹیوشن بازی نے اب وبا کی صورت اختیار کر لی ہے۔ اس کی کشش بہت کم استادوں کو یہ اجازت دیتی ہے کہ فاضل اوقات کا کچھ حصہ مطالعہ میں صرف کریں۔ پرائیویٹ ٹیوشن اگرچہ ایک اقتصادی مجبوری کے تحت وجود میں آئی تھی، مگر اب اس کی جڑیں اس قدر راسخ

ہو چکی معلوم ہوتی ہیں کہ استاد کی مالی زبوں حالی ختم ہو جانے پر بھی شاید ہی اس سے چھٹکارا پایا جا سکے۔

غالباً معاملے کا سب سے افسوس ناک پہلو تدریس اور نگرانی کے غیر جمہوری طریق ہیں، جو دورِ غلامی سے ہمیں ترکہ میں ملے ہیں۔ اجنبی حکمرانوں کا ایسے طور طریقے اختیار کرنا سمجھ میں آ سکتا تھا، مگر ایک ایسے ملک میں جو آزاد ہونے کے علاوہ اسلامی جمہوریت کے احیاء کا دعویدار ہو۔ یہ تحکمانہ آدابِ زندگی سراسر غلط ہیں۔ اگر اساتذہ کی تربیت گاہیں اور نگران افسر استادوں کو خود مختار، ذمہ دار، قابلِ احترام شہریوں کا درجہ نہیں دیں گے تو یہ استاد اپنے طلبہ کو اچھے پاکستانی شہریوں میں کیوں کر تبدیل کریں گے۔ تاہم یہ امر اطمینان بخش ہے کہ پرانی روایات دن بدن مٹتی چلی جا رہی ہیں۔ جوں جوں نظم و ضبط کے رشتے پرانے لوگوں کے ہاتھوں سے نکل کر نئی پود کے ہاتھ میں آ رہے ہیں۔ اسی قدر ہمارے ہاں انسانی تعلقات میں ایک عام خوش گوار تبدیلی پیدا ہوتی جا رہی ہے۔

دورانِ ملازمت تعلیم کی چند اہم تکنیکیں

اس ابتدائی بحث کے بعد اب چند ایسی تکنیکوں پر نگاہ ڈالی جائے گی جو مغرب میں اساتذہ کی دورانِ ملازمت تعلیم کے لیے کامیابی کے ساتھ آزمائی گئی ہیں، ہر ایک پر نگاہ ڈالتے وقت یہ بھی دیکھا جائے گا کہ وہ ہمارے ہاں کس حد تک کامیاب ہو سکتی ہے۔

اس ضمن میں اہم ترین نکتہ یہ ہے کہ بالیدگی کوئی ایسی شے نہیں جو کسی شخص کو دی جا سکے، بلکہ یہ اس وقت پیدا ہوتی ہے جب کوئی فرد توسیعِ نفس کی خاطر کسی پُر معنی عمل میں حصہ لے۔ ایسے عمل سے اس کی ذات اور اس کے ماحول کے مفہوم میں جو اضافہ حاصل ہوگا وہی حقیقی بالیدگی ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ نفسیاتی عمل اس وقت پورا ہوگا جب اساتذہ اپنے مسائل کو خود سوچیں۔ ان کے حل کرنے کے طریقے ڈھونڈیں ان طریقوں کو آزمائیں اور ان کے عملی نتائج کا جائزہ لیں، اور یہ سارا کام جماعتی تعاون کے رنگ میں انجام پائے۔ تاکہ نہ صرف افراد کے جوہر کھلنے کے لیے سازگار فضا موجود ہو۔ بلکہ انسانی مراسم بھی بلا روک ٹوک پختگی حاصل کریں۔ یہ نصب العین اگرچہ چنداں دشوار نہیں لیکن پاکستان جیسے ملک میں جہاں آزادانہ زندگی ابھی بچپن میں ہے پرانی ناپسندیدہ روایات کے مٹنے میں وقت لگے گا۔ اس لیے

گمان غالب ہے کہ کم از کم شروع شروع میں اساتذہ کی بالیدگی کا بہت کچھ سامان ان لوگوں کو کرنا ہوگا جن کے ہاتھ میں تعلیمی نگرانی اور نظم و نسق کی باگ ڈور ہے۔ جوں جوں وقت گذرتا جائے گا اور اساتذہ بالیدگی نفس کی قدر و قیمت اور اس کے طریقوں سے آگاہ ہوتے جائیں گے۔ یہ سارا کام رفتہ رفتہ ان کے اپنے ہاتھوں میں منتقل ہو جائے گا۔

ذیل میں جن تکنیکوں کا ذکر ہوگا ان میں سے کئی ایسی ہیں جو ہمارے ہاں آزمائی گئی ہیں یا آزمائی جارہی ہیں۔ تاہم ان سے خاطر خواہ نتائج حاصل کرنے کے لیے خود اساتذہ میں ضروری استعداد کا ہونا لازمی ہے۔

(۱) تجدید نصاب

امریکی یونیورسٹیاں گرمائی تعطیلات میں اساتذہ کے لیے تعلیمی نصاب پیش کرتی ہیں۔ اساتذہ لگاتار پانچ چھے سالوں تک ان نصابوں میں شرکت کر کے کسی امتحان (مثلاً ایم اے) کی تیاری کر سکتے ہیں۔ بعض سکولوں کے انتظامی بورڈوں یا خود اساتذہ کی اپنی انجمنوں کی طرف سے یہ ضروری قرار دیا گیا ہے کہ ہر استاد پانچ سال کے عرصے میں کم از کم ایک یا دو ایسے نصابوں میں شرکت کرے، ایسے کیے بغیر ترقی کے امکانات ختم ہو جاتے ہیں۔ بلکہ بعض اوقات ملازمت میں رہنا مشکل ہو جاتا ہے۔ کئی صورتوں میں ان نصابوں کے اخراجات اساتذہ خود برداشت کرتے ہیں، اور کچھ حالتوں میں مدرسہ کا انتظامی بورڈ یہ تمام اخراجات یا ان کا کچھ حصہ برداشت کرتا ہے۔

ہمارے ہاں یونیورسٹیاں اس قسم کی کوئی سہولت بہم نہیں پہنچاتیں۔ ہاں کبھی کبھی محکمہ تعلیم یا کسی اور انتظامی ادارہ کی طرف سے تجدیدی نصابوں کا بندوبست کر دیا جاتا ہے، مثلاً حال ہی میں جب جماعت مڈل تک کے نصاب میں کچھ اہم تبدیلیاں ہوئیں تو محکمہ تعلیم پنجاب نے کچھ نارمل اسکولوں میں تجدیدی نصابوں کا اہتمام کیا۔ یہ اقدام اگرچہ نظری طور پر نہایت عمدہ تھا مگر اس کے مولفوں نے ایک اہم نفسیاتی نکتہ کو نگاہ میں نہ رکھا، وہ یہ کہ ہر انسان بنیادی طور پر خود اپنی بھلائی چاہتا ہے۔ اس لیے جب تک کسی کام کے ساتھ کوئی مادی انعام وابستہ نہ ہو، اس وقت تک محض نظری قدر و قیمت بہت کم لوگوں میں ولولہ عمل پیدا کیا کرتی ہے، جب حالت یہ ہو کہ نہ نصاب پڑھانے والوں، اور نہ اس میں شامل ہونے والوں کو کسی ٹھوس فائدے کا

امید ہو تو وہاں بددلی اور بے کیفی کے سوا اور کس چیز کی توقع ہو سکتی ہے، اگر معاشرہ اپنی صحت مندی کے لیے اساتذہ کی مسلسل بالیدگی ضروری خیال کرتا ہے تو اسے اس بالیدگی کے مادی وسائل مہیا کرنے میں بخل نہ کرنا چاہیے۔ جیسا امریکہ کی مثال میں وضاحت گزر چکی ہے۔ جو لوگ یونیورسٹیوں کے گرمائی نصابوں میں حصہ لیتے ہیں وہ اس لیے ایسا کرتے ہیں کہ ترقی کا صرف یہی ایک راستہ ہے۔

ہمارے ہاں بھی اساتذہ کو ترقیاں ملتی ہیں، اکثر اوقات وہ ایک گریڈ سے کود کر اگلے گریڈ میں جا پہنچتے ہیں۔ مگر یہ پیش قدمی تعلیمی ترقی سے وابستہ نہیں، بلکہ محض مدت ملازمت سے، گویا سالوں تک ایک ہی جگہ گڑے رہنا بذات خود کوئی بڑی خوبی ہے: تاہم یہ اصلاح بھی غنیمت ہے، کیونکہ زمانہ قبل از آزادی میں مدت ملازمت سے بڑھ کر نفع رساں چیز سیاسی دھڑے بندیوں کے ساتھ وابستگی تھی، اس لیے امید رکھنی چاہیے کہ اب اگلا قدم یہ ہوگا کہ مدت ملازمت کی بجائے فنی بالیدگی کو وجہ استحقاق قرار دے دیا جائے۔

(۲) تعلیمی رسائل

تعلیمی جرائد اور رسائل نہ صرف اساتذہ کی فنی خدمت انجام دے سکتے ہیں، بلکہ وہ عوام کو سکولوں کی ضرورتوں سے آگاہ کر کے مدرسے اور معاشرے کو قریب تر لا سکتے ہیں۔ مگر یہ نتائج اسی صورت میں مرتب ہوں گے جب اساتذہ خود ان رسالوں کو چلائیں، یعنی ان کے خریدار بھی بنیں اور ان کے لیے مضامین بھی لکھیں اور اس طرح انہیں خود کفیل بنا دیں۔ ہمارے ہاں "پنجاب ایجوکیشنل جنرل" نہایت پرانا فنی رسالہ ہے۔ جو انگریزی زبان میں چھپتا ہے۔ آزادی کے بعد سے "آموزش" اردو میں یہی خدمت انجام دے رہا ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ یہ دونوں رسالے سرکاری مدد کے سہارے جیتے ہیں، اور ہمارے بیشتر اساتذہ قلمی معاونت تو درکنار ان کے پڑھنے کے لیے وقت نہیں نکال سکتے۔

(۳) تعلیمی انجمنیں

امریکہ میں اساتذہ کی انجمنوں کو جو وقار حاصل ہے اس کی بڑی وجہ وہ تعلیمی اور فنی خدمات ہیں جو ان انجمنوں نے انجام دی ہیں، ۱۹۳۵ء میں ایجوکیشن پالیسیز کمیشن نے جو رپورٹ ایجوکیشن فار آل امریکن یوتھ کے نام سے مرتب کی تھی وہ ان انجمنوں کی بیش بہا تعلیمی خدمات کا ایک نہ مٹنے والا ثبوت ہے۔ اس کے علاوہ

یہ جماعتیں آئے دن جن مختلف تحقیقاتی مطالعوں اور جائزوں کا اہتمام کرتی رہتی ہیں، ان سے نہ صرف اساتذہ کو عملی تعلیم کے دوررس معاشری اثرات کا بہترین علم حاصل ہوتا ہے، بلکہ گروہ پیشہ کے وسائل کی پوری واقفیت بھی۔

ہمارے ہاں اساتذہ کی انجمنوں کا آغاز ۱۹۳۵ء کی صوبائی خودمختاری کے بعد سے قرار دیا جاسکتا ہے، جب صوبوں میں عوامی وزراء نے وزارتِ تعلیم کے قلمدان سنبھالے اور عوامی تائید حاصل کرنے کے لیے تعلیمی انجمنوں کی حوصلہ افزائی کی لیکن اس ابتدائی دور میں یہ جماعتیں عموماً چند چالاک لوگوں کے ہاتھوں میں آلۂ کار بن کر رہ گئیں، جن کی ساری دوڑ دھوپ کا ماحصل یہ تھا کہ اس وسیلے سے افسرانِ بالا کو مٹھی میں لاکر ذاتی فائدے حاصل کیے جائیں، اور اپنا بھی اثر و رسوخ بڑھایا جائے۔ آزادی کے بعد ان جماعتوں نے زیادہ صحت مند دور میں قدم رکھا ہے۔ مگر پھر بھی وہ ابھی اس منزل سے کوسوں دور ہیں۔ جہاں ان کی ہم مغربی جماعتیں مدت سے پہنچ چکی ہیں۔ حال ہی میں اساتذہ کی تنخواہوں میں جو تسلی بخش اضافے ہوئے ہیں ان کے حصول میں ان انجمنوں کی کوششوں کو کافی دخل ہے، مگر ابھی انہیں یہ احساس نہیں ہوا کہ اساتذہ کی ذہنی اور فنی بالیدگی کے لیے کوشش کرنا بھی ان کے فرائض میں داخل ہے۔ امید رکھنی چاہیے کہ استاد کا معاشی مقام اونچا کرنے کی جدوجہد سے جو وقار اور اعتماد نفس ان انجمنوں کو حاصل ہوا ہے اسے فنی خدمت کے لیے جلد استعمال کیا جائے گا۔

(۴) اساتذہ کی عملی مدد

تربیتی درسگاہوں میں اساتذہ کو نظری تعلیم کے ساتھ ساتھ عملی مشق کا تھوڑا بہت موقعہ بھی دیا جاتا ہے، مگر فی الحقیقت عملی تعلیم اسوقت شروع ہوتی ہے جب یہ لوگ تربیت گاہوں سے رخصت ہوکر سکولوں میں کام کرتے ہیں۔ یہاں عموماً مصلحتیں نظری اصولوں سے ٹکرائی ہوئی نظر آتی ہیں۔ اس لیے ضرورت اس بات کی ہے کہ جن لوگوں نے نظری اصولوں کی تعلیم دی تھی وہ اب عملی دشواریوں کو ان اصولوں کی روشنی میں حل کرنے میں مدد دیں۔

امریکہ میں یہ اصول مان لیا گیا ہے۔ چناںچہ اکثر یونیورسٹیوں کے ماہرینِ تعلیم استادوں اور نگران افسروں کی درخواست پر ہر وقت تعلیمی مدد اور رہنمائی پیش کرنے کے لیے تیار رہتے ہیں۔ اساتذہ اپنی مخصوص مشکلیں

ان لوگوں کے سامنے پیش کرتے ہیں، اور وہ اپنے بالغ علم اور عملی تجربہ ان لوگوں کے لیے حاضر کر دیتے ہیں اس طرح ان کی رہنمائی اور جماعتی تعاون سے مخصوص مسائل کے حل تلاش کیے جاتے ہیں۔

ہمارے ہاں اساتذہ کو ایسی کوئی مدد یا رہنمائی حاصل نہیں۔ سال بھر تعلیم دینے کے بعد تربیت گاہیں یہ فرض کر لیتی ہیں کہ انہوں نے اپنے طلبہ پر فنِ تعلیم کے سب بھید کھول دیے، اور اب زندگی بھر ان لوگوں کو کسی فنی رہنمائی کی ضرورت نہیں، ادھر جب یہ لوگ عملی تدریس میں قدم رکھتے ہیں تو اپنے تئیں بے پناہ دباؤ سے گھرا پاتے ہیں جو یہ تقاضا کرتا ہے کہ جو اصول ذہن میں لے کر آئے ہو انہیں بھول جاؤ، اور گرد و پیش کے حالات کا ساتھ دو، ایسے ماحول میں بہت کم لوگوں میں سکت باقی رہتی ہے کہ اپنے معتقدات کو وقت کے تقاضوں پر اولیت دیں۔ اس لیے بیشتر نوجوان اساتذہ تربیت گاہوں سے نکلتے ہی بد دلی اور یاس کا شکار ہونے لگتے ہیں، اور بہت جلد فرسودہ طریقوں کی دلدل میں پھنس جاتے ہیں۔

تاہم یہ ضرورت اس قدر اہم اور شدید ہے کہ اس سے آنکھیں بند کرنا بہت بڑی خود فریبی ہوگی۔ یہ کام اساتذہ کی تربیتی درس گاہوں کے کرنے کا ہے اور انہیں بہت جلد اس فرض کا احساس ہونا چاہیے۔ پچھلے سال ایک اہم تربیت گاہ کے کچھ معلمین کچھ دنوں کے دورہ پر نکلے تھے۔ مگر یہ سفر نہ تو کسی کی درخواست پر اختیار کیا گیا تھا، اور نہ ہی اس کے دوران میں اساتذہ نے اپنے کوئی مسائل ان ماہرین تعلیم کے سامنے پیش کئے۔ اس لیے یہ سفر محض ایک تفریحی دورہ بن کر رہ گیا۔

(۵) مستقل سرٹیفکیٹ کے لیے شرائط

امریکہ میں یہ عام دستور ہے کہ کوئی شخص محض کسی تربیتی درس گاہ سے سند حاصل کر کے کسی ریاست میں مستقل ملازمت حاصل نہیں کر سکتا۔ ہر ریاست نے مستقل سرٹیفکیٹ عطا کرنے کے لیے شرائط قائم کر رکھی ہیں، جو عموماً کچھ تعلیمی نصاب پر مشتمل ہیں۔ جب تک کوئی استاد سند کے علاوہ اس نصاب کو پورا نہ کر لے اس وقت تک اسے اس ریاست میں مستقل ملازمت کا حق حاصل نہیں ہوتا۔ یہ پابندی گویا ایک لحاظ سے فنی بالیدگی کا سامان پیدا کرتی ہے۔

ہمارے ہاں اس قسم کی کوئی شرائط موجود نہیں۔ یہ صحیح ہے کہ بعض حالتوں میں پہلی سند کچھ شمار

ہوتی ہے، اور اسے پکی اسوقت کہا جاتا ہے جب استاد لگاتار کچھ سالوں تک تسلی بخش کام دکھائے۔ مگر اس چیز کے لیے کسی مزید مطالعہ یا فنی بالیدگی کی ضرورت نہیں۔

ہمارے ہاں ایک اور چیز بھی موجود ہے جس کا مغرب میں کہیں وجود نہیں، اور وہ ہے خاص سندات کا عطا کیا جانا، اس کی وجہ جواز یہ بتائی جاتی ہے کہ جب کوئی استاد اتنی لمبی ملازمت کر چکے کہ کسی کالج یا سکول میں داخل ہو کر مزید تعلیم حاصل کرنا مشکل ہو جائے تو پھر اسے فنی ارتقا کے لیے خاص سند عطا کی جانی چاہیے۔ یہ دلیل یوں تو خوب وزنی ہے مگر اس کی خامی یہ ہے کہ خاص سند کو مزید مطالعہ یا فنی بالیدگی کے ساتھ وابستہ نہیں کیا گیا، بلکہ محض طول ملازمت اور افسران بالا کی سفارش کے ساتھ، اور یہ دونوں بنیادیں کسی طرح بھی بالیدگی کی ضامن نہیں۔

آزادی کے بعد اب تک صرف پنجاب میں سینکڑوں استادوں کو خاص سندیں بٹ چکی ہیں۔ مہاجر استادوں کی حوصلہ افزائی کا بے شک یہ اچھا طریق ہوتا۔ اگر خاص سند کے لیے کسی خاص نصاب کا پورا کرنا شرط قرار دیا جاتا۔ اس طرح سینکڑوں استادوں کو حقیقی بالیدگی کے لیے اکساہٹ محسوس ہوتی اور صوبے کی تعلیمی زندگی میں تقویت آتی، اگر اب بھی خاص سندوں کے لیے نصاب مقرر کر دیے جائیں، اور ان نصابوں کے پڑھانے کے لیے گرمیوں کی رخصتوں میں توسیعی پروگرام جاری کر دیے جائیں تو یہ چیز اساتذہ کی بالیدگی میں بہت کچھ ممد ثابت ہو سکتی ہے۔

(۶) تعلیمی تجربہ میں باہمی شرکت

یہ اہم ترین تکنیک ہے جو امریکہ میں اساتذہ کی بالیدگی کے لیے استعمال کی جا رہی ہے۔ اس کی مقبولیت دن بدن بڑھ رہی ہے۔ اس کی کئی ایک صورتیں ہو سکتی ہیں۔ جن میں سے زیادہ عام مندرجہ ذیل ہیں۔

(۱) اساتذہ ایک دوسرے کے کمروں میں جاتے اور اپنے ساتھیوں کے طریق تدریس کا مطالعہ کرتے ہیں خواہ یہ لوگ ایک ہی مدرسہ میں پڑھاتے ہوں یا ایک شہر کے مختلف مدرسوں میں۔ اس تکنیک کو عملی جامہ پہنانے کے لیے نہ صرف نظام اوقات کی موزوں ترتیب ضروری ہے بلکہ خود استادوں میں باہمی اعتماد اور بلند ظرفی بھی۔

(ب) کئی مدرسے تعلیمی میلوں کا اہتمام کرتے ہیں، مثلاً سینٹ لوئس کا سائنسی میلہ۔ ایسی نمائش کے لیے اساتذہ کی مختلف جماعتیں مل کر کام کرتی ہیں۔ اور اس طرح باہمی تعاون اور اشتراک عمل سے حصہ لینے والے تمام افراد کے علم و نظر میں کشادگی پیدا ہوتی ہے۔

(ج) مخصوص ماہرین یا خاص طور پر اچھے استاد نمونے کے سبق دیتے ہیں، اور باقی اساتذہ مشاہدہ کرتے ہیں۔ بعض اوقات خاص طور پر اچھے نمونے کے سبقوں کو ٹیلی ویژن پر پیش کیا جاتا ہے، تاکہ ان کا فائدہ مقامی کی بجائے قومی سطح پر ہو۔

(د) طرح طرح کے جلسے۔ کانفرنسیں اور اجتماع منعقد کیے جاتے ہیں، اور سیر و سیاحت کے پروگرام مرتب ہوتے ہیں جن میں اساتذہ کی مختلف دلچسپیوں کے بڑھنے اور ابھرنے کا سامان کیا جاتا ہے

(ص) اشتراک باہمی کی اہم ترین صورت ورکشاپ ہے، جس کا یہ مطلب ہے کہ اساتذہ کسی خاص ضرورت کو پورا کرنے یا کسی خاص مسئلہ کا حل ڈھونڈنے کے لیے ایک جگہ جمع ہوتے ہیں۔ ان مسائل اور مشکلات پر آزادانہ بحث ہوتی ہے۔ اور انہیں باقاعدہ حل طلب سوالوں کی شکل دی جاتی ہے۔ پھر یہ طے کیا جاتا ہے کہ ان مسائل کے حل میں کس کس جگہ سے مدد مل سکتی ہے۔ نگران اور منتظم افسر ہر طرح کی مدد فراہم کرنے کی کوشش کرتے ہیں، چناں نہ صرف موزوں ماہرین تعلیم کی خدمات حاصل کی جاتی ہیں بلکہ ہر قسم کی ضروری کتب اور امدادی مواد بھی مہیا کیا جاتا ہے۔ پس ضروری سامان سے لیس ہو کر اساتذہ اپنے مسائل کے حل کے وسیلے سوچتے ہیں۔ اپنے حالات اور مقامی ذرائع کا جائزہ لیتے ہیں۔ مسئلہ زیر بحث کے مختلف پہلو مختلف کمیٹیوں کے سپرد کر دیے جاتے ہیں، جو تحقیق مطالعہ کے بعد اپنی اپنی رپورٹیں عام اجلاس میں پیش کرتی ہیں۔ عموماً ایک عام اجلاس روزانہ ہوتا ہے۔ تاکہ تمام افراد مختلف پہلوؤں کی رفتار ترقی سے باخبر رہیں۔ مخصوص ماہرین اور ذمہ دار افسران مباحث کو متاثر کرنے کی بالکل کوئی کوشش نہیں کرتے، ان کی حیثیت محض مشیروں کی ہوتی ہے۔ جو اپنی رائے صرف اسی وقت پیش کرتے ہیں جب یہ رائے طلب کی جائے۔

یہ کام عموماً ہفتوں جاری رہتا ہے۔ ہر استاد کسی نہ کسی ماتحت مجلس سے متعلق ہوتا ہے۔ اور اپنے حصے کے کام کو

سرانجام دینے کے لیے مستند فنی اور تحقیقاتی لٹریچر کی چھان بین کرتا اور اس سے ضروری مواد فراہم کرتا ہے۔ اس کے علاوہ اسے خود بھی مقامی زندگی سے بہت سے اعداد و شمار اور دوسرا مواد جمع کرنا پڑتا ہے، اور یہ سارا کام ایک ایسا ذہنی اجالا اور ایک ایسی سائنسی روش فکر پیدا کرتا ہے جو زندگی بھر باقی رہتے ہیں۔

ورکشاپ کے خاتمہ پر جس لائحہ عمل کو اپنایا جاتا ہے اس پر فوراً عمل شروع ہو جاتا ہے، اور وقتاً فوقتاً اس کے نتائج کا جائزہ لیا جاتا ہے۔ جہاں کہیں تبدیلی یا ترمیم کی ضرورت پیش آئے اسے اختیار کیا جاتا ہے۔ غرض ورکشاپ انفرادی بالیدگی اور جماعتی یک جہتی کی ترقی کا نہایت موثر اور پسندیدہ ذریعہ ثابت ہوا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کی مقبولیت تھوڑے سے عرصہ میں حیرت انگیز طور پر بڑھ گئی ہے۔

عام طور پر یوں ہوتا ہے کہ تعطیلات گرما کے بعد مدرسہ کھلنے سے چند ہفتے پہلے استاد مدرسے میں جمع ہو جاتے ہیں اور آئندہ سال کے مسائل پر غور کرتے ہیں، اس طرح مدرسہ کھلنے تک ایک جامع لائحہ عمل تیار ہو جاتا ہے۔ ایسا لائحہ عمل جس کی تیاری میں ہر استاد نے حصہ لیا اور جسے کامیاب بنانے کے لیے تمام استاد یکساں خواہشمند ہیں۔

یہ ضروری نہیں کہ ورکشاپ تعلیمی سال کے آغاز میں ہی منعقد ہو۔ کئی سکولوں میں یہ کام سال بھر جاری رہتا ہے۔ مثلاً ریاست کنی کٹ میں الیسٹ ہیمپٹن ہائی سکول میں اساتذہ ہفتہ میں ایک بار ورکشاپ منعقد کرتے ہیں۔ جو ریاستی یونیورسٹی کے ایک فاضل پروفیسر کی رہنمائی میں کام کرتی ہے۔ ورکشاپ نے اپنا کام تین چار الگ الگ رقبوں میں بانٹ رکھا ہے۔ مثلاً معاشرتی علوم۔ زباندانی، کاروباری ریاضی وغیرہ۔ یہاں یہ امر قابل ذکر ہے کہ یہ کام اکثر اساتذہ کی صورت میں کسی اعلیٰ ڈگری کی تیاری شمار ہو گا۔

ورکشاپ کا طریق دو اہم بنیادوں پر قائم ہے۔ اول جمہوری طرز نگرانی، دوم۔ استاد کے دل میں اپنی صحیح اہمیت کا احساس، ان شرائط کی موجودگی میں استاد پوری آزادی سے بے جھجک اپنی حقیقی مشکلیں اپنے ساتھیوں کے سامنے پیش کرتے ہیں، گویا اعتراض، استہزا، اور تخویف سے خالی فضا میں ہر شخص کو اس کی اپنی سطح پر قبول کیا جاتا ہے۔ اس طرح جو بالیدگی پیدا ہوتی ہے وہ لامحالہ حقیقی اور معنی خیز ہوتی ہے۔

خاتمہ سخن:۔ دوران ملازمت میں اساتذہ کی بالیدگی کے لیے ابھی پاکستان میں کوئی منظم کوشش

شروع نہیں ہوئی۔ سکول اور نظم و نسق کے ذمہ دار لوگ عموماً یہ خیال کرتے ہیں کہ تربیتی درس گاہوں کا یہ فرض ہے کہ قابل محنتی اور بیدار مغز استاد تیار کریں۔ ایسی تربیت استاد کو لازمی طور پر اس قابل بنا دے گی کہ نئے مسائل کو خود بخود حل کر لے، یہ دیکھا جا چکا ہے کہ اس قسم کا مفروضہ تعلیم کے جدید تصور سے براہ راست ٹکراتا ہے۔ بلکہ اس نظریۂ حیات کی بھی صریح ضد ہے، جس کا عقیدہ یہ ہے کہ "اگر تمام سمندر سیاہی بن جائیں اور اسی قدر سیاہی اور فراہم کر دی جائے تو بھی یہ سیاہی ختم ہو جائے گی۔ مگر اللہ کے سارے بھید ضبط تحریر میں نہ آسکیں گے"۔

یہ فلسفہ، زندگی اور جدید سائنس اور ٹکنالوجی کے تقاضے شدت سے یہ مطالبہ کرتے ہیں کہ علم اور روشنی کے متلاشی کا قدم کہیں رکنے نہ پائے۔ کیونکہ یہ وہ راستہ ہے جس کی منزل مسلسل راہ نوردی کے سوا کچھ نہیں۔ یہاں منزل اور مقام کا نام لینا ناقابل عفو گناہ ہے۔ جو شخص ایسے راستے میں دوسروں کے لیے میر قافلہ ہو، اس کی سب سے بڑی ذمہ داری اس کے سوا اور کیا ہو گی کہ وہ خود لگاتار پیش قدمی کا شیدائی ہو۔ پس قبل از ملازمت تربیت کو کافی سمجھنا دراصل استاد کے اصلی فرض سے بہت بڑی بے خبری ہے۔

تاہم ایک ایسے ملک میں جسے آزادی حاصل کیے ابھی صرف چھ برس ہوئے ہیں اور جہاں استبداد کی روایات صدیوں پرانی ہیں۔ کسی شخص کو آناً فاناً انقلابوں کی توقع نہ رکھنی چاہیے۔ اساتذہ کی مسلسل بالیدگی ایک اہم قومی ضرورت ہے، اور اس کا سامان ہونا چاہیے۔ پچھلی روایات کو دیکھتے ہوئے یہ امید رکھنا عبث ہے کہ اساتذہ کی اپنی کوششیں خود بخود اس چیز کا بندوبست کر لیں گی۔ ابتداً لامحالہ انتظام و نگرانی کے ذمہ دار لوگوں کو کرنا ہو گی۔ انہیں روائتی جبر و استبداد کی گرفت کو ڈھیلا ہی نہیں بلکہ سرے سے ختم کر دینا ہو گا، یہ خوف کہ اس گرفت کے نرم ہو جانے سے نظم و نسق یا کام کی خوبی میں فرق آجائے گا بالکل بے بنیاد ہے تجربہ گواہ ہے کہ جہاں یہ کام خود استادوں کے ہاتھوں میں سونپا گیا وہاں انہوں نے خود اپنے اوپر ایسی پابندیاں عائد کیں جو جابر سے جابر افسر بھی عائد کرنے کی ہمت نہ کرتا۔

یہاں ایک مثال کا ذکر کر دینا دلچسپی سے خالی نہ ہو گا۔ ریاست کنیکٹی کٹ (امریکہ) میں ویسٹ ہورٹ ہائی سکول اپنے جمہوری نظم و نسق کے لیے خاص شہرت رکھتا ہے۔ یہ سارا کام استادوں کے ہاتھ میں ہے

اور سپرنٹنڈنٹ آف سکول، جو ثانوی نظم و نسق کا ذمہ دار ہے، صرف انہی فیصلوں کو نافذ کرتا ہے جو اساتذہ نے خود پسند کیے ہوں۔ اس قسم کے ایک فیصلے کی مثال اساتذہ کی ترقی کا مسئلہ ہے، جس کے متعلق استادوں نے یہ طے کیا کہ سالانہ ترقی کے لیے ہر استاد کو سال میں اوسطاً اس قدر تعلیمی نصاب یا تحقیقاتی کام پورا کرنا چاہیے اور ایک گریڈ سے اگلے گریڈ میں ترقی پانے کے لیے پانچ سال کے عرصے میں اسی قسم کا اس قدر کام۔ یہی نہیں بلکہ یہ فیصلہ بھی ہوا کہ جو شخص پانچ سال کے عرصہ میں کم از کم اس قدر بالیدگی کا ثبوت نہیں دے گا (کمیٹی نے ایک خاص حد مقرر کر رکھی ہے) وہ تنخواہ کے سکیل میں ایک قدم پیچھے چلا جائے گا۔ اساتذہ کی مسلسل بالیدگی کے لیے یہ پروگرام جس قدر پُرتاثیر ہے وہ ظاہر ہے، مگر ایسا پروگرام خود استاد ہی اپنے لیے مرتب کر سکتے ہیں، کوئی دوسرا شخص ان پر اسے ٹھوپا نہیں سکتا۔

انتظامی افسروں کے علاوہ اساتذہ کی بالیدگی کی ذمہ داری تربیتی درس گاہوں پر بھی شدت سے عائد ہوتی ہے۔ انہیں نہ صرف توسیعی اور تجدیدی نصاب پیش کرنے چاہئیں، بلکہ اساتذہ کی درخواست پر ان کی عملی مشکلوں کو حل کرنے میں مدد بھی مہیا کرنی چاہیے۔ بدقسمتی سے نگران افسر ابھی تک کسی بیرونی افسر کو مدرسوں میں دیکھنے کے عادی نہیں۔ وہ اسے اپنے اختیارات کے علاقہ میں حملہ خیال کرتے ہیں، مگر یہ خیال جس قدر کھوکھلا ہے، اس کا کچھ اندازہ اوپر کی مثال سے ہو سکتا ہے۔ استاد، تربیتی ادارے اور نگران افسر یہ تمام لوگ ایک مشترک کام کے لیے فدا ہیں جو اسی صورت میں انجام پا سکتا ہے، جب یہ تینوں قوتیں ایک دوسرے کے پہلو بہ پہلو، ایک ہی سطح پر مل کر کام کریں۔

ثانوی مدارج میں ریاضی کا نصاب

فضل محمد خاں

(۶)

اس مضمون کے متعلق یہ چھٹی قسط ہے۔ پہلی قسطوں میں ان امور کو واضح کیا گیا ہے کہ آیا ثانوی مدارج میں ریاضی کو اختیاری مضمون کی حیثیت دینی چاہیے جیسا کہ آج کل سیکنڈری بورڈ لاہور اور پشاور یونیورسٹی نے اپنے نصاب برائے جماعت نہم و دہم میں دے رکھی ہے۔ یا ثانوی مدارج میں ریاضی کو ایک لازمی مضمون کی حیثیت سے رکھنا ضروری ہے، جیسے کہ پنجاب یونیورسٹی اور پشاور یونیورسٹی نے اپنے گذشتہ نصابوں میں کیا تھا۔ یا اس مضمون کے دو حصے کر دینے چاہئیں۔ ایک حصہ لازمی اور دوسرا اختیاری جیسا کہ آج کل ڈھاکہ بورڈ آف سیکنڈری ایجوکیشن اور کراچی بورڈ آف سیکنڈری ایجوکیشن نے کیا ہوا ہے۔

اس مضمون میں ہم اس بات کی وضاحت کریں گے کہ ان تینوں طریقوں میں کونسا طریقہ بہتر ہے اور اس طریقہ سے مطابقت کرتے ہوئے ہمارا ثانوی مدارج کا نصاب کیا ہونا چاہیے۔

تیسرا طریقہ کیوں بہتر ہے

ہمارے خیال میں تیسرا طریقہ زیادہ مناسب ہے۔ یعنی جماعت نہم و دہم میں ریاضی کے نصاب کے دو حصے ہونے چاہئیں۔ ایک حصہ لازمی ہو، اور دوسرا اختیاری۔ لازمی حصے کو جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے سب طلبہ پڑھیں گے اور اختیاری حصہ صرف وہ طلبہ پڑھیں گے جو ریاضی کی صلاحیت رکھتے ہیں یا جن کو ایسے پیشوں کو اختیار کرنا ہے، جن کا دار و مدار ریاضی پر ہے، یا جو کالجوں میں جا کر اعلیٰ ریاضی پڑھنا چاہتے ہوں، اس کی وجوہ درج ذیل ہیں۔

(۱) نفسیاتی تجربہ گاہوں میں صلاحیتوں کے سلسلے میں جو تجربات کیے گئے ہیں، ان سے حسابیہ صلاحیت یا ہندسی صلاحیت کی موجودگی ضرور ثابت ہوتی ہے، اور ان صلاحیتوں کی عدم موجودگی میں ریاضی میں مہارت حاصل کرنا ناممکن ہے۔ اعلیٰ ریاضی کے سیکھنے کے لیے طلبہ میں ان صلاحیتوں کی موجودگی کی

ضرورت ہے۔ مگر یہ تسلیم کرنا کہ ابتدائی ریاضی کا سیکھنا بھی ان صلاحیتوں پر منحصر ہے صحیح نہیں۔ راقم الحروف کو تجربہ ہے کہ ان بچوں کو جو ریاضی میں انتہائی کمزور ہوتے ہیں اور جن کو ریاضی سے کوئی دلچسپی نہیں ہوتی اگر تھوڑی سی صحیح رہبری مل جائے تو وہ اس مضمون میں دلچسپی کا اظہار کرتے ہیں اور اُن کی کمزوری آہستہ آہستہ دور ہو جاتی ہے۔

(ii) یہ عام نظریہ کہ ایک اوسط آدمی کو اپنی زندگی ریاضی کے بنیادی قاعدوں اور اکائی کی آسان صورتوں یا وزن اور لمبائی کے پیمانوں کے علاوہ ریاضی کے کسی اور قاعدہ کی ضرورت پیش نہیں آتی۔ موجودہ ترقی پذیر دور میں صحیح نہیں ہے۔ موجودہ دور میں سائنس اور تکنالوجی نے بے حد ترقی کر لی ہے۔ سائنس اور تکنالوجی کو سمجھنے کے لیے ان کے صحیح اطلاق کے لیے اور ان سے پورا فائدہ اٹھانے کے لیے ریاضی میں اچھی خاصی مہارت کی ضرورت ہے، اس دور میں صرف بنیادی قاعدوں اور اکائی کو جاننے والا آدمی تو اوسط شہری کہلانے کا بھی مستحق نہیں ہو سکتا۔

(iii) یہ بھی امر واقعہ ہے کہ بچوں میں انفرادی طور پر تفاوت ہوتا ہے، ان کی دلچسپیوں میں تفاوت ہوتا ہے ان کی صلاحیتوں میں تفاوت ہوتا ہے، ان کے گھریلو ماحول میں تفاوت ہوتا ہے، ان کے مستقبل کے پیشوں میں بھی تفاوت ہوتا ہے۔ ثانوی مدارج کے نصاب کے تعین میں اس تفاوت کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا، ایسی صورت میں ریاضی کا سب کے لیے لازمی ہونا صحیح نہیں ہے۔ مگر یہ بھی یاد رہے کہ بچہ ایسا پرندہ نہیں ہے جو جدھر جائے پھرا پھرا تا رہے، اس کے اچھا شہری ہونے پر مستقبل کے معاشرے کا دارومدار ہے۔ لہٰذا معاشرے کی ضروریات بھی مقدم ہیں۔ لہٰذا کسی ایسے مضمون کا لازمی نصاب سے خارج کر دینا صحیح نہیں جس پر معاشری زندگی کا دارومدار ہو۔ ریاضی ایک ایسا مضمون ہے جس کے ثانوی مدارج میں لازمی نصاب کی فہرست سے خارج کر دینا معاشرے کے لیے مہلک ہوگا۔

(iv) نویں جماعت کے بچوں کی اوسط عمر تقریباً ۱۴، ۱۵ سال کی ہوتی ہے، اس عمر کے بچوں میں یہ شعور نہیں ہوتا کہ وہ اپنے لیے مضامین کا صحیح انتخاب کر سکیں، یہ دقت تو ایسے ممالک میں بھی ہے جہاں طلبہ کے والدین لکھے پڑھے ہوتے ہیں، اور جہاں ہر سکول میں طلبہ کی رہبری کے لیے کلینک بنے ہوتے ہیں۔ ہمارے ہاں تو طلبہ کی اکثریت ایسی ہے جن کے والدین بے لکھے پڑھے ہوتے ہیں۔ ہمارے ہاں مدارس میں طلبہ کی رہبری کا بھی کوئی انتظام نہیں ہے

لہٰذا طلبہ کو اگر مضامین کے انتخاب کا کلی حق دے دیا جائے تو وہ ہر اس مضمون کو چھوڑنے کی کوشش کریں گے جس میں تھوڑا بہت باقاعدگی سے کام کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ ان کو اپنے مستقبل کی قطعی پرواہ نہیں ہوگی ایسی حالت میں وہ ریاضی جیسے مفید مضمون کو چھوڑنے کی پوری پوری کوشش کریں گے، چوں کہ والدین بھی لکھے پڑھے نہیں ہوتے، وہ بھی بچوں کی کسی طرح رہبری نہیں کر سکتے، لہٰذا چند سالوں میں ہی ہم اپنے معاشرہ میں ایک گروہ ایسا پیدا کر لیں گے، جس کے افراد نے ثانوی مدارج میں ریاضی کی تعلیم حاصل نہیں کی ہوگی۔ یہ گروہ ہر اس پیشے میں شامل نہیں ہو سکے گا جس کے لیے تھوڑے بہت ریاضی کی ضرورت ہے۔ پرائمری سکولوں کے معلمین کی حیثیت سے یہ زیادہ کامیاب نہ ہو سکیں گے۔ بنکوں کی ملازمت میں ان کو کوئی قبول نہ کرے گا۔ ڈاک خانوں کی ملازمت سے یہ لوگ گھبرائیں گے۔

(vi) یہ امر مسلمہ ہے کہ کالجوں میں جا کر علم طبیعات اور علم کیمیا کی تحصیل کے لیے ریاضی میں خاصی مہارت کی ضرورت ہے۔ صرف یہی نہیں۔ علم معاشیات کے سیکھنے کے لیے بھی ریاضی کی کافی ضرورت ہے، بلکہ آگے جا کر تو ریاضیاتی معاشیات ایک الگ مضمون بن گیا ہے۔ ایسے ہی جغرافیہ کی صحیح تحصیل کے لیے بھی ریاضی پر خاصی مہارت کی ضرورت ہے۔ آگے جا کر ریاضیاتی جغرافیہ بھی ایک الگ مضمون کی حیثیت لے لیتا ہے اس کے علاوہ علم شماریات، اور تجرباتی نفسیات بھی ریاضی پر مبنی ہیں۔ پس ہر وہ طالب علم جو ثانوی مدارج میں ریاضی کی تعلیم سے محروم ہو چکا ہے، وہ کالجوں میں جا کر سائنس کے مضمونوں کے علاوہ اور بہت سے مضمونوں کی تعلیم میں مہارت حاصل کرنے سے قاصر رہے گا۔

(vii) ترقی یافتہ ممالک میں ایسے کم ملک ملیں گے جن میں نویں اور دسویں جماعت میں ریاضی کو غیر ضروری سمجھا گیا ہو۔ امریکہ میں جہاں بچوں کو مضامین کے انتخاب میں پوری پوری سہولتیں دی جاتی ہیں وہاں بھی نویں جماعت میں الجبرا یا عام ریاضی سب کے لیے لازمی ہے۔ عام ریاضی کا کورس ان طلبہ کو پڑھنا ہوتا ہے جن کے متعلق سکول کے تعلیمی مشیر نے واضح طور پر کہہ دیا ہو کہ وہ الجبرا میں کامیابی سے چل نہیں سکیں گے روس میں دس سال کے ثانوی مدارج میں ہر جماعت میں ریاضی لازمی ہے۔

اب میں پڑوسی ملک کے ایک صوبہ کا تجربہ بتا کر اس بحث کو ختم کرنا چاہتا ہوں۔ اس ملک کے

ایک صوبہ میں یہ سمجھا گیا کہ ریاضی کی وجہ سے بہت سے طلبہ دسویں جماعت کے امتحان میں ناکام ہوتے ہیں چونکہ الجبرا اور جیومیٹری کی مڈل تک کی تعلیم کافی ہے۔ لہٰذا نویں اور دسویں جماعت کے طلبہ کے لیے حساب کو لازمی کر دیا جائے اور الجبرا اور جیومیٹری کو اختیاری مضمون بنا دیا جائے، چنانچہ ۱۹۴۵ء میں اس اسکیم پر عملی جامہ پہنایا گیا۔ ڈائرکٹر محکمہ تعلیم نے سکولوں میں ایک مراسلہ بھیجا کہ صرف اُن طلبہ کو الجبرا اور جیومیٹری چھوڑنے دیا جائے جو ریاضی میں بے حد کمزور ہوں، اور وہ بھی اگر ان کے والدین تحریری عرضی ہیڈ ماسٹر صاحب کی خدمت میں پیش کریں کہ ایسا کر دیا جائے۔ عام خیال تھا کہ الجبرا اور جیومیٹری کو چھوڑنے کے لیے کون اتنا جھنجھٹ کرے گا۔ کیوں کہ طالب علم تو حساب سے گھبراتا تھا۔ الجبرا اور جیومیٹری کی وجہ سے تو وہ امتحان میں کامیاب ہوتا تھا، مگر نہ ڈائرکٹر کی تحریر کا کسی پر اثر ہوا اور نہ ہی والدین نے عرضی کا دینا غیر ضروری سمجھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ دو سال کے عرصہ میں تقریباً ۵۰ فی صد طلبہ نے ہندسہ اور الجبرا چھوڑ دیا۔ چار سال بعد وہاں ریاضی کو غیر لازمی قرار دیا گیا۔ اب صحیح معنوں میں طلبہ کو اس مضمون سے نجات مل گئی۔ پھر اس کو پڑھنے کے لیے کون تیار ہوتا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ تھوڑے ہی عرصہ میں ایک جم غفیر پیدا ہو گیا جس کے افراد نویں اور دسویں جماعت میں ریاضی سے بے بہرہ رہے تھے۔ چھوٹے چھوٹے پیشوں میں اس کمی کے اثرات کو محسوس کیا گیا۔ کالجوں میں اس کے اثرات محسوس کیے گئے، اور عوام نے ان اثرات کو محسوس کیا۔ چنانچہ اب وہاں دوبارہ ریاضی کو لازمی مضمون قرار دیا گیا ہے۔ مجھے یہ ڈر ہے کہ پاکستان کے اُن صوبوں میں بھی جہاں فی الحال ریاضی کو لازمی نصاب سے خارج کر دیا گیا ہے۔ وہاں بھی دو چار سال بعد دوبارہ اس مسئلہ پر غور کرنا پڑے گا، اور ریاضی کو لازمی مضمون قرار دینا ہوگا، خواہ اس کی کوئی بھی شکل کیوں نہ ہو۔

پس زیادہ بہتر صورت یہی ہے کہ ریاضی کو لازمی مضامین کی فہرست سے ہرگز نہ نکالا جائے، بلکہ اس کے دو حصے کر دیے جائیں۔ ایک لازمی اور دوسرا اختیاری۔ ایسا کرنے سے جو طلبہ ریاضی کی صلاحیتیں نہیں رکھتے وہ اختیاری ریاضی کو چھوڑ دیں گے، اور ان کے کندھوں سے غیر ضروری بوجھ اتر جائے گا۔ مگر وہ بھی نویں اور دسویں جماعتوں میں ریاضی کے ان قاعدوں کی مزید تعلیم حاصل کر لیں گے جن کی افادی حیثیت ہے۔

یہاں پر یہ بتا دینا بے جا نہ ہوگا کہ ڈھاکہ بورڈ آف سیکنڈری ایجوکیشن میں ثانوی مدارج کے اختتام پر

چار قسم کے امتحانات رائج ہیں۔
(۱) میٹرکولیشن (۲) میٹرکولیشن ٹیکنیکل (۳) سکول فائنل (۴) ہائی مدرسہ امتحان
ان چاروں کے نصاب میں ریاضی کسی نہ کسی شکل میں شامل ہے۔ پہلے اور چوتھے گروہ میں ایک ایک پرچہ کا اور دوسرے اور تیسرے گروہ میں دو۔ دو پرچوں کا پڑھنا ضروری ہے۔
اجمیر بورڈ میں ہائی سکول کے مضامین کو گروہوں میں تقسیم کر دیا گیا ہے۔ جیسا کہ بورڈ آف سیکنڈری ایجوکیشن لاہور میں ہو چکا ہے۔ وہاں مضامین کے سات گروہ بنا دیے گئے ہیں۔

(۱) انسانی علوم
(۲) سائنس
(۳) تجارتی علوم
(۴) ٹیکنیکل علوم
(۵) زراعت
(۶) فنون لطیفہ
(۷) گھریلو سائنس

ان گروہوں کے نصاب میں پہلے، تیسرے، پانچویں، چھٹے، اور ساتویں گروہ میں ریاضی کے ایک ایک پرچے کا اور دوسرے اور چوتھے گروہ میں ریاضی کے دو دو پرچوں کا پڑھنا ضروری ہے۔
بورڈ آف سیکنڈری ایجوکیشن کراچی میں ریاضی کے نصاب کے دو حصے کر دیے گئے ہیں، لازمی حصہ اور اختیاری حصہ۔ ریاضی کی تدریس کے مقاصد لکھتے وقت کراچی بورڈ نے اس امر کی وضاحت کر دی ہے کہ لازمی ریاضی کی تدریس کا مقصد اس علمی ریاضی کو پڑھنا ہے، جو طلبہ کے لیے افادی اہمیت رکھتا ہو۔ وہ ان طلبہ کی ترقی کے راستے میں جن کو ریاضی سے دلچسپی نہیں ہے سد باب نہ ہو۔ لازمی ریاضی اختیاری ریاضی کا ایک مختصر حصہ نہیں ہے۔ لازمی کورس میں ریاضی کی مختلف شاخوں کے عملی موضوع کو متحد کیا گیا اور اس کورس میں رسمی ثبوت اور منطقی تسلسل کی بجائے مختصر قواعد پر زور دیا گیا ہے۔ ریاضیاتی اصولوں

عملی طریقوں سے واضح کرنے پر زور دیا گیا ہے۔ پس لازمی کورس کی تدریس کا مقصد اختیاری کورس کی تدریس کے مقصد سے بالکل جداگانہ ہے، اور اسے اختیاری کورس سے ایک الگ یونٹ تصور کرنے کی ضرورت ہے۔ پس اس کورس میں جو مشقیں شامل کی جائیں وہ عملی زندگی سے مربوط ہونی چاہئیں۔ مشکل اور پیچیدہ سوالات اس کورس میں سرے سے مفقود ہونے چاہئیں۔ ان کی بجائے اس کورس میں مشقی سوالات درج ہونے چاہئیں جو سیدھے اور براہ راست کسی قاعدے کے بنیادی اصولوں کی وضاحت کرتے ہوں، اور جن کی روزمرہ زندگی میں افادی اہمیت ہو۔

ڈھاکہ اور کراچی کا نصاب

پیشتر اس کے کہ اس امر پر بحث کی جائے کہ لازمی اور اختیاری نصابوں میں ریاضی کی کس کس شاخ کو شامل کیا جائے۔ ان شاخوں کے کون کون سے موضوع سے مواد لیا جائے اور کس قسم کا مواد لیا جائے یہ بے جا نہ ہوگا کہ کراچی اور ڈھاکہ کے سیکنڈری بورڈوں کے ریاضی کے نصاب کا سرسری جائزہ لیا جائے، کیوں کہ اصولاً ہم ان کی تجاویز سے زیادہ متفق ہیں۔ چناں چہ ہم ان دونوں بورڈوں کے تجویز کردہ نصابوں کو ذیل میں درج کرتے ہیں۔ نصاب ایک جدول کی شکل میں دیے گئے ہیں۔ تاکہ ایک نظر میں نصابوں کا خاکہ نظر کے سامنے آ سکے۔ علاوہ بریں ریاضی کی وہ تمام شاخیں درج کی گئی ہیں جہاں سے موضوع لیے گئے ہیں، اور ان موضوع کو بھی درج کر دیا گیا ہے جو مختلف شاخوں سے لے کر لازمی اور اختیاری نصاب کے اجزا بنے ہیں۔

لازمی ریاضی کا نصاب

ریاضی کی شاخ	ڈھاکہ بورڈ	کراچی بورڈ
حساب	(۱) مڈل جماعتوں کا نصاب جس میں ابتدائی قاعدے، تجارت، اوسط فی صد، سود مفرد، نفع نقصان نسبت و تناسب شامل ہیں۔	(۱) تجارت مفرد و تجارت مرکب، اوسط۔ فی صد۔ نسبت۔ و تناسب نفع و نقصان۔ سادہ سود
	(۲) شہریوں سے متعلق حساب مثلاً:۔	(۲) آمدنی اور اخراجات کو ظاہر کرتا

	ڈھاکہ بورڈ	کراچی بورڈ
حساب	انکم ٹیکس۔ ریٹ۔ قومی آمدنی، انشورنس	اور بیلنس معلوم کرنا۔ ریٹ ٹیکس انشورنس۔ دیوالیہ۔ منی کاٹا اور تجارتی کٹوتی۔ راس المال۔ تبادلہ
	(۳) ترسیمات۔ بکسروں کے گراف مستطیل نما گراف۔ کالم گراف	(۳)
	(۴) مستطیل اور مثلث، اشکال کے رقبے اور ان تمام اشکال کے رقبے جو مستطیل اور مثلث پر مبنی ہیں	(۴) مستطیل۔ مربع۔ متوازی الاضلاع اور مثلث کا رقبہ (جو کہ جیومیٹری کے نصاب کا جزو ہیں۔
الجبرا	(۵) کل چاعنوں کے نصاب کا اعادہ، جس میں چاروں بنیادی قاعدے مفرد اور ہمزاد مساواتیں اور عبارتی سوالات اور آسان اجزائے ضربی شامل ہیں۔	(۵) چاروں بنیادی قاعدے مساوات مفرد۔ ہمزاد مساواتیں اور عبارتی سوالات۔
	(۶) مسئلہ باقی۔ نسبت و تناسب۔ مفرد مساواتوں کے گراف۔ ہمزاد مساواتوں کا بذریعہ گراف حل۔ اعداد و شماریات سے متعلق گراف	(۶) مقسوم علیہ اعظم و ذو اضعاف اقل بذریعہ اجزا ضربی۔ آسان کسور۔ مفرد مساواتوں کے گراف۔ اجزاء ضربی۔ (آسان و عاقلیں۔ مسئلہ باقی شامل نہیں)
جیومیٹری	(۷) مسائل متعلقہ دائرہ۔ لوکس۔ مثلث کے زاویوں۔ ضلعوں اور وسطانیوں کے ناصف خطوط کا ہم نقطہ ہونا بشرطیکہ نتیجتاً غور شدہ	(۷) مسائل متعلقہ دائرہ۔ نقطہ پر کے زاویے متناظرہ اور متبادلہ زاویے۔ مثلث چوکور، اور متوازی الاضلاع کے زاویے۔ مثلثوں کا منطبق ہونا بشرطیکہ نتیجتاً غور شدہ

	ڈھاکہ بورڈ	کراچی بورڈ
عملی جیومیٹری و مسلّمات	(۸) مثلثوں۔ ذوارلعبۃ الاضلاعوں کی بناوٹ۔ دائرے کی بناوٹ۔ مثلث کے اندر اور باہر دائرے کھینچنا۔ خطوط کی مختلف نسبتوں میں تقسیم۔ ایک چوکور کے برابر (رقبہ میں) مثلث بنانا۔ اور مستطیل کے برابر (رقبہ میں) مربع بنانا	(۸) مشابہ اشکال کا تصور۔ کسی شکل کے مشابہ دوسری شکل بنانا
	(۹) ×	(۹) دائرے اور قطعہ دائرہ کا رقبہ۔ مکعب۔ مکعب نما۔ مخروط۔ بیلنس منشور۔ ہرم اور کرے کا حجم اور سطح کا رقبہ۔
ٹرگونومیٹری	(۱۰) کسی مثلث کے کا قانون۔ ٹرگونومیٹری کے ذریعہ فیثاغورث کا ثبوت مندرجہ ذیل قانونوں کا ثبوت۔	(۱۰) ×
مثلثی اور ہندسی مسایل کا اطلاق	(۱۱) i۔ نقشہ کشی سے متعلق سوالات۔ اسکیل۔ کنٹور لائن۔ سلوپ ii۔ بلندی اور فاصلے سے متعلق سوالات۔ iii۔ سادہ پلین اور رایلی ورشن سے متعلق مشقی سوالات۔	(۱۱) ×

دونوں بورڈوں کے مجوزہ نصابوں کا مطالعہ کرنے سے ہم ان نتائج پر پہنچتے ہیں۔

(i) دونوں بورڈوں میں حساب کا مجوزہ نصاب تقریباً یکساں ہے۔ کراچی بورڈ کے نصاب میں ہنڈی کاٹا تجارتی کٹوتی۔ دیوالیہ۔ راس المال اور تبادلہ ایسے موضوع ہیں جو ڈھاکہ بورڈ کے نصاب میں شامل نہیں ہیں۔ دونوں بورڈوں کے مجوزہ نصاب میں تجارت۔ اوسط۔ فی صد۔ سود مفرد۔ نفع نقصان۔ نسبت و تناسب۔ انکم ٹیکس۔ ریٹ۔ قومی آمدنی، انشورنس شامل ہیں۔

(ii) دونوں بورڈوں کے نصابوں میں مستطیل۔ مثلث اور ان پر مبنی اشکال کی مسطحات شامل ہیں۔ کراچی بورڈ کے نصاب میں مجسمات کی مسطحات اور ان کا حجم شامل ہے، اور یہ موضوع ڈھاکہ بورڈ کے نصاب میں شامل نہیں ہیں۔

(iii) دونوں بورڈوں کے الجبرے کے مجوزہ نصاب میں چاروں ابتدائی قاعدے۔ آسان اجزائے ضربی مفرد مساواتیں اور ان کے عبارتی سوالات۔ آسان ہمزاد مساواتیں اور ان سے متعلق آسان عبارتی سوالات۔ اعداد و شماریات کے گراف۔ مفرد مساواتوں کے گراف شامل ہیں۔ ان بورڈوں کے الجبرے کے نصاب میں بہت معمولی سا فرق ہے۔ ڈھاکہ بورڈ کے نصاب میں مسئلہ باقی اور نسبت و تناسب شامل ہیں۔ جو کہ کراچی بورڈ کے نصاب میں شامل نہیں کیے گئے۔

(iv) جہاں تک علم ہندسہ کے نصاب کا تعلق ہے دونوں بورڈوں کے نقطۂ نظر جداگانہ ہے۔ مسئلہ فیثاغورث اور دائرے کے مسائل دونوں میں مشترک ہیں۔ باقی نصاب جداگانہ ہے۔ ڈھاکہ بورڈ نے لوکس اور اس کے اطلاق پر زور دیا ہے۔ کراچی بورڈ میں متماثل اور متشابہ اشکال پر زور دیا گیا ہے۔ ایسے ہی عملی جیومیٹری میں بھی ڈھاکہ بورڈ میں دائرے سے متعلق عملی مسائل پر زور دیا گیا ہے، اور کراچی بورڈ میں متشابہ اشکال کی بناوٹ پر۔

(v) علم مثلث ڈھاکہ بورڈ کے نصاب کا جزو ہے۔ اس میں چند اہم مسائل شامل کیے گئے ہیں۔ کراچی بورڈ کے نصاب میں علم مثلث کا کوئی ذکر نہیں۔

(vi) دونوں بورڈوں نے ہندسی مسائل کے عملی اطلاق پر زور دیا ہے، ڈھاکہ بورڈ نے واضح کر دیا ہے

کہ ہندسی مسائل کے نقشہ کشی ۔ فاصلوں اور بلندیوں سے متعلق سوالات۔ آسان پلیین اور ایلیو پر مشتمل سوالات دیے جانے چاہئیں۔ کراچی بورڈ نے اس بات پر زور دیا ہے کہ ہندسی مسائل کا اطلاق سروے واک (SURVEY WOK) میں واضح طور پر دینا چاہیے ۔

(VII) دونوں بورڈوں نے ہندسی مسائل کے نظری ثبوت پر زیادہ زور نہیں دیا ۔ کراچی بورڈ کے نصاب میں واضح طور پر لکھا ہے کہ ہندسی سچائیوں پر مہارت ضروری ہے ۔ رسمی ثبوت کو رٹوانے کی چنداں ضرورت نہیں۔ ڈھاکہ بورڈ میں صرف چند ایک ہندسی مسائل کے نظری ثبوت بتانے کو کہا گیا ہے ۔ اور باقی مسائل کے نظری ثبوتوں کی ضرورت پر ثبوت نہیں دیا گیا۔ صرف مختلف موضوع سے متعلق ہندسی سچائیوں کا جاننا کافی ہے ۔ چناں چہ لازمی ریاضی کے کتب کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ مصنفین نے ہندسی مسائل کو عملی ثبوتوں سے ثابت کرنے کی کوشش کی ہے ، اور ان کے نظری ثبوتوں کو زیادہ اہمیت نہیں دی ۔ گو نظری ثبوتوں کا ضمنی طور پر ثبوت نہ زور دے دیا گیا ہے ۔

اختیاری ریاضی کا نصاب

ریاضی کی شاخ	ڈھاکہ بورڈ	کراچی بورڈ
حساب	(۱) لازمی حساب کا پورا نصاب	(۱) ×
	(۲) تقریبی قیمتیں ۔ مختصر طریقے ۔ مقادیر اعظم نظام عشری ۔ سود مرکب ۔ راس المال حصص ۔ لوکارتھم ۔ مربع اور جذر کے جدول	(۲) ×
الجبرا	(۳) لازمی الجبرے کا پورا حصہ	(۳) ×
	(۴) اعداد و شماریات کے گراف ۔ مساوات درجہ دوم کے گراف ۔ گراف کے ذریعہ عبارتی سوالات کا حل ۔ تفاعل کا تصور ۔ معکوس تناسب ، درجہ دوم کی مساواتیں	(۴) مفرد مساواتیں ۔ آسان اجزائے ضربی آسان کسور ۔ ہمزاد مساواتیں درجہ دوم کی آسان مساواتیں ۔ مساواتوں کے عبارتی سوالات ۔ عاد ذو اضعاف اقل ۔ جذر

قوت نما۔ مقادیر اصم۔ جذر۔ حاسب، اور ہندسی سلسلے۔

سیٹری

(۵) لازمی ہندسہ کا پورا حصہ

(۶) مشابہ شکلیں۔ ہندسی اشکال کی مسطحات دائرے کا رقبہ۔ ذو نقطی دائرہ۔ خط ممس PARAIBLA اور ELLIPSE کا مقام النقاط۔ جیسے اضلاع یک والی اشکال کی بناوٹ۔ مشابہ اشکال کے رقبوں میں نسبت اور اس کا مشابہ مجسمات کے حجم میں اطلاق۔ زاویے کے داخلی ناصف کا مقابل کے اضلاع کو زاویے کے خطوط کی نسبت میں تقسیم کرنا۔

ما = ۲لا + ب اور ما = ۲لا کے گراف۔ ہمزاد مساواتوں کا بذریعہ گراف حل۔ نسبت و تناسب۔

(۵) ×

(۶) یہ نصاب بعینہٖ وہی ہے جو سیکنڈری ایجوکیشن بورڈ کا عملی اور نظری ہندسے کا موجودہ نصاب ہے۔ اس لیے اس کو وضاحت سے لکھنے کی ضرورت نہیں، اس کے دو حصے ہیں۔ نظری ہندسہ اور عملی ہندسہ۔

نظری ہندسہ :- نقطہ پر کے زاویے۔ متوازی خطوط مستقیم۔ مثلثیں اور دیگر ہندسی اشکال رقبہ۔ طریق النقاط۔ مسئلہ فیثاغورث اور اس کا اطلاق۔ دائرہ۔ مشابہ اشکال سے متعلق مسئلے۔

عملی ہندسہ خطوط۔ زاویہ۔ قوس اور دائرے کی تنصیف۔ عمود گرانا۔ ایک زاویے کے برابر دوسرا زاویہ بنانا۔ مثلث اور ذوار بعۃ الاضلاع کی بناوٹ۔ مثلث کی تنصیف۔ مثلث کو تین برابر حصوں میں تقسیم کرنا۔ مثلث کے برابر مربع بنانا۔ مثلث کے برابر مستطیل بنانا۔ کثیر الاضلاع کے برابر مکون بنانا۔ کسی خط کی

	ڈھاکہ بورڈ	کراچی بورڈ
		داخلی اور خارجی تقسیم۔ امورِ معلومہ سے دائرے کی بناوٹ۔ خط کی زرین نسبت میں تقسیم اور اس کا اطلاق، دائرے کے اندر یا باہر کسی مثلث کے مشابہ مثلث بنانا۔ تیسرا، چوتھا اور وسطی تناسب
ٹرگونومیٹری	(۷) لازمی نصاب کا پورا حصہ	(۷) ×
	(۸) زاویے کی پیمائش کے مختلف طریقے، قائمہ زاویہ سے کم زاویے کی مثلثی نسبتیں ۳۰، ۴۵، ۶۰، ۹۰ درجے کے زاویوں کی مثلثی نسبتیں۔ فاصلوں اور بلندیوں کے آسان سوال۔	(۸) مثلثی نسبتیں۔ مثلثی نسبتوں کے جدول کا استعمال بالخصوص ۰، ۳۰، ۴۵، ۶۰، ۹۰/۱۲۰ درجے کے زاویوں کی مثلثی نسبتیں۔ قائمہ زاویہ مثلث کا حل۔ فاصلوں اور بلندیوں کے آسان سوالات۔

دونوں بورڈوں کے مجوزہ نصاب کے مطالعہ سے ہم ان نتائج کو اخذ کرتے ہیں۔

(i) کراچی بورڈ کے مجوزہ اختیاری ریاضی کے نصاب میں حساب سرے سے مفقود ہے۔ ڈھاکہ بورڈ کے نصاب میں حساب کے چند قاعدے شامل ہیں۔ ان قاعدوں میں سے جو ڈھاکہ بورڈ کے نصاب میں شامل ہیں اکثر قاعدے کراچی بورڈ کے لازمی ریاضی کے کورس میں شامل ہیں۔ مگر لوگارتم اور مختصر طریقے (CONTRCTEDMETHOD) کراچی بورڈ کے نہ لازمی ریاضی کے نصاب میں اور نہ ہی اختیاری ریاضی کے نصاب میں شامل کیے گئے ہیں۔

(ii) دونوں بورڈوں کا الجبرے کا نصاب مشابہ ہے۔ ڈھاکہ بورڈ کے نصاب میں قوت نما، متفادیر اصم، حسابیہ اور ہندسی مسئلے شامل ہیں۔ یہ موضوع کراچی بورڈ کے نصاب میں شامل نہیں ہیں۔

(iii) ڈھاکہ بورڈ کے نصاب میں نظری ہندسہ کو بہت اہمیت نہیں دی گئی۔ کراچی بورڈ کے نصاب میں نظری ہندسہ کو بہت اہمیت دی گئی ہے۔ یہاں تقریباً پچاس اقلیدسی مسائل درج ہیں، جن کا نظری ثبوت

طالب علموں کے لیے جاننا ضروری ہے۔ ڈھاکہ بورڈ میں صرف چند مسئلوں کو نظری طریق سے ثابت کرنیکی ضرورت سمجھی گئی ہے۔ ڈھاکہ بورڈ میں لوکس سے زیادہ واقفیت دلانے پر اہمیت دی گئی ہے، اس کے علاوہ نونقطی دائرہ اور سمسن خط بھی نصاب کا جزو ہیں۔

(vii) عملی ہندسہ کے نصاب میں کراچی بورڈ نے خط کی زرین تقسیم اور اس کا اطلاق۔ تیسرا، چوتھا، اور وسطی متناسب معلوم کرنا شامل کر دیے ہیں، جو ڈھاکہ بورڈ کے مجوزہ نصاب میں شامل نہیں ہیں۔

(viii) ٹرگونومیٹری میں دونوں بورڈوں کا نصاب تقریباً یکساں ہے۔ صرف فرق اتنا ہے کہ کراچی بورڈ نے قائمہ زاویہ مثلث کا حل نصاب میں شامل کیا ہے، جو ڈھاکہ بورڈ کے نصاب میں شامل نہیں ہیں اس کے برعکس ڈھاکہ بورڈ نے زاویوں کی پیمائش، مثلثی نسبتوں کا مسئلہ فیثا غورث میں اطلاق اور دو مسئلوں کا حل اپنے ہاں ٹرگونومیٹری کے نصاب میں شامل کیے ہیں۔

یہ واضح رہے کہ دونوں بورڈوں کے نصاب پر تنقید کرنا مناسب نہیں سمجھا گیا۔ ان بورڈوں کے نصاب کو دینا ضروری اس لیے سمجھا گیا تھا کہ اصولاً یہ ہمارے سالقہ ریاضی کے نصاب کی تجاویز سے اتفاق کرتے ہیں جن اصولوں کے ماتحت ہم لازمی اور اختیاری ریاضی کے نصاب کی تجاویز سے اتفاق کرتے ہیں۔ جن اصولوں کے ماتحت ہم لازمی اور اختیاری ریاضی کے نصاب تجویز کرنا چاہتے ہیں، وہ اگلے پیراگرافوں میں واضح کیے جائیں گے۔

موجودہ نصاب کی حدود

ہمارے ہاں آج کل جو نصاب رائج ہے، اس میں صرف حساب الجبرا اور جیومیٹری شامل ہیں۔ اس امر کے پیش نظر کہ سکولوں میں ریاضی کی تدریس کے لیے کم از کم ۹ پیریڈ بلکہ کسی کسی مدرسے میں ۱۲ پیریڈ وقف ہوتے ہیں۔ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ ہمارے ثانوی مدارس میں ریاضی کا نصاب غیر معمولی طور پر کم پڑھایا جاتا ہے، اس کی واحد وجہ یہ ہے کہ نصاب صحیح طور پر تجویز نہیں گیا۔ اس نصاب کی تجدید کی بے حد ضرورت ہے۔ آئیے اب موجودہ نصاب کا جائزہ لیا جائے۔

(۱) حساب:۔ حساب کا موجودہ نصاب قرات وکتابت سے شروع ہو کر تقریباً سارے موضوع پر مشتمل ہے اس میں شک نہیں کہ جب اس کو شروع شروع میں تجویز کیا تھا (جس کو کہ تقریباً ۵۰ سال ہو گئے) تو اس وقت

اس سلسلہ میں سب سے بڑا امر جو پیش نظر رکھا گیا تھا وہ ریاضی کے سارے نصاب کو نئے سرے میں انگریزی زبان میں پڑھانا تھا۔ اس زمانے میں ذریعہ امتحان انگریزی زبان تھی، اور کوئی طالب علم کسی مضمون کے پرچے کے جوابات سوائے انگریزی کے کسی دوسری زبان میں نہ دے سکتا تھا، پس اس امر کی ضرورت تھی کہ قرات و کتابت سے لے کر سارے کے سارے قاعدوں کو نویں اور دسویں جماعت میں نئے سرے سے کرایا جائے۔ اگر آپ مڈل کلاسوں کی حساب کی کتابوں کا غور سے مطالعہ کریں تو آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ ان کتابوں میں جو قاعدے درج کیے گئے ہیں ان پر اتنے مختلف النوع مشقی سوالات دیے گئے ہیں کہ دوبارہ ان قاعدوں کے سارے سوالوں کو نویں اور دسویں جماعت میں دہرانا تضیع اوقات ہے۔

ہم میں سے چند کو یہ اعتراض ضرور ہوتا ہے کہ مڈل سکول کا طالب علم جو حساب میں مشقی سوالات حل کرتا ہے، وہ اتنے مشکل یا معیاری نہیں ہوتے کہ ہم یہ کہہ سکیں کہ وہ طالب علم حساب پر مہارت حاصل کر چکا ہو ان سے یہ عرض کیا جاتا ہے کہ محض میکانکی قسم کے سوالوں کے حل کرنے میں اتنا وقت اور قوت صرف کرنا بے معنی چیز ہے۔ عاد اعظم، ذواضعاف اقل، کسور، ستہ متناسب، کام اور وقت سے متعلق گورکھ دھندوں میں الجھنا بے سود ہے، لائق طلبہ کے لیے میکانکی سوالوں کا حل کرنا ایک غیر ضروری بوجھ ہے، اور اوسط درجے کے طلبہ کے لیے یہ ایک ڈراؤنی چیز کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔

کمزور طلبہ تو ریاضی کے کمرے کو ایک جیل خانے سے تشبیہ دیتے رہتے ہیں، اور حساب کے پیریڈوں کو قید با مشقت سمجھتے ہیں۔ کیا یہ بجا نہ ہوگا کہ طول وطویل اور پیچیدہ حسابیہ عملوں والے سوالات کو لازمی نصاب سے خارج کر دیا جائے۔

(۱۲) الجبرا:- ایک اوسط آدمی کو جو ایسے پیشوں میں شامل نہیں ہے، جن کا دارومدار ریاضی یا سائنس پر ہو زندگی میں ایسے کم مواقع پیش آتے ہیں، جہاں اسے الجبرے کے ایسے موضوع کی ضرورت پڑے، جس قسم کے موضوع اسے نویں اور دسویں جماعت میں پڑھائے جاتے ہیں۔ اس امر کے پیش نظر تمام موضوع کو جس میں سوائے جبری عملوں کی پیچیدگی کے اور کچھ بھی نہیں ہے، لازمی نصاب سے خارج کر دینا مناسب ہوگا۔ عام آدمی کی اس موضوع پر مہارت بے سود ہے، کیوں کہ وہ اس کو زندگی بھر کبھی استعمال نہیں کرے گا اس موضوع کے پیچیدہ سوالات۔

جذر اور اجسّرائے ضربی کے پیچیدہ سوالات نسبت و تناسب اور اخراج شامل ہیں۔

اس سلسلہ میں ایک سوال نامہ کا تجزیہ بے جا نہ ہوگا۔ راقم الحروف نے ریاضی کے اساتذہ کو برصغیر ہند و پاک میں ایک سوال نامہ بھیجا تھا، اور ان سے درخواست کی تھی کہ وہ نویں اور دسویں جماعت میں ریاضی کا نمونے کا سلیبس بنا کر راقم الحروف کو روانہ کریں۔ اس سوال نامہ میں راقم الحروف نے ریاضی کے وہ تمام موضوع درج کر دیے تھے جو مختلف یونیورسٹیوں اور بورڈوں کے نصاب میں شامل تھے، اور ان سے یہ بھی دریافت کیا تھا کہ وہ اپنی رائے بتائیں کہ ان میں سے کون کون سے موضوع نویں اور دسویں جماعت کے نصاب میں شامل نہیں ہونے چاہئیں۔ ایک سَو اساتذہ نے جواب روانہ کیا تھا۔ ان اساتذہ کے سلسلہ وار نمبر اور وہ تمام موضوع درج کیے جا رہے ہیں جن کی نگاہ میں یہ موضوع بے کار تھے، اور ان کا نصاب سے خارج کر دینا ضروری سمجھا گیا تھا۔ اس سے آپ کو اندازہ ہو جائے گا کہ درج ذیل موضوع ریاضی کے اساتذہ کی نظروں میں بھی کتنے غیر مانوس تھے۔ ان کا خیال تھا کہ نہ عام طلبہ کے لیے ان کی کوئی افادی اہمیت ہے، نہ عام طلبہ ان سے متعلق اصولوں کو آسانی سے سمجھتے ہیں

نمبر شمار	موضوع	اساتذہ جو ان موضوع کو خارج از نصاب کرنا چاہتے ہیں۔
۱۔	مقادیر اصم	۴، ۵، ۶، ۷، ۸، ۹، ۱۰، ۱۱، ۱۴، ۱۶، ۱۷، ۱۸، ۲۲، ۲۴، ۲۷، ۳۰، ۳۲، ۳۳، ۳۴، ۳۸، ۳۹، ۴۰، ۴۱، ۴۲، ۴۵، ۴۶، ۴۷، ۴۸، ۴۹، ۵۰، ۵۱، ۵۲، ۵۳، ۵۴، ۵۵، ۵۶، ۵۷، ۵۸، ۵۹، ۶۰، ۶۱، ۶۲، ۶۴، ۶۵، ۶۷، ۶۸، ۶۹، ۷۰، ۷۱، ۷۲، ۷۳، ۷۴، ۷۵، ۷۶، ۷۷، ۸۱، ۸۴، ۸۵، ۸۶، ۸۷، ۸۸، ۸۹، ۹۰، ۹۱، ۹۲، ۹۴، ۹۷، ۹۸، ۹۹، ۱۰۰،
۲۔	قوت نما	۴، ۵، ۶، ۷، ۸، ۹، ۱۰، ۱۱، ۱۴، ۱۵، ۱۶، ۱۸، ۲۲، ۲۴، ۲۷، ۳۰، ۳۲، ۳۴، ۳۸، ۳۹، ۴۰، ۴۱، ۴۲، ۴۵، ۴۶، ۴۷، ۴۸، ۴۹، ۵۰، ۵۱، ۵۲، ۵۳، ۵۴، ۵۵، ۵۶، ۵۷، ۵۸، ۵۹، ۶۰، ۶۱، ۶۲،

نمبر شمار	موضوع	اساتذہ جو اِن موضوع کو خارج از نصاب کرنا چاہتے ہیں۔
		۶۴، ۶۷، ۶۸، ۶۹، ۷۰، ۷۲، ۷۳، ۷۴، ۷۵، ۷۶، ۷۷، ۸۳، ۸۴، ۸۶، ۸۷، ۸۸، ۸۹، ۹۰، ۹۱، ۹۴، ۹۸، ۹۹، ۱۰۰۔
۳۔		۲، ۵، ۶، ۷، ۱۰، ۱۱، ۱۲، ۱۵، ۱۶، ۱۷، ۱۸، ۲۲، ۳۰، ۳۱، ۳۳، ۳۴، ۳۸، ۳۹، ۴۰، ۴۶، ۴۷، ۴۸، ۴۹، ۵۰، ۵۱، ۵۲، ۵۳، ۵۴، ۵۵، ۵۶، ۵۷، ۵۸، ۵۹، ۶۰، ۶۱، ۶۴، ۶۵، ۶۶، ۶۸، ۷۰، ۷۳، ۷۴، ۷۵، ۷۶، ۷۷، ۸۱، ۸۳، ۸۴، ۸۵، ۸۶، ۸۷، ۸۸، ۸۹، ۹۰، ۹۱، ۹۲، ۹۸، ۹۹، ۱۰۰۔
۴۔	اسقاط	۲، ۵، ۶، ۷، ۱۰، ۱۶، ۱۸، ۲۲، ۲۳، ۲۶، ۲۷، ۳۰، ۳۱، ۳۲، ۳۳، ۳۴، ۳۹، ۴۰، ۴۷، ۴۸، ۴۹، ۵۰، ۵۱، ۵۲، ۵۳، ۵۴، ۵۵، ۵۶، ۶۵، ۶۶، ۷۰، ۷۲، ۷۴، ۷۷، ۸۳، ۸۴، ۸۶، ۸۸، ۸۹، ۹۲، ۹۸، ۹۹، ۱۰۰۔
۵۔	نسبت تناسب	۷، ۱۰، ۱۲، ۱۵، ۱۶، ۱۸، ۲۲، ۲۷، ۳۲، ۳۴، ۳۹، ۴۰، ۴۷، ۴۸، ۴۹، ۵۰، ۵۱، ۵۳، ۵۴، ۵۵، ۵۶، ۵۷، ۵۸، ۶۷، ۷۳، ۷۴، ۸۱، ۸۴، ۸۷، ۸۸، ۸۹، ۹۰، ۹۱، ۹۲، ۹۹، ۱۰۰۔
۶۔	لوگارتھم	۴، ۵، ۶، ۸، ۹، ۱۰، ۱۲، ۱۳، ۱۴، ۱۵، ۱۶، ۱۷، ۱۸، ۲۰، ۲۲، ۲۴، ۲۶، ۲۷، ۳۰، ۳۲، ۳۳، ۳۴، ۳۹، ۴۰، ۴۱، ۴۲، ۴۶، ۴۷، ۴۸، ۴۹،

نمبر شمار	موضوع	اساتذہ جو ان موضوع کو خارج از نصاب کرنا چاہتے ہیں
		۵۰، ۵۱، ۵۲، ۵۳، ۵۴، ۵۵، ۵۶، ۵۷، ۵۸، ۶۰، ۶۳، ۶۵، ۶۸، ۷۴، ۷۵، ۷۶، ۸۲، ۸۳، ۸۴، ۸۵، ۸۶، ۸۷، ۸۸، ۸۹، ۹۰، ۹۷، ۹۸، ۹۹، ۱۰۰ -
۷ -	حسابیہ اور ہندسی	۱، ۲، ۴، ۵، ۶، ۸، ۹، ۱۰، ۱۱، ۱۲، ۱۳، ۱۴، ۱۵، ۱۷، ۱۸، ۲۰، ۲۲، ۲۴، ۲۶، ۲۷، ۳۰، ۳۱، ۳۲، ۳۴، ۳۹، ۴۰، ۴۱، ۴۲، ۴۶، ۴۷، ۴۸، ۴۹، ۵۰، ۵۱، ۵۲، ۵۳، ۵۴، ۵۵، ۵۶، ۵۷، ۵۸، ۶۰، ۶۱، ۶۲، ۶۴، ۶۵، ۶۷، ۶۸، ۶۹، ۷۰، ۷۱، ۷۳، ۷۴، ۷۵، ۷۶، ۷۷، ۸۱، ۸۳، ۸۴، ۸۵، ۸۶، ۸۷، ۸۸، ۸۹، ۹۰، ۹۱، ۹۲، ۹۷، ۹۸، ۹۹، ۱۰۰ -
۸ -	متماثلات	۷، ۱۷، ۴۸، ۴۹، ۵۲، ۵۳، ۶۷، ۶۸، ۷۳، ۷۴، ۷۷، ۷۸، ۸۶ -
۹ -	کسور	۷، ۴۸، ۴۹، ۵۰، ۵۱، ۵۳، ۵۴، ۵۸، ۶۰، ۷۲، ۸۰، ۸۹، ۹۷، ۹۸ -
۱۰	اعشاریہ متوالی	۷، ۱۰، ۲۰، ۲۲، ۲۴، ۳۲، ۳۳، ۳۵، ۳۶، ۳۷، ۳۹، ۴۶، ۴۷، ۴۸، ۴۹، ۵۸، ۶۳، ۶۵، ۸۰، ۸۴، ۸۷، ۸۸، ۸۹، ۹۷، ۹۹، ۱۰۰ -

۱۱- اعشاریہ میں ۷، ۱۹، ۲۰، ۲۲، ۳۰، ۳۵، ۳۶، ۳۷،
تخمینہ لگانا- ۳۹، ۴۰، ۴۶، ۴۷، ۴۸، ۴۹، ۵۹، ۶۲، ۷۴،
۸۱، ۸۷، ۸۸، ۸۹، ۹۲، ۹۷ -

۱۲- راس المال ۲، ۷، ۱۱، ۱۲، ۱۳، ۱۴، ۱۶، ۱۷، ۲۰، ۳۱،
۳۴، ۳۹، ۴۰، ۴۱، ۴۲، ۴۳، ۴۴، ۴۶، ۴۷، ۴۸،
۴۹، ۵۰، ۵۱، ۶۰، ۷۳، ۷۴، ۷۵، ۷۷، ۷۸، ۸۰،
۸۵، ۸۶، ۸۸، ۸۹، ۹۲، ۹۶ -

۱۳- منتی سماٹا ۲، ۱۰، ۱۱، ۳۱، ۵۳، ۵۴، ۷۴، ۷۵، ۷۷،
۷۸، ۸۰، ۸۹، ۹۱ -

۱۴- بیمہ ۲، ۶، ۷، ۸، ۹، ۱۲، ۱۷، ۲۰، ۲۶، ۳۱،
۴۴، ۴۸، ۵۰، ۵۱، ۷۱، ۷۳، ۷۴، ۷۵، ۷۷، ۷۸،
۸۱، ۸۲، ۸۳، ۸۶، ۸۸، ۸۹، ۹۱ -

---

۱۵ قاعدہ تسلسل ۳، ۵، ۶، ۷، ۱۰، ۱۳، ۱۵، ۱۷، ۲۰، ۲۴،
۳۰، ۳۱، ۳۹، ۴۰، ۴۶، ۴۷، ۴۸، ۴۹، ۵۰، ۵۱،
۵۲، ۵۳، ۵۴، ۵۹، ۶۰، ۶۷، ۶۸، ۷۳، ۷۴، ۷۵،
۸۳، ۸۸، ۹۲، ۹۶، ۱۰۰ -

۱۶- آمیزش ۳، ۷، ۸، ۹، ۱۰، ۱۳، ۱۶، ۲۰، ۲۴،
۳۱، ۴۲، ۴۶، ۴۷، ۴۸، ۴۹، ۵۲، ۵۹، ۶۳،
۷۲، ۷۳، ۷۴، ۸۰، ۸۲، ۸۵، ۸۶، ۸۹، ۹۱،
۹۲، ۹۶، ۹۸،

۱۷- کیلنڈر ۵، ۶، ۸، ۹، ۲۰، ۲۶، ۳۱، ۳۴، ۴۰، ۴۸، ۷۱، ۷۳، ۷۴، ۷۵، ۸۱،
۸۲، ۸۳، ۸۶، ۹۸۔

۱۸۔	بیچک	۶ ، ۷ ، ۸ ، ۹ ، ۱۰ ، ۱۴ ، ۱۷ ، ۲۰ ، ۲۴ ، ۳۱ ، ۳۹ ، ۴۰ ، ۴۴ ، ۴۸ ، ۵۰ ، ۵۱ ، ۷۳ ، ۷۴ ، ۷۵ ، ۷۷ ، ۷۸ ، ۸۱ ، ۸۲ ، ۸۳ ، ۸۶ ، ۸۸ ، ۹۱ ۔
۱۹۔	بل BILLS	۷ ، ۸ ، ۹ ، ۱۴ ، ۱۷ ، ۲۰ ، ۲۴ ، ۳۱ ، ۳۴ ، ۳۹ ، ۴۰ ، ۴۱ ، ۴۲ ، ۴۴ ، ۴۸ ، ۵۰ ، ۵۱ ، ۷۳ ، ۷۴ ، ۷۵ ، ۷۷ ، ۷۸ ، ۸۱ ، ۸۲ ، ۸۳ ، ۸۶ ، ۸۸ ، ۹۱ ،
۲۰۔	ٹیکس AXES	۷ ، ۹ ، ۲۴ ، ۴۱ ، ۴۲ ، ۴۴ ، ۴۸ ، ۵۰ ، ۵۱ ، ۷۴ ، ۷۵ ، ۷۷ ، ۸۳ ، ۸۶ ، ۸۸ ، ۹۱ ۔

اس کے علاوہ پانچ اساتذہ نے یہ رائے دی تھی کہ سود مرکب کو نصاب سے خارج کر دینا چاہیے۔ چار اساتذہ نے یہ کہا تھا کہ الجبرے کے نصاب سے مقسوم علیہ اعظم اور ذواضعاف اقل کو نکال دینا چاہیے۔ تین اساتذہ اس کے حق میں بھی تھے کہ نویں اور دسویں جماعت کے ریاضی کے نصاب میں حساب کو کوئی جگہ نہیں دینی چاہیے۔ بلکہ ان جماعتوں میں الجبرا، ہندسہ، اور ریاضی کی دوسری شاخوں کے چند قاعدے پڑھائے جانے چاہئیں۔ یہ ضروری نہیں کہ جو کچھ ان تجربہ کار اساتذہ نے کہا ہے اس کو پتھر پر لکیر سمجھ لیا جائے، لیکن ہم یہ بھی نہیں کر سکتے کہ ان لوگوں کے تجربات کو بالکل قطع نظر کر دیا جائے۔

(باقی آئندہ)

اصل چیز کام ہے

ادریس احمد

ہر مدرسے میں جو چیز استادوں کے درمیان سب سے زیادہ موضوع بحث بنی رہتی ہے وہ صدر معلم ہے صدر معلم کی ہر بات اور اس کے روزمرہ کے کام استادوں کے مجمع میں فوراً گفتگو کا موضوع بن جاتے ہیں۔ یہ بات اس ملک میں بھی اسی طرح صحیح ہے جس طرح دنیا کے دوسرے ملکوں میں، بلکہ سچ پوچھیے تو یہ چیز ہر اس ادارے کے متعلق صحیح ہے، جہاں انسانوں کا ایک گروہ کسی ایک انسان کی رہنمائی اور نگرانی میں کام کر رہا ہو۔

ایک برطانوی استاد کا خط

ذیل میں ایک برطانوی استاد کا خط درج کیا جاتا ہے جو اس نے برطانوی تعلیمی رسالے ٹیچرز ورلڈ (دنیائے معلمین) کے مدیر کو لکھا ہے:۔

"آپ صدر معلم کے فرائض کی کیا تعریف کریں گے، یقیناً اس کے فرائض میں سب سے بنیادی چیز، وہ نمائی ہو گی"

"میں یہ سوال اس لیے پوچھ رہا ہوں کہ مجھے اپنے موجودہ صدر معلم کا رویہ بہت عجیب معلوم ہوتا ہے۔ میں ایک ابتدائی مدرسے میں پڑھا رہا ہوں، جس میں کوئی چار سو لڑکے لڑکیاں پڑھتے ہیں" صبح کی دعا میں شامل ہونے کے علاوہ (وہ بھی ہر صبح نہیں) صدر معلم مدرسے کی زندگی میں مزید کوئی دلچسپی نہیں لیتا۔ وہ شام کے چار بج کر دس منٹ تک سارا دن اپنے دفتر میں گذار دیتا ہے ہاں وہ تفریح کا وقفہ ہمیشہ کمرۂ معلمین میں گذارتا ہے۔ وہ بہت کم کمرہ ہائے جماعت میں جاتا ہے اور وہ بھی کسی انتظامی کام کے سلسلے میں، مثلاً کسی امدادی چندہ کی فراہمی، یا کسی کیمپ کے قیام کا اعلان (وہ خود کسی کیمپ میں شرکت نہیں کرتا) وہ مدرسے کے موسیقی کے پروگرام میں بظاہر کوئی

دل چسپی نہیں لیتا۔ نہ ہی اسے کھیلوں سے کوئی سروکار ہے، وہ کھیل کے میدان میں کبھی نہیں گیا۔ بچوں کے ساتھ اس کا رابطہ صرف اس قدر ہے کہ کھانے کے وقت وہ ان کے ساتھ بیٹھتا ہے وہ بچوں کے لیے جو لائحہ عمل تجویز کرتا ہے وہ محض تجاویز پر مشتمل رہتا ہے، ان تجاویز کو عملی شکل دینا اور بچوں کے طرزِ عمل کی رہ نمائی اور نگرانی کرنا کلی طور پر استادوں کی ذمہ داری ہے، اس نے استادوں کے لیے ضوابط بنا رکھے ہیں۔ لیکن بچوں کے معاملے میں اس کا عقیدہ یہ ہے کہ بچوں کی صالح فطرت ہی ان کی رہ نمائی کے لیے کافی ہے، اس کے نظریات بہت اونچے معلوم ہوتے ہیں لیکن عمل کے معاملے میں وہ بالکل کورا معلوم ہوتا ہے۔"

ان حالات میں آپ سے پوچھنا چاہتا ہوں کہ کیا یہ صدر معلم فی الواقعہ وہ فرض انجام دے رہا ہے جس کے لیے جس کے لیے اس کو مقرر کیا گیا تھا، اور جس کے لیے اسے تنخواہ دی جا رہی ہے کیا اتنی تعداد طلبہ والے مدرسے میں فی الواقعہ اتنا کاغذی کام ہوتا ہے کہ وہ ایک آدمی کو صبح ۹ نو بجے سے شام کے چار بجے تک باندھے رکھے۔ بعض اوقات جب کوئی استاد چھٹی پر ہو تو صدر معلم اس کی جماعت لے لیتا ہے۔ مگر بیشتر صورتوں میں وہ اس کی جماعت کو دوسری جماعتوں میں تقسیم کر دیتا ہے۔ تاکہ وہ خود اپنا دفتری کام کر سکے"۔

"کیا یہ صورت حال خلاف معمول نہیں ہے؟ اگر ہے تو اس کا کیا علاج ہونا چاہیے؟ مدرسے میں بدیہی طور پر رہ نمائی کی کمی ہے، اور اگر یہ رہ نمائی فراہم کی جا سکے تو یہ مدرسہ بہت بہتر حالت میں ہو جائے"۔

مدیر کا اظہار رائے

اس خط پر رائے ظاہر کرتے ہوئے رسالے کا مدیر رقمطراز ہے:-

اس خط نے مجھے الجھن میں ڈال دیا ہے۔ دیانت داری کی بات یہ ہے کہ اس نے میرے دل میں تشویش پیدا کر دی ہے۔ جو سوال مجھے ستا رہا ہے وہ یہ ہے کہ کیا صدر معلم فی الواقعہ اس لیے ہوتا ہے کہ وہ رہ نمائی کرے اگر یہ ایسا ہے تو وہ فرض کو کس طرح انجام دے؟ میں خود اپنے آپ سے سوال پوچھ رہا ہوں کہ کیا میں ایک ایک

رونما ہوں۔ اگر جواب اثبات میں ہے تو میں اس صدر معلم سے کس حد تک مختلف ہوں، جس سے اس کا ایک نوجوان ماتحت اس قدر ناخوش یا غیر مطمئن ہے ؟"

میں نے آج مدرسے میں کیا کیا کیا ؟

میں نے آج مدرسے میں کیا کیا کیا ؟ اس سوال کا جواب ٹیچر ورلڈ کا مدیر ان الفاظ میں دیتا ہے : ۔

میں ۹ بجے مدرسے میں پہنچا (مدرسہ ساڑھے نو بجے لگتا ہے) اور پندرہ منٹ مندرجہ ذیل کاموں پر صرف کیے (۱) صبح کی دعا کے لیے دعاؤں کا انتخاب کیا (۲) مدرسے کے بڑے مانیٹر کے ساتھ بات چیت کی۔ اس کے خلاف الزام یہ تھا کہ اس نے چھوٹے بچوں کی ٹوپیاں چھین کر مسخرے کا کردار ادا کیا۔ اور اس طرح اپنے عہدے کے وقار کو گرایا۔ پھر میں نے کوئی پانچ دس منٹ تک اپنے نئے استاد صاحب کے ساتھ بات چیت کی، جو تین روز ہوئے اس مدرسے میں آئے تھے۔ میں نے ان سے پوچھا کہ آیا وہ نئے ماحول سے مانوس ہو گئے ہیں ؟ یا اس قسم کے کچھ اور سوال پوچھے"

پھر میں صبح کی دعا میں شریک ہوا، یہ میرا ہمیشہ کا دستور ہے، دعا کے خاتمہ پر میں نے دو منٹ تک تقریر کی (کم از کم میرا ارادہ یہی تھا کہ صرف دو منٹ تک بولوں) تقریر کا موضوع سینٹ ایڈریو کی زندگی تھی۔

دعا سے واپسی پر میں نے دیکھا کہ مدرسے کی مجلس منتظمہ کے ایک رکن جو ریلوے میں ملازم ہیں، میرا انتظار کر رہے ہیں۔ مجھے اچھی طرح یاد نہیں کہ وہ کتنی دیر تک ٹھہرے لیکن انہوں نے آدھ گھنٹہ سے یقیناً زیادہ وقت لیا۔ پھر میں نے کچھ خطوں کے جواب دیے۔ یہ خط زیادہ تر والدین کے تھے۔ اسی اثنا میں تین چار بار ٹیلی فون اٹھا کر استفسارات کے جواب دینے پڑے۔ یہ استفسارات بیشتر دفتر تعلیم کی طرف سے تھے۔ اتنے میں تفریح کا وقفہ آ گیا!

تفریح کا وقفہ حساب کی اہم کتاب کی غلطی کی تحقیق کی نذر ہو گیا۔ مدرسے میں مہیا کی جانے والی خوراک کے حساب میں ایک شدید غلطی رونما ہو گئی تھی۔ بے شک حساب کتاب کا یہ کام ایک سکریٹری کے ذمہ ہے۔ مگر وہ یہ معاملہ میرے پاس لے آئیں"

وقفے کے خاتمہ پر میں نئے استاد صاحب کے کمرے میں گیا، اور کوئی بیس منٹ تک ان کا سبق دیکھتا رہا۔ میرا خیال ہے کہ میری موجودگی انہیں پسند نہ تھی۔ جب میں واپس دفتر میں پہنچا تو

دیکھا کہ میز پر ایک کاغذ پر چند ٹیلی فون نمبر درج ہیں، اور ساتھ یہ نوٹ موجود ہے کہ ان اصحاب کے ساتھ ٹیلی فون پر بات کر لیجیے۔ ادھر سے فراغت پا کر میں ہال میں گیا، جہاں دو جماعتیں ایک ساتھ آنے والے سنگیت میلہ کے لیے تیاری میں مصروف تھیں۔ مجھے یقین ہے کہ موسیقی کی استانی نے میری موجودگی کو خوش آئند کہا، کیوں کہ وہ اپنا مضمون پڑھانے میں بہت ماہر ہے۔ اگرچہ جماعت کو قابو میں رکھنے کے معاملے میں وہ بہت زیادہ کامیاب نہیں"۔

ساڑھے بارہ سے سوا ایک بجے تک میں طعام گاہ میں بچوں کے کھانا کھانے کے وقت آخر تک حاضر رہا۔ اس سے فارغ ہوا تو دفتر میں آن بیٹھا، اور اخبار ٹائمز کے لفظی معمہ کو حل کرنے لگا لیکن قبل اس کے کہ میں اس کا ایک نقطہ بھی حل کر سکوں، سال اوّل کے ایک لڑکے کی ماں ملاقات کے لیے آگئیں اور آتے ہی بولیں "جناب میرے لیے اس کے سوا فراغت کا اور کوئی وقت نہ تھا، اور میں نے یہ بھی سوچا کہ اس وقت آنا بہتر ہے بجائے اس کے کہ میں اس وقت آؤں جب آپ کام میں لگے ہوں"۔

ان بی صاحبہ کے چلے جانے کے بعد میں نے بیشتر وقت سال اول اور سال آخر کی جماعتوں کے لیے ریاضی اور انگریزی کے لیے امتحانی پرچے تیار کرانے میں گزارا۔ میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ یہ کام ڈیڑھ گھنٹے میں ہو سکتا تھا۔ مگر اس سارے عرصے میں ملنے والوں، ٹیلی فون کرنے والوں، سوالات پوچھنے والوں، درخواستیں لے کر آنے والوں، اور امور مدرسہ کے متعلق طرح طرح کے استفسارات کرنے والوں کا تانتا لگا تار بندھا رہا۔ اور پرچے تیار کرنے کا کام قدم قدم پر رکتا رہا۔ رکاوٹیں ڈالنے والے کام بادی النظر میں نہایت چھوٹے اور حقیر سے ہیں۔ لیکن یہ سب جمع ہو کر نہ صرف صدر معلم کا بے اندازہ وقت کھا جاتے ہیں۔ بلکہ اس کا مغز بھی خوب چاٹتے ہیں، یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس کو سب لوگ تسلیم کریں گے"۔

کیا میں نے قیادت کا فرض انجام دیا؟

رسالے کا مدیر اپنے دن بھر کے کام پر جس کا مختصر سا خاکہ اوپر دیا گیا ہے۔ نگاہِ بازگشت ڈالتے ہوئے اپنے آپ سے پوچھتا ہے کہ کیا میں نے قیادت کا فرض انجام دیا؟ دن بھر کی کارکردگی کا مزید تجزیہ کرتے ہوئے وہ لکھتا ہے:

بعد دوپہر کا کچھ وقت ایک لڑکے کی ماں سے ملاقات کرنے میں گذرا جس کا بیان تھا کہ میرے بیٹے پر غلط چوری کا الزام لگایا گیا ہے، مجھے چاروناچار اس کی خاصی لمبی کہانی کو سننا پڑا۔ اس نے مجھے بتایا کہ اس کا بڑا بیٹا شاہی بحری بیڑے میں ملازم ہے۔ اس نے یہ بھی بتایا کہ لڑکے کا والد بڑے ڈاک خانہ میں ملازم ہے اور اس کی ملازمت کا ریکارڈ بہت لمبا اور بے داغ ہے، یہ تمام چیزیں اس بات کا ثبوت ہیں کہ اس کا بیٹا واللہ گندا چور نہیں ہے، یہ درست ہے کہ اس کے پاس ایک اور لڑکے کا فاؤنٹین پن پایا گیا تھا۔ مگر وہ سراسر ایک الگ کہانی تھی"۔

دن بھر کی ان مصروفیتوں پر نگاہ بازگشت ڈالتے ہوئے اب اپنے آپ سے یہ پوچھ رہا ہوں کہ ان معاملات میں میں کونسی قیادت انجام دے رہا تھا: دیانتداری کی بات یہ ہے کہ مجھے اس سوال کا جواب معلوم نہیں، یہ درست ہے کہ مدرسہ اس نظام اوقات کے مطابق چل رہا تھا، جو میں نے پچھلے اگست میں مرتب کیا تھا، یہ بھی بجا ہے کہ نصاب مدرسہ کا ہر ایک حصہ میرے اور اساتذہ کے طویل مذاکرات اور بحث و تمحیص کا نتیجہ تھا۔ کیا یہ تمام باتیں میری غیرمرئی قیادت کے ثبوت ہیں؟ اس سوال کا جواب بھی مجھے معلوم نہیں ہے۔ اگر کوئی صدر معلم ایسے ہوں جنہیں احساس ہو کر وہ قیادت کا فرض انجام دے رہے ہیں تو ان سے درخواست ہے کہ اس کام کی تفصیلات سے آگاہ فرمائیں، یا زیادہ بہتر یہ ہوگا کہ انہیں کس قسم کی قیادت درکار ہے۔ اس سے بھی زیادہ بہتر بات یہ ہوگی کہ یہ اصحاب اس بات کی توضیح کردیں کہ جب صدر مدرسی کی ذمہ داری ان کے کندھوں پر ڈالی جائے گی تو وہ اسے کس طور پر نباہنا پسند کریں گے"!

دوسرا خط

دوسرا خط ایک اور برطانوی استاد کے قلم سے ہے، ٹیچر ورلڈ کے مدیر کو مخاطب کرتے ہوئے وہ لکھتا ہے:

"میں نے آپ کا مضمون دلچسپی سے زیادہ غصے کے جذبات کے ساتھ پڑھا ہے۔ مجھے بالخصوص مضمون کی آخری سطر پر بحث کرنا ہے، آپ نے لکھا ہے:۔

کیا صدر معلم کو اس لیے بُرا کہا جائے کہ کام کا بوجھ میرے کندھوں پر ہے؛ اصل نکتہ یہ ہے کہ کمزور صدر معلم خود ذمہ داری نہیں اٹھاتا، وہ اسے دوسرے کے کندھوں پر دھکیل دیتا ہے، اور اس بات کا اہتمام

کرتا ہے کہ وہ خود ہر طرف سے محفوظ رہے۔ ایسی صورت میں بدقسمت ماتحت کے لیے اس کے سوا چارہ نہیں کہ وہ مدرسہ چھوڑ دے۔"

مدیر کا نوٹ:۔ نہیں جناب! مجھے آپ کی اس رائے سے اتفاق نہیں، صدرِ معلم ہی مدرسے میں ایک ایسا شخص ہے جو ذمہ داری کو منتقل نہیں کر سکتا۔ امریکی صدر ٹرومین کی میز پر یہ جملہ لکھا تھا کہ ذمہ داری کا آخری بوجھ اس جگہ پڑتا ہے، جن غلطیوں کا صدرِ معلم کو علم تک نہ ہو ان کی آخری ذمہ داری بھی اسی پر ہوتی ہے۔ خوراک مدرسہ کے حساب میں غلطی سے لے کر ناجائز بدنی سزا تک کی ہر ذمہ داری بالآخر اسی کے سر ہے۔ اگر کمزور صدرِ معلم اس ذمہ داری کو ٹالنا بھی چاہے تو بھی حاکمان بالا اس کمزوری کو اصل غلطی میں ایک اور اضافہ خیال کریں گے، یا انہیں ایسا کرنا چاہیے۔"

خط کا بقیہ حصہ:۔ میں نے تقریباً ایک درجن صدرِ معلموں کے ماتحت کام کیا ہے۔ ان میں سے ایک برا تھا۔ ایک بددل قسم کا آدمی تھا، ایک عورت تھی، اور باقی سب کے سب باہمت آدمی اور بہت خوب رفقائے کار۔"

اس سارے معاملے کا مدار محض صبر پر ہے، استاد کو چاہیے کہ اپنے کام میں ماہر ہو، اور اس کام کو کرتا جائے اسے یہ نکتہ نہ بھولنا چاہیے کہ وہ بچوں کی خدمت کر رہا ہے۔ یہ باتیں اپنے اندر پیدا کر لیجیے، اور بُرے صدرِ معلموں کو جہاں تک ممکن ہو نظر انداز کر دیجیے"۔

کیا میں اس خط کے نیچے ایک فرضی نام لکھ دوں؟ میرا خیال ہے مجھے ایسا نہ کرنا چاہیے، میری ملازمت زیادہ باقی نہیں، جب میں اس کام پر نہیں رہوں گا تو بھی یہ کام چلتا رہے گا، خواہ کبھی کبھار کوئی بُرا صدرِ معلم آجائے اور خواہ زیادہ تعداد ایسے اساتذہ کی ہو جن کی نگاہ ہر وقت مدرسے کے کلاک پر رہتی ہے، اصل چیز کام ہے سب سے زیادہ اہم چیز یہی ہے۔

مدیر کا تبصرہ:۔ اس خط پر تبصرہ کرتے ہوئے رسالے کا مدیر لکھتا ہے:۔ جناب میں آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ میں آپ کی خدمت میں سلام پیش کرتا ہوں۔ دنیا کے شریف ترین پیشے کے متعلق جن لوگوں کا نقطۂ نگاہ اس قسم کا ہو وہ انسانی فطرت کی اچھائی میں لوگوں کے یقین کو بڑھاتے ہیں۔ آپ کے خط میں دو تین جملے

ایسے ہیں جن میں آپ نے وہ سب کچھ کہہ دیا ہے جو میں اکثر اوقات ان صفحات میں کہتا رہتا ہوں۔ کیا مجھے اجازت ہے کہ اس فقرے کو دہرا دوں تاکہ اس ہفتے کے لیے یہ فقرہ دوسروں کے لیے دعوت فکر پیدا کرے۔ اصل چیز کام ہے سب سے زیادہ اہم چیز یہی ہے۔

انسانی فطرت کی یکسانیت

ایک برطانوی جریدے میں دو استادوں اور ایک صدر معلم کے خیالات واحساسات کی یہ تصویر غالباً قارئینِ "آموزش" کو یہ تعجب انگیز احساس دلائے گی کہ استادوں کے مسائل دنیا بھر میں ہر جگہ کم وبیش ایک سے ہیں۔ اس امر کی وجہ بالکل عیاں ہے۔ انسانی فطرت ہر جگہ ایک ہی ہے، اور جہاں انسانی مراسم ایک ہی سانچے میں مرتب کیے جائیں وہاں ان کی نوعیت بھی ایک سی رہے گی۔ جغرافیائی بُعد ان کی نوعیت کو نہیں بدل سکے گا۔

برطانوی صدر معلم نے اپنے ایک دن کی مصروفیات کا ذکر کرتے ہوئے سوالیہ لہجہ میں یہ پوچھا ہے کہ ان معروف فرائض میں ان کی قیادت کس طرح اور کس حد تک بروئے کار آئی۔ یہ استفسار محض انکسار نفس پر مبنی ہے۔ وگرنہ اس ایک روزہ روئداد میں صدر معلم صاحب کی قائدانہ حیثیت بالکل نمایاں ہے۔ قیادت کے لیے نہ یہ ضروری ہے، اور نہ ہی ممکن کہ عمل کا ہر جزو اس کی زیر ہدایت تشکیل پذیر ہو۔ قیادت کا اصلی منصب عمل کی سمت متعین کر دینا اور اس بات کا یقین کرتے رہنا ہے کہ عمل فی الحقیقت تواتر کے ساتھ اسی سمت میں جاری ہے، جو صدر معلم تمام مضامین کا نصاب اپنی زیر نگرانی مرتب کراتا ہے۔ مدرسے کا نظم اوقات خود مرتب کرتا ہے، اہم جماعتوں اور اہم مضامین کے امتحانی پرچے خود بناتا ہے۔ ہر روز بلاناغہ صبح کے مجمع میں نہ صرف شرکت کرتا ہے، بلکہ اس کے لیے دعاؤں کا انتخاب خود کرتا ہے، اور روزانہ طلبہ سے خطاب بھی کرتا ہے۔ دوپہر کے کھانے کے وقت التزام کے ساتھ طلبہ کے ساتھ بیٹھتا ہے اور ان ساری باتوں کے علاوہ والدین، عوام اور حکام کے ہر قسم کے استفسارات کا جواب دیتا اور انہیں مطمئن کرتا ہے۔ اس کی قیادت میں کسے شک ہو سکتا ہے؟

دوسرے برطانوی استاد نے اپنے خط میں ایک بڑے پتے کی بات کہی ہے۔ وہ یہ کہ صدر معلم اچھا ہو یا بُرا۔ استاد کو اپنے کام سے سروکار رکھنا چاہیے۔ وہ بچوں کے ایک گروہ کی تعلیم کے لیے جوابدہ ہے۔ اس کا ضمیر اس بارے میں ہمیشہ مطمئن رہنا چاہیے کہ اس نے ان بچوں یا نوجوانوں کی جو خدمت اپنے ذمہ لے رکھی ہے،

اسے اسکان بھر انجام دے دیا ہے، اصل چیز یہ تعلیمی کام ہے اور بس۔

بعض نوجوان استاد جوشِ نمائش کی فراوانی میں غیر نصابی سرگرمیوں کو اولیت دے کر صدر معلم اور دوسرے لوگوں سے اپنا لوہا منوانا چاہتے ہیں۔ کہ شاید صدر معلم پر شاید یہ جادو چل جائے۔ لیکن جہاں مدرسے کی باگ ڈور ایک سمجھ دار اور مضبوط صدر معلم کے ہاتھ میں ہو وہاں ایسے لوگوں کو شدید مایوسی کا سامنا کرنا پڑتا ہے کیوں کہ ہر سمجھ دار صدر معلم یہ جانتا ہے کہ اصل چیز کام ہے اور فقط کام جس مدرسے کا تعلیمی کام گھٹیا درجے کا ہو اس کی دوسری سرگرمیاں اسے کوئی بلندی نہیں دے سکتیں۔ اس پر مستزاد یہ کہ مدرسے میں صرف ایک ہی شخص کی قیادت سما سکتی ہے، اور وہ قیادت صدر معلم کی قیادت ہے۔ مدرسے کی ہر سرگرمی اس کے علم اور اس کے مشورے سے وجود میں آنی چاہیے۔ جو سرگرمی صدر معلم کی قیادت کو نظر انداز کر دے گی وہ مدرسے کے بہترین مفاد کے خلاف ہو گی۔ خواہ وہ کتنی ہی پسندیدہ ہو۔

نرسری سکول کا باغ

منور جہاں رشید

بچوں کے لیے باغ اتنا ہی ضروری ہے جتنا کہ جماعت کا کمرہ۔ باغ نفسیاتی صحت کے لیے مفید ہے تعلیم فروغ کو سہل طریق سے پیش کر سکتا ہے، بچے کی ہمہ گیر نشوونما میں معاون ہے۔ کھلے آسمان کے نیچے کھیلنا بچے کے لیے ہر طرح سے مفید ہے۔ اچھے باغ کو دیکھ کر بچے خوامخواہ کھیلنا پسند کریں گے۔ اور کھیل کو تعمیری اور تخلیقی کھیل میں مبدل کرنے کے مواقع بہم پہنچائے جا سکتے ہیں۔ آزاد عمل تعلیمی تشغل کا پیش خیمہ ہے۔ باغ میں رنگ و خوشبو ہے، ہوا اور چمکیلی دھوپ ہے۔ باغ بچے کی فطری ضرورتوں کو کئی طرح سے مہیا کرتا ہے وہ فطری ضرورتیں جو نشوونما میں ممد ہیں مندرجہ ذیل ہیں۔

(۱) جسمانی نشوونما (۴) تخلیقی کھیل کے مواقع (۷) ذہنی و معلوماتی نشوونما۔
(۲) جذباتی سکون (۵) زباندانی کا فروغ (۸) روحانیت کی نشوونما۔
(۳) مجلسی آداب کی تربیت و نشوونما (۶) فنون لطیفہ کے ذوق کی نشوونما

(۱) جسمانی نشوونما و باغ:- بچہ ایسے کھیل پسند کرتا ہے جس میں وہ اپنے اعضاء کو استعمال کرتا ہے۔ اس عمر میں حرکت جسمانی فطری تقاضہ ہے۔ وہ ان حرکات کو کرنے پر مجبور ہے۔ ان حرکات کو کرنا اس کی نشوونما میں داخل ہے۔ باغ کی تازی ہوا اور دھوپ کی ہلکی شعاعیں اس کی صحت کی افزائش کا باعث ہیں وہ باغ میں تیز بھاگتا ہے۔ درختوں پر چڑھتا ہے، کودتا ہے۔ اچھلتا ہے۔ گھاس میں ٹونیاں لیتا ہے، دونوں ہاتھ چھوڑ کر بھاگتا ہے۔ زمین کھودتا ہے۔ زمین پر لٹو کتا ہے۔ کھلونا گاڑیوں میں سامان لادتا ہے، گاڑیاں کھینچتا ہے۔ وہ لگاتار معروف حرکاتِ جسمانی ہے، اور ان کے ذریعے اپنے پٹھے متوازن کرتا ہے۔ ان حرکات کو صفائی سے کرنا سیکھتا ہے۔ ان حرکات میں مہارت حاصل کرتا ہے، یہ تیز دوڑ اور جست حرکات کا کھیل باغ کی خوش گوار اور روحانیت سے بھری ہوئی فضا میں بچہ کی جسمانی و دیگر نشوونما کے لیے مفید ہے۔

(۲) جذباتی سکون :- بچہ باغ کی رنگ و بو سے خوش ہوتا ہے۔ کھیل سے خوش ہوتا ہے۔ باغ کے دلاویز مناظر سے فرحت حاصل کرتا ہے۔ تیز حرکات کا کھیل بچے کے تحت الشعور میں دبے ہوئے غصہ وانتقام کی آتش کو باہر نکال دیتا ہے۔ جھوٹ موٹ کے کھیل میں خیالی ڈراموں کے ذریعے وہ اپنی آتش رقابت کو ٹھنڈا کر لیتا ہے۔ جھوٹ موٹ کے کردار عل کو سخت سزائیں دیتا ہے۔ ان سے ہر قسم کا بدلہ لیتا لے لیتا ہے اسی کھیل میں ناممکن خواہشات کو پورا کر لیتا ہے۔ تحت الشعور کی غلاظتیں صاف ہو جاتی ہیں۔ جذباتی سکون کے امکانات مہیا ہو جاتے ہیں۔ باغ کی منقش و رنگین دنیا خوشی کا موجب ہے۔

(۳) مجلسی آداب کی تربیت ونشو و نما :- بچے مل جل کر کھیلتے۔ باغ کے پھولوں کو مل کر دیکھتے ہیں۔ پتوں میں چھپی ہوئی بیر بہوٹیوں کو دیکھتے۔ تیز بھاگتی ہوئی گلہریوں کو دیکھتے ہیں۔ باغ کو اور باغ میں قدرتی سامان کھیل کو مل کر استعمال کرتے ہیں۔ درختوں کی ٹہنیوں پر اور باڑوں کے پیچھے مل کر بیٹھتے ہیں۔ اور کھیلتے ہیں۔ گھاس پر تلا بازیاں مل کر لگاتے ہیں۔ مختلف قسم کا کھیل ہمجولی مل جل کر کھیلتے ہیں۔ اور یہیں پر یہ بات سیکھتے ہیں کہ جب ایک فرد ایک گروہ میں مل کر کھیلتا ہے تو اس کی ایک مقرر جگہ ہے اور اس کا اقتدار محدود ہے۔ اسے ایک دوسرے کا احترام کرنا۔ احساسات کا خیال رکھنا۔ رواداری کرنا۔ کسی کا رہبر بننا کسی کو رہبر مان کر تعاون کرنا، مل کر کھیلنے سے ہی آتا ہے۔

(۴) تخلیقی کھیل کے مواقع :- بچے باغ میں آزادی سے کھیلتے ہیں۔ آزادی سے سوچتے ہیں۔ فضا خاموش ہے۔ لیکن پھر بھی اس سکوت میں زبان ہے، جو کہ کئی قسم کے عمل کی ترغیب دیتی ہے۔ دماغوں کو کھولتی ہے، سبزے کی گہرائی میں چھپا ہوا حسن نئے خیالات کی آماجگاہ ہے۔ اپنے اندر نئی سوچیں پیدا ہوتی ہیں۔ اپنی روح کی آواز خاموش زبان میں پکارتی ہے، اپنے خیالات کی ترجمانی اپنے عمل سے کراتی ہے۔ پھولوں کی پنکھڑیاں ان پر جمی ہوئی تیتریاں بچے کے مشاہدہ کو گہرا کر دیتی ہیں۔ اس سے نئی سوچ بیدا ہوتی ہے۔ اپنی سوچ سے اپنا کھیل اور اپنا کام پیدا ہوتا ہے، بچے میں تخلیقی عمل بیدار ہو جاتا ہے۔ بچہ تعمیری و تخلیقی کھیل میں معروف ہو جاتا ہے۔ اس کی جدت طبع معروف ہو جاتی ہے۔ اس کا تخیل بلند پرواز کرتا ہے۔ جھوٹ موٹ کے قلعے تیار ہوتے ہیں۔ مسمار ہوتے ہیں۔

(۵) زبان دانی کا فروغ :۔ باغ کی ایک اپنی دنیا ہے۔ اس دنیا میں ہر ایک شے کا نام ہے۔ ہر نام کے پس پشت اپنی خاصیتیں ہیں۔ باغ میں درخت ہے، اس کا تنا، شاخیں اور پتے ہیں۔ درخت کا پھل لگتا ہے۔ باغ میں باڑیں ہیں۔ ان کے اندر گلہریاں تیز بھاگتی ہیں۔ گلہریوں کی کھال پر رنگین دھاریاں ہیں۔ بچے کے تجسس پر ایک تازیانہ لگتا ہے، وہ تیزی سے کام کرتا ہے، اس کا شوق جستجو ہر ایک چیز کو بنظر غور دیکھتا ہے۔ اور بعد ازاں سوالات پوچھتا ہے، اس کی لغت کھیل ہی کھیل میں وسیع ہوتی ہے۔ وہ درختوں۔ پھولوں۔ پودوں۔ پرندوں۔ کیڑوں، مکوڑوں کے نام سیکھتا ہے اور یہ معلوم کرتا ہے کہ کہاں رہتے ہیں۔ کیا کھاتے ہیں۔ کس رنگ کے ہیں بچے ان سے کیا حاصل کرتے ہیں۔ نئے نام۔ نئے نئے فقرے۔ محاورات سیکھتے ہیں اس طرح زبان دانی وسیع ہوتی ہے۔

(۶) فنون لطیفہ کے ذوق کی نشوونما :۔ باغ کی فضا میں ایک گہرا حسن ہے جس کو بچہ محسوس کرتا ہے۔ وہ رنگارنگ کے پھول دیکھتا ہے۔ رنگ کی دلآویزیوں سے متعارف ہوتا ہے کہیں سرخ گلاب ہے۔ کہیں پیلا اور کہیں سفید۔ کہیں موتیا کھلا ہے اور کہیں گل داؤدی۔ باغ میں نیچر کو دیکھتا ہے۔ باغ کے قسم قسم کے مناظر بچے کے بے ساختہ مشاہدہ میں ہیں۔ وہ دیکھتا ہے کہ ٹھنڈی ہوا چلتی ہے۔ شاخیں جھولتی ہیں۔ پتے سرسراتے ہیں۔ وہ یہ بھی دیکھتے ہیں ہوا کی آواز جب درختوں کی شاخوں سے ٹکراتی ہے تو کچھ اور ہے اور جب گھنی جھاڑیوں میں گھستی ہے تو کچھ اور ہے۔ وہ پرندوں کی آوازوں کو غور سے سنتے ہیں۔ ان کے پروں کے رنگوں کو دیکھتے ہیں۔ اور ان کا فرق شناخت کرتے ہیں۔

(۷) ذہنی و معلوماتی نشوونما :۔ باغ کا ماحول۔ بچے کے شوق جستجو کو تیز کرتا ہے، ذہانت کے فروغ کے لیے ذخائر مہیا کرتا ہے۔ بچہ میں تفتیش و تحقیق بیدار ہو کر عمل میں آتی ہے۔ بچے کی معلومات میں اضافہ ہونے کے امکانات میں سائنس میں دلچسپی زیادہ سے زیادہ ہوتی ہے۔ معلومات کا دائرہ وسیع ہوتا ہے۔ نباتات میں دلچسپی بیدار ہوتی ہے اور بڑھتی چلی جاتی ہے۔

بچے باغ میں قدرت (نیچر) کی پیدا کی ہوئی دنیا کا مشاہدہ کرتے ہیں، وہ پودوں کو دیکھتے ہیں ...روں کو دیکھتے ہیں۔ وہ آسمان کے وجود کو محسوس کرتے ہیں۔ بادلوں میں دلچسپی لیتے ہیں۔ وہ

سورج کو دیکھتے ہیں۔ کرنوں کو دیکھتے ہیں۔ روشنی آتی ہے۔ تدریج بڑھتی ہے۔ پھر تدریج گھٹتی ہے۔ سورج اور اس کی روشنی آسمان کے ایک کونے میں گم ہو جاتی ہے۔ اندھیرا گھپ ہو جاتا ہے سائے بڑھتے اور گھٹتے ہیں۔ پودے بڑے ہوتے جاتے ہیں۔ بیج چھوٹا سا ہے، جس کو زمین میں بو دیتے ہیں۔ وہ مٹی میں گم ہو جاتا ہے۔ کونپل پھوٹتی ہے۔ بڑھتی ہے۔ پودا بنتا ہے۔ شگوفہ پھوٹتا ہے۔ پھول بنتا ہے۔ کھلتا ہے، وہ پھول کو حیرت و استعجاب سے دیکھتے ہیں۔ وہ خوشبو کو پسند کرتے ہیں۔ کھلے ہوئے پھولوں کی بھینی بھینی خوشبو سے لطف اندوز ہوتے ہیں، یہ سب ان کے لیے مطالعہ ہے۔ قدرت کی تخلیق میں باقاعدگی ہے۔ خالق نازک پودوں کی خود حفاظت کرتا ہے۔ زندگی میں ایک ترتیب ہے۔ بالیدگی میں ایک ترتیب روانی ہے۔

بچے پتوں کو دیکھتے ہیں، وہ پتوں اور پنکھڑیوں کی بناوٹ کا مشاہدہ کرتے ہیں اور فرق کو شناخت کرتے ہیں۔ گلاب کی جھاڑیوں میں کانٹے ہیں، انہیں یہ واقفیت تجربہ سے ہوئی، وہ مختلف جانداروں کو جو کہ باغ کے پتوں، بیلوں اور گھاس میں چھپے رہتے ہیں، پہچانتے ہیں۔ کڑیاں جالا بنتی ہیں تتلے اڑتے ہیں۔ چیونٹے اور چیونٹیاں رینگتی ہیں۔ تیتریاں پھولوں پر بیٹھتی ہیں۔ وہ یہ بھی پہچانتے ہیں کہ کس کو کہاں رہنا پسند ہے۔ کس کو کون سے پھول پسند ہیں۔ وہ بہت سے سوالات پوچھتے ہیں۔ کیوں، کب، کیسے۔ وہ اپنے ذہن میں وسیع معلومات کا ذخیرہ جمع کر لیتے ہیں۔ نباتاتی دلچسپی سائنس کے متعلق تجسس ذہنی معلومات کے فروغ کی بنیاد ہے۔

(۸) روحانیت کی نشوونما:۔ باغ خاموش و گہرا مطالعہ ہے۔ سکوت اور اس میں پنہاں گہرائی روح پر اثر رکھتی ہے۔ پودوں اور پھولوں کی خوبصورتی بنانے والے کی عظمت سے متعارف کراتی ہے۔ یہ روحانیت کی نشوونما کے لیے مؤثر ماحول ہے۔

باغ کی بناوٹ

باغ کو لگانے سے پہلے اس کی سکیم بہت سوچ بچار کے بعد تیار کرنی چاہیے۔ باغ کا کھلا گھاس والا میدان بہت ضروری ہے۔ گھاس پر نیچے بوٹیاں لگا سکتے ہیں۔ قلابازیاں کھا سکتے ہیں۔

پھاٹک سے ایک چھوٹی سڑک باغ تک لائی جاسکتی ہے۔ یہ سڑک کم از کم ۵ فٹ چوڑی ہو۔ یہ سڑک جب باغ میں آجائے تو تین فٹ چوڑی رہ جائے۔ اس میں سے بہت سی اور سڑکیں نکالی جائیں۔ یہ سڑکیں باغ میں مختلف رخوں پر پھیلا دی جائیں۔ باغ میں بل کھائی ہوئی سڑکیں کھیل کے لیے خوب ہیں ان پر سرخ مٹی بچھا دی جائے۔ سبز گھاس میں سرخ دھاریاں دلکش ہوں گی۔ بچے ان سڑکوں پر اپنی کھلونا گاڑیاں۔ چھکڑے۔ موٹریں، اور ٹرائی سکل چلا سکتے ہیں۔ ٹھیٹ موٹ کے یا خود بنائے ہوئے چھکڑے اور دوسرا ایسا سامانِ کھیل جس کو سڑکوں پر کھینچ اور دھکیل سکتے ہیں۔ وہ ان سڑکوں پر استعمال کر سکتے ہیں۔

باغ میں ایک طرف چھوٹا سا کھلونا مکان کی صورت میں ہو، یہ چار فٹ اونچا ہو۔ اس میں کھڑکیاں اور دروازے ہوں۔ اس کے اندر ایک لمبا بنچ ہو۔ ایک میز ہو، اور کافی جگہ کھیلنے کی ہو۔ ان کھلونا مکانوں پر بیلیں چڑھی ہوں۔ سامنے کھلونا گملے ہوں۔ یہ بیلیں خوب گھنی ہوں، تاکہ ان سے مکان چھپ جائے۔ اور یہ مکان بچوں کی خفیہ جائے رہائش ہوگا۔ بچوں کو سب سے چھپ کر پوشیدہ جگہوں پر بیٹھ کر کھیلنا مرغوب ہے بیلوں میں قسم قسم کی تیتریاں۔ مکڑیاں اور جاندار بستے ہیں، بچے اُن کو دیکھنا پسند کرتے ہیں، یہ معلوماتی مشغلہ ہے۔

باغ میں خفیہ کونے ہوں۔ کسی پلاٹ پر چاروں طرف لکڑی کا جنگلہ لگا کر چار دیواری بنا دی جائے اس پر گھنی بیلیں چڑھا دی جائیں۔ بچے ان بیلوں کے پیچھے اس چار دیواری کے اندر بیٹھ کر کھیل سکتے ہیں۔

باغ کے کسی مناسب کونے میں ایک ڈھلوان سا ٹیلہ بنایا جائے، اس پر گھاس گھنی اگائی جائے بچے اس پر چڑھیں اور پھر ڈھلوان پر لڑھکتے ہوئے نیچے آجائیں۔

باغ کو صاف کرنے کے بعد بہت سا ایسا سامان اکٹھا ہو جاتا جو کہ اگر پھینکا نہ جائے تو چھوٹے بچوں کے کھیلنے کے کام آجاتا ہے، مثلاً جھاڑیوں اور پتوں کا ڈھیر، پرانے درخت کا تنہ۔ گری ہوئی ٹہنیاں باغ میں گرا ہوا درخت وغیرہ بچوں کے لیے ان کا مرغوب سامانِ کھیل بن سکتا ہے۔ بچے ان پر کئی قسم کا جھوٹ موٹ کا خیالی کھیل کھیل سکتے ہیں۔ گھاس والے میدان کی صفائی بہت ضروری ہے۔ اس میں کانٹے لکڑیاں، اور ایسا نقصان دہ فالتو سامان نہ ہو جس سے بچوں کے پاؤں کو یا جسم کو نقصان نہ ہو۔ علاوہ ازیں اگر لان کی صفائی نہ ہو تو اس میں سانپ بچھو جیسے نقصان دہ کیڑے آموجود ہوں گے۔ بچوں کے باغ کا ہر کونہ

سورج کو دیکھتے ہیں۔ کرنوں کو دیکھتے ہیں۔ روشنی آتی ہے۔ تدریج بڑھتی ہے۔ پھر تدریج گھٹتی ہے۔ سورج اور اس کی روشنی آسمان کے ایک کونے میں گم ہو جاتی ہے۔ اندھیرا غیب ہو جاتا ہے سائے بڑھتے اور گھٹتے ہیں۔ پودے بوئے جاتے ہیں۔ بیج چھوٹا سا ہے، جس کو زمین میں بو دیتے ہیں۔ وہ مٹی میں گم ہو جاتا ہے۔ کونپل پھوٹتی ہے۔ بڑھتی ہے۔ پودا بنتا ہے۔ شگوفہ پھوٹتا ہے۔ پھول بنتا ہے۔ کھلتا ہے، وہ پھول کو حیرت و استعجاب سے دیکھتے ہیں۔ وہ خوشبو کو پسند کرتے ہیں۔ کھلے ہوئے پھولوں کی بھینی بھینی خوشبو سے لطف اندوز ہوتے ہیں، یہ سب ان کے لیے مطالعہ ہے۔ قدرت کی تخلیق میں باقاعدگی ہے۔ خالق نازک پودوں کی خود حفاظت کرتا ہے۔ زندگی میں ایک ترتیب ہے۔ بالیدگی میں ایک ترتیب روانی ہے۔

بچے پتوں کو دیکھتے ہیں، وہ پتوں اور پنکھڑیوں کی بناوٹ کا مشاہدہ کرتے ہیں اور فرق کو شناخت کرتے ہیں۔ گلاب کی جھاڑیوں میں کانٹے ہیں، انہیں یہ واقفیت تجربہ سے ہوئی، وہ مختلف جانداروں کو جو کہ باغ کے پتوں، بیلوں اور گھاس میں چھپے رہتے ہیں، پہچانتے ہیں۔ مکڑیاں جالا بنتی ہیں پتنگے اڑتے ہیں۔ چیونٹے اور چیونٹیاں رینگتی ہیں۔ تیتریاں پھولوں پر بیٹھتی ہیں۔ وہ یہ بھی پہچانتے ہیں کہ کس کو کہاں رہنا پسند ہے۔ کس کو کون سے پھول پسند ہیں۔ وہ بہت سے سوالات پوچھتے ہیں۔ کیوں، کب، کیسے۔ وہ اپنے ذہن میں وسیع معلومات کا ذخیرہ جمع کر لیتے ہیں۔ نباتاتی دلچسپی سائنس کے متعلق تجسس ذہنی معلومات کے فروغ کی بنیاد ہے۔

(۸) **روحانیت کی نشوونما:-** باغ خاموش و گہرا مطالعہ ہے۔ سکوت اور اس میں پنہاں گہرائی روح پر اثر رکھتی ہے۔ پودوں اور پھولوں کی خوبصورتی بنانے والے کی عظمت سے متعارف کراتی ہے۔ یہ روحانیت کی نشوونما کے لیے مؤثر ماحول ہے۔

باغ کی بناوٹ

باغ کو لگانے سے پہلے اس کی سکیم بہت سوچ بچار کے بعد تیار کرنی چاہیے۔ باغ کا کھلا گھاس والا میدان بہت ضروری ہے۔ گھاس پر بچے ڈنڈیاں لگا سکتے ہیں۔ قلابازیاں کھا سکتے ہیں۔

پھاٹک سے ایک چھوٹی سڑک باغ تک لائی جاسکتی ہے۔ یہ سڑک کم از کم ۵ فٹ چوڑی ہو۔ یہ سڑک جب باغ میں آجائے تو تین فٹ چوڑی رہ جائے۔ اس میں سے بہت سی اور سڑکیں نکالی جائیں یہ سڑکیں باغ میں مختلف رخوں پر پھیلادی جائیں۔ باغ میں بل کھائی ہوئی سڑکیں کھیل کے لیے خوب ہیں ان پر سرخ مٹی بچھادی جائے۔ سبز گھاس میں سرخ دھاریاں دل کش ہوں گی۔ بچے ان سڑکوں پر اپنی کھلونا گاڑیاں۔ چھکڑے۔ موٹریں، اور ٹرائی سکل چلا سکتے ہیں۔ ٹھیٹ موٹے کے یا خود بنائے ہوئے چھکڑے اور دوسرا ایسا سامانِ کھیل جس کو سڑکوں پر کھینچ اور دھکیل سکتے ہیں۔ وہ ان سڑکوں پر استعمال کر سکتے ہیں۔

باغ میں ایک طرف چھوٹا سا کھلونا مکان کی صورت میں ہو، یہ چار فٹ اونچا ہو۔ اس میں کھڑکیاں اور دروازے ہوں۔ اس کے اندر ایک لمبا بنچ ہو۔ ایک میز ہو، اور کافی جگہ کھیلنے کی ہو۔ ان کھلونا مکانوں پر بیلیں چڑھی ہوں۔ سامنے کھلونا گملے ہوں۔ یہ بیلیں خوب گھنی ہوں، تاکہ ان سے مکان چھپ جائے۔ اور یہ مکان بچوں کی خفیہ جائے رہائش ہوگا۔ بچوں کو سب سے چھپ کر پوشیدہ جگہوں پر بیٹھ کر کھیلنا مرغوب ہے بیلوں میں قسم قسم کی تتریاں۔ مکڑیاں اور جاندار رہتے ہیں، بچے ان کو دیکھنا پسند کرتے ہیں، یہ معلوماتی مشغلہ ہے۔

باغ میں خفیہ کونے ہوں۔ کسی پلاٹ پر چاروں طرف لکڑی کا جنگلہ لگا کر چار دیواری بنادی جائے اس پر گھنی بیلیں چڑھادی جائیں۔ بچے ان بیلوں کے پیچھے اس چاردیواری کے اندر بیٹھ کر کھیل سکتے ہیں۔ باغ کے کسی مناسب کونے میں ایک ڈھلوان سا ٹیلہ بنایا جائے، اس پر گھاس گھنی اگائی جائے بچے اس پر چڑھیں اور پھر ڈھلوان پر لڑھکتے ہوئے نیچے آجائیں۔

باغ کو صاف کرنے کے بعد بہت سا ایسا سامان اکٹھا ہو جاتا جو کہ اگر پھینکا نہ جائے، تو چھوٹے بچوں کے کھیلنے کے کام آجاتا ہے، مثلاً جھاڑیوں اور پتوں کا ڈھیر۔ پرانے درخت کا تنہ۔ گری ہوئی ٹہنیاں باغ میں گرا ہوا درخت وغیرہ بچوں کے لیے ان کا مرغوب سامانِ کھیل بن سکتا ہے۔ بچے ان پر کئی قسم کا جھوٹ موٹ کا خیالی کھیل کھیل سکتے ہیں۔ گھاس والے میدان کی صفائی بہت ضروری ہے۔ اس میں کانٹے لکڑیاں، اور ایسا نقصان دہ فالتو سامان نہ ہو جس سے بچوں کے پاؤں کو یا جسم کو نقصان نہ ہو۔ علاوہ ازیں اگر لان کی صفائی نہ ہو تو اس میں سانپ بچھو جیسے نقصان دہ کیڑے آموجود ہوں گے۔ بچوں کے باغ کا ہر کونہ

لان کی طرح ہموار ہونا ضروری نہیں۔ گھاس بے شک اونچا نیچا ہو، اور اس میں جگہ جگہ پھول لگے ہوں، بے ترتیبی بچوں کے لیے اتنی ہی دل چسپ ہے جتنی کہ وہ خوب صورتی دل چسپ ہے جتنی کہ ہموار تراشے ہوئے لان اور قرینے سے لگے ہوئے روشوں پر پھولوں سے حاصل ہوتی ہے۔

باغ کے ایک حصے میں مختلف قسم کے مجموعات بچوں کے لیے دل چسپ ہوں گے۔ لکڑی کے تختے لکڑی کے ڈبے۔ لکڑی کے ڈرم۔ پہیے۔ لکڑی کی اینٹیں، رسیاں وغیرہ دل پسند سامان کھیل ہے۔ رسیوں کو درختوں سے باندھ کر جھولے بنا دیے جائیں۔ پرانے موٹے ٹائر جھولے پر گدی کا کام خوب دیں گے ایسے پرانے درخت جن کی شاخیں مضبوط اور ملائم ہیں باغ میں اگر ہوں تو خوب ہیں۔ چھوٹے قد کے گھنی و مضبوط شاخوں والے درخت خوب ہیں۔ بچے آسانی سے چڑھ کر اپنی نشستیں مقرر کر لیں گے اور قسم قسم کا کھیل کھیلیں گے

زمین دوز باغ

زمین دوز باغ بچوں کے لیے بہت دل چسپ ہے۔ باغ میں ایک گڑھا کھودا جائے۔ اس میں چند سیڑھیاں بنائی جائیں جن کے ذریعے وہ نیچے چلے جائیں گے۔ بچوں کو اترنے اور چڑھنے کا موقع ملے گا چھپ کے بیٹھ کر کھیلنے کے لیے یہ جگہ بہت خوب ہے۔

باغ کا ایک کونہ ویسے ہی چھوڑ دینا چاہیے۔ بچے یہاں پر بیٹھ کر زمین کھودیں، مٹی کو مختلف سانچوں میں ڈال کر مختلف شکلیں بنانے کا کھیل کھیل سکتے ہیں۔ یہاں پر بچے اینٹوں گارے یا شاخوں کی ایک چھوٹی سی غار بنا سکتے ہیں، جس میں گھس کر کھیل سکتے ہیں۔ یہ بھی خفیہ جگہ ہے جو سب کی نظروں سے پوشیدہ ہے

پہاڑی باغ

یہ بھی بچوں کو بہت مرغوب ہے۔ باغ میں ایک چھوٹی موٹی سی قدرے نیچی پہاڑی بنائی جائے اس پہاڑی پر بہت سے پھول لگائے جائیں۔ سطح زمین سے اونچے لگے ہوئے پھول بچوں کو زیادہ دل چسپ معلوم ہوتے ہیں۔ ان پر پرندے آتے ہیں۔ بچے درختوں پر چڑھنا سیکھتے ہیں۔ مضبوط شاخوں پر جھولے ڈالے جا سکتے ہیں، درخت ہوا کو صاف کرتے ہیں۔ موسم کے پھل کے درخت بچوں کے لیے دل چسپ ہیں۔ پھل لگا ہوا بہت بھلا معلوم ہوتا ہے۔ یہ درخت معلومات کا ذریعہ ہیں۔ پھل کیوں کر لگتا اور پکتا ہے وغیرہ۔

امرود وانار کے درخت قد میں بھی چھوٹے ہیں، آلوچہ اور سیب بھی خوب ہے۔

وہ پھول لگانے چاہئیں جن کو کاٹ کر بچے گلدانوں میں لگا سکیں، اور اپنے کمروں کو سجا سکیں بعض پھولوں پر بعض تتلیاں و پرندے آتے ہیں۔ بچے ان کو دیکھ کر خوش ہوتے ہیں۔ اور ان کا مطالعہ مشاہدہ مفید ہے۔

بچوں کو باغبانی پسند ہے۔ باغ کا ایک کونہ باغبانی کے لیے چھوڑ دینا چاہیے۔ بچے سبزیاں لگائیں اور شوق باغبانی کی تسکین کریں۔

باغ پالتو پرندوں اور جانوروں کے لیے بہت مناسب جگہ ہے۔ پرندوں کا رکھ رکھاؤ بچوں کی معلومات کو وسیع کرتا ہے۔ باغ میں ذرا اونچی جگہ پر پنجرے لٹکا دیے جائیں۔ ان پنجروں میں مختلف پرندے چڑیا۔ طوطا۔ مینا، کبوتر وغیرہ رکھے ہوں۔ بچے ان کی دیکھ بھال کریں۔ خوراک کو دیکھیں، بچے ان کی شکل و صورت عادات۔ خوراک وغیرہ کے بارے میں مکمل و باتفصیل معلومات حاصل کرلیں گے۔ مرغی خانہ خوب ہے۔

باغ کو تعلیمی مشاغل کے لیے بھی استعمال کیا جاتا ہے: بچوں کا سامان کھیل اندر کے کمرے سے باہر باغ میں لے جایا جاسکتا ہے۔ اس میں مختلف قسم کا سامان کھیل شامل ہے۔ مثلاً وہ سامان جو تربیت جسمانی کے کھیل کے کام آتا ہے تعمیری کھیل۔ جھوٹ موٹ کے کھیل کے کام آتا ہے۔ حسی تربیت و ذہنی نشو ونما کے کھیل کے کام آتا ہے۔ ریت و پانی کے کھیل کے لیے نقاشی کا سامان مٹی وغیرہ۔ بچے اس سامان اور کھیل سے آزاد عمل میں مصروف ہو جائیں گے۔ باغ کی آزاد و خوب صورت فضا میں کام میں کھیل کی فرحت میں لطف اندوز ہوں گے۔

باغ میں سامان کھیل : - چڑھنے والا جنگلہ بچوں کو بہت ہی مرغوب، اس کا باغ میں ہونا بہت ہی ضروری ہے۔ سی سا۔ توازن کے تختے۔ کودنے کا سٹینڈ۔ جنگل جیم وغیرہ۔ مفید ہیں۔

باغ میں بہت سا سامان کھیل خود باغ مہیا کرتا ہے۔ مثلاً پتے، شاخیں۔ چھڑیاں۔ ٹہنیاں۔ تنے لکڑی کے ٹکڑے بیج۔ ان کو کئی طرح سے استعمال کرتے ہیں جیسے لادنے لے جانا وغیرہ ان سے کھیلتے ہیں جھوٹ موٹ کے کھیل میں ان کے قلعے بھی تعمیر کیے جاتے ہیں۔ چھوٹی شہتیریاں بھی خوب ہیں۔ بچے

مل کر لڑھکاتے ہیں، دھکیلتے ہیں۔ ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جاتے ہیں۔ مل کر کھیلنا سیکھتے ہیں۔ تختیوں پر بیٹھتے ہیں اور میز تصور کر کے میزبان اور مہمان نوازی کھیلتے ہیں۔

ہر نرسری سکول کے باغ میں ایک ریت سے بھرا ہوا گڑھا ضرور ہونا چاہیے۔ یہ گڑھا بہت ہی کم گہرا ہو۔ ۵۰ بچوں کے لیے ۲۴۰ مربع فٹ کافی ہے۔ مستطیل شکل میں ۶ فٹ چوڑا اور ۴۰ فٹ لمبا ہو اس کی تہ پختہ اینٹ کی بنی ہو۔ گڑھے کے آس پاس پختہ جگہ ہو۔ جہاں بچے بیٹھ کر ریت کو مختلف سانچوں میں ڈھال کر کھیل سکیں۔ ریت میں چکنی مٹی نہ ہو۔ تاکہ گیلی ریت دلدل سی نہ بن جائے۔ ایک پانی کا نلکا ہو تاکہ بچے پانی کا کھیل بھی آسانی سے کھیل سکیں۔

ایک بہت کم گہرا گڑھا کھودا جائے۔ اس کے چاروں طرف دو اینٹ کی چار دیواری بنائی جائے اس میں تین یا چار انچ کی گہرائی کا پانی ہو۔ اس کی صفائی باقاعدگی سے ہو۔ اس میں بچے پانی کا کھیل کھیلیں۔

نرسری سکول کی ٹیچر کو نیچر سے خاصی دلچسپی ہو۔ بچے کو باغ میں کھیلنے کے مواقع مہیا ہوں۔ تاکہ اس کی قوتِ اختراع اور قوتِ تخلیق عمل میں آ سکیں۔ بچہ باغ میں کھیل کی ترغیب دینے والا سامان خود منتخب کرے۔ اپنی سوچ سے اپنی پسند کا کھیل کھیلے۔ یہ بچے کی صحت مند نشو و نما میں مد ہوگا۔

قدرتی ماحول۔ بچے کی جبلّی ضرورتوں کی تسکین کے امکانات مہیا کرے گا۔ بچے کے گھرے دوچوں میں خوابیدہ مجلسی اخوت کے امکانات بیدار کرے گا۔ جذباتی سکون مہیا کرے گا۔ تخلیقی قوتیں بروئے کار آئیں گی اور تندرست جوانی کی پرورش ہو گی۔

معلومات عامہ

عالمی یوم اطفال

دنیا کے بہت سے ملکوں میں جن میں پاکستان بھی شامل ہے، اس سال ۷ اکتوبر کو عالمی یوم اطفال منایا گیا۔ اس موقع پر اقوام متحدہ کے بچوں کے فنڈ (یونی سیف) کے قائم مقام ڈائرکٹر برائے ایشیا مسٹر بریان جونز نے ایک بیان دیا ہے، جس کا خلاصہ حسب ذیل ہے۔

یونی سیف کے لیے عالمی یوم اطفال دوگنی اہمیت رکھتا ہے۔ آج کے دن عوام کو بچوں کی احتیاج سے باخبر کرنا ہی ضروری نہیں ہے، اور نہ بڑوں کو یہ یاد دلانا ہے کہ بچوں کی ذمہ داریاں ان پر عائد ہوتی ہیں۔ بلکہ گذشتہ کارگذاریوں پر نظر ڈال کر یہ سوچنے کی بھی ضرورت ہے کہ اس سال اب تک ہم نے دنیا بھر کے بچوں کی بہتری کے لیے کیا کچھ کیا ہے۔

جہاں تک باشندگان ایشیا کا تعلق ہے: بچوں کی احتیاج کو دوبارہ گنوانا ضروری نہیں ہے۔ یہ باتیں روزانہ ہمیں اس وقت یاد آجاتی ہیں، جب بھی ہم کسی بھوکے ننگے یا بیمار بچے کو دیکھتے ہیں البتہ یہ بتانا لازمی ہے کہ دنیا کے تقریباً نوے کروڑ بچوں میں سے دو تہائی کو ہماری امداد کی ضرورت ہے۔ صرف اتنی امداد کہ وہ زندہ رہ سکیں، اور پروان چڑھ کر اپنی برادری میں ایک عضو مفید ثابت ہو سکیں ان ضرورت مند بچوں میں سے نصف ایشیا میں آباد ہیں

ہم سب اچھی طرح جانتے ہیں کہ آج کے بچے جوان ہو کر کل کے شہری کہلائیں گے۔ اور یہ امر بھی بدیہی ہے کہ ہماری امیدیں اور دنیا کا مستقبل اس حقیقت پر منحصر ہے کہ ہمارے بچے جوان ہو کر کیا کریں گے یا کیا کر سکتے ہیں۔ ہمارا کم سے کم فرض یہ ہے کہ ہم ان کو صحت مند اور تندرست رہنے، ان کے دلوں میں خلوص و محبت کا بیج بونے اور دوسروں کے دکھ درد کو محسوس کرنے کا موقع دیں اور وہ جان لیں کہ کبھی وہ خود بھی دوسروں کی نظر کرم کے محتاج تھے۔

بچوں کی احتیاج کو محسوس کر کے اور یہ فیصلہ کرنے کے بعد کہ انہیں تعلیم خوراک اور بیماریوں سے نجات پانے کی اشد ضرورت ہے۔ ہمیں یہ معلوم کرنا چاہیے کہ اس وقت کیا ہو رہا ہے۔ جہاں تک ایشیا میں یونی سیف کی کارگزاریوں کا تعلق ہے۔ اس سال کی پہلی ششماہی میں ایشیائی حکومتوں عالمی ادارہ صحت اور اقوام متحدہ کے دوسرے اداروں کے تعاون سے حسب ذیل خدمات انجام دی گئی ہیں

(۱) ڈی ڈی ٹی کے ذریعہ ۷۷ لاکھ ۸۷ ہزار باشندوں کو ملیریا سے نجات دلائی گئی

(۲) تپ دق کے سلسلہ میں ایک کروڑ ۸۴ لاکھ ۱۳ ہزار بچوں کا معائنہ ہوا اور ۲۵ لاکھ ۲۸ ہزار کے ٹیکے لگائے گئے۔

(۳) خارش کے سلسلے میں ایک کروڑ ۶ لاکھ ۱۵ ہزار انسانوں کا معائنہ ہوا، اور ۶ لاکھ ۷۷ ہزار کا (جن میں زیادہ تر بچے تھے) علاج کیا گیا۔

(۴) ماؤں اور بچوں کے تقریباً ۴ سو صحتی مرکزوں کو یونی سیف سے سامان ملا۔ اس سال یوم اطفال کا موضوع ہے "اس بچے کو جو بھوکا ہے ضرور کھانا دیا جائے" لہذا یہ بتا دینا ضروری ہے کہ تقریباً ۱۵ لاکھ ماؤں اور بچوں کو اس سال کی پہلی ششماہی میں ہنگامی پروگرام کے ماتحت دودھ دیا گیا۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ اب تک جو کچھ ہوا۔ اسے محض ابتدائی قدم سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ تاہم یہ مسئلہ خواہ کتنا ہی دشوار ہو اور ہماری کوششیں خواہ کتنی ہی حقیر ہوں ہمیں ہمت سے کام کرنا اور اپنے وسائل کو وسیع اور جوش عمل کو تیز تر کرنا ہوگا؛

یونی سیف بورڈ سے تقسیم رقوم کی منظوری

اقوام متحدہ کے بچوں کے فنڈ (یونی سیف) کی مجلس انتظامیہ کا اجلاس پچھلے مہینے صدر مقام پر منعقد ہوا تھا جس نے ۵۳ ملکوں اور علاقوں میں بچوں کی امداد سے متعلق ۸۰ پروگراموں کو عمل میں لانے کے لیے مجموعی طور پر ایک کروڑ ۱۶ لاکھ ۱۴ ہزار ۶۷۳ ڈالر کی رقم تقسیم کرنے کی منظوری دے دی ہے۔ اس طرح امسال تقسیم ہونے والی رقوم کا میزان ۲ کروڑ ۱۴ لاکھ ۶۴ ہزار ۱۰۷ ڈالر ہو جائے گا، اور یونی سیف کی امداد سے عمل میں آنے والے پروگراموں کی تعداد ۲۰۱ ہو جائے گی۔

کل رقم میں سے ۸۶ لاکھ ۷۲ ہزار ۹ سو ڈالر غذاؤں اور ماؤں اور بچوں کی فلاح و بہبود سے متعلق خدمات کے لیے مخصوص کیے گئے ہیں۔ ملیریا کے استیصال اور روک تھام پر ۳۴ لاکھ ۵۶ ہزار ڈالر اور بی سی جی کے ٹیکوں اور تپ دق کے دوسرے کاموں پر ۴ لاکھ ۳۷ ہزار ۵۴۵ ڈالر صرف ہوں گے۔ خارش کی روک تھام پر ایک لاکھ ۲۷ ہزار ۵ سو ڈالر اور امراض چشم کے علاج کے لیے ۲ لاکھ ۵ سو ڈالر۔ جذام کی روک تھام کے لیے ایک لاکھ ۲۴ ہزار ڈالر، پنسلین کی تیاری کے لیے ۷۵ ہزار ۵۲۱ ڈالر اور اردن میں خوراک کے پروگرام کے لیے ۲ لاکھ ۳۲ ہزار ڈالر منظور کیے گئے ہیں۔ باقی رقم عملے کی تنخواہوں اور دوسرے انتظامی امور پر خرچ کی جائے گی۔

مشرقی پاکستان میں دق کی روک تھام کا منصوبہ

اقوام متحدہ کے بچوں کے فنڈ (یونی سیف) نے بچوں میں پھیلے ہوئے مرض دق کی روک تھام کے لیے ایک پروگرام منظور کر لیا ہے۔

یونی سیف کی مجلسِ انتظامیہ کے صدر پاکستان کے نمائندے مسٹر محمود شفقت نے یہ اعلان ایک پریس کانفرنس میں کیا تھا جو اقوام متحدہ کے مرکز اطلاعات کراچی میں منعقد ہوئی تھی۔ یونی سیف کے دفتر برائے ایشیا کے قائم مقام ڈائرکٹر مسٹر بریان جونز پاکستان میں یونی سیف کے اقامتی نمائندے مسٹر کرسٹن سن اور حکومتِ پاکستان کے محکمۂ صحت کے ڈائرکٹر جنرل کرنل ایم جعفر نے بھی نامہ نگاروں سے خطاب کیا۔

مسٹر شفقت گذشتہ ماہ نیویارک روانہ ہو گئے ہیں کیوں کہ انہیں یونی سیف کی مجلس انتظامیہ کے موسم خزاں والے اجلاس کی صدارت کرنی ہے ۔۔۔ پریس کانفرنس میں مسٹر شفقت نے بتایا کہ اس سال حکومت پاکستان نے درخواست کی تھی کہ ادویات اور خوراک سے مدد کی جائے، اور ملک میں ماؤں اور بچوں کی فلاح و بہبود کے جو مرکز قائم ہیں انہیں جاری رکھا جائے۔ اس خرچ کا اندازہ ۷۰۰ ہزار ڈالر ہے۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ ۱۹۴۹ء سے اب تک یونی سیف نے جو امداد پاکستان کو دی ہے وہ ۱۵ لاکھ ڈالر کے مساوی ہے توقع ہے کہ یونی سیف کی مجلس انتظامیہ والے اجلاس میں دس بارہ ملین ڈالر کی رقم منظور کی جائے گی جس سے دنیا بھر میں مختلف منصوبوں کو عملی جامہ پہنایا جائے گا۔ ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے مسٹر شفقت نے کہا کہ یونی سیف نے ان ملکوں تک کی درخواستوں پر غور کیا ہے، جو اقوام متحدہ کے ممبر نہیں ہیں۔ انہوں نے بتایا کہ

کہ یونی سیف کے امدادی پروگرام کے ماتحت دنیا بھر کے ساڑھے چار کروڑ بچوں کو اس سال فائدہ پہنچے گا۔

تپ دق کا ذکر کرتے ہوئے مسٹر شفقت نے بتایا کہ مشرقی پاکستان کے تین شہروں - راج شاہی سلہٹ اور چٹا گانگ، میں تین مرکز قائم ہیں۔ جہاں سے تپ دق کے بچاؤ کے ۴۴ لاکھ قرص تقسیم کیے جارہے ہیں۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ تحقیقات سے ثابت ہوا ہے کہ ادویات سے تپ دق کا مقابلہ کامیابی کے ساتھ کیا جا سکتا ہے اور چنانچہ ایسا ہی ہو رہا ہے۔ پچھلے سال تپ دق کے خلاف مہم کو تیز تر کرنے کے لیے ایک منصوبہ منظور ہوا تھا، جس پر عمل ہونے والا ہے۔

انہوں نے بیان کیا کہ کراچی، ڈھاکہ، راج شاہی، سلہٹ اور چٹا گانگ میں تپ دق کے جو مرکز قائم ہیں، ان کے لیے یونی سیف نے ایکس رے کی مشینیں، آلات و سامان اور ادویات فراہم کی ہیں۔

یونی سیف کے طریقۂ کار کی وضاحت کرتے ہوئے انہوں نے کہا کہ حکومت کی درخواست پر ہر منصوبے پر غور کیا جاتا ہے۔ اور اس طرح گویا ابتدائی قدم حکومت کی طرف سے اٹھتا ہے۔ اس کا کام اس اصول پر منحصر ہے کہ وہ کل خرچ کا ۳۳ فی صد ادا کرے گا، لیکن بعض صورتوں میں اس سے زیادہ بھی دے سکتا ہے۔

غذائی لائحۂ عمل اور یونی سیف کی امداد

یونی سیف کے ایشیائی دفتر سے اعلان ہوا ہے کہ یونی سیف کی مجلس انتظامیہ نے ماؤں اور بچوں کے غذائی پروگرام کے ضمن میں امداد کی متعدد نئی اقسام کو اصولی طور پر منظور کر لیا ہے۔ امداد کی نئی قسموں میں آلات و سامان وظیفے اور حمل و نقل کی گاڑیاں شامل ہیں، ان کا مقصد یہ ہے:-

(۱) غذائی جائزے (۲) غذائی کاموں کے لیے قومی عملے کی تربیت (۳) موضوع غذا پر کنبوں کی تعلیم و تربیت (۴) دیہات میں غذائی خدمات (۵) اصل خوراک میں ضروری حیاتین کا اضافہ تاکہ کمزوری سے لاحق ہونے والی بیماریوں کا مقابلہ ہو سکے۔ اور امداد پانے والے ملکوں میں حیاتین کی تیاری، اس غذائی پروگرام کو عمل میں لانے کے لیے یونی سیف امداد دے رہا ہے، اور ادارۂ خوراک و زراعت

عالمی ادارۂ صحت اور اقوام متحدہ کے شعبۂ امور معاشرت سے مشورہ کے بعد مرتب کیا گیا ہے۔ اس ضمن میں وہ اگلے سال سولاکھ ڈالر اور اس سے اگلے دو سال میں ۱۵ لاکھ ڈالر خرچ کرے گا۔

معذوروں کی آبادکاری کے مسائل

ایشیا اور مشرق بعید میں معذور لوگوں کی آبادکاری سے متعلق ایک سیمینار حال ہی میں انڈونیشیا کے شہر سولو میں منعقد ہوا تھا جس میں اس موضوع سے متعلق دشوار مسائل کو حل کرنے کے لیے دور رس فیصلے کیے گئے یہ علمی اجتماع اقوام متحدہ اور بعض مخصوص اداروں کے تعاون سے عمل میں آیا اور اس میں اس خطے کے بہت سے ملکوں اور علاقوں کے ماہرین نے حصہ لیا۔ بہت سے غیر سرکاری اداروں کے نمائندے بھی اس میں شریک ہوئے۔

تفہیم عامہ

سیمینار نے پرزور الفاظ میں سفارش کی کہ انتہائی کوششوں کے ذریعہ ان معذور لوگوں کی ضروریات اور ان کے حقوق کے بارے میں عوام کو تعلیم دی جائے۔ قومی تنظیمات کو اس کام سے پوری طرح ہم آہنگ کرنے کے لیے صلاح دی گئی کہ ایک قومی رابطہ کمیٹی قائم کی جائے اور آبادکاری کے کام کو ملک کے تمام منصوبوں کا جو صحت و تندرستی، تعلیم و تربیت، فلاح و بہبود اور روزگار کے سلسلے میں مرتب ہوں، ایک لازمی جزو قرار دیا جائے۔ رضاکارانہ چندوں کی ضرورت پر بھی زور دیا گیا۔ وہ چندے نقد یا اجناس کی صورت میں وصول کیے جائیں معذوروں کے روزگار پر بحث کرتے ہوئے اراکین اجلاس نے اس علاقے کے مخصوص حالات پر روشنی ڈالی اور کہا کہ معذوروں کو باقاعدہ تربیت دی جائے۔ اور روزگار دینے والوں کو باور کرایا جائے کہ وہ ان کے لیے مفید ثابت ہو سکتے ہیں۔

آبادکاری کے عملے کو تربیت دینے کے موضوع پر سب متفق الرائے تھے کہ چاہے شروع میں اس کا معیار پست ہو، لیکن اسے یکسر نظر انداز نہ کیا جائے۔ اس عملے کے بغیر صحیح آبادکاری ممکن نہیں ہے۔

مصنوعی اعضا

اپاہج لوگوں کی دردناک حالت پر بھی غور کیا گیا۔ تمام اراکین نے تسلیم کیا کہ اگر اس وقت کوئی ملک

آبادکاری کا بھرپور پروگرام بنانے کی استطاعت نہیں رکھتا تب بھی چھوٹے پیمانے پر مصنوعی اعضا بنانے کا کارخانہ قائم کرلے۔ ایسے اعضا کی ساخت کے بارے میں ماہرین نے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔

انسداد جرائم سے متعلق ایشیائی سیمینار

ایشیا اور مشرق بعید کے ملکوں کو دوسرے طبقاتی سیمینار میں شرکت کے لیے دعوت دی گئی ہے۔ جو انسداد جرائم اور اصلاح مجرمین کے موضوع پر منعقد ہونے والا ہے۔ اقوام متحدہ نے حکومت جاپان کے تعاون سے اس علمی اجتماع کا اہتمام کیا ہے جو ۲۵ نومبر سے ۷ دسمبر تک ٹوکیو میں ہوگا۔

نوجوانوں کی بے راہ روی۔ جیلخانوں میں کام کرانے کے اقتصادی پہلوؤں۔ قیدیوں کی اصلاح اور عصمت فروشی جیسے مسائل پر اس اجلاس میں تبادلۂ خیالات کیا جائے گا۔

نمائندے بھیجنے کے لیے ان ملکوں کو دعوت دی گئی:۔

افغانستان۔ برونئی۔ برما۔ کمبوڈیا۔ سیلون۔ بھارت۔ چین۔ ہانگ کانگ۔ سراوک۔ سنگاپور۔ تھائی لینڈ اور ویت نام۔ تمام نمائندے اپنی ذاتی حیثیت میں بطور ماہرین شرکت کریں گے، اور وہ سرکاری مندوب نہیں سمجھے جائیں گے۔ اس موضوع پر پہلا ایشیائی سیمینار اکتوبر ۱۹۵۴ء میں بمقام رنگون منعقد ہوا تھا۔

تجوری خالی کرنے کا فیصلہ

اقوام متحدہ کے بچوں کے فنڈ (یونی سیف) کے ایگزیکٹو ڈائرکٹر مسٹر مورس پیٹ کے بیان کے مطابق فنڈ نے اپنی تجوری خالی کردینے کا فیصلہ کیا ہے۔ اس وقت وہ ایک سو دو ملکوں اور علاقوں میں صحت اطفال سے متعلق سرکاری پروگراموں کے ذریعہ تقریباً ساڑھے چار کروڑ ماؤں اور بچوں کو امداد دے گا۔

مسٹر پیٹ نے حال ہی میں یہ بیان ۱۲۰ اراکین پر مشتمل یونی سیف کی مجلس انتظامیہ کے اجلاس میں دیا جو پاکستان کے مسٹر محمود شفقت کی صدارت میں اقوام متحدہ کے صدر مقام واقع نیویارک میں منعقد ہوا تھا۔ اس اجلاس کا منعقد یہ تھا کہ ۴۵ ملکوں اور علاقوں میں نئی امداد دینے کے لیے ایک کروڑ ۲ لاکھ ڈالر کی تقسیم کی جائے۔ ان میں ایشیا کے گیارہ ملک بھی شامل ہیں۔

مزید عطیات کی ضرورت | مسٹر پیٹ نے اس بات پر زور دیا کہ سب سے بڑا عطیہ دینے والے ملک

یعنی ریاست ہائے متحدہ کے علاوہ باقی حکومتوں کو ۱۹۵۸ء کے اخراجات کے لیے ۲۰ لاکھ ڈالر کی مزید رقم جمع کرنی ہوگی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اس سال جو رقمیں دی گئی ہیں، ان میں ۲۵ فی صد کا اضافہ کیا جائے۔

مسٹر پیٹ کی رائے ہے کہ یہ صورت اسی وقت ممکن ہے جب کہ ہم تمام ملکوں کو اچھی طرح یہ بات سمجھا دیں کہ یونی سیف کا وجود اور اس کی خدمات، انسانیت کے اعتبار سے قطع نظر اقتصادی قدروں کے لحاظ سے کس درجہ مفید ہیں۔

اس سال کا خرچ | مختلف ملکوں میں اس سال جتنی رقمیں خرچ کرنے کی تجاویز پیش ہوئی ہیں۔ ان کا میزان دو کروڑ ۴۰ لاکھ ڈالر سے زیادہ ہوگا، جب کہ ۱۹۵۷ء میں دو کروڑ ۲۳ لاکھ ۷۲ ہزار ڈالر صرف کیے گئے تھے۔ پچھلے دس سال سے یہی ہو رہا ہے کہ اخراجات کی رقم عطیات کے میزان سے بڑھ جاتی ہے۔

مسٹر پیٹ نے بتایا کہ ریاستہائے متحدہ کی حکومت نے اگلے سال ایک کروڑ دس لاکھ ڈالر دینے کا فیصلہ کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ رقم کل میزان کا ۵۲٫۵ فی صد ہوگی۔ اس کا مطلب یہ ہوگا کہ عطیے کی پوری رقم وصول کرنے کے لیے باقی تمام ملکوں کو ایک کروڑ ڈالر جمع کرنے ہوں گے۔

برابر کی رقم | انھوں نے کہا کہ یونی سیف کی امداد کے ضمن میں ایک یہ بات خاص طور پر قابل ذکر ہے کہ امداد پانے والے ملکوں کو بھی برابر کی رقم فراہم کرنی پڑتی ہے۔ چناں چہ اس سال ایسے ملکوں نے ۵ کروڑ ۰۷ لاکھ ڈالر خرچ کیے۔ بالفاظ دیگر یونی سیف کے ہر ایک ڈالر کے مقابلے میں امداد پانے والے ملکوں کو بھی ۲٫۲۹۷ ڈالر لگانے پڑتے ہیں۔ لہٰذا اپنی مدد آپ کرنے کے اصول کو تسلیم کرنے والے اس معقول صورت حال سے ضرور متاثر ہوں گے۔

فوری امداد | یونی سیف کی امداد فوری ضرورت کے کاموں میں دی جاتی ہے، اور اس کی نوعیت دیرپا ہوتی ہے۔ مثلاً ماؤں اور بچوں کی فلاح و بہبود سے متعلق مرکزوں سے دودھ یا حیاتین بخش ادویات کی صورت میں جو امداد ملتی ہے، یا تپ دق، ملیریا، خارش، امراض چشم اور جذام سے محفوظ رکھنے کے لیے جو علاج کیا جاتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ بچے اپاہج ہونے کے بجائے تندرست و توانا رہیں۔ یونی سیف کی امداد بہت زیادہ نہیں ہوتی تاہم اسے گذارے کے لائق کہا جا سکتا ہے۔ اور انسان اس قابل ہو جاتا ہے کہ وہ زندگی کی کشمکش میں

...کے اور آلام حیات کا مقابلہ کر سکے۔ اس ضمن میں بعض پہلو ایسے بھی ہیں، جن کو یونی سیف نے اپنی مجبوریوں کے باعث چھوا تک نہیں ہے۔ لیکن شاید مستقبل قریب میں یہ ممکن ہو جائے کہ ہم صرف گذارے کے لائق امداد دینے کی بجائے صحیح کلفت حیات دے سکیں۔

اس مقصد کو حاصل کرنے میں وقت لگے گا۔ اور یہ اسی وقت ممکن ہو گا جب کہ انسان اچھی طرح یہ سمجھ لے کہ آج جو کام بظاہر غیر نفع بخش ہیں، درحقیقت اپنے اندر تعمیری اغراض پوشیدہ رکھتے ہیں۔

لاشعاعوں کی تابناکی کے خطرات

عالمی ادارۂ صحت نے عالموں کی ایک جماعت یہ معلوم کرنے کے لیے مقرر کی تھی کہ انسانی وراثت پر تابناکی کا کیا اثر پڑتا ہے۔ اس جماعت نے حال ہی میں اپنی رپورٹ شائع کر دی ہے۔ اس اہم دستاویز میں اس پیچیدہ اور اہم مسئلہ پر جدید اطلاعات کی روشنی میں بحث کی گئی ہے اور مشورہ دیا ہے کہ انسان اور اس کی اولاد پر لاشعاعوں کی تابناکی سے جو اثر افزائش نسل پر ہوتا ہے آئندہ اس کی تحقیقات کس طرح کی جائے۔ ادارے کے ماہرین کی رائے ہے کہ اس نقطۂ نظر سے ہر وہ تابناکی جو انسانی ساختہ ہو، صحت انسانی کے لیے مضر ثابت ہو گی۔ اور یہ امر بھی قابل یقین ہے کہ بہت سے افزائشی اثرات اضافی نوعیت کے ہوتے ہیں۔ اور اگر تابناکی کی قلیل مقدار بھی بہت سے انسانوں پر اثر انداز ہو جائے تو بحیثیت مجموعی ساری آبادی کو خطرہ لاحق ہو سکتا ہے۔ انسانی ساختہ تابناکی کا سب سے بڑا منبع لاشعاعوں کی نلکیاں اور جوہری آلات ہیں ان کے علاوہ مصنوعی تابناکی کے وہ عناصر بھی اثر انداز ہوتے ہیں جو انسان سے فضا میں پھیلتے رہتے ہیں۔

ماہرین باہمی تبادلۂ خیالات کے بعد اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ لاشعاعوں کے ذریعہ تابناکی کا سب سے بڑا حملہ جنسی غدود پر ہوتا ہے۔ اس لیے ان غدود کو بچانے کی ضرورت ہے۔ انہوں نے ہدایت کی کہ لاشعاعیں جب بھی انسان کے جسم پر ڈالی جائیں تو ایسی احتیاطی تدابیر اختیار کی جائیں کہ جنسی غدود تک ان کا زیادہ اثر نہ پہنچے۔

ماہرین نے کہا کہ جوہری طاقت سے محفوظ طریقے پر استفادہ کرنے کے لیے اور بھی بہت سی تدابیر ممکن ہیں لیکن آئندہ ہونے والے فیصلوں کی بنیاد پر کہا جا سکے گا کہ انسان اس ضمن میں کس حد تک اپنی ذمہ داری پوری کر

کو پورا کر سکتا ہے۔

عالمی ادارۂ صحت نے حال ہی میں "چیلنج آف ایٹامک انرجی" کے عنوان سے اپنے رسالے کا خاص نمبر شائع کیا ہے جو متذکرہ بالا ماہرین کی رپورٹوں اور مقالوں کا خلاصہ ہے۔ اس شمارے کی تمہید میں عالمی ادارۂ صحت کے ڈپٹی ڈائرکٹر جنرل نے اس بات پر تشویش کا اظہار کیا ہے کہ تشخیص امراض کے سلسلے میں لاشعاعوں کا استعمال اندھا دھند ہو رہا ہے۔ جو بعض صورتوں میں سخت نقصان دہ ثابت ہوتا ہے۔ انہوں نے لکھا ہے کہ اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی نے ۱۹۵۵ء میں ایٹمی تابکاری کے اثرات معلوم کرنے کے لیے جو سائنسی کمیٹی مقرر کی تھی۔ اس نے بھی اس موضوع پر کافی غور کیا ہے۔ اس کے علاوہ عالمی صحت کی دسویں اسمبلی میں اس کا ذکر ہوا تھا۔

مطالعی دورے کے لیے کامیاب امیدوار

اقوام متحدہ کے محکمۂ اطلاعات عامہ نے سات مختلف ملکوں کے ان سات امیدواروں کے ناموں کا اعلان کیا ہے جو اقوام متحدہ کی طرف سے ۳۰ دن کا مطالعی دورہ کریں گے۔ انہیں ۱۶ اکتوبر سے ۱۵ نومبر تک کی مدت اقوام متحدہ کے صدر مقام پر گذارنی ہوگی وہ سکرٹریٹ جنرل اسمبلی اور اقوام متحدہ کے دوسرے اعضاء کے طریقۂ کار کا مطالعہ کریں گے۔ دنیا کے مختلف حصوں سے اقوام متحدہ کے مراکز اطلاعات کے ذریعہ صدر مقام پر ۵۰ سے زیادہ امیدواروں کی فہرست پیش ہوئی تھی۔ ان میں سے فیلوشپ پروگرام کمیٹی نے ۷ کو منتخب کیا ہے۔ یہ انتخابات امیدواروں کی تعلیمی اور ثقافتی استعداد اور معاشرتی فلاح و بہبود کے ضمن میں ان کی خدمات کو مدنظر رکھ کر کیے گئے ہیں۔ کامیاب امیدوار افغانستان، کیوبا، سوئیڈن، آئرلینڈ، فلپائن، چیکوسلواکیہ اور نیوزی لینڈ کے باشندے ہیں۔

صحافیوں کی تربیت

یونیسکو کے زیر اہتمام اطلاعی عملہ کی پیشہ ورانہ تربیت کے موضوع پر ماہرین کا ایک خاص اجلاس حال ہی میں بمقام پیرس منعقد ہوا تھا۔ تبادلۂ خیالات کے بعد ماہرین اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ صحافیوں کو ہر قسم کی تعلیم و تربیت دی جائے تو صحافت کا معیار زیادہ بلند ہو سکتا ہے۔ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے بہت سی سفارشات پیش کی گئیں جن میں سب سے اہم یہ ہے کہ طبقاتی یا بین الاقوامی مرکز قائم کیے جائیں جو دنیا کے مختلف حصوں میں

صحافیوں کی تعلیم و تربیت کے معیار کو بلند کرنے کے لیے مخصوص ہوں۔ ماہرین کی رائے ہے کہ ایسے مرکزوں کا یونیورسٹیوں سے الحاق ہو اور نصاب تعلیم میں اطلاعات کے تمام ذرائع ۔ اخبارات، ریڈیو، ٹیلی وژن اور فلم مدنظر رکھے جائیں۔

پاکستان کے لیے جمعیتی ترقی کے مشیر

پچھلے ہفتے اقوام متحدہ کے فنی امداد کے ادارے نے جمعیتی ترقی سے متعلق اپنے ایک مشیر اعلیٰ مسٹر چارلس ایچ آسپاک کو کراچی بھیجا ہے۔ ان کا فرض منصبی حکومت پاکستان کو اس کی ان کوششوں میں مشورے دینا ہوگا جو شہروں میں رہائش اختیار کرنے کے باعث پیدا ہونے والے مسائل کو حل کرنے کے لیے شروع کی گئی ہیں اس سے پہلے وہ اقوام متحدہ کے صدر مقام پر محکمۂ امور معاشرت و اقتصادیات کے شعبۂ جمعیتی ترقی کے افسر اعلیٰ تھے۔

مسٹر آسپاک نے حکومت پاکستان کے اس اقدام کو سراہا ہے کہ اس نے شہری زندگی کے معاشرتی اور اقتصادی پہلوؤں پر اور دیہاتی زندگی کے بعض امور پر خاص توجہ دینے کا فیصلہ کیا ہے۔ ان کی رائے ہے کہ اگر شہروں میں رہائش اختیار کرنے کا سلسلہ شروع ہو جائے اور اس کے متوازن شہری علاقوں میں ترقی کے امکانات محدود ہوں تو بہت سی دشواریاں لاحق ہو سکتی ہیں، اور پھر ضرورت ہوتی ہے کہ معاشرتی خدمات کو وسیع کیا جائے۔ مثلاً یہ کہ مکانات تعمیر ہوں۔ بلدیہ کے نظم و نسق کو زیادہ تقویت دی جائے، اور پیشہ ورانہ تربیت کا انتظام کیا جائے۔ سب سے زیادہ اہم بات یہ ہے کہ نئے آنے والے اور قدیم باشندے مل جل کر ان معاملات پر غور کریں۔

مسٹر آسپاک نے بتایا کہ قرب و جوار میں رہنے والوں کی اس لحاظ سے ہمیشہ ہمت افزائی کی جائے کہ وہ مل جل کر بہت سے مسائل طے کرنے میں حصہ لیں، اور نجی یا سرکاری ذرائع سے جو بھی فنی خدمات میسر آسکیں ان سے پورا پورا فائدہ اٹھائیں۔ اس مقامی اشتراک عمل سے ترقی بتدریج لیکن اہم ہوگی مسٹر آسپاک لاہور میں قیام کریں گے۔ وہ حکومت پاکستان کو قومی پروگراموں میں مشورے دینے کے علاوہ مغربی پاکستان کی حکومت کو جمعیتی ترقی کی خدمات کو ترقی دینے میں مدد دیں گے ۔

Regd. No. L. 5327

پنجاب ایجوکیشنل جرنل

اور

آموزش (اردو)

۱ ۔ پاکستا بھر میں یہ دو ھی تعلیمی رسالے ھیں ۔ جنکو سرکاری سرپرستی اور امداد حاصل ہے ۔

۲ ۔ پاکستان بھر میں یہی دو تعلیمی رسالے ھیں ۔ جو مرکزی اور صوبائی درسگاھوں اور تعلیمی حلقوں میں مقبول ھیں ۔

۳ ۔ ان رسالوں کے متعلق ادارتی خطوط اور چھپنے والے مضامین ایڈیٹر (پرنسپل) سنٹرل ٹریننگ کالج لاھور کو بھیجے جائیں ۔ ان رسالوں میں چھپے ھوئے مضامین کیلئے معاوضہ دیا جاتا ہے ۔

۴ ۔ یہ رسالے ھر مہینے کے دوسرے ھفتہ میں چھپتے ھیں اور ان کا چندہ آٹھہ روپیہ (انگریزی) اور چھہ روپیہ (اردو) ہے ۔ جو کہ منیجر کو بھیجنا چاھئے ۔

۵ ۔ ان رسالوں میں اشتہار دینے سے آپکی اشیاء مقبول ھونگی ۔ اری معاملات کیلئے خط و کتابت منیجر سے کریں ۔

منیجر پنجاب ایجوکیشنل جرنل
آموزش
۲ کچہری روڈ ۔ لاھور (پاکستان)



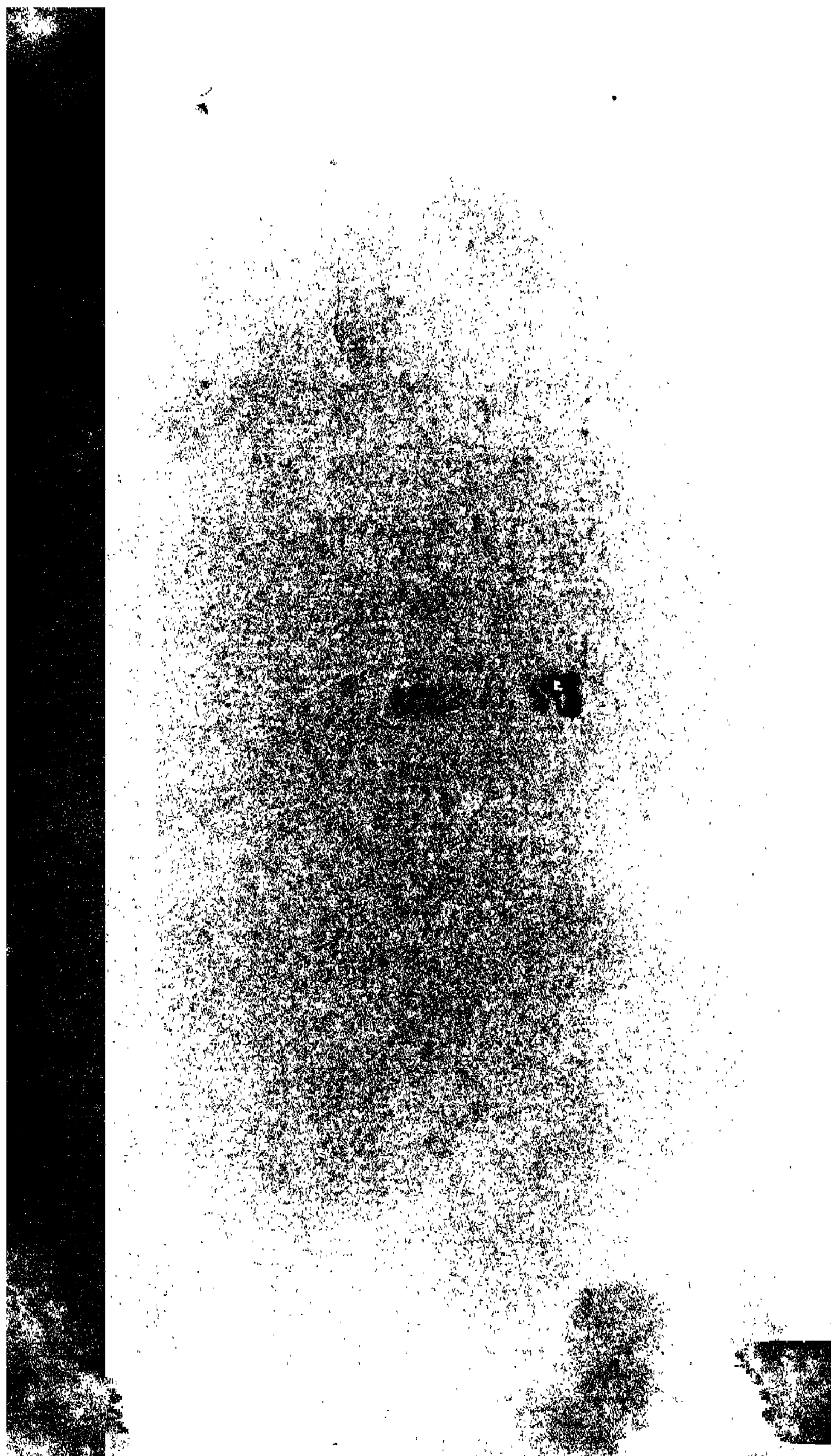
آموزش

۱۰ شمارہ ۷] لاهور [اکتوبر ۵۷

اس شمارہ میں

ادارہ تحریر { پروفیسر سراج الدین
پروفیسر ایم ۔ اے ۔ مخدومی

معاونین { عبدالغفور چوہدری
فضل احمد



تعلیمی ماہ نامہ

آموزش

لاہور

اکتوبر ۱۹۵۷ء

جلد ———————— ۱۰

شمارہ ———————— ۷

سالانہ چندہ

پاکستان کے لیے ۶ روپے

غیر ممالک کے لیے ۸ روپے

قیمت فی پرچہ دس ۱۰ آنے

پبلشرز

یونیورسٹی بک ایجنسی لاہور

آر۔ ایچ۔ ڈی خالد پرنٹر پبلشر نے دین محمدی پریس لاہور میں طبع کرا کے
یونی ورسٹی بک ایجنسی ۲ کچہری روڈ لاہور سے شائع کیا

ایٹمی دور کا چیلنج

ایم۔ اے مخدومی

روس نے مصنوعی سیارے تیار کر کے نہ صرف دنیائے علم و سائنس میں ایک ہل چل پیدا کر دی ہے بلکہ مختلف ملکوں کے نظامہائے تعلیم کے لیے ایک بہت بڑا چیلنج بھی پیش کیا ہے۔ روسی قوم آج بھی دہقانوں کی قوم ہے۔ معیار زندگی کے لحاظ سے روسی عوام اپنے مشرقی بھائیوں سے چنداں آگے نہیں۔ لیکن دہقانوں کی اس قوم نے پچھلے تیس چالیس برسوں میں سائنس اور ٹکنالوجی کے میدان میں اس برق رفتاری سے ترقی کی ہے کہ آج برطانیہ اور امریکہ بھی اس ترقی پر رشک کرنے لگے ہیں۔ روس کی یہ سائنسی ترقی کوئی اتفاقی حادثہ نہیں۔ یہ ایک سوچے سمجھے منصوبہ کی پیداوار ہے۔ یہ روس کے نظام تعلیم کا کارنامہ ہے۔ روسی قوم نے یہ کارنامہ ممکن بنانے کے لیے بہت بھاری قیمت ادا کی ہے۔ لیکن یہ ایک ایسا سودا ہے جو کسی قیمت پر بھی مہنگا نہیں۔

موجودہ دنیا میں سائنس اور ٹکنالوجی کی حکمرانی ہے۔ آج اصل قوت سائنس اور ٹکنالوجی کی قوت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ صدر آئزن ہاور نے امریکہ کے چوٹی کے سائنس دانوں کی ایک تنظیم اس غرض سے قائم کی ہے کہ وہ اپنی مساعی کی رفتار تیز تر کر دیں، اور اس طرح آزاد ممالک کے ہاتھ مضبوط کریں۔ جس دنیا میں مختلف نظریہ ہائے حیات برسرپیکار رہوں وہاں ہر نظریہ حیات کے لیے ضروری ہو جاتا ہے کہ اپنی قوت کو دوسروں کے مقابلے میں گھٹنے نہ دے۔

یہ صورت حال ہمارے نظام تعلیم کے لیے ایک چیلنج کا درجہ رکھتی ہے۔ پاکستان ایک اسلامی جمہوریت ہے۔ ہم اپنی قومی زندگی کی عمارت کو انفرادی آزادی مساوات معاشرتی انصاف اور رواداری کے اسلامی اصولوں پر تعمیر کرنا چاہتے ہیں۔ یہی وہ اصول ہیں جو جمہوری طرز زندگی کا خلاصہ ہیں۔ اسی بنا پر پاکستان نے باقی آزاد دنیا کے ساتھ دوستی اور تعاون کے گہرے رشتے قائم کر رکھے ہیں لیکن آزاد قوموں کی برادری میں باوقار مقام حاصل کرنے کے لیے ضروری ہے کہ پاکستان سائنس اور ٹکنالوجی کے میدانوں میں

اپنے لیے ایک خاص جگہ پیدا کرے۔ ایٹمی دور کا یہ چیلنج قبول کیے بغیر آج کسی قوم کے لیے آبرومند زندگی ممکن نہیں۔

ایٹمی دور کے اس چیلنج نے برطانیہ جیسے ترقی یافتہ ملک کو بھی یہ سوچنے پر مجبور کر دیا ہے کہ آیا اس کا نظامِ تعلیم کافی تعداد میں سائنس دان اور فنی ماہرین پیدا کر رہا ہے۔ ہمارے لیے یہ سوال خصوصیت کے ساتھ اہم ہے کیوں کہ ہم ابھی اپنے نظامِ تعلیم میں اصلاح و ترمیم کرنے والے ہیں۔ مروجہ نظامِ تعلیم پر ایک عرصے سے لے دے ہو رہی ہے۔ بعض لوگوں کو شکایت ہے کہ اس کی بدولت عوام پر تعلیم کے دروازے بند ہیں بعض اس پر یہ الزام دھرتے ہیں کہ یہ نہ صرف اپنے طور پر سوچنے سمجھنے کی صلاحیت پیدا نہیں کرتا بلکہ ہاتھ سے کام کرنے کو بھی باعثِ عار بنا کر رکھ دیتا ہے۔ لیکن نظامِ تعلیم کی تعمیرِ نو کے وقت ہمیں صرف انہی شکایات کو دور کرنا نہیں ہوگا بلکہ سب سے پہلے اس بات کا لحاظ رکھنا ہوگا کہ آیا ہمارا نظامِ تعلیم آبرومند قومی زندگی کی ساری ضرورتوں کے لیے کافی تعداد میں سائنس دان اور انجینئر پیدا کر رہا ہے؟ ایٹمی دور کے اس چیلنج کو پہلی توجہ دیے بغیر آج کوئی نظامِ تعلیم معقول ہونے کا دعویٰ نہیں کر سکتا۔ ہمیں امید ہے کہ مغربی اور مشرقی پاکستان میں جن ماہرینِ تعلیم کو یہ خدمت سونپی جا رہی ہے کہ وہ حالات و واقعات کا جائزہ لے کر مروجہ نظامِ تعلیم میں مناسب تبدیلیوں کی سفارش کریں۔ وہ عہدِ حاضر کی اس منہ بولتی تعلیمی ضرورت کا پورا پورا خیال رکھیں گے ؂

مغربی تعلیمی فکر میں نئی وسعت

فضل احمد

۱۹۴۴ء کا قانونِ تعلیم

۱۹۴۴ء کے قانونِ تعلیم نے انگلستان کے نظامِ تعلیم میں بنیادی تبدیلیاں ہی پیدا نہیں کیں بلکہ اس قانون کی بدولت برطانوی تعلیمی فکر میں بھی ایک انقلابی تبدیلی ہوئی ہے۔ یوں تو ہنری ہشتم کے وقت سے تاجِ برطانیہ نے محافظِ دین کا لقب اختیار کر رکھا ہے اور انگلستان میں یونانی علم و حکمت کی روشنی پھیلانے کا کام اوّل اوّل کلیسائی تعلیمی اداروں نے ہی شروع کیا تھا، لیکن قومی ریاست کے تصوّر اور جمہوری فلسفۂ زندگی کی ترقی کے ساتھ ساتھ یہ خیال بھی زور پکڑتا گیا کہ ریاست کو مذہبی امور سے الگ تھلگ رہنا چاہیے۔ اس خیال کا براہِ راست نتیجہ یہ نکلا کہ تعلیم اور مذہب کو بھی دو الگ الگ چیزیں سمجھا جانے لگا۔ شہریوں کی بنیادی تعلیم کا بندوبست کرنا مدت سے جدید رفاہی ریاست کی ذمہ داری تسلیم کی جا چکی ہے۔ مگر چونکہ ریاست کو مذہبی امور سے بے تعلق رکھنا ضروری سمجھا گیا۔ اس لیے تعلیم کو بھی مذہب سے بے تعلق بنا دیا گیا۔

۱۹۴۴ء کے قانونِ تعلیم نے حکومت کی تعلیمی ذمہ داری کو دو سمتوں میں بڑھایا ہے۔ اس قانون کی رو سے حکومت کے لیے لازمی ہو گیا ہے کہ ہر لڑکے اور لڑکی کو اس کی حسبِ استعداد ثانوی درجے تک تعلیم دے اس کے ساتھ ہی اس قانون نے ہر مدرسے کے لیے یہ بھی لازمی قرار دیا ہے کہ اس کے طلبہ اور طالبات دن میں ایک مرتبہ عبادت کے لیے جمع ہوا کریں۔ قانون کے اس دوسرے حصے کو عملی جامہ پہنانے کے رستے میں بہت سی مشکلات پیش آئیں۔ عیسائی فرقوں کی تعداد سینکڑوں کو پہنچتی ہے۔ ان میں سے بعض کے عقاید میں اتنا شدید اور بنیادی اختلاف ہے کہ وہ ایک دوسرے کے ساتھ مل کر عبادت کرنے پر آمادہ نہیں ہو سکتے۔ لیکن برطانیہ کے سرکاری مدرسوں نے ان ساری مشکلات پر قابو پا لیا ہے۔ تمام سرکاری مدرسوں میں نہ صرف دینیات کی تعلیم لازمی بن چکی ہے بلکہ ہر مدرسہ دن میں ایک بار مل کر عبادت کرنے کا بندوبست بھی کرتا ہے۔ ہر مدرسہ نواحی آبادی میں اکثریت رکھنے والے فرقہ کے عقائد کے مطابق عبادت

کا اہتمام کرتا ہے۔ تھوڑی گنتی والے فرقوں کو اجازت ہے کہ اپنے بچوں کے لیے اپنے چرچ پر الگ عبادت کا انتظام کر دیں۔ غرض ۱۹۴۴ء کے قانون تعلیم نے انگلستان میں نظریاتی و عملی ہر دو لحاظ سے تعلیم اور مذہب کی بے تعلقی کا خاتمہ کر دیا ہے۔

انگلستان کے تعلیمی فکر میں یہ انقلاب تاریخ تعلیم کا ایک بہت بڑا واقعہ ہے۔ اس واقعہ کی اہمیت کا اندازہ کرنے وقت ہمیں یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ اصلاح کلیسا۔ صنعتی انقلاب۔ جمہوری طرز زندگی یہ اور اس قسم کی دوسری ترقی پسند تحریکوں کو پروان چڑھانے میں جس یورپی ملک نے سب سے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا وہ برطانیہ ہی ہے۔ فکری اور معاشی لحاظ سے مشرقی یورپ آج بھی ایشیا سے بہت مختلف نہیں۔ مغربی یورپ میں بھی آزاد خیالی اور ترقی پسندی کا چرچا زیادہ تر انگلستان میں ہی ہے۔ فرانس۔ پرتگال اور ہسپانیہ اب تک مذہبی جنون کی گرفت میں ہیں۔ اطالیہ کی طرح ان ملکوں میں بھی اکثریت رومن کیتھولک فرقے کی ہے جس کے مذہبی تعصب کا یہ حال ہے کہ دوسرے مذاہب درکنار وہ پروٹسٹنٹ عیسائیوں کو بھی مذہبی آزادی نہیں دیتا۔ حد یہ ہے کہ کوئی پروٹسٹنٹ عیسائی ان ملکوں میں سفر کرنے وقت اپنے ساتھ پروٹسٹنٹ عقائد کی کتابیں اور رسالے نہیں لے جا سکتا۔ بسا اوقات ان ملکوں کے پروٹسٹنٹ باشندوں کو یہ اجازت نہیں دی جاتی کہ اپنی عبادت گاہوں پر گرجے کی طرح گنبد اور کلس تیار کریں۔

غرض انگلستان نے تعلیم اور مذہب کو یکجا کرنے کا جو قدم اٹھایا ہے وہ بہت معنی خیز ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ یورپ نے تعلیم کے مفہوم سے مذہب کو خارج کرنے کا جو فیصلہ کیا تھا۔ اب وہ اسے غلط سمجھ کر منسوخ کر چکا ہے۔ مغربی ملکوں میں اس وقت ریاست ہائے متحدہ امریکہ ہی کی ایک قابل ذکر مثال باقی ہے۔ جہاں مذہب بدستور تعلیم سے خارج ہے۔ مگر اس علیحدگی کی وجوہ تاریخی اور سیاسی ہیں امریکہ نے اپنی تعلیم کے اس ادھورے پن کو دور کرنے کے اور ذرائع اختیار کر رکھے ہیں۔ امریکہ اس قدر امیر ملک ہے کہ اس نے اپنے بچوں کی مذہبی تعلیم کے لیے مدرسوں سے باہر گرجوں میں انتظام کر رکھا ہے۔

تعلیم کا مغربی مفہوم

مغربی تعلیمی فکر نے تعلیم کی سب سے بڑی غایت یہ قرار دی ہے کہ فرد کی تمام صلاحیتوں کو اس طور پر

ترقی دی جائے کہ وہ اپنے ماحول پر زیادہ سے زیادہ قدرت حاصل کرتا جائے اور اس طرح اس کی انفرادی اور اجتماعی زندگی زیادہ سے زیادہ مالامال ہوتی چلی جائے۔ تعلیم کے اس تصور میں بظاہر کوئی کمی نظر نہیں آتی جو شخص اپنے ماحول کی تمام قوتوں کو اچھی طرح سمجھ کر اپنی خداداد صلاحیتوں کو اس طرح بروئے کار لائے گا کہ وہ اپنی نجی زندگی بھی سکھ اور چین سے گذارے اور اجتماعی زندگی کے حسن و خوبی میں بھی اضافہ کا موجب ہو وہ یقیناً ایک کامیاب زندگی کا مالک اور تعلیم یافتہ شخص کہلانے کا مستحق ہوگا۔ مغرب نے تعلیم کے اس مفہوم کو سامنے رکھ کر معاشی ترقی اور رفاہی بہبود کے میدانوں میں جو حیرت انگیز ترقی کی ہے وہ تاریخ میں اپنی مثال آپ ہے۔ سائنس اور ٹکنالوجی کی برق رفتار پیش قدمی نے انسان کو اس قابل بنا دیا ہے کہ وہ فطرت کے چہرے سے صدیوں پرانے نقاب الٹ دیے اور مادی افراط و فراوانی اور راحت و آسائش کے ایسے ایسے جادو اثر نسخے معلوم کرے جو طلسم ہوش ربا اور الف لیلے کی کہانیوں کو بھی شرمندہ کر کے رکھ دیں۔ آج انسان کے بنائے ہوئے راکٹ اور مصنوعی چاند فضائے بسیط تک کو کھنگالتے پھرتے ہیں۔ انسان فضا میں ذی روح مسافروں کو بھیجنے میں کامیاب ہو چکا ہے، اور کوئی دن جاتا ہے کہ وہ خود بھی فضا میں سفر کرنے لگے گا اور چاند بھی اس کی مٹھی میں آجائے گا۔

اگر مادی اور طبعی ماحول پر انسانی قدرت کا حال یہ ہے تو معاشرتی ماحول پر بھی جدید انسان بے پناہ تصرف حاصل کرنے میں کامیاب ہو چکا ہے۔ قدیم زمانوں اور قرون وسطیٰ کی بڑی سے بڑی سلطنت کے انتظامی اور معاشی نظام کا موازنہ جدید زندگی سے کریں تو زمین آسمان کا فرق نظر آتا ہے۔ آج انسان کی سیاسی اور معاشی زندگی کے رشتے اس قدر پیچ در پیچ راستوں میں سے گذرتے ہیں اور بالآخر اس طرح ایک دور و دراز مرکز پر جا جمع ہوتے ہیں کہ پہلے وقتوں میں یہ بات کسی کے وہم و گمان میں بھی نہ آسکتی تھی۔ معاشرتی زندگی کا غالب رنگ ہر جگہ مقامی تھا۔ آج مقام اور وقت کا بُعد بہت کچھ مٹ چکا ہے، اور انسان نے اپنی سیاسی اور معاشی زندگی کو حیرت انگیز کامیابی کے ساتھ عالمی بنیادوں پر منظم کر لیا ہے۔

بے شک مغربی تہذیب اپنے ان دونوں کارناموں پر فخر کر سکتی ہے۔ اس نے اگر مادی سہولت اور فراوانی کے معاملے میں معجزے کر دکھائے ہیں تو سیاسی اور معاشی تنظیم کے بارے میں بھی اس کے کارنامے کچھ کم

حیرت انگیز نہیں۔ بے شک انسان کی بنیادی ضرورت ہمیشہ یہی رہی ہے کہ اپنے ماحول پر زیادہ سے زیادہ قابو حاصل کرتا چلا جائے۔ انسان اپنے آپ کو ایک بے پروا طبعی ماحول سے دوچار پاتا ہے۔ ایک ایسا ماحول جو اس کی خواہشات اور تمناؤں سے آنکھیں بند کیے اپنی راہ پر چلا جاتا ہے۔ اگر انسان اس ماحول کے ساتھ نباہ نہیں کر سکتا تو اس کے لیے زندہ رہنا محال ہو جاتا ہے۔ دنیا کے آغاز میں جب انسانی آبادی گنتی میں بہت تھوڑی تھی طبعی ماحول اچھا خاصہ فراخ دل معلوم ہوتا تھا۔ انسان کو بغیر مشقت کیے کافی مقدار میں جنگلی پھل اور شکار ہاتھ لگ جاتے تھے۔ اس طرح اس کی گنتی کی ضرورتیں کسی خاص تگ و دو کے بغیر پوری ہو جاتی تھیں لیکن جوں جوں آبادی بڑھی یہ مسئلہ ٹیڑھے سے ٹیڑھا ہوتا گیا۔ پیٹ بھرنے، تن ڈھانپنے اور اپنے آپ کو سلامت رکھنے کا سوال دن بدن مشکل ہوتا گیا۔ اس سوال کو حل کرنے کے لیے انسانی ذہن نے طرح طرح کے طریقے ڈھونڈ نکالے اور انسانی جسم نے قسم قسم کی کلفتیں قبول کیں۔ انسان نے زمین کو توڑ پھوڑ کر ہموار کیا۔ جنگلی پودے خود کاشت کرنے لگا۔ ندی نالوں پر بند باندھے۔ جنگلی جانوروں کو رام کیا۔ غرض اس نے اپنے طبعی ماحول کی شکل بدل کر رکھ دی اور اسے اس بات پر مجبور کر دیا کہ انسانی ضرورتیں پوری کرے۔

طبعی ماحول میں رد و بدل کے ساتھ ساتھ انسان کی اجتماعی زندگی کا رنگ بھی بدلنے لگا۔ کنبے کی جگہ قبیلوں اور بستیوں نے لے لی۔ اس اجتماعی زندگی نے ایک نیا معاشرتی ماحول پیدا کر دیا۔ مل جل کر رہنے کے طور طریقے مقرر کر دیے گئے۔ ہر فرد کے لیے ضروری ہو گیا کہ ان طور طریقوں کے مطابق زندگی گذارے۔ ہر چند کہ یہ طور طریقے بالکل مصنوعی تھے۔ کیوں کہ یہ انسان کے اپنے بنائے ہوئے تھے۔ مگر ان کی قوت قاہرہ طبعی ماحول سے کچھ بھی کم ہو گی، یہ مصنوعی معاشرتی ماحول جسے انسان تہذیب کا نام دے کر جی خوش کیا کرتا ہے وقت کے ساتھ پیچیدہ سے پیچیدہ ہوتا گیا۔ مگر جس طرح طبعی ماحول کے ساتھ نباہ کیے بغیر زندگی ناممکن تھی اسی طرح معاشرتی ماحول کے ساتھ نباہ کیے بغیر خوشی کی زندگی گذارنا محال ہو گیا۔

مغربی تعلیم نے اپنا آخری مقصد یہ قرار دیا کہ انسان کو اپنے مادی اور معاشرتی ماحول پر قابو پانے کے قابل بنا دے۔ اس مقصد میں مغربی تعلیم نے جو کامیابی حاصل کی ہے وہ ناقابل انکار ہے۔ اس سے بہت عرصہ تک خود مغرب کو یہ دھوکہ رہا کہ اس نے وہ سب کچھ حاصل کر لیا ہے جو انسانی کوشش اور تلاش سے حاصل کیا جا سکتا ہے۔

ادھورا مقصد

بظاہر دیکھنے میں تعلیم کا یہ مقصد بہت تسلی بخش ہے کہ وہ انسان کو اس کے ماحول کے ساتھ ہم آہنگ ہوگا۔ وہ نہ صرف اس کے غیر متبدل اور آفاقی اجزا کے ساتھ خوبی کے ساتھ نباہ کر سکے گا۔ بلکہ اس کے باقی عناصر کا تنقیدی جائزہ لے کر ان کی اصلاح و ترقی کی راہیں تلاش کرنے کے قابل بھی ہوگا تعلیم کے مغربی تصور نے ہم آہنگی کے ان دونوں عناصر کو تعلیم کا لازمہ ضرور قرار دیا۔ اس نے تعلیم کے ذمے یہ دوگونہ فرض لگایا کہ وہ فرد کی گوناگوں صلاحیتوں کی اس طور پر پرورش کرے کہ آگے زندگی میں چل کر وہ ایک اچھا شہری بھی ثابت ہو اور اجتماعی زندگی کی لگاتار اصلاح میں موثر حصہ لینے کے قابل بھی بن جائے۔ اور اس طرح زندگی سے ایک پائدار راحت حاصل کر سکے۔

یہ استدلال عقل کی تشفی کر سکتا ہے۔ لیکن اس میں بنیادی خامی یہ ہے کہ ماحول کے مفہوم کی حد بندی نہیں کی گئی۔ مغربی تعلیمی فکر نے اپنے نظام تعلیم کی ساری عمارت اس مفروضے پر کھڑی کی کہ انسان کو جس ماحول کے ساتھ ہم آہنگ ہونے کی ضرورت ہے وہ محض مادی اور معاشرتی عناصر پر مشتمل ہے۔ جو شخص اپنے اور اپنی قوم کے لیے مادی فراوانی پیدا کرنے کا موجب بن سکتا ہے اور دوسرے انسانوں کے ساتھ خوش گوار مراسم قائم کر سکتا ہے وہ ایک کامیاب انسان ہے اور تعلیم کی غایت اس قسم کی کامیابی کے سوا اور کچھ نہیں۔ بالکل حال تک مغربی تہذیب کی ساری دوڑ دھوپ صرف اسی منزل کے لیے تھی۔ اس کا سارا زور علم و مہارت کی ترقی و توسیع پر صرف ہوتا تھا۔ لیکن دوسری عالمی جنگ کے بعد سے مغرب میں چند غیر مانوس آوازیں بھی سنائی دینے لگی ہیں۔ یہ وہ آوازیں ہیں جو مغرب کو اس کی بے بصیرتی سے خبردار کرنا چاہتی ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ علم اور مہارت اکیلے انسان کو صحیح کردار کا مالک نہیں بنا سکتے۔ اگر تعلیم کی اصل منزل ذہنی ادراک اور فنی تیاری کی بجائے پسندیدہ قسم کا طرز عمل ہے تو اسے ماحول کے سطحی عناصر کے علاوہ ان آفاقی عناصر کا وجود بھی تسلیم کرنا چاہیے جو انسانی زندگی کو ایک بلند مقصدیت اور ایک ابدی حسن عطا کرتے ہیں جب تعلیم کی نگاہ محض مادی اور معاشرتی عناصر پر اٹک کر رہ جاتی ہے، اور وہ ان سے پیچھے روحانی اور اخلاقی قوتوں تک نہیں پہنچتی، وہ ایسے لوگ پیدا کرتی ہے جو نہ انسانی مقام میں کوئی آفاقی بلندی دیکھ سکتے ہیں اور نہ ہی زندگی میں وہ پُرسکون راحت جو آفاقی قوتوں کے ساتھ رابطہ

پیدا کرنے سے ہی میسر ہو سکتا ہے۔

مغرب کی مادی تہذیب میں اس قسم کی انتہائی آوازیں غیر مانوس ضرور ہیں، لیکن ان کی طرف دن بدن زیادہ توجہ ہونے لگی ہے۔ اب سائنس اور ٹیکنالوجی کے پرستار بھی یہ بات تسلیم کرنے لگے ہیں کہ سائنس اور ٹیکنالوجی کی بے پناہ قوت سے مفید کام لینے کے لیے ایسی شخصیت کی ضرورت ہے جس کی تعمیر آفاقی اصولوں کی بنا پر کی گئی ہو۔ لہٰذا مدرسے کا یہ فرض ہے کہ سائنسی علوم پڑھانے کے ساتھ ساتھ طالب علم کی ذہنی آبیاری کے لیے ان ابدی روحانی اقدار کی طرف رجوع کرے جن کا لازوال حسن زندگی میں روح افزا تازگی اور سکون پیدا کرنے کا ضامن ہے۔

غرض طویل مایوسی کے بعد مغرب کو اب اپنے تعلیمی مقصد کے ادھورے پن کا احساس ہوا ہے اسے اب یہ علم ہوا ہے کہ محض مادی فراوانی اور انسانی مراسم کی خوش گواری انسانی زندگی کو بھرپور نہیں بنا سکتیں۔ جو شخص صرف مادی افراط اور خوش گوار مراسم پر اکتفا کر دیتا ہے وہ اپنے ماحول کے ساتھ پوری طرح ہم آہنگ نہیں اس نے اپنے ماحول کے ایک بے حد اہم عنصر یعنی روحانی قوتوں کو نظر انداز کر رکھا ہے۔ ایسا شخص زندگی سے پائدار راحت حاصل نہیں کر سکتا۔ مادی فراوانی اور اچھے معاشرتی مراسم اسے جو راحت عطا کرتے ہیں وہ نسبتاً سطحی اور ناپائدار ثابت ہوتی ہے۔ افراد کو زندگی کی پائدار راحت عطا کرنے کے لیے تعلیم کو چاہیے کہ انہیں عظیم آفاقی قوتوں کے پہچاننے اور اپنے آپ کو ان کے ساتھ مربوط کرنے کے قابل بنا دے۔ مدرسے کی ذمہ داری صرف علم و مہارت عطا کرنا ہی نہیں بلکہ اس کی ذمہ داری میں یہ بات بھی شامل ہونی چاہیے کہ وہ آفاقی قوتوں کے ساتھ جذباتی لگاؤ پیدا کرے۔ تاکہ صحیح قسم کے کردار اور پسندیدہ قسم کے طرز عمل کی پوری پوری ضمانت مل جائے یہ اسی احساس کا نتیجہ ہے کہ انگلستان میں دینی تعلیم کو نصاب مدرسہ کا مرکزی نقطہ بنا دیا گیا ہے۔ جوہری توانائی کے اس دور میں مغرب کو پھر سے ایک کا بھولا ہوا سبق یاد آیا ہے۔ اسے دفعتہً یہ احساس ہوا ہے کہ روحانی اور اخلاقی قدریں بے معنی الفاظ نہیں بلکہ زندگی کی اہم ترین اور بیش قیمت ترین حقیقتیں ہیں۔

اسلام کا موقف اسلام نے بلاشبہ علم و حکمت کو زندگی کی ساری سعادتوں کا سرچشمہ قرار دیا ہے

حضرت آدمؑ کو فرشتوں پر اس لیے فوقیت ملی کہ وہ علم میں فرشتوں سے بڑھے ہوئے تھے۔ قرآن حکیم نے تقویٰ کو واحد وجہ امتیاز قرار دیا ہے۔ اس کے مقابلہ میں دولت۔ نسب۔ قوم۔ ملت۔ رنگ۔ نسل و غیرہ کے تمام امتیازات باطل قرار دیے گئے ہیں۔ لیکن ایک اور مقام پر یہ وضاحت بھی کر دی ہے کہ تقویٰ کا مقام حاصل کرنے کا ذریعہ علم ہے "انما یخشی اللہ من عبادہ العلماء" کے ایک جملہ نے یہ نکتہ ہمیشہ کے لیے واضح کر دیا ہے کہ اسلام میں اگر وجہ امتیاز تقویٰ ہے تو تقویٰ تک پہنچانے والا راستہ علم و حکمت کا راستہ ہے۔

تاریخ گواہ ہے کہ اسلامی تہذیب و ثقافت نے پہلے دن سے علم و حکمت کو اپنی بنیاد قرار دیا، قرون اولیٰ میں کسی مسلمان کے لیے سب سے بڑا امتیاز نماز کی امامت تھی۔ یہ وہ منصب تھا جو کسی مسلمان کو فوراً نائب رسولؐ کا درجہ دے دیتا تھا۔ مگر اس بلند مقام کے حصول میں، عمر، دولت۔ نسل۔ نسب وغیرہ کچھ کام نہ دیتے تھے۔ ارشاد نبویؐ یہ تھا کہ مسلمانوں کے کسی گروہ میں جو شخص قرآن حکیم کا سب سے زیادہ علم رکھتا ہے امامت کا منصب اسے دیا جائے۔ غرض اسلامی ثقافت نے اپنے فرزندوں کو ان کے ماحول پر قدرت عطا کرنے کے لیے علوم و مہارت کی تلاش پر بے حد زور دیا۔ شارع علیہ السلام نے اپنی امت کو خود اس راہ پر لگایا تھا، اور یہ امت صدیوں تک تلاش و جستجو کی اس راہ پر گامزن رہی۔

لیکن اسلام کی علمی پیاس کو ایک چیز جدید مغرب سے ممتاز کرتی ہے۔ اسلام نے پہلے دن سے اپنے پیروؤں کو یہ نکتہ سمجھا دیا تھا کہ "رأس الحکمۃ مخافۃ اللہ" (ساری دانائی کا سرچشمہ اللہ کا خوف ہے) مسلمان دنیا کے ہر گوشے سے علم و حکمت کے خزانے سمیٹنے کے لیے بے تاب رہتا تھا۔ اس کی علمی پیاس اور اس کا جذبہ جستجو اسے صحراؤں۔ پہاڑوں۔ دریاؤں اور سمندروں کے پار کھینچے پھرتے تھے۔ لیکن اس ساری تگ و دو کے ساتھ ساتھ اس کے دل کو ایک عجیب نورانی شمع روشن کیے رکھتی تھی۔ وہ تلاش و جستجو کے متوالے ہونے کے ساتھ ہی "یذکرون اللہ قیاماً و قعوداً و علیٰ جنوبھم" کی زندہ تصویر تھے، وہ چلتے پھرتے۔ اٹھتے بیٹھتے اور بستر پر لیٹے ہوئے بھی دلوں کو اللہ کی یاد سے زندہ رکھتے، وہ دن بھر دنیا کے ہنگاموں میں کھوئے رہتے۔ مگر دل کو ایک لمحہ کے لیے بھی اللہ کی یاد سے غافل نہ ہونے دیتے۔

غرض اسلام نے افراد کو ان کے ماحول کے ساتھ جو ہم آہنگی عطا کی وہ کلی طور پر جامع اور مکمل ہم آہنگی تھی ایسی ہم آہنگی جس کے سکون و خوبی میں ذرہ بھر کی کمی نہ تھی۔ اس ہم آہنگی میں ماحول کے ناگزیر عناصر کے ساتھ نباہ بھی شامل تھا۔ اس میں مادی اور معاشرتی ماحول کی تعمیر و تجدید بھی شامل تھی اور اس میں سچائی کی ابدی قوتوں کے ساتھ بھرپور مفاہمت بھی شامل تھی۔ اس ہمہ گیر ہم آہنگی کو دین فطرت اور اسلام کے نام دیے گئے ہیں۔ اسلام جس تہذیب کی داغ بیل ڈالنا چاہتا ہے، وہ کائنات کی طبعی اور معاشرتی اور روحانی قوتوں کے ساتھ مکمل مفاہمت کا مطالبہ کرتی ہے۔ اسلامی تعلیم فرد کو کائنات کے ذرّے ذرے کے ساتھ ہم آہنگ دیکھنا چاہتی ہے۔ اور اس ہم آہنگی کو مکمل سلامتی کا نام دیتی ہے۔ چوں کہ روحانی قوتیں نظام کائنات کے لیے اساس کا درجہ رکھتی ہیں۔ اس لیے اسلام انہیں اولیت کا درجہ دیتا ہے۔ اس لیے وہ صراحت کے ساتھ اعلان کرتا ہے:۔

الا بذکر اللہ تطمئن القلوب (یاد رکھو اللہ کی یاد ہی دل کو سکون بخشنے والی چیز ہے) چوں کہ زندگی کا آخری ماحصل اطمینان قلب کے سوا کچھ نہیں اس لیے اسلام نوع انسان کو بار بار یہ نکتہ یاد دلاتا ہے کہ خالق کائنات کے ساتھ گہرا رشتہ جوڑے بغیر زندگی کی ساری کامرانیاں بے مزہ ہو کر رہ جاتی ہیں اس کا یہ مطلب نہیں کہ اسلام مادی اور معاشرتی ماحول کو نظر انداز کر دینے کے حق میں ہے۔ اسلام اس بات کا سختی سے مخالف ہے کہ روحانی نجات کی دھن میں دنیا کو ٹھکرا دیا جائے۔ حقیقت یہ ہے کہ اسلام کی آمد سے پہلے دنیا کے تمام مروجہ مذاہب دین و دنیا کے ایک ساتھ حصول کو محال قرار دیتے تھے۔ ان سب کے نزدیک روحانی فلاح کے لیے دنیاوی لذات پر لات مارنا ضروری شرط تھی۔ اسلام نے آکر انسانی ذہن کی اس کج فہمی کا ازالہ کیا۔ اس نے موثر اور دلنشین پیرائے میں لوگوں کو سمجھایا کہ من حرم زینۃ اللہ التی اخرج لعبادہ والطیبٰت من الرزق۔ (اللہ کی پیدا کی ہوئی دل کش چیزوں اور پاکیزہ رزق کو بندوں کے لیے کس نے حرام قرار دیا ہے؟) اور اعلان کیا کہ "یہ چیزیں اس زندگی میں مومنوں کے لیے ہیں اور آخرت میں تو کلی طور پر انھیں کا حصہ ہوں گی"۔

اس طرح دین و دنیا کی کامیابی کو ایک جگہ جمع کر کے اسلام نے انسانی فطرت کے تمام معقول تقاضوں کو پورا کر دیا۔ اس نے افراد کے لیے ایسی تعلیم تجویز کی جو نہ صرف مادی اور معاشرتی ماحول پر قدرت عطا کرنے کی ضامن تھی بلکہ اس کے ساتھ ہی افراد کا رشتہ ابدی سچائی کے ساتھ استوار کر دینے والی تھی۔ یہ ایسی تعلیم تھی جو مکمل

اور متوازی ہم آہنگی کے بلند ترین معیار کو پورا کرتی تھی۔ اس تعلیم نے افراد کی نجی اور اجتماعی زندگی کو ایسی متوازن قوت اور ایسا لطیف حسن عطا کیا جس سے بڑھ کر کوئی اور چیز تصور میں نہیں آسکتی۔

ستم ظریفی

اسلامی تعلیم کا یہ بلند نصب العین مدتوں باقی رہا۔ مگر وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یہ متحرک تصور آنکھوں سے اوجھل ہونے لگا۔ اصلاح و ترمیم کی جگہ سکون و جمود کو ملنے لگی۔ بعد میں آنے والی نسلوں نے خیال کرنا شروع کیا کہ طبعی اور معاشرتی ماحول میں جو رد و بدل باپ دادا کر گئے ہیں۔ اس سے آگے قدم بڑھانا سوئے ادب ہے۔ قرون وسطیٰ کے اس دور میں یورپ بھی جمود و سکون کے اندھیرے میں گم تھا۔ اس سے اسلامی دنیا کی خود فراموشی کو اور سہارا ملا۔ رفتہ رفتہ زمانے نے کروٹ بدلی۔ یورپ صدیوں کی نیند سے یک دم جاگ اٹھا اور اس نے مادی اور معاشرتی ماحول پر قابو پانے کے لیے سر دھڑ کی بازی لگا دی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بہت تھوڑے عرصہ میں مغرب مادی فراوانی اور فارغ البالی کے ایسے مقام پر پہنچ گیا جو پہلے کسی اور قوم کو نصیب نہ ہوئی تھی۔

مادی قوتوں پر بے پناہ غلبہ حاصل کر لینے سے مغرب کو عالمی معاملات میں جو غیر مامون بالادستی حاصل ہوئی اس نے باقی دنیا کو اس کے رحم و کرم پر ڈال دیا۔ یورپ کی خالصتہً مادی تہذیب نے اسے جو معاشی اور عسکری قوت عطا کی ہے اس کے بل بوتے پر اس نے ایشیا، افریقہ اور دوسرے براعظموں کے اصل باشندوں کو جاہل اور پسماندہ قرار دے کر انھیں دونوں ہاتھوں سے لوٹا اور انھیں اس طرح اپاہج کر کے رکھ دیا کہ بظاہر ان کے سر اٹھانے کی کوئی امید باقی نہ رہی۔ آخر تاریخ نے یہ ورق بھی الٹا۔ بیسویں صدی کی دو عالمگیر جنگوں نے یورپ کی مادی عظمت کی بنیادیں ہلا دیں اور پسماندہ ممالک کے روندے ہوئے عوام کو سر اٹھانے کی مہلت مل گئی۔

آج ہم صدیوں کی پامالی کے بعد آنکھیں ملتے ہوئے اٹھ رہے ہیں۔ قدرتی طور پر ہم یہ چاہتے ہیں کہ مادی اعتبار سے ہم بھی مغرب کے ہم پلہ بن جائیں۔ یہ خواہش بہت جائز اور پسندیدہ ہے۔ لیکن اس ضمن میں ایک خطرے سے خبردار رہنے کی ضرورت ہے۔ جہاں تک مادی اور معاشرتی ماحول پر قابو پانے کا تعلق ہے۔ مغربی تہذیب سے بڑھ کر تاریخ کی کسی اور تہذیب نے اس میدان میں اس قدر عظیم الشان کامیابی حاصل نہیں کی۔ مغربی تہذیب کی مادی ترقی اس قدر پر ہیبت ہے کہ اس پر جادو کا دھوکہ ہونے لگتا ہے۔ لیکن اس کی ساری عظمت

اور بیت اس کو وہ نرمی اور لطافت عطا نہ کر سکی جو روحانی سکون کی سب سے بڑی دلیل ہوا کرتی ہے۔ مغربی تہذیب کی خشونت بالآخر اس قدر ابھر آئی کہ خود مغرب کو اس کے علاج کی تلاش ہوئی۔ آج مغرب کوشاں ہے کہ سائنس اور ٹکنالوجی کے کرشموں کو روحانی لطافت کے امتزاج سے کائناتی حسن عطا کرے، وہ اس کوشش میں مذہب کی طرف رجوع کرنے پر مجبور ہو رہا ہے۔ وہ اپنے سیکولر نظام تعلیم کے لیے مذہب کو محور قرار دینے کی فکر میں ہے۔ وہ ماحول کے ساتھ ہمہ گیر ہم آہنگی حاصل کرنے کے لیے عبادات کا سہارا ڈھونڈ رہا ہے۔ روحانی قدریں جو بے کار سمجھ کر ردی کی ٹوکری میں پھینک دی گئی تھیں۔ از سر نو زندہ کی جا رہی ہیں۔ تعلیمی ادارے یہ کوشش کرنے لگے ہیں کہ تعمیر کردار میں روحانی قدروں کو مرکزی نقطہ بنائیں۔ وہ نوجوان طلبہ اور طالبات کے دلوں میں ان قدروں کے ساتھ والہانہ جذباتی لگاؤ پیدا کرنے کی فکر میں ہیں تاکہ سائنس اور ٹکنالوجی سے پائدار اطمینان حاصل کیا جا سکے۔

اس مقابلے میں ہم مغرب کی مادی چمک دمک سے اس قدر مرعوب ہو چکے ہیں کہ ہم نے اسی کو زندگی کا آخری ماحصل قرار دے دیا ہے۔ ترقی پسندی کی دھن میں ہم اپنے اخلاقی اور روحانی ترکہ کو روند کر بھی مادی ترقی کی منزل پر پہنچنا چاہتے ہیں۔ تاریخ کی یہ عجب ستم ظریفی ہے کہ جس قوم نے نوع انسان کو دین و دنیا کی ہم آہنگ ترقی کا راستہ دکھلایا تھا۔ آج وہ دین کو دنیاوی ترقی میں مزاحم خیال کرنے لگی ہے۔ جہاں دوسرے اپنی مادی ترقیوں کو روحانی زندگی بخشنے کی فکر میں ہیں۔ ہمیں اپنی دنیاوی زندگی کو بے روح بنا دینے میں باک نہیں۔

یہ صورت حال تشویش سے خالی نہیں۔ اسلام فطرت کا راستہ ہے۔ وہ اعتدال اور میانہ روی کا راستہ ہے۔ وہ جہاں دنیاوی نعمتوں سے بھرپور فائدہ اٹھانے پر زور دیتا ہے وہاں اس بات کی تلقین بھی کرتا ہے کہ کہیں دنیا کی کشش تمہاری روحوں کو مردہ کر کے نہ رکھ دے۔ مادی فراوانی اور روحانی تر و تازگی اسلامی تعلیم کے دو یکساں اہم امتیازی نشان ہیں۔ جن لوگوں کی مثال ہمیں ترقی پسندی پر ابھار رہی ہے۔ آج انھیں خود اپنی اس فروگذاشت کا احساس ہو رہا ہے کہ انھوں نے سائنس اور ٹکنالوجی کی دھن میں روح کی صحت مندی کو نظر انداز کر دیا اور اس طرح ایک ناقابل تلافی نقصان اٹھایا۔ ان حالات میں پاکستان کی قومی زندگی کے معماروں پر یہ فرض بڑی شدت کے ساتھ عائد ہوتا ہے کہ وہ مغربی علم و حکمت سے بہرہ ور ہونے کی دھن میں اس بیش قیمت روحانی اور اخلاقی ترکہ کو

نہ کھو بیٹھیں جس کا بدل دنیا کی کوئی نعمت نہیں ہو سکتی۔ اپنے بے مثال روحانی اور اخلاقی ترکہ کو محفوظ رکھنے کے لیے اسلام نے حیات بخش عبادات کے نسخے تجویز کر رکھے ہیں، یہ وہ نسخے ہیں جن کی جادو اثری سے ایک دنیا واقف ہے۔ تاریخ ان کی کیمیا اثری کی گواہ ہے۔ آج کل ہمارے نظامِ تعلیم کی تعمیرِ نو کے چرچے بہت عام ہیں۔ یہ اہم قومی خدمت جن لوگوں کو سونپی جائے انہیں چاہیے کہ اسلامی اخلاق و عبادات کو نصابِ تعلیم کے ہر درجے پر مرکزی نقطہ قرار دیں، تاکہ علمی اور سائنسی ترقی کے ساتھ ساتھ اخلاقی اور روحانی تر و تازگی کا سامان بھی باقی رہے۔

ایک ضروری احتیاط

اس ضمن میں ایک احتیاط بہت ضروری نظر آتی ہے۔ قیامِ پاکستان کے بعد سے "اسلامیات" کے نام سے ایک نیا مضمون حصّہ مڈل تک داخلِ نصاب کیا جا چکا ہے۔ ہائی جماعتوں کے نصاب میں ابھی اس کی گنجائش پیدا نہیں کی گئی۔ لیکن اگر ایسا ہو بھی جائے تو بھی اس سے یہ نہ سمجھ لینا چاہیے کہ سچی اسلامی قدروں کو نصابِ مدرسہ کا محور بنا دیا گیا ہے۔ اسلام کسی نظری فلسفے کا نام نہیں، بلکہ ایک ضابطۂ حیات کا نام ہے۔ اس لیے بچوں یا نوجوانوں کو ہفتے میں دو ایک بار اسلامیات کے سبق پڑھا دینے سے اسلامی قدروں کو کوئی بہت زیادہ تقویت نہیں پہنچتی۔ انہیں طلبہ کی سیرت کا جزو بنانے کی ایک ہی صورت ہے۔ وہ یہ کہ مدرسے کی ساری زندگی میں ان کی حکمرانی نظر آئے۔ اگر چہ بچوں کو اتنا تو بتا دیا جاتا ہے کہ نماز اور روزہ ہر مسلمان پر فرض ہیں اور یہ انسانی اخلاق کو انتہائی بلندی تک پہنچانے کے بہترین ذرائع ہیں۔ مگر بچہ اپنے استادوں اور تعلیمی افسروں کو اوقاتِ نماز میں خوش گپیوں میں معروف دیکھتا ہے اور ماہِ رمضان میں کھلے بندوں سگریٹ کے کش لگاتے دیکھتا ہے۔ یا وہ یہ دیکھتا ہے کہ اسلامیات پڑھانے والے استاد صاحب نماز روزہ کے پابند تو ہیں مگر ان عبادات نے ان کے اخلاق کو کوئی بلندی عطا نہیں کر رکھی ہے تو ایسی حالتوں میں یہ امید رکھنا سراسر خود فریبی ہوگی کہ اسلامیات کی تدریس بچے کے کردار پر کوئی مستقل اثر چھوڑے گی۔

موجودہ سائنسی تہذیب کے دور میں سائنس اور ٹکنالوجی میں اعلیٰ پایہ کی مہارت کا اہتمام کرنا تعلیم کی ایک بڑی ذمہ داری ہے۔ مگر ان جادو اثر آلات سے مفید خدمت لینے کے لیے صحیح قسم کی جذباتی تربیت لازمی شرط ہے۔ انسان کے لیے صرف اتنا کافی نہیں کہ وہ ہر قسم کی مادی قوتوں سے کام لے، بلکہ اس سے زیادہ ضروری ہے کہ وہ ان قوتوں کو کسی بلند مقصد پر لگائے۔ سائنس اور ٹکنالوجی سے بلند مقاصد کے لیے خدمت اسی صورت میں لی جا سکتی ہے جب ان

مقاصد کے ساتھ جذباتی لگاؤ پیدا کیا جا چکا ہو۔ اگر ہم چاہتے ہیں کہ ہمارے بچے اور نوجوان سچی اسلامی قدروں کے ساتھ دلی دل بستگی پیدا کریں تو مدرسوں اور کالجوں کی ساری زندگی کی تعمیر ان قدروں پر ہونی چاہیے۔ سال بھر میں اسلامیات کی ایک چھوٹی سی کتاب پڑھا دینے سے یہ غایت کبھی حاصل نہیں کی جا سکتی۔

برطانوی ماہرین تعلیم نے اوقات مدرسہ میں روزانہ عبادت کا اہتمام کرکے یہ بات قطعی طور پر تسلیم کر لی ہے کہ مذہبی اور روحانی اقدار کی نشوونما کے لیے عبادات مؤثر ترین ذریعہ ہیں۔ ہمیں برطانیہ کی اس مثال سے سبق سیکھنا چاہیے اور اپنے مدرسوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں کی زندگی کو پورے طور پر اسلامی عبادات اور اسلامی ضابطہ اخلاق کے گرد منظم کرنا چاہیے۔ ایسا کیے بغیر اسلامی جمہوریہ پاکستان اس بلند نصب العین کی طرف کبھی پیش قدمی نہ کر سکے گا جس کی خاطر لاکھوں انسانوں نے اپنا خون بہایا تھا، اور جسے حاصل کرنے کے دعوے ہم آئے دن کرتے رہتے ہیں۔

ثانوی مدارج میں ریاضی کا نصاب

فضل محمد خاں (مسلسل نمبر ۷)

(۳) ہندسہ ہمارے موجودہ ریاضی کے نصاب میں ہندسہ کو اتنی اہمیت جو دی گئی ہے اسکی وجہ صرف یہ ہے کہ اس سے ذہنی ضبط پیدا ہوتا ہے۔ اور اس کی افادی حیثیت کو زیادہ اہمیت نہیں دی گئی چناں چہ یہی وجہ ہے کہ نظری ہندسہ سے متعلق مسئلے اچھی خاصی تعداد میں ہمارے ہاں ریاضی کے نصاب میں عام طور پر شامل ہوتے ہیں۔ ان کے علاوہ ہر مسئلہ سے متعلق کافی تعداد میں مشقی سوالات بھی شامل نصاب ہوتے ہیں۔ یہی نہیں بلکہ میٹرکولیشن کے سالانہ امتحان میں بھی ۳۰ نمبر کے مشقی سوالات جیومیٹری کے پرچے میں دیے جاتے ہیں۔

اس سے تو سب کو اتفاق ہے کہ ہندسہ کی تعلیم سے ہندسی سوالوں کے حل کرنے میں دلائل دینا آجاتا ہے اور اس سے ایک فرد کی وہ منطق بہتر ہو جاتی ہے جو ہندسی سوالوں کے حل کرنے میں کارآمد ہے۔ لیکن ماہرین نفسیات اور تعلیم اس امر سے متفق نہیں رہے کہ ہندسہ میں ماہر شخص ہندسی دلائل کے زور سے دیگر غیر ہندسی امور کے حل کرنے میں بھی کامیاب ہو جاتا ہے۔ اوشی اپنی کتاب میں رقمطراز ہے کہ اس میں شک ہے کہ وہ ضبط جو ہندسہ پیدا کرتا ہے، اس سے اقتصادیات یا حیاتیات یا سیاست کے مسائل حل کرنے میں بھی کوئی فائدہ اٹھایا جا سکے (ذہنی ضبط کے نظریے پر ہم کسی پہلی قسط میں مکمل بحث کر چکے ہیں۔ لہٰذا دوبارہ اس پر بحث کرنے کی ضرورت نہیں ہے)

پس چوں کہ ذہنی ضبط کا نظریہ اب رد ہو چکا ہے۔ لہٰذا بچوں کو ایسے مضمون کی تعلیم کے لیے مجبور کرنا جس کی اساس یہ نظریہ ہو صحیح نہیں۔ لہٰذا نظری ہندسہ کو نصاب کا لازمی جزو قرار دینا بھی صحیح نہیں۔ ہندسہ کے ضروری مسائل طلبہ کو بغیر نظری ہندسہ پڑھائے بھی بتائے جا سکتے ہیں۔ پس طلبہ کے لازمی نصاب میں جیومیٹری کا وہ حصہ شامل ہو جانا چاہیے جس کی افادی اہمیت ہو مثلثان منطبق مثلثان۔ متشابہ مثلثان۔ متوازی خطوط ذوار بعۃ الاضلاع۔ مسئلہ فیثا غورث۔ دائرہ۔ رقبہ۔ حجم وغیرہ سے متعلق جو افادی اہمیت رکھنے والے مسائل ہیں

ان کی حقیقت سے طلبہ کو عملی اور تجرباتی طریقوں سے واقفیت دلائی جا سکتی ہے۔ نظری ہندسہ پڑھانے کا واضح نتیجہ جیومیٹری سکھانا نہیں بلکہ ذہنی ضبط پیدا کرنا ہے، چناں چہ وہ طلبہ جن میں ہندسہ سیکھنے کی صلاحیت کم ہے ان کو نظری ہندسہ کی تعلیم سے کوئی لگاؤ نہیں ہو سکتا۔ لہٰذا نظری ہندسہ کو لازمی ریاضی کے نصاب سے خارج کر دینا بہتر ہو گا۔

اس سلسلے میں ضمنی طور پر ان اساتذہ کے تخیلات کا جائزہ بے جا نہ ہو گا جن کا ذکر حساب اور الجبرے کے نصاب پر روشنی ڈالنے کے سلسلے میں کیا جا چکا ہے۔ مجموعی حیثیت سے یہ لوگ ہندسے کے نصاب سے حساب اور الجبرے کے نصاب کی نسبت زیادہ مطمئن تھے، ان کے خیال میں ہندسہ کا نصاب میں شامل ہونا طلبہ کے لیے باعث رحمت ہے اور ہندسہ کی بنا پر بہت سے طلبہ ریاضی میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ لیکن پھر بھی ۵ اساتذہ کی نگاہ میں نظری ہندسہ کا نصاب سے خارج کر دینا بہتر ہے۔ ان کا خیال ہے کہ نظری ہندسہ کا نصاب سے خارج کر دینا بہتر ہے۔ ان کا خیال ہے کہ نظری ہندسہ اختیاری مضمون ہونا چاہیے۔ اور عملی ہندسہ لازمی طور پر پڑھایا جانا چاہیے۔ تین اساتذہ کے نزدیک نظری ہندسہ کا نصاب موجودہ نصاب سے آدھا ہو جانا چاہیے۔ دو اساتذہ کے نزدیک نظری ہندسہ کا ہر وہ مسئلہ نصاب سے خارج کر دینا چاہیے جس کا زندگی سے کوئی تعلق نہیں، چھے اساتذہ کے نزدیک دائرے کے تمام مسائل نصاب سے خارج کرنے کی ضرورت ہے۔ چار کے نزدیک متشابہ مثلثوں سے متعلق مسائل۔ دو کے نزدیک رقبہ کے مسئلے۔ دو کے نزدیک منطبق مثلثوں کے مسئلے۔ دو کے نزدیک جبریہ متماثلات کے ہندسی ثبوت۔ دو کے نزدیک لوکس کے مسئلے اور ایک معلم کے نزدیک متوازی خطوط کے مسئلے نصاب سے خارج کر دینے چاہئیں ان کا خیال ہے کہ طلبہ جبریہ متماثلات، لوکس، رقبہ، متشابہ مثلثات، منطبق مثلثات کے مسئلوں کو بہت کم سمجھتے ہیں اور ان کو صرف رٹ لیتے ہیں۔ تاکہ اگر ان میں سے کوئی مسئلہ امتحان میں آ جائے تو وہ اسے لکھ سکیں۔

علم مثلث (ٹرگونومیٹری) ہمارے ہاں تو کچھ ایسی قدامت پسندی کا عالم ہے کہ جو چیزیں ایک دفعہ نصاب میں شامل کر دی گئی ہیں ان کا نصاب سے خارج کرنا کم لوگوں کو بھاتا ہے، ایسے ہی جو چیز ایک دفعہ نصاب میں شامل نہ کی گئی تو اس کا نصاب میں شامل کرنا بھی مشکل ہو جاتا ہے۔ یہ مثال علم مثلث پر حرف بہ حرف صحیح

عائد آتی ہے۔ چوں کہ علم مثلث جب میٹریکولیشن کا ۱۸۸۲ء میں نصاب بنا تھا، اس میں شامل نہیں کیا گیا تھا۔ لہٰذا اس کا میٹریکولیشن کے نصاب میں شامل کرنا بہت ہی پیچیدہ مسئلہ سمجھا گیا ہے۔ عام لوگ اس مضمون سے خائف ہیں کہ شاید یہ مضمون طلبہ کی سمجھ سے باہر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کو نصاب کا جزو آج تک نہیں بنایا گیا۔ یہ خیال کرنا کہ یہ مضمون طلبہ کی سمجھ سے بالاتر ہے حقیقت پر مبنی نہیں ہے۔ راقم الحروف نے خود اس بات کی پڑتال کی تھی کہ آیا یہ مضمون ہائی سکول کے طلبہ کی سمجھ سے بالاتر ہے۔ حقیقت پر مبنی نہیں ہے۔ راقم الحروف نے خود اس بات کی پڑتال کی تھی کہ آیا یہ مضمون ہائی سکول کے طلبہ کی سمجھ سے فی الواقعی باہر ہے یا نہیں۔ اس نے نویں جماعت کے طلبہ کو مماسی نسبت پر سبق دیا۔ راقم الحروف کے نزدیک علم مثلث میں پہلا سبق یہی ہونا چاہیے۔ اس جماعت کو ابھی آٹھویں سے نویں میں آئے ہوئے چند ہفتے گذرے تھے۔ ان طلبہ کو توضیحی امداد کی مدد سے پہلے مماسی نسبت کا تصور دیا گیا، پھر اس کا بلندی اور فاصلے کے سوالوں میں اطلاق بتایا گیا طلبہ نے اس سبق میں بے حد دلچسپی کا اظہار کیا اور اس کو خوب خوب سمجھا۔ پھر بی۔ ایڈ کے ایک طالب علم کو کسی دوسرے سکول میں یہی سبق پڑھانے کو کہا گیا۔ وہاں بھی طلبہ نے اس سبق میں گہری دلچسپی کا اظہار کیا، اس سے راقم الحروف اس نتیجہ پر پہنچا کہ علم مثلث کے آسان آسان قاعدے جن کا روزمرہ زندگی سے تعلق ہے، اگر ریاضی کے لازمی نصاب میں شامل کر دیے جائیں تو طلبہ کے لیے زیادہ اچھا ہوگا۔ طلبہ ان قاعدوں کو بآسانی سمجھیں گے۔

اکثر ممالک میں ٹرگونومیٹری کے چند قاعدوں کو ثانوی مدارج کی جماعتوں کے ریاضی کے نصاب میں شامل کر دیا گیا ہے۔ مثلاً امریکہ کی اکثر ریاستوں کے آٹھویں جماعت کے نصاب میں مماسی نسبتیں ریاضی کے نصاب میں شامل ہیں۔ علی گڑھ یونی ورسٹی کے ہائی سکول کے ریاضی کے نصاب میں مثلثی نسبتیں چند ابتدائی کلیے اور قائمۃ الزاویہ مثلث کا حل ریاضی کے نصاب میں شامل ہیں۔ بمبئی میں میٹریکولیشن ریاضی کے نصاب میں ٹرگونومیٹری شامل ہے۔ ڈھاکہ بورڈ آف سیکنڈری ایجوکیشن نے ہائی سکول کے لازمی ریاضی اور اختیاری ریاضی کے دونوں نصاب میں ٹرگونومیٹری کو شامل کیا ہوا ہے۔ بورڈ آف سیکنڈری ایجوکیشن لاہور نے ٹرگونومیٹری کا اچھا خاصہ حصہ ٹیکنیکل میٹرک کے ریاضی کے پرچہ ب میں شامل کیا ہوا ہے۔ سنٹرل بورڈ آف ایجوکیشن اجمیر نے

گروہ الف (معاشرتی علوم) کے اختیاری ریاضی کے نصاب میں اور گروہ ب (سائنس) اور گروہ د (ٹیکنیکل) کے لازمی ریاضی کے نصاب میں ٹرگونومیٹری کے کئی قاعدے شامل کر لیے ہیں۔

ٹرگونومیٹری کے چند ابتدائی تصورات کو لازمی ریاضی کے نصاب میں شامل کرنے سے بلندی اور فاصلوں کے سوالات کو حل کرنے میں بے حد آسانی ہو جائے گی، یہ وہ قاعدے ہیں جن کی طلبہ کے لیے بے حد افادی اہمیت ہے اختیاری ریاضی کے نصاب میں چند ایک مزید قاعدوں کو شامل کرنے سے نہ صرف طلبہ کو ٹرگونومیٹری کے علم سے مزید واقفیت ہو جائے گی بلکہ علم ہندسہ کے اکثر لمبے لمبے ثبوتوں والے مسئلے بھی ٹرگونومیٹری کے اطلاق سے آسانی سے حل ہو سکیں گے۔

سوالنامہ جو تجربہ کار ریاضی کے اساتذہ کو بھیجا گیا تھا۔ اس میں ایک سوال یہ تھا کہ کیا وہ لوگ جو اس امر کی سفارش کرتے ہیں کہ نویں اور دسویں جماعت کے ریاضی کے نصاب میں ٹرگونومیٹری کو بھی شامل کر دیا جائے، اگر وہ اس کے حق میں ہوں تو ٹرگونومیٹری کے وہ کونسے قاعدے ہیں جو نصاب میں شامل کیے جا سکتے ہیں۔ ٹرگونومیٹری شامل کرنے کے حق میں ۱۶ معلمین تھے اور ۳۹ اس کے خلاف تھے۔ ان معلمین کے جوابوں کے تجزیے سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ صرف ان قاعدوں کے نصاب میں شامل کرنے کے حق میں تھے جن کی افادی اہمیت ہے، اور جن کا سیکھنا طلبہ کے لیے کوئی دقت پیش نہیں کرتا۔ چناں چہ وہ لوگ صرف مثلثی نسبتوں۔ پیمائش میں ٹرگونومیٹری کا استعمال، قائمہ زاویہ مثلث کا حل۔ بلندی اور فاصلے سے متعلق آسان سوالات اور چند مسئلوں کے کورس میں شامل کرنے کے حامی تھے۔

ریاضیاتی طبیعات چند لوگ اس بات کا اظہار کرتے ہیں کہ ریاضیاتی طبیعات بھی ریاضی کے نصاب کا جزو ہونا چاہیے۔ ان کا خیال ہے کہ اس میں چند باتیں ایسی ہیں جو ہر ایک طالب علم کے لیے مفید ہیں اور جن کا روز مرہ زندگی سے تعلق ہے۔ بالخصوص اس نئے دور میں تو ان کی [illegible] دیت اور بھی بڑھ گئی ہے، جب کہ سب جگہ صنعت و حرفت کو میکانکی شکل دے دی گئی ہو۔ ایسے حالات میں ہمیں بھی اپنے نصاب کو ایسا موڑنے کی ضرورت ہے جس سے وہ طلبہ بھی فائدہ اٹھا سکیں جن کو صنعتی پیشوں میں کام کرنا ہے۔ ایسی حالت میں ریاضیاتی طبیعات کا بہت آسان حصہ ریاضیاتی نصاب میں شامل کر دینا چاہیے۔

ریاضیاتی طبیعات کا کسی بھی ریاضی کے نصاب میں شامل کرنا ایک عجیب سی چیز معلوم ہوتی ہے اور

شاید کسی ملک میں بھی ریاضیاتی طبیعات ریاضی کے لازمی نصاب کا جزو نہیں ہے۔ البتہ کہیں کہیں ریاضیاتی میکانک کو ہائی سکولوں کے نصاب میں ایک اختیاری مضمون کی حیثیت دے دی گئی ہے۔ تقسیم ہند سے قبل میکانک کلکتہ یونیورسٹی میٹریکولیشن کے امتحان کے نصاب میں ایک اختیاری مضمون کی حیثیت سے پڑھایا جاتا تھا۔ ڈھاکہ میں بھی تاحال اس کو اختیاری مضمون کی حیثیت حاصل تھی، گو ۱۹۵۹ء کے امتحان سے اس کو میٹریکولیشن کے امتحان کے نصاب سے بالکل الگ کر دیا گیا ہے۔ ریاضیاتی طبیعات کو ایک الگ مضمون بنایا جائے یا نہ بنایا جائے، ایک الگ مسئلہ ہے جس پر تفصیلی بحث کی یہاں ضرورت نہیں۔ آئیے اب ہم دیکھیں کہ ریاضیاتی طبیعات کو ریاضی کے نصاب کا جزو بنانے میں کیا کیا الجھنیں پیدا ہو سکتی ہیں اور ان کا کوئی تدارک بھی ہے یا نہیں۔ بظاہر تو یہ مسئلہ الجھا سا نظر آتا ہے، مگر یہ مسئلہ اتنا پیچیدہ نہیں کہ اس کا ہمارے سکولوں میں کوئی حل نہ ہو۔ بالخصوص آج کل جب کہ سائنس کا ایک اچھا خاصہ کورس مڈل سکولوں کے نصاب کا کئی سال سے لازمی حصہ بن چکا ہے۔ اور سائنس کے بنیادی اصولوں سے سب کے سب طلبہ کچھ نہ کچھ واقف ضرور ہیں۔ ایسی حالت میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ تجربی طور پر ریاضیاتی طبیعات کے سکون کو ثابت کر دیا جائے اور پھر ان کا اطلاق طلبہ کو بتلا دیا جائے۔

ریاضیاتی طبیعات جس میں زیادہ تر حصہ میکانک کا ہوگا کے ریاضی کے نصاب میں شامل کرنے سے دو الجھنیں تو ضرور پیدا ہوں گی۔ پہلی دقت یہ ہوگی کہ میکانک کی تدریس کے لیے خصوصی تجربہ گاہ کی ضرورت ہوگی جو ہمارے عام سکول اس وقت تک مہیا کرنے کے قابل نہیں ہیں۔ اس تجربہ گاہ میں خصوصی سامان مہیا کرنا ہوگا اور خصوصی فرنیچر۔ عام مدارس اس خرچ کے کفیل نہیں ہو سکتے۔ دوسری دقت یہ ہوگی کہ ریاضی کے مدرسین صرف وہ لوگ بن سکیں گے جو میکانک سے واقف ہوں گے۔ ہمارے ہاں تو اچھے ریاضی کے معلمین کی پہلے ہی کمی ہے اور ریاضی کے اس نصاب کو پڑھانے کے لیے جس میں ریاضیاتی طبیعات بھی شامل ہے بہت ہی کم معلمین مل سکیں گے۔ ایسے نصاب کو تو صرف وہ معلم ہی پڑھا سکتے ہیں جو یا تو بی اے میں ریاضی اے اور ریاضی بی پڑھے ہوں یا ریاضی اے اور طبیعات پڑھے ہوں۔ وہ لوگ بھی کام چلا سکتے ہیں جنہوں نے انٹرمیڈیٹ میں طبیعات اور ریاضی پڑھی ہو کیوں کہ یا تو بی اے کے ریاضی کے کورس میں میکانک شامل ہے یا انٹرمیڈیٹ کے طبیعات کے کورس میں۔ ہمارے ہاں ریاضی کے بہت سے معلمین ایسے ہوں جنہوں نے ہائی سکول اور انٹرمیڈیٹ میں

ریاضی پڑھنے کے بعد بی۔ ایڈ میں جاکر ریاضی پڑھانے کی تربیت حاصل کی ہوتی ہے۔ ریاضی اے اور ریاضی بی ایسے کر پاس شدہ گریجوایٹوں کی تعداد جو بی۔ ٹی میں ریاضی پڑھتے ہوں بہت کم ہوتی ہے۔ ایسے ہی ان طلبہ کی تعداد بھی جنھوں نے انٹرمیڈیٹ میں طبیعیات اور ریاضی پڑھی ہوں اور پھر بی ایڈ میں ریاضی پڑھانے کی تربیت حاصل ہو بہت کم ہوتی ہے۔ اس دقت کو دور صرف یوں کیا جاسکتا ہے کہ ریاضیاتی طبیعیات کا حصہ سائنس کے معلمین کو پڑھانے کے لیے کہہ دیا جائے۔ مگر نہ ہی سائنس کے معلمین خواہ مخواہ دوسرے شخص کے مضمون کو پڑھانے کے لیے تیار ہوں گے اور نہ ہی ریاضی کے معلمین یہ چاہیں گے کہ ان کے مضمون کا ایک حصہ دوسرے مضمون کے معلم کو پڑھانے کے لیے دیا جائے۔ اس الجھن کو دور کرنے کا دوسرا حل یہ ہے کہ ٹرگنومیٹری کے دو تین باب بی ایڈ کے ریاضی کے سلیبس میں شامل ہوں۔ ایسے ہی ریاضیاتی طبیعیات کی چند چیزیں بی ایڈ کے نصاب میں شامل کر دی جائیں پھر جو زیر تربیت اساتذہ ریاضی کی تربیت بی ایڈ کلاس میں حاصل کریں گے۔ وہ ریاضیاتی طبیعیات اور اس کی تدریس سے واقفیت حاصل کریں گے۔

دوسری دقت یعنی خصوصی تجربہ گاہ کا مہیا کرنا البتہ ایسی دقت نہیں ہے جو دور نہ کی جاسکتی ہو۔ ہر مدرسے میں ایک سائنس کا کمرہ۔ ایک ڈرائنگ کا کمرہ۔ ایک دست کاری کا کمرہ ہوتا ہے۔ کیوں نہ ہر سکول میں ایک ریاضی کی تجربہ گاہ ہو۔ ابتدائی جماعتوں میں تو ریاضی ایک سائنس ہی مانا گیا ہے۔ لہٰذا اس امر کی ضرورت ہے کہ ریاضی کی تدریس کے لیے الگ کمرہ ہو جس میں ریاضی کی تدریس کا مخصوص سامان ہو اور اس کمرے کا فرنیچر بھی ایسا ہو جس پر لڑکے بیٹھ کر آسانی سے پیمائش کر سکیں۔ فول سکیپ، گن سکیں۔ قینچی سے کاٹ سکیں تو زیادہ مناسب ہوگا اس کمرے کی تو ہر حالت میں تدریس ریاضی کے لیے ضرورت ہے۔ خواہ میکانک ریاضی کے نصاب کا جزو بنایا جائے یا نہ بنایا جائے۔ π کی قیمت معلوم کرنا۔ دائرے کا رقبہ نکالنا۔ بیلن، مخروط، مکعب اور مکعب نما کا حجم نکالنا بیلن کی سطح معلوم کرنا۔ پیمائش کے ذریعے مثلث اور ذوار بعۃ الاضلاع کے خارجہ زاویوں کا مجموعہ معلوم کرنا بمسئلہ فیثاغورث کی تجربی طریقہ سے حقیقت معلوم کرنا، ایسے موضوع ہیں جن کو بغیر تجربہ گاہ کے صحیح معنوں میں پڑھانا موزوں نہیں۔ اگر گورنمنٹ ہائی سکولوں میں ریاضی کے لیے الگ کمرے مہیا کرنے کو کہا جائے اور ان میں ریاضی کی تدریس کا سامان فراہم کر دیا جائے تو نیم سرکاری ادارے بھی گورنمنٹ سکولوں کی فوراً پیروی کریں گے اور

تھوڑے ہی عرصے میں ہر ہائی سکول میں ریاضی کی تدریس کے لیے الگ کمرے مہیا ہو جائیں گے۔

تاہم جب تک یہ پہلی دقت دور نہ ہو، ریاضیاتی طبیعیات کا ریاضی کے نصاب میں شامل کرنا زیادہ مناسب نہیں ہوگا۔ ہاں ایسا ضرور ہو سکتا ہے کہ ریاضیاتی طبیعیات کے کلیوں سے اچھی خاصی واقفیت ہم ریاضی کی دوسری شاخوں کی تدریس کے دوران میں ہم دے سکیں۔ مثلاً قیمت درج کرنے کے باب میں الجبرے کی کتابوں میں ہم ریاضیاتی سے چیدہ کلیے لے کر ان میں قیمتیں درج کرانے کی مشق کرا سکتے ہیں۔ مساوات کے عبارتی سوالوں میں بیرم کے اصول پر چند سوالات لے سکتے ہیں۔ میٹرک نظام کو حساب کی کتابوں کا بطور ایک باب لیا جا سکتا ہے۔

ترقی یافتہ ممالک میں تو ایسا ہو ہی رہا ہے۔ وہاں ریاضیاتی طبیعیات ریاضی کے نصاب کا کوئی الگ جزو نہیں ہے۔ بلکہ وہاں ریاضی سے دوسرے مضامین کو ہر کتاب میں مربوط کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ بلکہ ریاضی کا دوسرے مضامین اور زندگی سے ضبط اگر کسی کتاب میں نہ دیا جائے تو اس کتاب کو معیاری کتاب تصور نہیں کیا جاتا۔ راقم الحروف کو امریکہ کے تعلیمی سفر کے دوران میں چند ریاضی کی کتب کا بغور مطالعہ کرنے کا موقع ملا۔ ان کتابوں میں مساوات پر عبارتی سوالوں کے ابواب میں۔ فاصلہ حرکت، متوازی قوتیں۔ بیرم، مخالف قوتوں کے عبارتی سوالوں کی الگ الگ سرخیاں تھیں۔ ایسے ہی کلیات کے باب میں تھرمامیٹروں کی باہمی تحویل۔ گرتے ہوئے اجسام۔ ہاؤس پاور سے متعلق سوالات درج تھے۔ ایک کتاب میں تو سائنس کے کلیات۔ حرکت پر عبارتی سوالات۔ سنٹی گریڈ، فارن ہائیٹ تھرمامیٹر کا گراف۔ بیرم کا اصول، پنڈولیم کا اصول۔ طول ماسکہ، گرتے ہوئے اجسام کا اصول سب الگ الگ سرخیاں تھیں، اس کتاب میں ۱۴۲ صفحے ایسے تھے جن میں ریاضی کا سائنس سے ربط واضح کیا گیا تھا۔

ہماری ہائی کلاسوں کی ریاضی کی کتب میں بھی اگر یہ جدت پیدا ہو جائے تو اس سے دوہرا مطلب حل ہو جائے گا۔ ریاضی اور سائنس کا ربط اجاگر ہو جائے گا۔ دوسرے ریاضیاتی طبیعیات بھی ایک اور شکل میں ریاضی کے نصاب کا جزو ہو جائے گا۔

نصاب | مندرجہ بالا بحث میں یہ واضح کر دیا جا چکا ہے کہ ریاضی کے نویں اور دسویں درجہ میں دو الگ الگ

نصاب بنانا زیادہ موزوں ہوگا۔ لازمی نصاب اور اختیاری نصاب۔ لازمی نصاب میں صرف وہ موضوع ہوں گے جو طلبہ کی زندگی میں افادی اہمیت رکھتے ہوں۔ موضوعات کی افادیت ہی وہ کسوٹی ہے جس پر کسی مضامین کو نصاب میں شامل کرنے کے لیے ماہرین تعلیم رائے دیتے ہیں۔ یہی وہ اصول ہوگا، جس پر ہم لازمی ریاضی کا نصاب مرتب کریں گے۔

یہ یاد رہے کہ ریاضی کو دو حصوں میں تقسیم کرنے کی سفارش صرف نویں اور دسویں جماعت میں کی گئی ہے۔ آٹھویں جماعت تک سب طلبہ ایک ہی نصاب پڑھیں گے۔ ہمارے ہاں آٹھویں جماعت تک کا ریاضی کا نصاب جس کے بعد نویں اور دسویں جماعت کا نصاب مرتب ہونا چاہیے، ریاضی کی تین شاخوں پر مشتمل ہے اور اس کا خاکہ مختصراً یہ ہے۔

(i) **حساب** :۔ چاروں بنیادی قاعدے۔ کسور عام اور کسور اعشاریہ۔ اکائی۔ فی صد۔ تجارت مفرد۔ تجارت مرکب۔ اوسط۔ نسبت و تناسب۔ اربعہ متناسبہ۔ نفع و نقصان۔ جذر۔ تقسیم باجزاء متناسبہ۔ شراکت تقویم۔ انکم ٹیکس۔ بیمہ و دلالی۔ سود مفرد و سود مرکب۔

(ii) **گھریلو حساب** :۔ مال کھاتہ۔ روزانہ کیش بک۔ ذاتی حسابات۔ گھر مدرسہ اور کمیت کے میزانیے۔

(iii) **الجبرا** :۔ اعداد کی بجائے حروف کا استعمال۔ منفی اور مثبت مقداریں۔ ارکان اور قوت نما۔ جملوں کی جمع اور تفریق۔ خطوط وحدانی۔ اندراج قیمت۔ جملوں کی ایک رکن سے ضرب اور تقسیم۔ سادہ مساوات ثنائی جملوں کی ضرب۔ کلیات $ا^2 \pm 2اب + ب^2 = (ا \pm ب)^2$ اور $(ا + ب)(ا - ب) = ا^2 - ب^2$۔

(iv) **ہندسہ** :۔ مجسمات اور ہندسی اشکال کا تصور۔ زاویوں کا تصور اور قسمیں۔ مثلث اور ذوار بعۃ الاضلاعوں کی بناوٹ۔ پرکار کے ذریعہ زاویے بنانا۔ زاویوں اور خطوط کی تقسیم۔ عمود گرانا۔ مسئلہ فیثاغورث کا اطلاق۔ کلیہ ہیرو کا اطلاق۔ متوازی خطوط۔

(v) **مسطحات** :۔ مربع۔ مستطیل۔ مثلث۔ متوازی الاضلاع۔ ذوزنقہ، اور دائرے کا رقبہ۔ مکعب نما مکعب اور سلینڈر کی جسامت۔ فیلڈ بک۔

لازمی ریاضی کا نصاب

نویں اور دسویں جماعت کے لازمی ریاضی کے نصاب میں وہ موضوع شامل ہونے چاہئیں جو طلبہ نے آٹھویں تک نہ پڑھے ہوں۔ اور جو زندگی میں افادی اہمیت رکھتے ہوں۔ ریاضی کی افادی اہمیت پر کسی پہلی قسط میں مفصل بحث کی جا چکی ہے۔ پس ان جماعتوں میں لازمی ریاضی کا مندرجہ ذیل نصاب شامل ہو جائے تو مناسب ہوگا

حساب (i) مڈل تک کی جماعتوں کے نصاب کا اعادہ۔

(ii) حساب کے وہ سوالات جو طلبہ کو اپنی گھریلو زندگی اور کاروباری زندگی میں کام آتے ہوں مثلاً حساب کتاب رکھنا۔ بل و بیچک بنانا کنبے کا بجٹ تیار کرنا۔ کٹوتی۔ انشورنس

(iii) حساب کے وہ مسائل جو سماجی زندگی سے متعلق ہوں۔ مثلاً راس المال۔ بینکنگ۔ ٹیکس اور ریٹ۔ لگان حصص۔ مبادلہ۔ سرکاری کفالتیں اور قرضے۔ قومی آمدنی۔

الجبرا (i) مڈل تک کی جماعتوں کے نصاب کا اعادہ اور بنیادی اصول۔

(ii) ہم عصر مساواتیں اور ان کے عبارتی سوالات۔ آسان اجزائے ضربی۔ درجہ دوم کی مساواتیں جن میں صرف اجزائے ضربی سے جواب نکالا جا سکے اور ان پر آسان عبارتی سوالات۔ کسور، عاد اعظم اور ذو اضعاف اقل (جن کا دارومدار جبریہ اجزائے ضربی پر ہے)

(iii) ترسیمات۔ گراف کا تصور۔ گراف کی قسمیں۔ شماریات کے گراف۔ کلیوں کے گراف۔ دائرہ گراف۔ موڑ۔ پیچ گراف

تجزئی ہندسہ (i) مڈل تک کی جماعتوں کے نصاب کا اعادہ

(ii) ہندسی اشکال کا ڈیزائن کے کام میں استعمال۔ مشابہ اشکال، اور منطبق اشکال کا روزمرہ زندگی میں استعمال۔ لوکس اور اس کے مسائل کا روزمرہ زندگی میں اطلاق۔ مسئلہ فیثا غورث اور اس کا اطلاق۔

دائرے کے خواص مستطیل۔ اور مربع کے خواص۔ دبیہ وزیب مستطیل۔ خط کی زریں حصوں میں تقسیم اور اس کا اطلاق۔ کثیر الاضلاع کے برابر تکون بنانا۔ تکون کے برابر مستطیل بنانا۔ اور مستطیل کے برابر مربع بنانا

علم مثلث (i) مثلثی نسبتیں اور ان کا اطلاق

(ii) ابتدائی کلیے مثلاً

(a) $\sin^2\theta + \cos^2\theta = 1$

(b) $\sec^2\theta = 1 + \tan^2\theta$

(c) $\sin\theta = \tan\theta$

(iii) قائمہ زاویہ مثلث کا حل۔

مسطحات (i) مڈل تک کے نصاب کا اعادہ۔

(ii) اہرام اور مخروط کی سطح اور حجم۔ یہ واضح رہے کہ متذکرہ بالا نصاب پتھر پر لکیر نہیں ہے۔ ضرورت کے مطابق اس میں ترمیم اور تصحیح ہوتی رہنی چاہیے۔ راقم الحروف کی رائے کہ یہ ہماری موجودہ ضروریات کو پورا کرتا ہے۔ اس سے لڑکوں پر کوئی بوجھ نہیں ہوگا۔ مختصراً اس کے فوائد درج ذیل ہیں۔

(ا) زندگی کے موجودہ دور میں یہ اوسط ذہانت کے بچوں کی ریاضیاتی ضروریات کو پورا کرتا ہے۔

(ب) حساب کے قاعدوں کو بار بار دہرانے پر جو وقت ضائع ہوتا تھا، اس کو بچا لیا گیا ہے۔ حساب میں ان قاعدوں کو شامل کر لیا گیا ہے جو بچوں کے لیے افادی حیثیت رکھتے ہیں۔ مگر آج تک کسی نصاب میں شامل نہیں کیے گئے تھے۔

(ج) الجبرے کے وہ تمام موضوع جن کا روزمرہ زندگی سے زیادہ تعلق نہیں ہے، سلیبس سے خارج کر دیے گئے ہیں۔ ان کی جگہ ان موضوع پر زیادہ زور دیا گیا ہے، جن کی افادی اہمیت ہے۔

(د) تجربی ہندسہ اور مسطحات پر زیادہ زور دیا گیا ہے۔ اس پر قطعی زور نہیں دیا گیا کہ طلبہ رسمی ثبوت یاد کر کے ہندسے کے حقائق سیکھیں۔ ہندسہ کے مسائل کو روزانہ زندگی سے مربوط کرنے پر بہت زیادہ زور دیا گیا ہے۔

(س) علم مثلث کے چند قاعدے جن کا روزانہ زندگی میں استعمال ہوتا ہے شامل کر دیے گئے ہیں اس بات پر بار بار زور دیا گیا ہے کہ نصاب کے موضوع سماجی زندگی سے متعلق ہوں۔

اختیاری ریاضی کا نصاب

اختیاری ریاضی کا مضمون محض ان طلبہ کے لیے ہوگا جن کو یا تو کالجوں اور علمی شعبوں دائروں میں جا کر یا ان کو پڑھنا ہوگی یا جن کو ایسے پیشوں کو اختیار کرنا ہوگا جن کا انحصار ریاضی پر ہے۔ اس کو وہ طلبہ بھی لے سکتے ہیں جن کو ریاضی سے خصوصی دلچسپی ہے۔ پس اختیاری ریاضی کے نصاب میں وہ موضوع شامل کر لیے جائیں جو مذکورہ بالا گروہوں کے طلبہ کے لیے ضروری ہوں۔ اس سلسلے میں ہمیں مندرجہ بالا امور کو مد نظر رکھنا ہوگا۔

(i) نصاب میں ایسے موضوع شامل کرنے چاہئیں جو طبیعیات، کیمیا اور حیاتیات اور نباتات کے مطالعہ میں مفید ہوں۔

(ii) اس میں ایسے موضوع شامل ہونے چاہئیں جو طلبہ کو اس قابل بنا دیں کہ وہ اگر شماریات، مالیات یا معاشیات کا تجربی نفسیات کا مطالعہ کرنا چاہیں تو ان کو ریاضی کے ایسے اصولوں سے واقفیت ضرور ہو جن پر شماریات، مالیات وغیرہ کے مطالعہ کا انحصار ہے۔

پس ایسے طلبہ کے لیے الجبرا میں مزید مشق۔ ہندسہ اور علم مثلث سے کافی واقفیت کی ضرورت ہے۔ پس اس نصاب میں مندرجہ ذیل موضوع شامل کرنے کی ضرورت ہے۔

الجبرا (i) لازمی نصاب کے موضوع۔

(ii) اجزائے ضربی۔ عاد اعظم۔ ذواضعاف اقل اور کسور میں زیادہ مشق۔ جذر۔ قوت نما۔ مقادیر اصم۔ مساوات۔ مفرد اور درجہ دوم میں زیادہ مشق۔ حسابیہ اور ہندسی سلسلے۔ ثنائی حدیوں کو پھیلانا۔ ما یک ۷ کا گراف۔ عبارتی سوالات کا بذریعہ گراف حل۔ لوگارتھم۔ نسبت کے اندراج کرنے میں مزید مشق۔ مساوات کے عبارتی سوالوں میں مزید مشق۔

ہندسہ (i) لازمی نصاب کے موضوع۔

(ii) نقطہ پر کے زاویے۔ متوازی خطوط۔ مثلثاں اور دیگر ہندسی اشکال۔ لوکس۔ دائرہ۔ متشابہ اشکال کے تمام مسئلوں کے نظری ثبوت

(iii) دیے ہوئے امور معلومہ سے مثلثان اور دائرہ کی بناوٹ۔ دائرے کے اندر مخمس اور معشر وغیرہ کا بنانا۔

(vi) ہندسی اشکال کے رقبوں میں زیادہ مشق۔ ہندسی مجسمات کے حجم اور رقبوں میں مزید مشق

علم مثلث (i) لازمی نصاب کے موضوع۔

(ii) زاویوں کی پیمائش کے مختلف طریقے۔

(iii) مثلثی نسبتوں میں زیادہ مشق۔ تکملہ اور تتمہ زاویوں کی مثلثی نسبتوں سے متعلق مسائل۔ صفر، ۳۰، ۴۵، ۹۰، ۱۲۰، ۱۳۵، ۱۵۰، ۱۸۰ درجوں کے زاویوں کی مثلثی نسبتیں۔

(iv) دو زاویوں کے مجموعہ اور فرق سے متعلق سائن اور کوسائن فارمولے۔

(v) مثلثوں کا حل۔

(vi) فاصلے اور بلندیوں سے متعلق سوالات

(vii) لوگارتم

حساب (i) لازمی نصاب کے موضوع

(ii) مئی کاٹنا۔ تجارتی کٹوتی۔ راس المال اور حصص۔ کسوا اعشاریہ میں مختصر طریقوں کا اطلاق۔ سود مرکب میں زیادہ مشق۔ کام اور وقت۔ حوض اور نل۔ گھڑیاں۔ حرکت۔ قاعدہ مسلسل۔ ریل گاڑیوں وغیرہ کے متعلق عبارتی سوالات۔

یہ زیادہ مناسب ہوگا کہ اختیاری ریاضی کے دو پرچے کر دیے جائیں۔ ایک پرچے میں حساب اور الجبرا شامل ہو اور دوسرے میں ہندسہ اور علم مثلث ۔

دیہات میں تعلیمِ سائنس

محمد حسین

تمام بچے خواہ شہری ہوں، یا دیہاتی۔ یکساں قسم کی بنیادی ضروریات رکھتے ہیں، دونوں میں خفیہ صلاحیتیں موجود ہوتی ہیں۔ جن کو اجاگر کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ دونوں قسم کے بچوں میں سوچ بچار کا مادہ بدرجہ اتم پایا جاتا ہے۔ دونوں ہی قسم کے بچوں کو اپنے ماحول میں اپنا مقام پیدا کرنے کے واسطے مختلف قسم کے مسائل درپیش ہوتے ہیں۔ انہیں روزانہ موجودہ دور کی سائنسی دریافتوں کے نتائج سے بہت زیادہ واسطہ پڑتا ہے۔ وہ علم سائنس کے متعلق سوالات سے پُر ہوتے ہیں، روزمرہ کے قدرتی مظاہروں کے مشاہدہ میں آنے سے ان کی نظر میں وسعت اور ذہن میں بالیدگی پیدا ہوتی ہے۔ اپنے گردونواح میں حواس خمسہ کی مدد سے جو کچھ وہ محسوس کرتے ہیں، اس کا صحیح جواب لینے کے خواہش مند نظر آتے ہیں۔ مثلاً جب بادل گرجتے ہیں تو بجلی کیوں چمکتی ہے؟ آتشی شیشہ چیزوں کو کیوں جلا دیتا ہے؟ چاند گرہن اور سورج گرہن کیسے واقع ہوتے ہیں؟ قوس قزح نکلنے کے کیا اسباب ہوتے ہیں؟ شبنم، دھند، کہر، بادل وغیرہ بننے کے کیا اسباب ہیں؟

مندرجہ بالا قسم کے سوالات طلبہ کے ذہنوں پر چھائے ہوتے ہیں، وہ حتی المقدور ذہنی سوچ بچار سے ان کا جواب حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس کے بعد وہ معلم سائنس کی طرف رجوع کرتے ہیں۔

راقم کو شہر اور دیہات دونوں جگہ مضامین سائنس کی تدریس کا موقعہ ملا ہے۔ بلکہ کئی لحاظ سے دیہاتی طلبہ میں جدت اور شوقِ جستجو کو شہری طلبہ کی بہ نسبت کہیں زیادہ ہی پایا۔ شہروں میں جہاں فرصت کے لمحات کم دستیاب ہوتے ہیں اور طلبہ کی توجہ کو ان کی پڑھائی سے ہٹانے کے واسطے بیشتر لوازمات از قسم تھیٹر سینما وغیرہ بھی شہر میں ہی پائے جاتے ہیں۔ برعکس اس کے طلبہ کو دیہات میں بکثرت ایسے مواقع میسر آتے ہیں جو دماغ کو دعوت فکر دیتے ہیں۔

دیہات کی کھلی فضاؤں میں قدرت کے لاتعداد مظاہر ظہور پذیر ہوتے رہتے ہیں۔ جہاں ایک شہری طالب علم بادل۔ دھند، کہر، شبنم، اولے اور موسموں کے تغیر و تبدل پر صرف کتابیں پڑھتا ہے۔ وہاں دیہات کا رہنے والا طالب علم بچشم خود ان کا مطالعہ کرتا ہے۔ مشاہدہ میں آنے سے یہ مظاہر اس کے لیے ایک ان مٹ قسم کی حقیقت بن جاتے ہیں۔ لیکن روزمرہ کے مشکل سائنسی مظاہرات کو سمجھنے کے لیے دیہاتی طالب علم بے بس اور مجبور ہو کر رہ جاتا ہے کیونکہ شہری طالب علموں کی طرح اس کو لائبریریوں۔ عجائب گھروں۔ چڑیا گھروں، تھیٹروں۔ سینماؤں۔ تجربہ گاہوں اور اعلیٰ قسم کی درس گاہوں سے مستفید ہونے کا موقع میسر نہیں آتا۔

جہاں تک تدریس سائنس کا تعلق ہے اس کا دیہات میں خاطر خواہ انتظام نہیں ہوتا۔ سائنس کی کتاب کو مضمون اردو کی درسی کتاب کی طرح پڑھایا جاتا ہے۔ سامان سائنس کی کمی، بعض سکولوں میں تجربہ گاہ کا نہ ہونا۔ فرنیچر کی کمی۔ چند ایک ایسی خامیاں ہیں جو بلاواسطہ یا بالواسطہ سائنس کی عملی درس و تدریس پر اثر انداز ہوتی ہیں۔ غرضیکہ جو سہولتیں حصول علم سائنس کے لیے شہری بچے کے قدم بقدم میسر ہیں وہ دیہات میں ناپید ہیں

علم سائنس اپنی وسعت کے لحاظ سے لاثانی بنتا جا رہا ہے۔ یہ مختلف شاخوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے مثلاً۔ علم کیمیا۔ علم طبیعات۔ علم الابدان۔ علم حیوانات۔ علم نباتات۔ علم ارضیات وغیرہ، علم سائنس کی مشہور و معروف شاخیں ہیں آج کے زمانہ میں اگر کوئی بشر علم سائنس تو کجا اس کی ایک ایک شاخ پر ہی قدرت کاملہ حاصل کرنا چاہے تو ناممکن نہیں تو از حد مشکل ضرور ہے۔

ہمارے ملک کے اکثر دیہاتی مڈل سکولوں میں زرعی سائنس پڑھائی جاتی ہے۔ جبکہ شہری ہائی سکولوں میں علم کیمیا اور علم طبیعات پڑھائی جاتی ہے۔ سائنس کی دوسری متعدد شاخوں کی تدریس ملک کے چند بڑے شہروں تک ہی محدود ہے۔

موجودہ تعلیم سائنس کا مقصد

جو طلبہ دیہاتی مڈل سکولوں میں زرعی سائنس پڑھتے ہیں تعلیم ختم کرنے کے بعد ان کا کچھ حصہ تو تعلیم کو خیرباد کہہ دیتا ہے، باقی ہائی سکولوں میں داخلہ لیتے ہیں۔ جہاں پر انہیں زرعی سائنس کی بجائے کیمیا۔ طبیعات پڑھائی جاتی ہیں، کسی ملک کے نظام تعلیم کا بہترین مقصد یہی ہو سکتا ہے کہ مختلف علوم کی تدریس میں ٹکراؤ پیدا نہ ہو

مڈل تک سیکھی ہوئی تعلیم کا مقصد ختم ہو جاتا ہے۔ کیوں کہ اس کے بعد انہیں بالکل نیا مضمون پڑھنا پڑتا ہے اور جو طلبہ تعلیم ختم کر کے گھر بیٹھ جاتے ہیں وہ بھی کما حقہ طور پر اس سے فائدہ نہیں اٹھانے پاتے۔ جو کچھ وہ حاصل کرتے ہیں وہ صرف کتابی علم ہوتا ہے جس کو وہ امتحان سے فارغ ہوتے ہی بھول جاتے ہیں۔

موجودہ سائنسی مواد جو ہائی سکولوں میں پڑھایا جاتا ہے وہ طلبہ کو کالج میں داخلہ دلانے کی حد تک کے مقصد کو پورا کرتا ہے۔ حالاں کہ کالج میں داخل ہونے والے طلبہ کی تعداد چند فی صد ہوتی ہے۔ اس محدود اقلیت کی خاطر اکثریت کے فائدے یا انجام کو بالکل نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ قومی ضیاع کی مندرجہ بالا دو بڑی اہم مثالیں ہیں، ان کو دور کرنا ابتدائی تعلیم کا اولین فرض ہے۔

ہمارے ملک کی بیشتر آبادی زراعت پیشہ ہے۔ لیکن اس کے باوجود ملک میں غذائی مسئلہ طوالت اختیار کرتا جا رہا ہے۔ ہر سال کروڑوں روپے کے اجناس درآمد کیے جاتے ہیں۔ ہمارے برعکس امریکہ کے ۱۵ فیصد لوگ نہ صرف اپنے ملک کے باشندوں کو غذا مہیا کرتے ہیں، بلکہ فاضل اناج دنیا کے بیشتر ممالک کو بھی برآمد کرتے ہیں۔ اس کی مندرجہ ذیل وجوہ ہیں۔

(۱) امریکہ مشینی ذرائع استعمال کرتا ہے۔ اور ہم زراعت کے پرانے اصولوں پر ہی کاربند ہیں۔

(۲) امریکہ کے کسان علم زراعت سے پوری طرح واقف ہوتے ہیں۔ وہاں کا ایک گریجوایٹ اپنے فارم پر کام کرنا باعث فخر سمجھتا ہے۔ لیکن ہمارے ہاں کسان بالکل ان پڑھ ہیں۔ اگر قسمت سے ان کا کوئی فرد تعلیم حاصل کر لیتا ہے تو کھیتی باڑی کرنا گھٹیا کام سمجھتا ہے۔

(۳) ہر امریکی کی خواہش ہوتی ہے کہ اس کی بدولت قومی آمدنی میں اضافہ ہو۔ خود غرضی کو بالائے طاق رکھ دیتے ہیں۔ اس کے برعکس ہمارے ہاں قومی آمدنی کے مفہوم کو بھی نہیں سمجھا جاتا۔ فاضل غلے کی سمگلنگ کر کے ذاتی اغراض پوری کی جاتی ہیں۔

(۴) امریکہ میں زرعی تحقیق کے لیے بڑے پیمانہ کی تجربہ گاہیں اور درس گاہیں موجود ہیں جو اپنے کسانوں کی ہر وقت مناسب ہدایات سے مدد کرتی رہتی ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ ہمارے ملک میں دو ایک زرعی کالج ہیں، جن میں تحقیق کا کام بھی ہوتا ہے۔ لیکن ملکی ضروریات کے لیے یہ مکتفی نہیں، نہ ہی ان کا عام

کسانوں کے ساتھ رابطہ ہے ، یہ صرف درس و تدریس کا مسئلہ یا تجرباتی پلاٹ چلاتے ہیں۔ عام کسانوں کی واقفیت کے لیے کوئی لٹریچر شائع نہیں کیا جاتا۔

(۵) امریکہ کی وزارت زراعت کسانوں کو کثیر تعداد میں زرعی معلومات پر مشتمل کتابچے شائع کر کے مفت تقسیم کرتی ہے۔ لیکن ہمارا محکمہ زراعت "سیم و تھور جو زمین کو تیزی کے ساتھ زمین کو ناقابل کاشت بنا رہے ہیں" کے موضوع پر بھی کوئی کتابچہ وغیرہ شائع کرنے سے معذور رہا ہے۔

ہمیں زراعت کو ترقی دینے کے لیے زرعی سائنس کی ترقی کو مقدم سمجھنا چاہیے۔ اس میں شک نہیں ہے کہ ہمارے ہاں بھی چند اعلیٰ خصوصیت کی حامل درس گاہیں ہیں لیکن ان درس گاہوں میں تعلیم حاصل کرنے والے ملک کی بڑھتی ہوئی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے ناکافی ہے ان درس گاہوں میں گریجوایٹ ہونے والے طلبہ پڑھتے ہیں لیکن ہمیں تو ان طلبہ کو بھی ذہن میں رکھنا ہے اور ان کے لیے موقع بہم پہنچانا ہے۔ جو صرف مڈل تک تعلیم حاصل کر سکتے ہیں۔ زراعتی ترقی کے لیے ہمیں صرف زرعی افسروں ہی کی ضرورت نہیں بلکہ زرعی کارکنوں کی بھی ضرورت ہے۔ اس ذیل میں آنے والے طلبہ کے لیے زرعی سکول کھلنے چاہئیں۔ ایسے سکولوں کی اہمیت اور بھی زیادہ نمایاں ہو جاتی ہے جبکہ ہزاروں لوگ اس پیشہ کو خیر باد کہہ کر دفتروں کارخانوں وغیرہ میں ملازمت شروع کرنا چاہتے ہیں، اس سے ملک میں بیروزگاری کے دور کرنے میں بھی مدد ملے گی اور زراعت میں ترقی ہوگی۔ طلبہ مضامین کے ٹکراؤ سے بچ جائیں گے۔ ہر چالیس مربع میل میں اس قسم کا ایک سکول قائم ہو۔ اس نصاب میں کتابی علم مناسب اور علمی تجربہ زیادہ ہونا چاہیے۔ یہاں کے فارغ التحصیل طلبہ ملازمت نہ بھی کرنا چاہیں تو اپنے کھیتوں میں کام کر کے قومی آمدنی میں اضافہ کا باعث بن سکتے ہیں ؎

افریقی استوائی خطّہ

خداداد خان

چوں کہ دوپہر ڈھل چکی تھی اس لیے سورج کی حدّت مدھم پڑتی جا رہی تھی، ایسے میں نرم نرم ہوا پتہ دے رہی تھی کہ رات خوش گوار اور ٹھنڈی ہو گی۔ دن بھر چٹیل میدانوں میں ٹرک کی سواری نے مجھے خاصا تھکا دیا تھا۔ لیکن میں مطمئن تھا کہ میری محنت ضائع نہیں گئی۔ میرے کیمرے نے چند خوفناک شیروں کی تصویریں محفوظ کر لی تھیں ——— زیبرے کی لاش سے اپنا منہ اٹھاتے ہوئے وہ شیرنی کتنی ڈراؤنی معلوم ہوتی تھی، اس کے سر پر خون کے دھبے کس قدر خوفناک تھے، اور جب اس نے مجھے گھور کر دیکھا تھا تو میرے بدن کے رونگٹے سیدھے ہو گئے تھے میرا کلیجہ منہ تک آ گیا تھا۔

پچاس گز کے فاصلے پر میں نے کتنے خوفناک منظر کی یہ تصویر لی تھی۔ میں اپنے ساتھی اور دو علاقائی مزدوروں کے ساتھ سیدھا اپنے خیمے میں پہنچا، جو ایک وسیع میدان کے کنارے پر ببول کے درختوں کے پاس تنا ہوا تھا۔ کھلے میدان میں زرد زرد گھاس پڑی سو رہی تھی۔ دائیں طرف گھنا جنگل اپنی خوفناک مخلوق کے ساتھ چپ چاپ کھڑا تھا، اور بائیں ہاتھ کو پہاڑی نالہ بہ رہا تھا جس کے کناروں سے باہر بہت سے پانی کے گڑھے بکھرے ہوئے تھے۔ شام کے دھندلکوں میں قریب کے جنگلی جانور ان گڑھوں پر جمع ہو جاتے تھے۔

ہم چائے کا مزہ لے رہے تھے اور میرے ذہن کے پردے پر دن بھر کے خوفناک منظر ناچ رہے تھے کہ میرے ساتھی نے میرے کندھے کو آہستہ سے دبایا۔

”ہش“ اُس نے انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

میری نگاہوں نے اُس کی انگلی کے اشارے کا تعاقب کیا۔ دو سو فٹ کے فاصلے پر ایک جلوس گذر رہا تھا۔ جنگل کا ”شہنشاہ“ اپنی پوری عظمت اور شان سے جا رہا تھا۔ خدام کی جماعت اس کے جلو میں تھی۔ میں نے اتنے رعب و جلال کا شیر کبھی نہیں دیکھا۔ اس کی موٹی گردن پر کے سیاہ بال اس کو اور بھی زیادہ ہیبت ناک اور

خوفناک بنا رہے تھے، اور اس کے قدم نہایت وقار اور شاہی جلال کے ساتھ اٹھ رہے تھے۔

جلوس نالے کی طرف جا رہا تھا۔ شیر نے ہمیں بالکل نہیں دیکھا۔ یا اگر دیکھا بھی تو اسے ہماری پروا نہ ہوئی تھی، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اسے یہ گمان بھی نہیں ہو سکتا کہ اس کے حدود سلطنت میں انسانی مخلوق بھی کہیں آسکتی ہے۔ اس کے چاروں جانب جنگل کے وہ تمام جانور تھے جو عام طور پر شیروں کی مرغوب غذا ہو سکتے ہیں لیکن وہ تمام جانور شیر کے آگے پیچھے ناچتے اور کلیلیں کرتے ہوئے جا رہے تھے۔ اچھلنے کودنے کے باوجود سارا جلوس چپ چاپ اور پُر امن طریق سے گذر رہا تھا۔ شیر کے آگے تین ہرن ناز و ادا کے ساتھ رقص کرتے ہوئے جا رہے تھے۔ وہ ناچتے ہوئے شیر کے بالکل قریب آ جاتے تھے، اتنے قریب کہ میں انہیں دیکھ کر دم بخود رہ گیا اور سمجھا کہ شاید بھول گئے ہیں کہ ہرن شیروں کی پسندیدہ غذا ہوتے ہیں، وہ اپنے تیز اور تند کھروں سے مٹی اڑاتے ہوئے جا رہے تھے، اور گرد اُٹھ اٹھ کر شیر کی آنکھوں میں پڑتی جا رہی تھی۔ اس جماعت میں چار یا پانچ بارہ سنگوں کے جسم دھوپ میں چمک رہے تھے۔ وہ آپس میں لڑتے ہوئے شیر کے نزدیک آکر اپنے سینگوں سے اس کی ٹانگوں کو چھیڑتے اور اپنی اکڑی ہوئی گُپھے دار دُمیں اس کے مُنہ پر زور زور سے مارتے۔ لیکن شیر تمکنت اور جلال کے ساتھ جا رہا تھا، گویا یہ سب گستاخیاں اسے منظور خاطر ہیں۔

ہم اس منظر کے پس منظر کے متعلق سوچنے لگے۔ ہماری متفقہ رائے تھی کہ شیر ابھی ابھی قیلولہ سے فارغ ہوا ہے۔ نیند کے بعد شیر اکثر پانی پیتے ہیں۔ چناں چہ اس کو نالے کی طرف جاتے ہوئے دیکھ کر باقی جانوروں نے سمجھا کہ شیر اپنی بھوک کی شدت میں نہیں ہے۔ اور ویسے بھی ان کا خیال تھا کہ وہ دن کی تیز روشنی میں ان کا شکار نہیں کرے گا، کچھ یہی وجہ تھی کہ وہ اس کے حضور میں گستاخانہ حرکتیں کر رہے تھے۔ حالاں کہ وہ اس کے پنجے کی ایک ضرب کے محتاج تھے۔

چلتے چلتے شیر یکایک ٹھہر گیا۔ اپنی قوت و عظمت کا احساس دلانے کے لیے اس نے تمام جانوروں کو ایک غضب ناک نگاہ سے دیکھا۔ تمام جانور یک لخت سہم کر پتھروں کی طرح ساکت ہو گئے۔ لیکن شیر نے اپنی نگاہیں پھر رستے پر لگا دیں اور جلوس آگے بڑھنے لگا۔

اس منظر کی تصویر لینا ممکن نہیں۔ تاہم میں نے کوشش کی کہ شاید کچھ کامیابی ہو جائے۔ اس لیے ہم

ٹرک کی طرف بڑھے تاکہ کسی موزوں زاویے پر کھڑے ہو کر اس عجیب منظر کو محفوظ کر لیا جائے۔ لیکن میرے ساتھی نے گاڑی کو اسٹارٹ کیا ہی تھا کہ آواز سن کر تمام ہرن اور بارہ سنگھے چوکڑیاں بھرتے ہوئے بھاگ کھڑے ہوئے۔ شیر نے ان کی مطلق پرواہ نہ کی اور اسی سنجیدگی سے بڑھتا گیا، یہاں تک کہ وہ تالاب کے کنارے گردھوں کے گرد جھاڑیوں میں غائب ہو گیا۔ مجھے اس دلچسپ نظارے کی تصویر نہ لے سکنے کا بڑا رنج تھا، تاہم وہ پورا سماں میرے حافظے میں اب تک روشن ہے۔

افریقہ کی اس خطرناک وادی میں میرا یہ تیسرا دورہ تھا۔ میں نے یہاں کے درندوں اور جانوروں کے فہم و ادراک کے علاوہ ہمدردی اور اخوت کے بے شمار واقعات کو دیکھا ہے، ان کے فہم و فراست کی بیسیوں مثالیں میرے سامنے آئیں۔ خطرے کے وقت بارہا ان کو شعور اور تدبیر سے کام لیتے دیکھا۔ ایک روز ہمارا ٹرک ریت کے وسیع میدان سے گزر رہا تھا کہ میری نگاہ ایک شتر مرغ پر پڑی جو انڈوں پر بیٹھا ہوا تھا۔ مادہ شاید خوراک کی تلاش میں کہیں باہر تھی، جوں ہی ہم اس کے قریب پہنچے شتر مرغ بے چین ہو کر بھاگا۔ اس کا ایک بازو نیچے جھکا ہوا تھا۔ گویا ٹوٹ کر بے کار ہو گیا ہے۔ وہ لنگڑاتا ہوا، اس طرح جا رہا تھا کہ شاید زخمی ہے اور اس کو آسانی سے پکڑا جا سکتا ہے۔ حالاں کہ نہ تو وہ زخمی تھا اور نہ ہی اس کا بازو بیکار تھا، بلکہ محض اس کی چال تھی جو ہماری توجہ کو گمراہ کرنے کے لیے تھی کہ اس کے انڈے ہماری دست برد سے بچ سکیں یہ انڈے ریت پر بے ترتیب سے پڑے تھے، انہیں گھاس میں اچھی طرح چھپایا بھی نہیں گیا تھا۔ ان میں ایک انڈا پہلے ہی ٹوٹا ہوا تھا اور اندر کا بچہ باہر نکلنے کی کوشش میں مر چکا تھا۔ میں نے اندازہ لگایا کہ باقی انڈوں سے بچے نکلنے کے قریب ہی ہیں۔ چوں کہ دن ڈوب رہا تھا، اس لیے انڈوں سے بچے نکلنے کی تصویر لینا ممکن نہیں تھا، دوسرے روز ہم سویرے ہی پہنچ گئے۔ اب کہ مادہ انڈوں کی خبر گیری پر مامور تھی جو ہمیں دیکھتے ہی بھاگ اٹھی، اس نے بھی اپنی رفتار سے یہی ظاہر کرنے کی کوشش کی کہ وہ شدید زخمی ہے اور اس کا پکڑنا نہایت آسان ہے، اور جب اس نے دیکھا کہ ہم اس کے تعاقب میں نہیں ہیں تو وہ کچھ دور جا کر ٹھہر گئی اور دیکھتی رہی کہ ہم کیا کرتے ہیں۔ میں نے فوراً کیمروں کو انڈوں پر جما دیا، اور بچوں کے برآمد ہونے کا انتظار شروع ہو گیا۔ مجھے خیال تھا کہ شاید اس منظر کشی کے لیے کئی روز منتظر رہنا پڑے گا۔ لیکن قدرت نے کچھ

ایسی مدد کی کہ ایک ہی گھنٹے کے بعد ایک انڈے سے ٹِک ٹِک کی آواز آئی۔ اور وہ آہستہ آہستہ ہلنے لگا۔ انڈے کا چھلکا باہر آنے کی کوشش میں تھا۔ اور وہ زندگی اور آزادی کے لیے تگ و دو میں مصروف تھا۔ تھوڑی دیر گزری تھی کہ چٹاخ کی آواز پیدا ہوئی، اور ایک لمبا سا سر اور گردن باہر نکلی۔ چوزے نے دھوپ کی تیزی میں فوراً آنکھیں میچ لیں، ابھی اس کا باقی جسم انڈے کے اندر ہی تھا، جسے باہر کھینچنے کے لیے وہ برابر زور لگا رہا تھا۔ آنکھیں بند کیے ہوئے وہ انڈے کے خول پر ٹھونگے مارے جاتا تھا۔ تاکہ اپنے جسم کو نکالنے کے لیے راستہ فراخ کر سکے۔ اس نے اس کوشش میں دو ٹکڑے توڑ بھی ڈالے، لیکن وہ ابھی خول میں جا بیٹھا تھا، گویا کسی ڈوری سے بندھا ہوا ہے۔ وہ بار بار اِدھر اُدھر سر ہلاتا اور زور لگاتا اور اپنے چھوٹے سے جسم کو دائیں بائیں پھیرتا اور باہر کھینچتا تھا۔ اس مسلسل کوشش میں وہ بے حال ہو جاتا لیکن پھر تازہ دم ہو کر نئی کوشش شروع کر دیتا۔

اور آخرکار وہ کامیاب ہو ہی گیا اور ''[illegible]'' سے باہر آ پڑا۔ چند لمحوں تک وہ گرم ریت پر تڑپتا رہا۔ اس کا جسم بھیگا ہوا تھا۔ کچھ دیر وہ بے تاب سا رہا۔ لیکن جسم خشک ہونے پر اس نے پاؤں پر کھڑا ہونے کی کوشش کرنی چاہی۔ مگر اس کی ٹانگیں اس کا ساتھ نہیں دیتی تھیں وہ گر پڑا، اور اس کی چونچ اور آنکھیں ریت میں ڈوب گئیں۔ اس نے پھر اٹھنا چاہا۔ اس کی کوشش میں غصہ اور استقلال سا معلوم ہوتا تھا۔ اب کے وہ پھر کھڑا ہوا، لیکن کھڑے ہوتے ہی بے دم سا ہو کر گرا۔ اسی طرح وہ بار بار اٹھتا اور بار بار گرتا، اس کی ہمت برابر جاری تھی۔ گویا اسے معلوم تھا کہ ہمت اور کوشش پر ہی اس کی زندگی کا انحصار ہے .... دس منٹ کی لگاتار محنت کے بعد چوزہ سیدھا کھڑا ہو گیا۔ ''ہمتِ مرداں مددِ خدا''

میں اس کی درازی عمر کی دعائیں دیتا ہوا رخصت ہوا۔

افریقہ میں دلچسپ مخلوق کی کمی نہیں ہے۔ آپ اپنے سفر میں تلاش اور تجسس کے بغیر اسے ہر کہیں دیکھ سکتے ہیں، اور یہ ضروری نہیں کہ ایک نڈر شکاری یا جانباز سیاح کی طرح آپ اس کا کھوج لگاتے پھریں۔ بلکہ افریقہ کی سرزمین پر یہ چیزیں ازخود ہر جگہ پیش کرے گی۔ آپ کو نہ صرف عجیب و غریب جانور نظر آئیں گے، بلکہ آپ کو ان کے اطوار اور عادات کے مواقع بھی ملیں گے۔ میں نے دیکھا ہے کہ اذیت اور مصیبت میں جانور کس شدت سے ہمدردی اور مدد کے منتظر رہا کرتے ہیں۔ مجھے وہ زیبرا اب تک یاد ہے۔ جو مایوس اور کھویا ہوا سا پھر رہا تھا۔ اسے دیکھ کر میں

سمجھا کہ وہ اپنے ہمراہیوں سے بچھڑا ہوا ہے۔ وہ بیمار اور زخمی سا نظر آتا تھا۔ جونہی اس نے ہمیں دیکھا ٹھہر گیا اور ہماری طرف دیکھنے لگا۔ اس کی آنکھوں سے حسرت اور مایوسی صاف ظاہر ہو رہی تھی۔ زیبرے موٹر یا ٹرک کی آواز سے بدک جایا کرتے ہیں۔ اس لیے ہم ذرا آگے بڑھ گئے اور ٹرک کو کھڑا کر دیا، لیکن زیبرا بھاگنے کی بجائے آہستہ آہستہ ہماری جانب بڑھنے لگا اور ڈرتے ڈرتے ہمارے نزدیک آگیا۔ خوف سے سہم کر ٹھہر بھی جاتا، لیکن ہمیں بے حس و حرکت دیکھ کر پھر چل پڑتا، اور آخر ہمارے قریب آکر ٹھہر گیا، جیسے مدد کے لیے التجائیں کر رہا ہے۔ اس کی ٹانگیں کانپ رہی تھیں۔ افسوس کہ اس کی زبان ہم نہ سمجھ سکے اور بے چارے کی کوئی مدد نہ کر سکے۔ ہمارا ٹرک چل پڑا۔ کوئی ایک میل کے فاصلے پر جنگلی کتوں کا ایک غول ہماری طرف بڑھتا ہوا آ رہا تھا۔ انہیں دیکھ کر مجھے فوراً زیبرے کا خیال آگیا، کہ یہ اس کی بو پاتے ہی اس کا گوشت نوچ لیں گے اور اس کی انتڑیاں باہر کھینچ لیں گے۔ ہم نے ٹرک کو پیچھے موڑا۔ اور پھر وہیں پہنچ گئے۔ زیبرا وہیں غمزدہ سا پھر رہا تھا۔ ہمیں دیکھ کر اس کے قدم تیز ہو گئے اور وہ ہماری طرف بڑھنے لگا۔ میرے ساتھی نے اس کے ماتھے میں گولی مار کر اس کو بیماری کی اذیت اور کتوں کے خوف سے نجات دلائی۔

بہت سے جانوروں کو اپنے ہم جنسوں کے حق میں بہت کم احساس ہوتا ہے، اور وہ ان کے حق میں خاصے ظالم ہوتے ہیں لیکن بعض اوقات میں نے معاملہ اس کے برعکس بھی دیکھا ہے۔ ایک شیرنی دوسری شیرنی کے بچوں کی اس کی غیر حاضری میں نگہداشت کرتی ہے۔ ہاتھی اپنے زخمی بھائی کو حفاظت کے مقام تک پہنچنے میں مدد دیتا ہے، وہ اکثر بڑی دور سے آکر اس مقام پر انتہائی درد کے ساتھ آہ و زاری کرتا ہے، جہاں اس کا کوئی بھائی مرتا ہے۔ گوریلا رات کو اپنی بیوی اور بچوں کو درخت کے اوپر محفوظ کر کے خود درخت کے نیچے چوکنا ہو کر لیٹتا ہے۔ میں نے جانوروں میں ہمدردی اور اخوت کے بیسیوں نمونے دیکھے ہیں جن کے میں نے فوٹو بھی لیے۔

ایٹوری کے جنگل کی وہ شام کتنی دلچسپ اور عجیب تھی، جب لبو نے جلشی شام کو اپنے شکار سے کامیاب واپس لوٹے تھے۔ ان کے شکاری کتے ان کے آگے آگے دوڑ رہے تھے۔ ان کتوں کے گلوں میں بندھی ہوئی چھوٹی چھوٹی گھنٹیاں آہستہ آہستہ بج رہی تھیں۔ ٹیالی اور بھوری چمڑی والے لپست قد شکاری ناچتے اور گاتے ہوئے گاؤں میں داخل ہوئے، وہ اپنی چھوٹی چھوٹی کمانیں گھما رہے تھے، اور تیروں سے

باربار ہرن کی طرف اشارہ کرتے تھے جسے انھوں نے آج شکار کیا تھا۔ عورتیں اور بچے ان کے گرد جمع ہو گئے تھے۔ رات کو انھوں نے ایک دعوت رچائی اور صبح تک ناچنے اور گانے میں مصروف رہے اور ایک پل بھر میری آنکھ نہ لگنے دی۔

مجھے جو کچھ کہنا ہے وہ یہ ہے کہ افریقہ میں سب کچھ ہے۔ ہاتھی سے لے کر مچھر تک کو آپ کی ملاقات کا انتظار ہے۔ لیکن افریقہ کی تاریخ آہستہ آہستہ بدلتے بدلتے جدید دور میں داخل ہو رہی ہے۔ اب افریقہ میں دور دراز جنگلات اور صحراؤں کے چھوٹے چھوٹے شہروں میں وہ خموشی اور سکوت نہیں رہا جو چند سال پیشتر ان پر مسلط تھا، اب ان میں شور اور ہنگامے آ گئے ہیں۔ نیکٹریوں اور دکانوں کی بہتات بھی پیدا ہو گئی۔ لیکن یہاں کے تمدن اور معاشرت میں ابھی نسلی امتیازات کا اثر بہت گہرا ہے، جو خاصا دور رس معلوم ہوتا ہے۔ گورے اور کالے کے مدارج بالکل جدا ہیں، اور ان کے درمیان سخت اختلافات قائم کر دیے گئے ہیں۔ یہاں کے دور ماضی کی تاریخ امریکہ کی تاریخ کے عین مطابق ہے۔ سفید لوگوں نے یہاں کے غیر مہذب اور سیاہ فام باشندوں کو دور ویران علاقوں کی طرف دھکیل دیا تھا۔ اور ان سے میدانی علاقے چھین کر وہاں زرعی فارم آباد کر لیے ہیں۔

تاریخ کے اوراق الٹتے جائیے۔ ہزاروں سال پیشتر کی افریقی زندگی قدیم زمانے کے ظروف اور پتھروں کے کتبوں میں جھلکتی ہوئی نظر آئے گی۔ افریقہ کا قدیم انسان جسے آدم کی صحیح نسل خیال کیا جاتا ہے۔ اب بھی اپنی اُسی پہلی حالت میں موجود ہے۔ میرا مطلب گوریلا سے ہے۔ لیکن پرانی دنیا جلد جلد سکڑ رہی ہے۔ سائنسی ایجادات زمین کی وسعتوں کو نگل رہی ہیں۔ سڑکوں ریلوں اور ہوائی راستوں نے پہنائے کائنات کو تنگ کر دیا ہے۔ اور شرق کو مغرب کے بُعد کو مٹا دیا ہے۔ میں نے اٹھارہ سال میں تین بار افریقہ کا سفر کیا ہے اور میں نے یہ محسوس کیا ہے کہ افریقہ کا ماضی حال سے بڑی سرعت کے ساتھ دبتا چلا جا رہا ہے، اور ماضی کے نقوش حال کے پردوں میں چھپتے جا رہے ہیں۔ یہاں کے قدرتی مناظر کی دلچسپیاں آہستہ آہستہ مٹ رہی ہیں بلکہ یہاں کی مخلوق میں بھی اب وہ دلچسپ اجنبیت کم ہوتی جا رہی ہے جو کبھی پہلے تھی۔ زمانہ جس قدر آگے جا رہا ہے، افریقہ میں بڑے بڑے جانوروں کی تعداد گھٹتی جا رہی ہے۔ دنیا کی ترقی کے ساتھ ان کا خاتمہ ہو رہا ہے۔

دل چسپ حقیقت یہ ہے، کہ گوریلا بھی اب نئی قسم کی زندگی سے متاثر نظر آتا ہے۔ میری سب سے بڑی خواہش یہ تھی کہ میں افریقی دنیا کو جدید اثرات سے متاثر ہونے سے پہلے دیکھ سکوں۔ اس لیے میں نے اپنی سیاحت کے لیے اکثر انہی مقامات کو پسند کیا جہاں ابھی تک انسانی قدم نہیں پڑے تھے، خواہ وہ مقامات کتنے ہی خطرناک کیوں نہ تھے۔ میرے ذوقِ تجسس نے میرے لیے ہر خطرے کو ٹلتے ہوئے دیکھا اور ہر دشواری کو رستے سے ہٹتا ہوا پایا۔

میں نے اپنا پہلا سفر اسی خود اعتمادی کے ساتھ شروع کیا تھا جو ایک مستقل مزاج سیاح میں ہوتی ہے۔ میں نے اکثر تنہا سفر کیا۔ مجھے اپنے ملک کی کسی انجمن یا ادارے کی سرپرستی حاصل نہیں تھی۔ اگرچہ اپنی طرف سے میں نے مکمل طور پر تیاری کی تھی، لیکن افریقہ پہنچ کر مجھے معلوم ہوا کہ میرے پاس بہت سی ضروری اشیاء کی کمی ہے۔ میں نے سفر کے لیے ایک ٹرک کا انتظام کیا، لیکن یہ ٹرک اور دوسرا کچھ سامان جنوبی سوڈان جیوبا کے مقام پر میرا منتظر تھا۔ میرا مطلب یہ تھا کہ جیوبا پہنچ کر یہ چیزیں اپنے ساتھ لے لوں گا، میرے پاس عمدہ اور نئی قسم کے کیمرے اور ہزاروں فٹ لمبی رنگین فلمیں تھیں۔ تجربہ کار لوگوں سے مفید مشورے لینے کے بعد برسات کے آغاز سے بیشتر ہی میں بلجین کانگو، کی طرف چل پڑا۔ لیکن بدقسمتی سے میں نے ایک اور راستہ اختیار کر لیا، اور جیوبا کے بجائے جھیل وکٹوریا کے ہوائی اڈے پر اتر گیا، جہاں برطانوی فضائیہ نے میرے لیے ایک ایسی بڑی دخانی کشتی کا انتظام کیا جو جیوبا کے نزدیک ٹھہر نہ سکتی تھی، کیوں کہ دریائے نیل میں پانی بہت کم تھا، اور میں جیوبا سے تقریباً سات سو میل آگے نکل گیا۔ میرے پاس اب سوائے دو سوٹ کیسوں اور دو کیمروں کے اور کچھ نہ تھا۔ اور باقی سامان جیوبا میں منتظر پڑا تھا۔ اپنے ہوائی سفر میں میں نے کم و بیش ڈیڑھ سو ہاتھیوں کے فوٹو لیے ہوں گے۔ پائلٹ اتنے نیچے پر آ جاتا تھا کہ ہاتھی ٹھیک کیمرے کی زد میں آ جاتے تھے۔ ان ہاتھیوں کی پیٹھ پر سفید سفید بگلے بیٹھے ہوئے ہوتے تو عجیب سماں نظر آتا۔ جہاز کی گرج ان ہاتھیوں اور بگلوں کے سکون میں بُری طرح خلل انداز ہوتی۔ بگلے متوحش ہو کر اُڑ جاتے اور ہاتھی بدک کر چنگھاڑتے ہوئے اِدھر اُدھر گھاس اور نرسل میں چھپ جاتے۔ جھیل وکٹوریا نیا منظر، ایک وسیع علاقے میں اپنی دل کشی کے ساتھ پھیلی ہوئی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ایک نیلے پانی کی چادر دُور دُور تک تنی ہوئی ہے۔

وکٹوریا افریقہ کی سب سے بڑی جھیل ہے، اور دنیا کی بڑی جھیلوں میں اس کا شمار دوسرے نمبر پر ہے، اس کے کناروں پر دور دور تک خلیجیں اور کھاڑیاں سی بنتی چلی گئی ہیں۔ ایک طرف کے وسیع حصے میں دلدل ہی دلدل ہے جس میں نرسلوں کا جنگل کھڑا ہے۔ اس کے کناروں پر سطح سمندر سے تین ہزار فٹ اونچے پہاڑ ہیں جھیل کے اردگرد جھونپڑوں کے بہت سے گاؤں آباد ہیں۔ اس جھیل کو ۱۸۵۸ء میں دریافت کیا گیا تھا۔ اس وقت یہاں آمدورفت کے لیے ایک خاص قسم کے ڈونگے چلتے تھے۔ لیکن ۱۸۹۶ء سے اس میں دخانی جہاز چلنے لگے ہیں۔ میں نے اس کے کنارے پر سے سامنے دیکھا تو دوسری جانب دور افق پر آسمان اور پانی آپس میں ملتے ہوئے دکھائی دیتے تھے۔ برطانوی انتظامیہ کا صدر مقام این ٹیب، جھیل کے کنارے پر ہی واقع ہے جس کے گرد، دور دور تک سبزہ زار اور آموں کے درخت پھیلے ہوئے ہیں، جھیل کے ساحل کے ساتھ ساتھ کنول کے پھولوں کی کشتیاں سی تیر رہی تھیں، جن میں عجیب و غریب قسم کے چھوٹے چھوٹے پرندے خوراک کی تلاش میں پھد کتے پھرتے تھے۔

این ٹیب، میں دو برطانوی نوجوانوں نے مجھے چائے کی دعوت دی۔ یہاں برطانوی افسروں کا کلب بھی ہے۔ یہ مقام گرم خطے میں ہونے کے باوجود آب و ہوا کے لحاظ سے مرطوب ہے۔ یہاں کا ماحول جدید طرز زندگی سے خاصا متاثر ہے۔ اور میں جوان انگریزوں کے ساتھ چائے پیتے ہوئے یہ محسوس نہ کر سکا کہ میں افریقہ کی غیر مہذب دنیا میں ہوں۔ ہم چائے کی میز پر دیر تک باتیں کرتے رہے اور یہ برطانوی جوان ہر پھر کر گفتگو واس موضوع پر لے آتے کہ یہاں خوب صورت عورتیں نہیں ملتیں۔ وہ بار بار یہ شکایت کرتے کہ ان کی آنکھیں سین عورت کو دیکھنے کے لیے ترس رہی ہیں۔ انہوں نے مجھے مشورہ دیا کہ میں جب کمپالا جاؤں تو "سیئر رے" م کے ایک بلجین سے ضرور ملوں۔ وہ کئی سالوں سے کانگو میں کان کنی کا کام کرتا ہے، لیکن اب وہ کسی اور دلچسپ م کی تلاش میں ہے۔ یہ شخص بہر حال تمہارے مفید مطلب ثابت ہوگا۔

مشورے کے مطابق میں کمپالا پہنچ کر "سیئر رے" سے ملا۔ وہ ہلکے اور چھریرے بدن کا نازک اندام خاموش قسم کا آدمی تھا، اس کے ارادوں سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ اپنی موجودہ زندگی سے مطمئن نہیں ہے ، کے پاس ایک پرانی گاڑی بھی تھی جس کے اوپر ٹاٹ کی چھت مڑھی ہوئی تھی، پچھلی سیٹ پر سامان

رکھنے کی جگہ بھی تھی۔ میں نے سیزرسے کو دیکھتے ہی محسوس کر لیا کہ یہ ایک معقول آدمی ہے، اور مجھے سفر میں ایسے ہی آدمی کی ضرورت بھی ہے۔ اور سچ تو یہ ہے کہ میرا یہ قیاس درست ثابت ہوا۔ میں نے سیزرسے سے سفر کے لیے معاہدہ طے کیا اور چوں کہ تھکا ہوا تھا اس لیے جلد ہی سو گیا۔ جس ہوٹل میں میرا قیام تھا وہ جدید فیشن کے بالکل مطابق تھا۔ صبح جب میں بیدار ہوا تو کھڑکی سے ٹریفک کا شور صاف سنائی دے رہا تھا۔ میں نے جھانک کر باہر دیکھا شہر کی عمارتیں اور گھر پہاڑ کی چوٹیوں پر بکھرے ہوئے تھے۔ ایک چوٹی کے اوپر گرجے کی عمارت نمایاں طور پر ابھر رہی تھی۔ میں ہوٹل کی سیڑھیوں سے اترا تو معلوم ہوا کہ ٹریفک کا شور محض سائیکلوں کی وجہ سے ہے، جو پتھریلے رستے میں کھڑکھڑاہٹ سے پیدا ہوتا ہے۔ ان سائیکل سواروں میں زیادہ تر سیاہ فام لوگ تھے جن کا لباس یوروپین طرز کا تھا۔ لیکن وہ پاؤں سے بالکل ننگے تھے۔ انگریزوں کی آمد کے بعد افریقیوں میں سائیکل کا رواج عام ہو گیا کیوں کہ شیر کے خطرے کی صورت میں آسانی سے بھاگا جا سکتا ہے۔ یہاں کی عورتیں مردوں سے بالکل مختلف ہیں۔ ان کے قد لمبے اور اعضا متناسب سے ہیں۔ وہ سڑک پر بھاری بوجھ اٹھانے کے باوجود اپنی رفتار متوازن رکھتی ہیں۔ ان کا لباس نہایت سادہ اور رنگین قسم کا ہوتا ہے۔ رنگین لباس پہننا افریقی عورتوں کی قدیم رسم ہے۔ وہ لمبی سی مایاسی پہنتی ہیں جو چھاتی پر خوب چست اور ملی ہوئی ہوتی ہیں۔ لیکن نیچے جا کر خوب کھلی ہوئی اور ڈھیلی ڈھالی سی ہو جاتی ہے۔ ان کے کندھے ننگے رہتے ہیں جو سورج کی روشنی میں چمکتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ افریقہ کے عام لباس میں اب خاکی کپڑے بھی شامل ہوتے جا رہے ہیں۔

میں جس افریقی قدامت کی تلاش میں گھر سے نکلا تھا، کمپالا میں اس کا نشان تک بھی نہ تھا۔ یہاں تین برطانوی بنک اور کئی دوا فروشوں کی دکانیں ہیں۔ یہاں کی تجارت پر ہندوؤں اور سکھوں کی اجارہ داری ہے جن کی دوکانیں سینکڑوں کی تعداد میں موجود ہیں۔ یہ تمام دوکانیں جدید طرز کی ہیں دراصل کمپالا میں ہر ملک اور مذہب کے لوگ تجارت کرتے ہیں۔ سوتی کپڑا یہاں کی مشہور صنعت ہے یہ شہر ۱۸۶۲ء میں انگریزوں کی آمد سے پہلے ہی جدید رنگ اختیار کر چکا تھا اور انگریزی تسلط کے

کے بعد تو اس کی کایا ہی پلٹ گئی۔ یہاں کی حکومت انگریزوں کے تحت ہے جس کی باقاعدہ اپنی پارلیمنٹ ہے۔ انگریزی قبضے کے بعد یہاں کے تمدن اور معاشرت میں نہایت تیزی سے تبدیلی آگئی ہے اور طریق زندگی میں نئے نئے اسلوب داخل ہو گئے۔ بلکہ سیاہ فام باشندوں کی رنگت میں بھی تبدیلی آنے لگی ہے۔

میں اس جدید تہذیب کی دنیا کو چھوڑنے کے لیے سخت بے چین تھا۔ لیکن سیبزرے کی رائے تھی کہ کچھ روز اور ٹھہرا جائے تاکہ کانگو سے رائفلیں خریدی جائیں۔ میں نے جلد جلد بعض ضروری چیزیں مہیا کرنی شروع کیں۔ مجھے کچھ کپڑے خریدنے تھے، جس کے لیے سیبزرے، مجھے گوا (ہندوستان) کے ایک پرتگیزی کی دکان پر لے گیا۔ یہاں پرتگیزوں کی آبادی کوئی پانچ سو کے قریب ہے۔ چند سال پیشتر یوگنڈا کے ایک افسر نے ایک پرتگیزی عورت سے شادی کر لی تھی۔ اس عورت نے اپنے خاوند سے سفارش کی کہ وہ پرتگیزوں کو کلرک بھرتی کرے۔ خاوند نے اس شرط کو تو منظور کر لیا۔ لیکن یہ سودا بڑا مہنگا ثابت ہوا۔ پرتگیزی اتنے ہوشیار نکلے کہ انہوں نے قلیل عرصے میں ہی تمام تجارت اپنے ہاتھ میں لے لی۔ اس وقت سے کمپالا میں یہ محاورہ عام ہو گیا کہ "خدا بادشاہ کو پرتگیزوں سے محفوظ رکھے"۔ یہ پرتگیز رومن کیتھولک ہیں، اس لیے ہندوؤں اور سکھوں سے بالکل الگ تھلگ رہتے ہیں۔ حالانکہ شہر کے انتظامی امور میں ہندوؤں اور سکھوں کو بہت بڑا دخل حاصل ہے۔

وقت گذر گیا۔ میں نے ضروری سامان جو کچھ ممکن ہوا مہیا کر لیا۔ میں نے رائفلوں کی خریداری کو ملتوی کر دیا جس کا سیبزرے کو کافی رنج بھی تھا۔ یوگنڈا کی خفیہ پولیس کے افسر اعلیٰ کیپٹن رابرٹ نے مجھے اتنے قیمتی مشورے اور ہدایات دیں کہ ان کے بغیر نہ صرف یہ کہ میرا مشن ناکام رہتا بلکہ سفر کے دوران میں میری زندگی بھی خطرے میں رہتی۔ رابرٹ کے پاس افریقہ کے متعلق چند نہایت ہی قیمتی اور خوبصورت تصاویر بھی تھیں۔ اس نے مجھے یہ تصاویر دکھلاتے ہوئے کہا کہ اگر تم چند سادہ سے اصولوں پر عمل کرو گے تو ہر مقام پر خطرے سے بچے رہو گے، چھجے دار ٹوپی پہنے رہو۔ ورنہ لو اور گرمی تمہیں بھسم کر دے گی۔ ہمیشہ ابلا ہوا اور بوتل کا پانی استعمال کرو، تاکہ ٹائیفائڈ اور پیچش سے بچے رہو۔ کونین کی ایک خوراک روزانہ پیو

تاکہ ملیریا سے محفوظ رہو۔ یہاں نیند کی بیماری پیدا کرنے والی مکھیاں بھی ہیں، ان سے ہوشیار رہو۔ اپنے پیروں کو روزانہ دھو کر صاف رکھو، اور رات کو شیروں اور چیتوں کے لیے ہرگز پھندے نہ ڈالنا، اور نہ ان کی گذرگاہوں میں ٹنٹینا۔ رابرٹ نے مجھے یہ بھی کہا کہ یوگنڈا قوم کی لڑکیوں سے دور رہنا ورنہ جنسی بیماریوں سے ہرگز نہ بچ سکو گے۔

ہم کپالا سے مغرب کی طرف افریقہ کے وسط میں پہنچنے والے راستے پر روانہ ہو پڑے۔ سرخ گرد سے اٹی ہوئی سڑک پہ کاریں اور سائیکلیں دھنسی جا رہی تھیں۔ گرد کے دھوئیں زمین سے اٹھ اٹھ کر اڑتے جا رہے تھے۔ صبح روشن اور صاف تھی۔ ارد گرد کی پہاڑیوں کے ڈھلانوں پر سبزہ اور درخت عجیب سماں پیدا کر رہے تھے۔ چند گھنٹوں میں ہم کھلے میدان میں پہنچ گئے۔ ہمارے ایک طرف کپاس کے لمبے لمبے کھیت پھیلتے چلے گئے تھے، دوسری طرف کیلے کے درختوں اور کافی کے پودوں کے جھنڈ نظر آ رہے تھے جوں جوں ہم آگے بڑھتے سڑک تنگ ہوتی جاتی، اور چند ہی منٹوں میں کھیت اور کافی کے جھنڈ ختم ہو گئے۔ اب ہماری آنکھوں کے سامنے زرسل اور زرد زرد گھاس کے میدان تھے۔ تھوڑی دیر میں سڑک نے یک لخت سرنگ کی سی صورت اختیار کر لی تھی۔ راستہ اتنا پیچدار ہوتا چلا جا رہا تھا کہ ہمیں اپنے سامنے سوائے چند گز راستے کے اور کچھ دکھائی نہ دیتا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ہم دو دیواروں کے درمیان سے گذر رہے ہیں۔ میرے دل میں ایک گونہ اطمینان اور مسرت سی پیدا ہوتی جا رہی تھی۔ میں نے کیمرے کو پچھلی سیٹ پر پہلے ہی فٹ کر دیا تھا۔ لیکن یہاں کسی دل کش منظر کا سوال ہی غائب تھا۔ تاہم میں نے اتنا ضرور سمجھ لیا کہ ہم جدید تہذیب کو بہت پیچھے چھوڑ آئے ہیں، اور ہمارے سامنے جنگل کی وہی قدیم زندگی ہے جس کی مجھے تلاش تھی۔

تنگ اور پیچدار راستہ ختم ہو کر جنگل میں داخل ہو گیا۔ جنگل کے ہر موڑ پہ قدم قدم روشنی کے چھوٹے چھوٹے مینار سے کھڑے تھے، جو اندھیرے میں از خود روشن ہو جاتے ہیں، اور جوں جوں اندھیرا زیادہ ہوتا ہے، ان کی روشنی تیز تر ہوتی جاتی ہے۔ ہر نئے راستے کے آغاز پر بھی ایسے روشن نشان کھڑے ہیں۔ ان میناروں کے گرد دس دس فٹ تک روشنی بکھری رہتی ہے، اور جنگلی جانور اس روشنی میں پھرتے ہوئے

صاف نظر آتے ہیں۔

ہم اس گھنے جنگل کو عبور کر کے صاف میدان میں آ گئے۔ جنگلی بطخیں اور سارس آزادانہ اِدھر اُدھر پھر رہے تھے۔ سرکنڈوں کے جھنڈ کے اوپر چھوٹے چھوٹے رنگین پرندے ناچ رہے تھے۔ گھنی اور لمبی لمبی گھاس کے کھیت پھر شروع ہو گئے۔ ہم برابر بڑھتے جا رہے تھے کہ زرد زرد گھاس کے اوپر مجھے کچھ سائے حرکت کرتے ہوئے دکھائی دیے۔ میں نے سیزرے کے کندھے کو دبایا۔ اس نے گاڑی کی رفتار کو دھیما کر دیا۔ گھاس میں ہاتھیوں کا گلہ پھر رہا تھا۔ میں چڑیا گھروں اور سرکسوں میں اکثر ہاتھی دیکھے ہیں، لیکن وہاں قید اور مجبوری میں ان کی فطری حرکات کہاں باقی رہتی ہیں۔ یہ ہاتھی اپنی آزاد دنیا میں انسانی گرفت سے بہت دور تھے۔ ان کی حرکتیں تصنع سے پاک تھیں، اور وہ اپنے اصلی رنگ و روپ میں بڑے دلکش معلوم ہوتے تھے۔ میرے لیے ان ہاتھیوں کی فلم لینے کا نادر موقع تھا۔ ہماری کار رک گئی۔ ہاتھی ہم سے کوئی دو فرلانگ دور ہوں گے۔ لیکن انہوں نے ابھی ہمیں نہیں دیکھا تھا۔ یا اگر دیکھا بھی ہو تو شاید کار کو ایک جانور ہی سمجھا ہو۔ میں نے کار سے باہر نکلنے کی کوشش کی ہی کہ "سیزرے" نے مجھے روکتے ہوئے کہا۔

"ہمارے پاس کوئی رائفل نہیں ہے۔ اگر ہاتھیوں نے حملہ کر دیا تو بچاؤ کیسے ہو گا"

"لیکن ان کے بچے تو ان کے ساتھ نہیں"۔ میں نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔ پریشان ہونے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ میں نے اکثر کتابوں میں پڑھا ہے، کہ جنگلی جانور اس وقت تک مزاحم نہیں ہوتے جب تک انہیں زخمی نہ کر دیا جائے۔ اگر انہیں یا ان کے بچوں کو نہ چھیڑا جائے تو وہ بالکل مقابلہ نہیں کرتے۔ یہ ہاتھی اطمینان سے چر رہے تھے۔ ان کی سونڈیں گھاس سے اس طرح اوپر اٹھتیں گویا سانپ ہیں کہ ناچ رہے ہیں۔ وہ اپنے سونڈوں کو اِدھر اُدھر موڑتے تو ان کے کانوں کے پھڑپھڑانے کی آوازیں صاف سنائی دیتی تھیں۔ میں سیزرے کے اصرار کے باوجود کار سے باہر آ گیا۔ لیکن دل میں رہ رہ کر خیال آتا تھا کہ حادثہ کی صورت میں رائفل کے بغیر مدافعت تو فی الواقع ناممکن ہے۔ دراصل کسی جانور کا شکار کرنا اتنا مشکل نہیں جتنا کہ اس کی تصویر لینا خطرناک ہے اور قریب سے فوٹو لینا تو اور بھی جانبازانہ کوشش ہے۔ جنگل میں بعض شریر قسم کے ہاتھی تو اشتعال کے بغیر بھی حملہ کر دیتے ہیں۔ میں یہی سوچتا ہوا آگے بڑھتا گیا۔ ہاتھیوں سے تقریباً ڈیڑھ سو گز کے فاصلے پر میں نے کیمرے کو

موزوں انداز دیے پر لگا دیا۔ ہاتھیوں کا پورا منظر کیمرے کی صحیح زد میں تھا، اور ہم بغیر کسی حادثے کے کار میں واپس آگئے میں جس قدر خوش تھا سیزرے کی حالت اتنی ہی دگرگوں تھی۔

"ڈرومت سیزرے"۔ میں نے اسے دلاسا دیتے ہوئے کہا۔ میں کبھی خطرے ابن نہیں پڑوں گا لیکن اگر مجھے سو فیصد اطمینان ہو کہ ہم محفوظ ہیں تو میں موقع کبھی ہاتھ سے نہ جانے دوں گا۔ تم بہرحال یقین رکھو کہ میں کسی حال میں بھی تمہاری ہدایت کو نہ چھوڑوں گا"

لیکن وہ کچھ نہ بولا اور بدستور متوحش اور سہما ہوا گاڑی چلا رہا تھا۔ اس نے لرزتی ہوئی آواز میں ان شکاریوں کے واقعات سنانے شروع کر دیے، جو جنگلی جانوروں کو شکار کرتے کرتے خود ان کا شکار ہو گئے تھے؛

"تم نے شاید ایکلے کے متعلق نہیں سنا" اس نے طنزاً کہا۔ وہ کمبخت محض خوش قسمتی سے بچ گیا، ورنہ اس کے ہلاک ہونے میں کچھ کمی نہ رہی تھی"۔

میں نے ایکلے کے متعلق سن رکھا تھا کہ اس کو کیا حادثہ پیش آیا تھا۔ افریقہ میں یہ واقعہ خاصا مشہور ہے بانسوں کے گھنے جنگل میں وہ معجزانہ طور پر ایک ہاتھی کے حملے سے بچ نکلا تھا، اس ہاتھی نے جب ایکلے پر حملہ کرنا چاہا تو اُس نے اس کے دونوں دانت اپنے ہاتھوں میں مضبوط پکڑ لیے، اور ہاتھی کو اپنے زور سے پیچھے دھکیلنا چاہا۔ ہاتھی دانتوں کو چھڑا کر بپھرا۔ اور ہٹ کر ٹکر لگائی۔ ٹکر اگرچہ ایکلے کی چھاتی پر تھی۔ لیکن اس کی چھاتی چونکہ دونوں دانتوں کے درمیان تھی۔ اس لیے ضرب سے محفوظ تھی۔ اب ہاتھی نے سر اٹھا کر ایک اور ٹکر مارنا چاہی، اس دفعہ وہ سخت غصے میں تھا اور پیچھے ہٹ کر اتنے غضب اور جوش سے ٹکر لگائی کہ وہ ٹکر کے ساتھ خود بھی گر پڑا، خوش قسمتی سے ہاتھی کے دانت ایک سخت چٹان سے ٹکرائے اور ایکلے پھر بچ گیا۔ ہاتھی گرتے ہی اٹھ کھڑا ہوا، اور ایکلے کو اسی طرح چھوڑ کر ایک طرف کو چل دیا۔ تھوڑی دیر میں ایکلے کے ساتھی دوڑے دوڑے آئے اور اس کو اٹھا کر کیمپ میں لے گئے۔ جہاں کئی روز کے بعد اس کو افاقہ ہوا۔

"ہاں میں جانتا ہوں کہ ہاتھی ہم پر بھی حملہ کر سکتا ہے"۔ میں نے سیزرے کو بتایا۔ لیکن میں تو محض ان کی تصویریں لینا چاہتا ہوں۔ ایکلے کی طرح انہیں پکڑنا تو نہیں چاہتا۔ ہم کسی ہاتھی کو تکلیف نہیں دیں گے۔ اور ہاں کمپالا میں لوگ تو یہ کہتے تھے کہ اگر آدمی درخت سے لپٹ کر چپ چاپ کھڑا رہے تو ہاتھی پاس سے گذر جاتا ہے،

کیا اس میں تمہیں کوئی شک ہے"؟

"ٹھیک ہوگا" سیزرے نے گھاس کے میدانوں کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔ "لیکن یہاں درخت ہی کہاں ہیں"؟

شام نزدیک آ رہی تھی۔ اندھیرا بڑھتا جا رہا تھا۔ چند موڑ مڑنے کے بعد سامنے سے ہمیں روشنی دکھائی دی۔ سیزرے پر اطمینان کی کیفیت طاری ہوتی جا رہی تھی۔ اور تھوڑی دیر میں ہم پارٹل کے قلعے میں پہنچ گئے۔ پارٹل کے آس پاس کافی کے بڑے بڑے کھیت ہیں۔ رات بسر کرنے کے لیے ہم ریسٹ ہاؤس میں ٹھہر گئے۔ ہمیں بتایا گیا کہ نواحی جنگلوں میں بندر رات بھر شور مچایا کرتے ہیں۔ اس شور میں گھبرانے کی کوئی وجہ نہیں۔ رات کو اس شور و شغب میں مجھے گھبراہٹ تو کیا ہوتی، البتہ میں ایک لمحے کے لیے بھی نہ سو سکا۔ صبح ہونے میں ابھی کچھ دیر تھی کہ مجھے ذرا اونگھ سی آئی لیکن سیزرے نے مجھے جھنجھوڑ کر اٹھا دیا، اور روینزری کے پہاڑوں کی برفانی چوٹیاں دیکھنے کی دعوت دی مجھے معلوم تھا کہ پہاڑ کی چوٹیاں برف سے ڈھکی ہوئی ہیں، اور ان کا دیکھنا ممکن نہیں۔ لیکن میں نے بے خوابی کے باوجود باہر جانا ہی مناسب سمجھا۔ ہم اس وقت خطِ استوا سے پانچ درجے شمال پر تھے۔ روینزری کے پرشکوہ برفانی سلسلہ کوہ پر پندرہ پندرہ ہزار فٹ کی اونچی چوٹیاں ہیں۔ مارگریٹا کی مشہور چوٹی زمین سے سولہ ہزار آٹھ سو چودہ فٹ بلندی پر ہے، جو افریقہ کی سب سے اونچی چوٹی ہے۔ ان تمام چوٹیوں پر برف کی سفید چادریں بچھی رہتی ہیں اور سورج کی روشنی میں ان کا منظر بڑا اداس اداس سا معلوم ہوتا ہے۔ میں دیر تک روینزری کے سلسلہ کوہ کو دیکھتا رہا۔ بطلیموس نے روینزری کا نام چاند کا پہاڑ لکھا ہے، اگرچہ یہ واضح نہیں ہو سکا کہ آیا بطلیموس نے خود ان پہاڑوں کو دیکھا تھا یا نہیں۔ لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ آج سے ہزاروں سال پہلے کے لوگوں نے پہاڑوں کے متعلق جو معلومات اخذ کی تھیں وہ بالکل صحیح تھیں۔ بطلیموس نے جو نقشے تیار کیے تھے، ان میں وسط افریقہ کے ایک برفانی سلسلہ کوہ کی وضاحت ہوتی ہے۔ ان نقشوں میں یہ بھی دکھایا گیا ہے کہ دریائے نیل انہی پہاڑوں سے نکلتا ہے۔ قدیم یونانی علماء کا خیال تھا کہ دریائے نیل برف سے پرورش پائی ہوئی جھیلوں سے نکلتا ہے، اور اس کے بعد عرب جغرافیہ دانوں کا بھی یہی نظریہ تھا۔ لیکن حیرت ہے کہ ان کے بعد کے جغرافیہ دان اس حقیقت کو جھٹلاتے رہے کیوں کہ وہ یہ سمجھتے تھے کہ استوائی خطے کی شدید گرمی میں برفانی پہاڑوں کا تصور ہی ایک دیوانہ پن سا ہے، اور یہ خیال اتنا پختہ ہو گیا کہ جب کبھی یورپین سیاحوں سے افریقہ کے اصلی باشندے ان برفانی

پہاڑوں کے متعلق ذکر کرتے تھے تو وہ سیاح اسے محض وہم سمجھتے تھے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آج سے چند صدی پیشتر یورپ کے لوگ جغرافیہ سے کس قدر بے بہرہ تھے۔ ٹیسلے نے روینزری، کے دامن میں کئی ہفتے تک اپنا کیمپ لگائے رکھا۔ لیکن اسے ان برفانی چوٹیوں کا قطعًا علم نہ ہو سکا۔ کیوں کہ برف اور دھند میں یہ نظر ہی نہ آسکتی تھیں، اور بادلوں نے ان پر پردے ڈال رکھے تھے۔ کئی سالوں کے بعد سٹینلے کو ان چوٹیوں کا علم ہوا، اور آخر ۱۹۰۶ء میں ان کی آخری پیمائش کی گئی۔

افریقہ میں کلیمنجرو، اور کینیا، سب سے اونچے پہاڑ ہیں، مٹی اور پتھروں کے یہ عظیم الشان اور ہیبت ناک تودے اور ماضی میں زمین کے جھٹکوں سے پیدا ہوئے تھے۔ (۱) جھٹکوں سے افریقہ کے شمال میں ایشیائے کوچک تک شگاف پڑتے گئے، خلیج عقبہ، بحیرہ مردار، جردان کی وادی اور خلیج گیلیلی انہی جھٹکوں سے ظہور میں آئے ہیں۔ وسطی افریقہ کے مشرق اور مغرب میں یہ شگاف نہایت گہرے ہیں اور عمیق ترین کھائیاں سی بن گئی ہیں۔ ان کھائیوں کے دونوں کناروں پر ہزاروں میل لمبے پہاڑوں کے سلسلے پھیلتے چلے گئے ہیں، درمیان میں زرخیز زمین اور خوب صورت جھیلیں پیدا ہو گئی ہیں۔ کوہ روینزری بھی انہی پہاڑوں کا ایک سلسلہ ہے۔ اس کا حسن بار بار مجھے اپنی طرف کھینچتا تھا۔ اس کے ڈھلانوں پر نباتات کا حسین منظر اور وہاں کے جنگلی جانوروں کی زندگی میرے لیے کچھ کم باعث کشش نہیں تھی۔ اس پہاڑ پر تیرہ ہزار فٹ کی بلندی تک چیتے ہاتھی جنگلی بھینسے، چمپینزی، سؤر اور قسم قسم کے ہرن دوڑتے پھرتے ہیں۔ اس کے ڈھلانوں پر بانس، پام اور زنا کے بلند قامت درخت کھڑے ہیں۔ چھوٹی نباتات میں جنگلی لالہ، بنفشہ اور کاسنی کے پودے بیس بیس فٹ تک اونچے ہیں۔ گہرے غار، ابلتے ہوئے چشمے اور آبشاریں ایسے مناظر نہیں تھے کہ میں ان سے لطف اندوز نہ ہوتا۔ لیکن مصیبت یہ تھی کہ میں کوہ پیمائی کے فن سے ناآشنا تھا اور پھر روینزری پر چڑھنا یوں بھی فرد واحد کا کام نہیں۔ یہاں تو ساز و سامان سے لیس پوری جماعت کی ضرورت ہے۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ میرے اس سفر میں روینزری کا مطالعہ شامل نہیں تھا۔ بلکہ اس کے بجائے مجھے قدیم افریقی زندگی کے نمونے مثلاً بونے حبشی اور بڑے بڑے جانوروں کی تلاش تھی۔ میرا سب سے بڑا مقصد گوریلا سے ملاقات تھی جو روینزری کے پہاڑوں میں نہیں تھا۔ اس لیے میں نے جلدی جلدی آگے بڑھنے کا فیصلہ کیا۔

کوہ رونیزری کے ساتھ ساتھ جنوب مغرب میں بلجیئن کانگو کی طرف بڑھنے لگے۔ دو ڈھائی گھنٹے کا سفر کرنے کے بعد سڑک کے کنارے بانسو، حبشیوں کا ایک گروہ پھرتا ہوا نظر آیا۔ ان سب کے قد اوسط سے کہیں زیادہ چھوٹے معلوم ہوتے تھے۔

"بونے"؟ میں نے سیزرے سے پوچھا۔

"انہیں باما کہتے ہیں"۔ سیزرے نے بتایا۔ "یہ بونوں ہی کی ایک قسم ہے۔ یہ آج سے کئی برس پہلے مردم خور تھے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ اب تک اپنے دانتوں کو رگڑ رگڑ کر خوب نوکدار اور تیز بنا کر رکھتے ہیں"۔

سیزرے نے مجھے بتایا کہ وسطی افریقہ میں مردم خوری کے واقعات اب بھی اکثر ہوتے رہتے ہیں بعض قومیں تو ایسی ہیں جن میں قدیم سے مردم خوری کا رواج چلا آ رہا ہے۔ ہم ان باماؤں سے باتیں کرنے کو ٹھہر گئے۔ مجھے یہ دیکھ کر بہت خوشی ہوئی کہ سیزرے ان کے ساتھ بے تکلف بول رہا ہے۔ افریقہ میں کم از کم آٹھ سو زبانیں بولی جاتی ہیں، لیکن بیلجئے نے یہاں کی غیر مہذب زبان اور انگریزی کو ملا کر ایک نئی زبان ایجاد کی جس کو "لنگوا فرانکا" کہا جاتا ہے۔ قدیم حبشی اور غیر ملکی آپس میں اسی زبان سے اظہار خیال کرتے ہیں۔ اس نئی زبان میں گرامر اور تلفظ کا کوئی لحاظ نہیں ہے، لیکن سادہ اور آسان خیالات کے اظہار کے لیے اس سے بہتر اور کوئی زبان نہیں ہے، اور سیزرے کو اس پر کافی عبور تھا۔

کسینڈی سے بلجیئن کانگو کی حدود شروع ہوتی ہیں۔ محصول خانے کا افسر سیزرے کا دوست نکل آیا۔ وہ ہم سے دیر تک باتوں میں لگا رہا۔ اس نے میرے سفر کا مقصد دریافت کیا تو میں نے اسے بتایا کہ میرا مدعا محض گوریلوں کی فوٹو گرافی ہے، تو اس نے واضح کیا کہ گوریلوں کی بستی میں جانے والے اپنے پاس کوئی رائفل وغیرہ ہرگز نہیں لے جاتے۔ میں نے سیزرے سے کہا کہ یہ تو بڑا اچھا ہوا کہ ہم نے رائفلیں خریدنے میں جلدی نہیں کی۔

ہم آگے روانہ ہونے کو ہی تھے کہ محصول خانے کے ملازمین نے کہا کہ ابھی ابھی جنگلی بھینسوں اور ہاتھیوں کے دو گلے یہاں سے گذرے ہیں۔ اگر انہیں پا سکو تو ان کی تصویریں تمہارے لیے نہایت قیمتی ہوں گی۔ انہوں نے ہماری رہنمائی کے لیے ایک لڑکا بھی ہمارے ساتھ بٹھا دیا۔ میں نے فوراً کیمرے کو فٹ کیا، اور گاڑی کو تیز چلا دیا ہم لمبی لمبی گھاس پر سے گذر کر دریا کی طرف بڑھ رہے تھے۔ راستہ ایک ڈھلان کے اوپر اوپر جا رہا تھا۔ میں نے

نیچے دیکھا تو کوئی درجن سے زیادہ دریائی گھوڑے بیٹھے دھوپ کھا رہے تھے۔ مجھے اچانک ان کی فوٹو لینے کی سوجھی۔ گاڑی کھڑی کر کے میں آہستہ آہستہ پیٹ کے بل رینگتے ہوئے مناسب زاویے پہ پہنچ رہی رہا تھا کہ سیزرے نے کار میں بیٹھے بیٹھے شور مچایا ——— ایک ہاتھی تھپ تھپ کرتا ہوا ہماری طرف اتر رہا تھا۔ اس کے کان زور زور سے پھڑ پھڑا رہے تھے۔ وہ مجھ سے کوئی دو سو گز دور ہوگا کہ میں دوڑ کر کار میں پہنچ گیا۔ جب سیزرے نے اس کو اسٹارٹ کیا تو ہاتھی کھڑا ہو کر آواز کو توجہ سے سنتا رہا اور پھر ایک جانب چل دیا۔

"دیکھیے اگر ہم انہیں تکلیف نہ دیں تو وہ ہٹ جاتے ہیں" میں نے سیزرے کو آگاہ کرتے ہوئے کہا۔ لیکن وہ بالکل خاموش رہا۔ کسینڈی واپس جاتے ہوئے ہم نے چار ہاتھی زور زور گھاس پہ پھرتے ہوئے دیکھے۔

"ٹھہرو"۔ میں نے یک لخت کہا۔ "ذرا مجھے ان کی تصویر لینے دو"۔ لیکن لڑکے نے فوراً کہا کہ ہاتھیوں نے آپ کو دیکھ لیا ہے۔ سیزرے کی بھی رائے تھی کہ مجھے ایسی کوشش سے باز رہنا چاہیے۔ مگر میں بضد تھا۔ کیوں کہ میرا خیال تھا کہ لمبی لمبی گھاس میں ہاتھی مجھے نہیں دیکھ سکیں گے۔ اس لیے میں دبے پاؤں بڑھتا گیا اور کیمرے کو اس کی سرپائی پر لٹکا دیا۔ ہاتھی پچاس گز کے فاصلے پہ پھول گے اور میں ابھی کیمرے کو متوازن کر ہی رہا تھا کہ سیزرے نے ایک ہاتھی کے متعلق خبردار کیا جو سونڈ اٹھائے میری طرف دوڑا آ رہا تھا۔ میں نے دیکھا کہ ہاتھی کانوں کو زمین کے متوازی پھیلائے آ رہا تھا۔ چوں کہ مجھے ہاتھیوں کی نفسیات سے بہرہ وری نہیں اس لیے میں سمجھ نہ سکا کہ یہ ہاتھی فی الواقع غصے میں ہے یا نہیں۔ میں بھاگ کر کار میں پہنچ گیا۔ سیزرے نے اطمینان کا سانس لیتے ہوئے کہا۔

"تم نے وہ بچوں والی ہتھنی نہیں دیکھی۔ لیکن تم پھر بھی ان کی طرف بڑھے جا رہے تھے"

ہم نے واپس جاتے ہوئے لڑکے کو کسینڈی اتار دیا۔ اور خود بینی کی طرف رخ پھیر لیا۔ سڑک دریائے سملکی کے کنارے کنارے جا رہی تھی بطخیں پانی سے نکل نکل کر کار کے آگے آ جاتی تھیں۔ بالکل اسی طرح جس طرح افریقی لوگ اجنبی لوگوں کے گرد جمع ہو جایا کرتے ہیں۔ ایک جگہ سے ہمیں دریا کو عبور کرنا تھا۔

دریا پر کشتیوں کا پل بندھا ہوا تھا۔ جوں ہی ہم پل کے نزدیک پہنچے بونے حبشی ہمارے گرد جمع ہو گئے وہ ایک ساتھ "ہی۔ اُو۔ ہی اُو" کی آوازیں بلند کر رہے تھے۔ اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ بڑے سوز اور درد میں کوئی گیت گا رہے ہیں۔ ہم دیر تک یہ گیت سنتے رہے۔ بعد میں سیزرے نے اس گیت کا اس طرح ترجمہ سنایا۔

اگر سفید آدمی نے اپنے وعدے کے مطابق ہمیں کچھ نہ دیا تو
ہمارے دل ٹکڑے ٹکڑے ہو جائیں گے اور
ہماری آنکھیں باہر نکل آئیں گی۔
ہمارے پیٹ خالی ہیں۔
اور ان کے اندر سے آوازیں اُٹھ رہی ہیں۔
ہم نے بہت دنوں سے کچھ نہیں کھایا۔
لیکن سفید آدمی ہمیں کھانے کو ضرور کچھ دے گا۔
سفید آدمی کا دل سیاہ ہے۔ وہ ضرور ہم پر مہربانی کرے گا۔"

دوسرے کنارے تک پہنچتے ہوئے گیت ختم ہو گیا، اور میں نے اپنی سیاہ دلی کی لاج رکھتے ہوئے ان بونے ملاحوں کو نقدی کے علاوہ کھانے کی بھی خاص چیزیں ہدیۃً پیش کیں۔

ترجمہ
لوئیس کوٹیو

پھر بھی وہ استاد بننا چاہتے ہیں

عزیز احمد

اصلاح حال کی ایک لازمی شرط اپنی کمزوریوں کا احساس ہے جس شخص کو اپنی کوتاہیوں کا کبھی احساس ہی نہ ہو وہ جنت الحمقا میں دن گذار کر چلا جاتا ہے۔ اصلاح و ترقی کی راہیں اس پر کبھی نہیں کھل سکتیں۔

اپنے پیشے کی کوتاہیوں کا احساس۔ اگر کسی پیشے کو لگاتار ترقی کے مدارج کی طرف لے جا سکتا ہے تو پیشہ معلمی کو اس لحاظ سے بہت خوش نصیب سمجھنا چاہیے کیوں کہ بہت کم پیشے ایسے ہوں گے۔ جہاں بعد میں آنے والوں کو اپنے پیش روؤں کی خامیوں کا اتنا احساس ہو جتنا بننے والے استادوں کو اپنے ایام مدرسہ کے استادوں کی کوتاہیوں کا۔

ایک دلچسپ مطالعہ

اپنے سابق استادوں کے طریقہ ہائے تدریس اور ان کے کام پر رائے زنی ایک عام شے ہے۔ مگر سوال یہ ہے کہ جو لوگ مدرسہ چھوڑنے کے بعد خود معلمی کا پیشہ اختیار کرنا چاہتے ہوں وہ اپنے ایام مدرسہ کے متعلق کیا رائے رکھتے ہیں؟ اس دلچسپ مسئلہ کا مطالعہ یونیورسٹی آف وسکونسن (ریاست ہائے متحدہ) کے دو پروفیسروں نے کیا ہے۔ امریکہ میں ثانوی مدرسے کی میعاد بارہ سال ہے۔ ثانوی مدرسے کا نصاب کامیابی سے ختم کر لینے کے بعد جو طلبہ آگے تعلیم جاری رکھنا چاہیں وہ یونیورسٹی میں چلے جاتے ہیں۔ ان میں سے جو معلمی کا پیشہ اختیار کرنا کرنا چاہیں وہ کالج میں پہلے سال ہی سے عام نصابوں کے علاوہ علم التعلیم کے کچھ نصاب بھی لے لیتے ہیں۔ یہ تعلیمی نصاب رفتہ رفتہ بڑھتے جاتے ہیں۔ تا آں کہ کالج کے آخری سال میں طلبہ کا بیشتر وقت ان ہی نصابوں پر صرف ہوتا ہے۔

زیر نظر مطالعہ ۱۹۴۹ء سے ۱۹۵۳ء تک یعنی کوئی پانچ سال جاری رہا۔ علم التعلیم کے طلبہ کو یونیورسٹی میں داخلہ کے دوسرے ہی دن ایک سوال نامہ دیا جاتا تھا۔ اس مختصر سے سوال نامے میں ایک

سوال یہ بھی تھا: "اب تک آپ مدرسے میں جو تعلیم حاصل کرکے آئے ہیں اس کے متعلق آپ کی اہم تنقید کیا ہے" جواب دینے والوں کی رہنمائی کے لیے اس سوال کے نیچے چند اندراجات دے دیے گئے تھے، تاکہ ان کی روشنی میں جواب کو ایک واضح شکل دی دی جائے۔ ساتھ ہی یہ وضاحت کر دی گئی تھی کہ جو تنقید بھی پیش کی جائے اس کا تعلق قبل از کالج تعلیم سے ہونا چاہیے۔

نمائندہ قسم کے ردِّ عمل حاصل کرنے کے لیے ہر سال داخل ہونے والے طلبہ اور طالبات میں سے ایک نمائندہ گروہ چن کر اس سے سوال نامے کے جواب حاصل کیے جاتے رہے۔ اس طرح کل ۳۶۴ طالبات اور ۱۵۳ طلبہ سے جوابات حاصل کیے گئے۔ ان ۵۱۷ بننے والے اساتذہ اور استانیوں کی کی تنقید کا خلاصہ درج ذیل ہے۔

فی صد تناسب

	موضوعِ تنقید	کل تعداد	طالبات	طلبہ
۱۔	اساتذہ	۳۱٫۶	۳۲٫۴	۳۵٫۵
۲۔	طریقہ ہائے تدریس	۲۹٫۵	۲۹٫۰	۳۱٫۲
۳۔	نصابِ تعلیم	۲۶٫۳	۲۶٫۶	۲۶٫۰
۴۔	تعدادِ طلبہ	۷٫۹	۷٫۴	۹٫۴
۵۔	طریقِ امتحان	۳٫۱	۳٫۵	۲٫۳
۶۔	متفرق	۱٫۶	۱٫۱	۱٫۱

دلچسپ روشنی

مندرجہ بالا نقشہ مسئلہ زیرِ بحث پر بہت دلچسپ روشنی ڈالتا ہے۔ مدرسہ کی تعلیم میں جن چیزوں کو قابلِ اعتراض اور قابلِ اصلاح بنایا گیا ہے۔ ان میں استادوں اور ان کے طریقہ ہائے تدریس کا حصہ تقریباً کل کا دو تہائی ہے۔ نقشے پر ایک نگاہ ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ استادوں، طریقہ ہائے تدریس اور نصابِ تعلیم پر سب سے زیادہ تنقید ہوتی ہے۔ ان میں سے استادوں اور ان کے تدریسی طریقوں کو تقریباً دو تہائی جواب دہندگان نے

قابل اعتراض قرار دیا ہے۔ نصاب تعلیم کو صرف ایک چوتھائی جواب دہندوں نے قابل اصلاح قرار دیا ہے۔ تعداد طلبہ تدریسی خوبی پر گہرا اثر ڈالنے والی شے ہے۔ مگر اس مطالعہ میں اسے چنداں قابل مواخذہ خیال نہیں کیا گیا۔ وجہ غالباً یہ ہے کہ امریکی مدرسوں میں تعداد طلبہ کو موزوں حدوں کے اندر رکھا جاتا ہے، اس لیے گو سارے مدرسے کی تعداد طلبہ خواہ ہزاروں کو پہنچے کسی ایک جماعت میں طلبہ کی بھیڑ کا وہ عالم کبھی نہیں ہوتا جو ہمارے ہاں ایک عام شے ہے۔ لہٰذا تعداد طلبہ کو چنداں قابل اعتراض نہیں گردانا گیا۔

اسی طرح طریق امتحان پر بہت کم توجہ دی گئی۔ مدرسے کے عام مراسم والدین کے ساتھ تعاون اور اس قسم کے دوسرے امور کو جن میں سب کا ذکر ایک سانقہ متفرق کے تحت کیا گیا تھا۔ چنداں اہمیت نہیں دی گئی۔ صرف کوئی دو فی صد جواب دہندوں نے ان کو قابل اصلاح بتایا۔ طلبہ اور طالبات کے جوابوں کی نوعیت میں کوئی قابل ذکر فرق نہیں۔

مطالعہ کرنے والوں نے موصول شدہ جوابوں کا جو تفصیلی تجزیہ کیا ہے۔ اس کا مختصر سا حال نیچے دیا جاتا ہے۔

استادوں پر تنقید:- مدرسے کی تعلیم ختم کر کے کالج میں داخل ہونے والوں نے اپنے سابق استادوں پر جو تنقید کی ہے اس میں سب سے زیادہ شکایت اس بات کی ہے کہ استاد انہیں ذاتی توجہ نہیں دیتے تھے۔ کوئی ایک تہائی جواب دہندوں نے یہ شکایت کی کہ استاد ادنیٰ قابلیت اور غیر مؤثر شخصیت کے حامل تھے۔ صرف کوئی دس فی صد جواب دہندوں نے استادوں کے طریق ضبط پر تنقید کی ہے، اور کہا ہے کہ استاد چھوٹی چھوٹی باتوں میں دخل دیتے تھے۔ یا یہ کہ وہ ناواجب رعایت یا سختی سے کام لیتے تھے۔ جواب دہندوں کی رائے کے مطابق کوئی دس فی صد استاد غیر جمہوری طریقوں سے کام لیتے تھے۔ نیز آٹھ فیصد ایسے تھے جو اپنے متعلقہ مضامین پڑھانے کی اہلیت نہیں رکھتے تھے اور کوئی سات فی صد استاد ایسے تھے جو جوانوں کے مسائل سمجھنے کی صلاحیت نہیں رکھتے تھے۔

طریقہ ہائے تدریس پر تنقید:- طریقہ ہائے تدریس پر سب سے بڑی نکتہ چینی یہ کی گئی ہے کہ یہ عملی قسم کی نہیں تھی۔ اس سے مراد یہ ہے کہ استاد جو کچھ پڑھاتے تھے، وہ بعد میں زندگی میں کام دینے والی چیزیں نہ تھیں اور نہ ہی ان کی مدد سے حالات حاضرہ کا فہم پیدا ہوتا تھا، دوسری بڑی نکتہ چینی

یہ تھی کہ انہیں تعلیمی اور فنی رہ نمائی نہیں پہنچائی گئی۔ تیسرا اعتراض یہ تھا کہ کمرۂ جماعت میں ایسا کام نہیں کرایا جاتا تھا جو جذبۂ عمل کو جھنجوڑ کر جگا سکنے والا ہو۔ کوئی چودہ فی صد جواب دہندوں نے شکایت کی یہ انہیں مؤثر مطالعہ کی عادات نہیں سکھائی گئیں۔ تقریباً اتنی ہی تعداد نے یہ شکوہ کیا کہ انہیں طوطے کی طرح رٹنے پر مجبور کیا گیا اور بولنے اور لکھنے کے کام کو نظرانداز کیا گیا۔

نصاب پر تنقید

اگرچہ طریقہ ہائے تدریس اور مندرجات نصاب کے درمیان بہت سی باتیں مشترک ہیں پھر بھی جواب دینے والوں کے کوئی ۲۷ فی صد اعتراضات واضح طور پر نصاب تعلیم سے متعلق تھے۔ سب سے زیادہ شکایت اس بات کی تھی کہ متبادل مضامین کی تعداد کم ہے اور لازمی مضامین کی تعداد زیادہ۔ تقریباً اسی قدر عام یہ شکایت تھی کہ مقررہ نصاب انہیں کالج کی پڑھائی کے لیے اچھی طرح تیار نہیں کرتا۔ کوئی پندرہ فی صد جواب دہندوں نے کہا کہ مدرسوں کا انگریزی کا شعبہ غیر تسلی بخش ہے، اور اس کی از سر نو تنظیم ہونی چاہیے۔ ان بڑی بڑی شکایتوں کے علاوہ چند معمولی شکایات کا بھی ذکر تھا۔ ان میں سے ہر ایک کا تناسب کوئی چار فی صد تھا، وہ شکایتیں یہ تھیں کہ نصاب میں ربط، توازن اور موزوں تکرار کی کمی ہے۔ نیز غیر نصابی سرگرمیاں کافی مقدار میں بہم پہنچائی نہیں جاتیں۔

تعداد طلبہ

کل ۸۸۹ شکایات میں سے صرف ۱۷ تعداد طلبہ سے متعلق تھیں۔ ان میں سے ۸۰ فی صد شکایات سہولتوں کی کمی یا متبادل مضامین کی کمی کی بابت تھیں۔ صرف دس فی صد شکایات میں یہ کہا گیا تھا کہ جماعتوں میں تعداد طلبہ بہت زیادہ ہے۔ چار شکایات میں مخصوص مقامی حالات کا رونا رویا گیا تھا۔ غرض جن جواب دہندوں نے زیادہ تعداد کی شکایات کی تھی ان کا اصلی منشا بھی اس امر کی طرف توجہ دلانا تھا کہ سہولتیں ناکافی یا محدود ہیں۔

طریق امتحان

اگرچہ طریق امتحان یا غیر منصفانہ درجہ بندی کے متعلق عام طور پر بہت کچھ سنا جاتا ہے۔ اس سوال نامہ کے جواب دہندوں نے اس معاملہ کو حیرت انگیز طور پر غیر اہم خیال کیا۔ کل ۸۸۹ شکایات میں سے صرف ۲۸ اس امر کے متعلق تھیں۔ ان میں سے بھی ۲۶ کو شکایت یہ تھی کہ امتحانوں اور درجہ بندی پر غیر ضروری زور

دیا جاتا ہے۔ طریق امتحان یا طریق درجہ بندی پر نہ کوئی نکتہ چینی کی گئی نہ ان کی اصلاح کا کوئی مشورہ دیا گیا ۸۸۹ میں سے صرف دو شکایات اس امر کی تھیں کہ نصاب کے خاتمہ پر آخری امتحان نہ ہونا چاہیے۔ اس کا مطلب یا یہ ہو سکتا ہے کہ آخری امتحان ہر مدرسے میں نہیں لیا جاتا یا یہ کہ طلبہ کو اس پر کچھ اعتراض نہیں۔

عام نتائج

اس مطالعہ سے عام نتائج اخذ کرتے وقت یہ یاد رکھنا چاہیے کہ طلبہ کو یہ موقع نہیں دیا گیا تھا کہ مدرسے کی تعلیم کی خوبیوں کے متعلق بھی کچھ کہیں۔ ان سے صرف اس کی خامیوں کا ذکر کرنے کو کہا گیا تھا۔ اندریں حالت یہ اغلب ہے کہ وہ عموماً اس سے مطمئن تھے۔

تنقید کے مطالعہ سے ظاہر ہے کہ طلبہ کو سب سے زیادہ شکایت اس امر کی ہے کہ استاد انہیں ذاتی توجہ سے محروم رکھتے تھے۔ ان کی تدریس ولولہ انگیز نہ تھی۔ وہ طلبہ کی موزوں رہ نمائی نہ کرتے تھے۔ نصاب تعلیم محدود اور ناقابل عمل تھا۔ نیز اس میں لازمی مضامین کی غیر ضروری بھرمار تھی۔ نصاب کی یہ خامیاں طلبہ کو کالج کی پڑھائی کے لیے اچھی طرح تیاری کرنے سے روکتی تھیں۔

اس تنقید کے ضمن میں ایک اور قابل ذکر بات یہ ہے کہ یہ ساری نکتہ چینی ایسے نوجوانوں نے کی جو مدرسے کی تعلیم کامیابی کے ساتھ ختم کرنے کے بعد کالج میں پہنچ چکے تھے اور اب خود استاد بننے کا ارادہ رکھتے تھے۔ اگر کامیاب طلبہ اور طالبات مدرسوں کے متعلق اتنی شکایات رکھتے ہیں تو ان کے متعلق ایسے طلبہ اور طالبات کی کیا رائے ہوگی جو کامیابی کے اس درجہ کو نہیں پہنچ سکے۔ اگرچہ اس دوسرے سوال کا دوٹوک جواب دینے کے لیے کوئی مطالعہ نہیں ہوا۔ لیکن قیاس یہی کہتا ہے کہ مدرسوں کو اس کے جواب کے بارے میں کسی خوش فہمی میں مبتلا نہ ہونا چاہیے۔

اس بحث میں دوسرا اہم نکتہ یہ ہے کہ جواب دینے والے تمام کے تمام ایسے لوگ تھے جو چند سالوں بعد خود استاد بننے والے تھے۔ کیا یہ لوگ ان تمام شکایات کا مؤثر تدارک کریں گے جو انہیں خود اپنے استادوں سے ہیں۔ اس سوال کا سائنسی جواب بھی اسی صورت میں دیا جا سکتا ہے جب ان لوگوں کے پیشۂ معلمی میں داخل ہونے کے بعد خود ان کے شاگردوں کے ردعمل معلوم کیے جائیں۔ تاہم بادی النظر میں ایک بات صاف نظر آتی ہے وہ یہ کہ اگر نوجوان استاد اپنے متعلق وہ شکایات کبھی پیدا نہ ہونے دیں جو ایام مدرسہ میں انہیں اپنے استادوں سے

تیں، تو تدریسی معیاروں میں برق رفتار ترقی نظر آنے لگے۔ اگر کسی کو کوئی ایسی ترقی نظر نہ آئے تو اسے یہ سمجھ لینا چاہیے۔ کہ نوجوان استاد غالب کے اس قول کے قائل ہیں۔

جانتا ہوں ثوابِ طاعت و زُہد ٭ پر طبیعت اِدھر نہیں آتی

متعلم اساتذہ کو یہ نکتہ یاد رکھنا چاہیے کہ جس طرح وہ اپنے استادوں کے متعلق شکایات کرتے ہیں۔ اسی طرح ان کے شاگرد ان کے متعلق شاکی ہوں گے۔ اس ناخوش گوار قضیہ کا خاتمہ صرف ایک ہی بات سے ہو سکتا ہے، وہ یہ کہ متعلم اساتذہ جب تدریسی ذمہ داریاں سنبھالیں تو اپنے کام پر نہ صرف تنقیدی نگاہ ڈالتے رہیں بلکہ اپنی کارکردگی کے متعلق طلبہ کا نقطۂ نگاہ بھی معلوم کرتے رہیں۔ عام طور پر یہ کہا جاتا ہے کہ استاد کے کام کے بہترین نقاد طلبہ ہوتے ہیں۔ اس خیال میں بڑی صداقت موجود ہے۔ کئی استاد طلبہ کی تنقید کو بے معنی سمجھ کر درخورِ اعتنا خیال نہیں کرتے۔ یہ رویہ سراسر خود فریبی کا رویہ ہے۔ تدریس کی اصل غایت طلبہ کے دلوں کو مناسب طور پر متاثر کرنا ہوتی ہے۔ اگر یہ نتیجہ خاطر خواہ پیدا نہ ہو رہا ہو تو استاد کو پہلی فرصت میں ان لوگوں کا ردِ عمل معلوم کرنا چاہیے۔ جو موزوں تاثر قبول نہیں کر رہے۔ جدید استاد کے لیے یہ بات بے حد ضروری ہے کہ وہ جھوٹے وقار کا خیال دل سے نکال دے اور تعلیم و تعلم کے عمل میں طلبہ کو بھی اپنے ساتھ برابر کا شریک خیال کرے۔ بعض استادوں کو یہ بدظنی رہتی ہے کہ طلبہ کو ان سے محض اس لیے شکایت ہے کہ وہ ان سے کام لیتے ہیں اگر استاد ان کی بے توجہی کو نظر انداز کر دے تو انہیں کوئی شکایت پیدا نہ ہو۔ تحقیقاتی مطالعوں نے اس قسم کی بدظنی کو غلط ثابت کیا ہے۔ طلبہ کی غالب اکثریت سنجیدگی سے کام کرنا چاہتی ہے، اور استاد کی تدریس سے فائدہ اٹھانا چاہتی ہے طلبہ کو شکایت اسی وقت پیدا ہوتی ہے جب یہ فائدہ مترتب نہ ہو رہا ہو۔

تعلیمی دنیا پر ایک نظر

نوّے کروڑ بچوں کے حقوق

آج سے چند ہفتے بعد ساری دنیا اقوام متحدہ کی ایک اور سالگرہ منائے گی یعنی ۱۰ دسمبر کو یوم حقوق انسانی کی تقریب عمل میں آئے گی۔ اس موقع کی مناسبت سے اقوام متحدہ کے تعلیمی، سائنسی اور ثقافتی ادارے (یونیسکو) نے اپنے مشہور ماہ نامہ "کوریر" کا ایک خاص نمبر شائع کیا ہے۔ اکتوبر کی یہ اشاعت "بچوں کے حقوق" سے تعلق رکھتی ہے

عالمی برادری میں بچوں کے حقوق اور فلاح و بہبود کا ہمیشہ خاص خیال رکھا گیا ہے۔ سب سے پہلے ۱۹۲۳ء میں بہبودیٔ اطفال کی بین الاقوامی انجمن نے "حقوق اطفال کے منشور" کا اعلان کیا تھا، اور اس کے بعد مجلس اقوام نے اسی کی توثیق کی۔ ۱۹۵۲ء میں بین الاقوامی اساتذہ کے وفاق کی مشترک کمیٹی نے ایک اور منشور مرتب کیا۔ آج کل اقوام متحدہ کا تیار کردہ منشور ممبر حکومتوں کے پاس زیر غور ہے، اور اگلے سال پیرس میں جب انسانی حقوق سے متعلق اقوام متحدہ کے کمیشن کا اجلاس منعقد ہوگا تو اس مسودہ پر تبادلۂ خیالات کیا جائے گا۔

یونیسکو کوریر کے اداریے میں لکھا ہے کہ اگرچہ اقوام متحدہ نے خود کوئی منشور ابھی تک منظور نہیں کیا ہے، تاہم وہ اس کے مخصوص ادارے اور اعضا مثلاً یونی سیف، عالمی ادارۂ صحت، خوراک و زراعت اور یونیسکو کسی نہ کسی صورت میں بچوں کی فلاح و بہبود کا کام کر رہے ہیں، خواہ وہ تپ دق کی روک تھام کے لیے بی سی جی کا ایک ٹیکہ ہو یا جسم کو مضبوط کرنے کے لیے تقویت بخش غذا کا ایک نوالہ۔ مدرسوں میں چھوٹے بچوں کو دودھ پلایا جا رہا ہو۔ یا فاقہ کشی سے بچانے کے لیے ان کی ماؤں کو عمدہ خوراک دی جا رہی ہو۔

اس شمارے میں تندرست رہنے کے حق پر زور دیا گیا ہے۔ چناں چہ اس موضوع پر کئی مقالے شریک اشاعت ہیں۔ ایک مضمون یونی سیف کے علاقائی ڈائرکٹر برائے ایشیا مسٹر ایس ایم کیمی نے لکھا ہے جو "دنیا کے نصف بچے" نامی کتاب کے مصنف بھی ہیں۔ چار کروڑ بچوں کے سفیر کی حیثیت سے ایک مضمون مسٹر ڈینی کے نے لکھا ہے امریکہ کے یہ مشہور اداکار ایشیا اور مشرق بعید کے ملکوں میں گھوم پھر کر بچوں کی دکھ بیماریوں اور ان کے علاج معالجے سے

متعلق ایک رنگین فلم تیار کر چکے ہیں۔ ایک اور مضمون میں بتایا گیا ہے کہ ریاست ہائے متحدہ کس طرح رضاکارانہ اداروں کی ہمت افزائی کرتا ہے تاکہ وہ یونی سیف کے کاموں میں شریک ہو کر اس کے پروگراموں کو کامیاب بنائیں۔ ایک اور قابل ذکر جائزہ مسٹر پال المانسی کا لکھا ہوا شامل اوراق ہے جس کا عنوان ہے "نوے کروڑ بچوں کے حقوق"۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ بچوں کے حقوق منوانے کے لیے شروع زمانے سے اب تک کیسی کوششیں کی جاتی رہی ہیں۔

طبی مدارس کی عالمی فہرست

دنیا کے تمام حصوں کے معلمینِ طب نے مل کر طبی مدارس کی ایک عالمی فہرست مرتب کرانے میں امداد دی ہے۔ ایسی کتاب کی پہلی جلد ۱۹۵۳ء میں شائع ہوئی تھی۔ تازہ اشاعت میں ۸۰ سے زیادہ ملکوں کے طبی تعلیم کے اداروں کی فہرست شامل ہے۔ ہر ایک کا مختصر حال درج کیا گیا ہے۔ تاہم موضوع زیادہ وسیع کر دیا ہے کیوں کہ اس میں طبی تعلیم کے عام نظام پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے، اور بتایا ہے کہ ہر ملک میں طبی تعلیم کے کیسے قواعد رائج ہیں۔ اعداد و شمار کا حصہ بھی دل چسپ اور معلومات افزا ہے۔ یعنی ہر ملک میں طبی مدارس کی تعداد گنواتے ہوئے بہ لحاظ آبادی اس کا تناسب بتلایا ہے، جو ہر باب کے آخر میں درج ہے۔ پھر ضمیمے کے طور پر ہر براعظم کے الگ الگ اور ساری دنیا کے مجموعی طور پر اعداد و شمار لکھے ہیں۔ ایک نقشے کے ذریعے بتایا ہے کہ ساری دنیا میں اور ہر ایک ملک میں بلحاظ آبادی معالجین کا کیا تناسب ہے، تعلیمی نصاب کی تفصیلات اور مدت تعلیم کا بھی ذکر ہے۔

یوں سمجھنا چاہیے کہ اس فہرست کو دیکھ کر طبی تعلیم سے متعلق ہر قسم کی معلومات حاصل کی جا سکتی ہیں اور ان کی بنیاد پر ساری دنیا میں تعلیمی نظام کا مکمل جائزہ نگاہ کے سامنے آ جاتا ہے۔

ایشیا کی معدنی پیداوار میں اضافہ

اقوام متحدہ کے اقتصادی کمیشن برائے ایشیا و مشرق بعید (ایکیفے) نے ایشیا اور مشرق بعید کی معدنی ترقیوں پر سالانہ تبصرہ کرتے ہوئے اپنی رپورٹ میں لکھا ہے کہ ۱۹۵۶ء میں ایشیا کی اہم معدنی اشیا مثلاً کوئلے خام لوہے پیٹرولیم اور قدرتی گیس کی پیداوار نے ایک خاص ریکارڈ قائم کر دیا ہے۔ پنسل کا سرمہ، ابرق، ٹین اور ٹنگسٹن برآمد کرنے میں ایشیا باقی دنیا کے مقابلے میں اب بھی سب سے آگے ہے۔ نیز المنائٹ اور خام مینگنیز برآمد

کرنے میں اسے حسب معمول اہمیت حاصل رہی۔

پچھلے سال ایشیا میں معدنی پیداوار بڑھنے کا ایک سبب یہ ہے کہ حکومتوں نے معدنی وسائل کو ترقی دینے میں خاص توجہ دی ہے تاہم ایشیا کی معدنی دولت کا جو اندازہ لگایا گیا ہے، اس کے مقابلے میں بہت کم مال کانوں سے برآمد کیا گیا ہے۔

ایشیا کی معدنی ترقی سے متعلق یہ رپورٹ کمیشن کی اس سب کمیٹی کے اجلاس میں پیش ہوگی جو ۱۱ سے ۱۶ نومبر تک کلکتہ میں ہو رہا ہے۔

ایشیا کی ارضیاتی ساخت کا پہلا نقشہ

مغربی بنگال کے وزیر اعلیٰ ڈاکٹر بی سی رائے نے ۴ نومبر کو کلکتہ میں ایکیفے کی ایک کانفرنس کا افتتاح کیا ہے جس میں شرکت کے لیے ۱۸ ملکوں کے ماہرین ارضیات شرکت کر رہے ہیں۔ کانفرنس کا مقصد یہ ہے کہ ایشیا اور مشرق بعید کی ارضیاتی ساخت کا پہلا نقشہ برطانیہ سے مکمل کرایا جائے جسے اگلے سال شائع کرنا ہے۔ اس نقشے کی بنیاد پر دوسرے نقشے تیار کیے جائیں گے جن میں ایشیا کے معدنی وسائل کی تقسیم کو واضح کیا جائے گا۔ وزیر اعلیٰ نے کہا کہ صنعتوں کو ترقی دینے کے لیے معدنی ذرائع سے فائدہ اٹھانا لازمی ہے۔ اور ان ذرائع کا کھوج لگانے کے لیے زمین کی ساخت کا صحیح مطالعہ ضروری ہے۔ اگر بین الاقوامی کوششوں سے ایشیا کے ارضیاتی اور معدنی نقشے تیار ہو جائیں تو ایک دیرینہ آرزو پوری ہو جائے گی۔

خبروں کی ترسیل کے لیے کم اجرتوں کی تجویز

اقوام متحدہ کے تعلیمی، سائنسی اور ثقافتی ادارے (یونیسکو) نے ایک سلسلۂ تجویز ممبر ملکوں کو بھیجا ہے اور درخواست کی ہے کہ وہ اپنے جواب تیار کر کے بین الاقوامی انجمن مواصلات کی کانفرنس میں پیش کریں جو اگلے سال ۲۹ ستمبر کو جنیوا میں منعقد ہوگی۔ یونیسکو کا منشا یہ ہے کہ خبروں کی ترسیل کے لیے دنیا بھر میں اجرتوں کی شرح کم کی جائے اور خبریں بھیجنے کے نظام کو آسان تر بنایا جائے۔ کیونکہ اس وقت بعض علاقوں میں چند فنی رکاوٹیں حائل ہیں۔ بخصوصاً دنیا کے مشہور خبر رساں اداروں اور افریقہ، ایشیا اور جنوبی امریکہ کے کم ترقی یافتہ ملکوں کے درمیان کچھ دشواریاں ہیں۔ بہت سے ملکوں نے ایک ہی قسم کی ترسیلات کے لیے مختلف نرخ مقرر کیے ہیں

یہاں تک کہ بعض کی شرح مین گئی ہے۔ بعض ملکوں کے درمیان خبریں بھیجنے اور وصول کرنے کی اجرتیں مختلف ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس صورت میں خبروں کی پوری طرح تشہیر ممکن نہیں ہو سکتی۔ حالاں کہ موجودہ بین الاقوامی دور اضطراب میں ایسا ہونا ضروری ہے۔

یونیسکو کی ایک انتظامی تجویز یہ ہے کہ بین الاقوامی انجمن مواصلات ایک خاص مطالعی جماعت مقرر کرے تاکہ وہ خبروں کی ترسیل سے متعلق مسائل کا جائزہ لے اور ان کا حل بتائے۔ یہ جماعت دنیا بھر کے اخباری اداروں کے نظریات کو ملحوظ رکھے گی۔

یونیسکو کی تجاویز پر اقوام متحدہ کی اقتصادی اور معاشرتی کونسل غور کر چکی ہے اور بہت سے بین الاقوامی اخباری اداروں نے اس کی حمایت کی ہے۔ اب تجاویز کی نقلیں ممبر ملکوں تک پہنچ جانے کا مطلب یہ ہے کہ یونیسکو کا وہ پروگرام ایک قدم آگے بڑھ گیا ہے جو ۱۹۴۹ء میں ٹیلیگراف اور ٹیلی فون کانفرنس کے اجلاس سے شروع ہوا تھا۔ اس دوران میں بین الاقوامی انجمن مواصلات اور یونیسکو نے مل کر یہ معلوم کر لیا ہے کہ دنیا کے مختلف حصوں میں خبروں کی ترسیل کے لیے کیا نرخ مقرر ہیں اور اس ضمن میں کیا سہولتیں دی جاتی ہیں۔ اس معلومات کی بنیاد پر اقوام متحدہ نے ایک کتابچہ شائع کیا ہے جس میں ۸۰ سے زیادہ ملکوں کی اطلاعات درج ہیں۔ اس میں یہ بھی لکھا ہے کہ خبروں کی ترسیل میں مزید سہولتیں بہم پہنچانے کے لیے بہت سے ملک مناسب کارروائی کر رہے ہیں۔

انسداد جرائم اور اصلاح مجرمین

ایشیا اور مشرق بعید کے ملکوں کو دوسرے علاقائی سیمینار میں شریک ہونے کی دعوت دی گئی ہے جس کا موضوع انسداد جرائم اور اصلاح مجرمین ہے۔ اقوام متحدہ نے حکومت جاپان کے تعاون سے اس کا اہتمام کیا ہے یہ ۲۵ نومبر سے ۷ دسمبر تک ٹوکیو میں منعقد ہوگا۔

نوجوانوں کی بے راہ روی، قید خانوں میں کام لینے کے اقتصادی پہلو، قیدیوں کی اصلاح اور عصمت جیسے موضوعات اس علمی اجتماع میں زیر بحث ہوں گے

حکومت جاپان ایک ڈائرکٹر مقرر کرے گی۔ اقوام متحدہ نے اپنی طرف سے مسٹر ایڈورڈ گالوے کو معاون ڈائرکٹر کے طور پر مقرر کر دیا ہے۔ وہ اقوام متحدہ کے شعبہ امور معاشرت افسر اعلیٰ کی حیثیت سے بنکوک میں متعین ہیں

سینیمار شروع ہونے سے پہلے اقوامِ متحدہ کے سات ماہرین تبادلۂ خیالات کے لیے مواد تیار کریں گے اور وہی بحث کے سربراہ ہوں گے۔ شریک ہونے والے اراکین سے بھی کہا گیا ہے کہ وہ بیانات تیار کریں اور بتائیں کہ ان کے ملکوں میں یہ مسائل کس طرح حل کیے جا رہے ہیں۔

ان ملکوں اور علاقوں کو شرکت کی دعوت دی گئی ہے۔ پاکستان۔ افغانستان۔ برونئی۔ برما۔ کمبوڈیا۔ سیلون۔ چین۔ ہانگ کانگ۔ بھارت۔ انڈونیشیا۔ جاپان۔ جمہوریتِ کوریا۔ لے اوس۔ ملایا۔ نیپال۔ شمالی بورنیو۔ فلی پین۔ سراوک۔ سنگاپور۔ تھائی لینڈ اور ویت نام۔ اراکین اپنی انفرادی حیثیت میں بطور ماہرین شریک ہوں گے۔ وہ اپنی حکومتوں کے نمائندے نہیں سمجھے جائیں گے۔ اقوامِ متحدہ کے مخصوص اداروں اور خاص دلچسپی لینے والے بین الاقوامی اور قومی غیر سرکاری اداروں کو اپنے مبصرین بھیجنے کے لیے کہا گیا ہے۔ اقوامِ متحدہ نے معاشرتی فلاح و بہبود کی مشاورتی خدمات کے ماتحت یہ پروگرام مرتب کیا ہے۔

ٹوکیو میں ہونے والا یہ علمی اجتماع ان جلسوں کے دوسرے دور کا آغاز کرے گا جو اسی موضوع پر مختلف علاقوں میں منعقد ہوں گے۔ گذشتہ سیمینار اکتوبر نومبر ۱۹۵۲ء میں بمقام رنگون اور اس سے پہلے سٹ۱۹۵۱ء میں بمقام قاہرہ اور ریوڈی جنیرو منعقد ہوئے تھے۔ ان سیمیناروں کی روئداد مرتب ہو کر شائع ہو گئی ہے۔

نئے نئے سمندر

گذشتہ دس یا پندرہ سال کے عرصے میں سوویٹ یونین کے نقشے میں نیلے رنگ میں کافی اضافہ ہو گیا ہے عظیم روسی والگا دریا کا ناک نقشہ بدل گیا ہے۔ ایک پتلی سی لکیر کی بجائے اب نقشے میں بڑی اور چھوٹی جھیلوں ایک سلسلہ نظر آتا ہے، جو لینن شہر سے سرحد پار ہو کر بحیرۂ کیسپین تک جا پہنچتا ہے۔ نیز اور کاما دریاؤں کی شکل و صورت بھی ایسی ہو گئی ہے۔ بیکال جھیل کے جنوب میں ایک نئی کھاڑی ہے اور دریائے انگارا کا منبع ۵۰ کلومیٹر مغرب جانب ہٹ گیا ہے۔ ارتش اور اوب دریاؤں پر بڑی بڑی جھیلیں نمودار ہو گئی ہیں، یہ سب تبدیلیاں جس کے قدرت کو لاکھوں کروڑوں برس درکار تھے، بڑے تھوڑے وقفے میں انسان کے ہاتھوں ظہور میں آئی ہیں۔ کئی نئے آبی ذخیرے طول و عرض میں درجنوں بلکہ سینکڑوں کلومیٹروں تک ہیں جبکہ ان کی گہرائی کئی درجن میٹر سے جا پہنچی طوفانی موسم میں ان کی گہرائی ۱ سے ۵ میٹر تک بلند ہوتی ہے۔ اس لیے صرف جھیلوں میں سفر کے لیے خاص طور

بنائے ہوئے یا سمندر میں سفر کرنے والے جہاز ان بڑے آبی ذخائر کو سمندر کہیں تو بے جا نہ ہوگا۔

روس میں نسبتاً سب سے پہلا بڑا ذخیرہ ۲۵ برس پیشتر دریائے نیپر پر مشہور نیپروجس بند باندھ کر بنایا گیا تھا۔ نیپر کی ڈھلوان تلہٹی کو گھیرے میں لیے اس آبی ذخیرہ نے نیپر دریا کے آخری شمالی حصہ سے لے کر اس کے دہانے تک جہازرانی کے پرانے مسئلے کو حل کر دیا ہے۔

دریائے والگا پر پہلا بڑا ذخیرہ یا بحیرہ "ایوانکوف" یا بحیرہ ماسکو تھا، جسے والگا ماسکو نہر تعمیر کرنے کے سلسلے میں ۱۹۳۷ء میں بھر دیا گیا تھا۔

طویل و عریض ریبنک بحیرہ کا پانی گذشتہ جنگ حب وطن کے موقع پر شہر باکوف کے قریب کی وادی میں اچھل کود کر رہا تھا۔ یہ ذخیرہ آب جھیل اونیگا کے سائز کے نصف ہے۔ یہ جھیل یورپ کی دوسری بڑی جھیل ہے

جنگ کے بعد اس سے بڑے بڑے ذخیرے ملک کے نقشے پر ابھرے ہیں، ان میں سب سے پہلا سلیا نکایا بحیرہ تھا جو دریائے ڈان پر ۱۹۵۲ء میں مکمل کیا گیا تھا۔ اس بحیرہ سے جو والگا جہاز رانی کے لیے نہر اور سلیا نکایا کے بجلی گھر کی تعمیر کے سلسلہ میں تعمیر کیا گیا تھا۔ اس علاقہ میں بجلی کی سپلائی، دریائے ڈان میں جہاز رانی، جنوبی بر میدانوں میں آب پاشی کے مسائل کو حل کر دیا تھا، اور اس کے تھوڑے عرصے بعد قفقاز سے کیسپین تک بہنے لے دریا "کورا" کا پانی آذربائیجان میں منگیچور آبی ذخیرہ کو بھر رہا ہے۔ اس عظیم بند کی دیواریں اسی میٹر تک رہیں، اور اس کا پانی نہ صرف یہ کہ پن بجلی کے پنکھوں کو حرکت میں لاتا ہے، بلکہ اس نے کورالینڈ کے نیم صحرائی الوں کو نئی زندگی بخشی۔ اب یہ میدان ملک کے روئی پیدا کرنے والے عظیم علاقوں میں سے ایک ہے۔ لیکن جب کے لحاظ سے ان ذخائر آب کا مقابلہ کیوئبنیو بحیرۂ دریائے والگا پر سے کرتے ہیں تو ان کی حیثیت معمولی سی رہ جاتی مذکورہ بحیرہ ۱۹۵۵-۵۶ء میں تعمیر ہوا تھا۔ ۵۸ء کے موسم گرما تک اس میں پانی کی مقدار ۵۲ ارب کیوبک میٹر پہنچ گئی تھی۔ بحیرۂ مأخوذ کا رقبہ اس بحیرہ سے دگنا ہے۔ ذخیرہ آب ژیگولی سلسلہ کوہ سے لے کر والگا کے ساتھ کلومیٹر تک پھیلا ہوا ہے۔ بعض مقامات پر تقریباً چالیس کیلومیٹر چوڑا ہے۔ کیوئبنیو بحیرہ پر درجنوں نقشوں کے مطابق کئی بندرگاہیں نئے سرے سے تعمیر کی جا رہی ہیں۔

انسانی ہاتھوں کے اس بنائے ہوئے سمندر نما کا رقبہ اتنا بڑا ہے کہ دریائے والگا کو بھی جس میں پانی کی

بڑی مقدار رہتی ہے، اس کو بھرنے کے لیے دو سال کا عرصہ لگا۔ بیشتر اس کے کہ دریائے وانگا اس آبی ذخیرہ کو بھرے، اس کے تعمیر کرنے والوں کو سخت محنت کرنی پڑی ۷۵۰ سے زائد آبادیوں، ہزاروں گھروں اور ہزاروں صنعتی اداروں کی عمارات کو اس جگہ سے ہٹانا پڑا، جہاں آج بکر اکیو بنبیرہ بہتا ہے۔

بین الاقوامی ادارۂ عمال کا جائزہ

بین الاقوامی ادارۂ عمال کے ماہرین نے متعدد ملکوں میں جائزہ لینے کے بعد اندازہ لگایا ہے کہ ہر جگہ صحتی عملے خصوصاً نرسوں کی سخت کمی ہے۔ اس موضوع سے متعلق کاروباری اداروں کے بیان کے بموجب اس کمی کی بڑی وجہ یہ ہے کہ نرسوں کے کام کی شرائط سائنسی ترقی کا ساتھ نہیں دے سکی ہیں، ان اداروں کا دعویٰ ہے کہ اگر کم سے کم ملازمین کی دوسری اقسام کے برابر نرسوں کی شکایت کار، خصوصاً ان کی تنخواہوں اور کام کے اوقات کا تعین مناسب صورت میں ہو جائے تو نرسنگ کے پیشے سے متعلق بے اطمینانی کی جو کیفیت اس وقت پائی جاتی ہے بڑی حد تک دور ہو جاتی ہے۔

بین الاقوامی ادارۂ عمال پر، اس کے دستور العمل کی رو سے جو اہم ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ وہ ساری دنیا میں ہر قسم کے کارکنوں کے کام کی شرائط کو بہتر بنانے کی کوشش کرے۔ اسی لیے متعدد موقعوں پر ادارے نے نرسنگ کے عملے کی فلاح و بہبود کے لیے اپنی دلچسپی اور تعلق کا اظہار کیا ہے۔

اس سال ماہ اپریل میں ادارے کے ماتحت ایک مجلس نے جو تنخواہ دار ملازمین اور پیشہ ور کارکنوں کی مشاورتی کمیٹی کہلاتی ہے۔ اور خاص قسم کے کارکنوں کی مشاورتی کمیٹی کہلاتی ہے اور خاص قسم کے کارکنوں کے مسائل کا جائزہ لینے کے لیے مخصوص ہے، ایک قرارداد منظور کی جو ہسپتالوں اور صحتی عملے سے متعلق ہے۔

اس کمیٹی نے نرسوں کی تعداد میں کمی کو بے اطمینانی کا رسے منسوب کرتے ہوئے ادارے سے کہا ہے کہ وہ جس قدر بھی جلد ممکن ہو غیر طبی ہسپتالوں اور صحتی مرکزوں کے تنخواہ دار عملے کی تربیت اور روزگار سے متعلق عام حالات کا جائزہ تیار کرے۔

دائرۂ تحقیقات:۔ کچھ تو اس قرارداد کی تعمیل میں اور کچھ ان درخواستوں کو مدنظر رکھتے ہوئے جو متعلقہ بین الاقوامی اداروں نے بھیجی ہیں۔ ادارے نے سب سے پہلے نرسوں کے کام اور روزگار کا جائزہ لینا

آموزش

شروع کیا ہے۔ بین الاقوامی سطح پر یہ اپنی قسم کا پہلا تحقیقاتی کام ہے۔ اس ضمن میں ہر پہلو پر روشنی ڈالی جائے گی
بالفاظ دیگر روزگار کے معاہدوں، اس کے طریقوں، کام کے اوقات، تنخواہ سمیت تعطیلات۔ مشاہرے، منتقلی
کے مسائل، صحتی تحفظ، معاشرتی سلامتی اور پنشن وغیرہ جیسے موضوعات مدنظر رکھے جائیں گے۔ علاوہ ازیں آئندہ
کے مسائل، نامزدگی کے طریقوں، پیشہ ورانہ تربیت، ترقی اور نرسوں کی اقتصادی اور معاشرتی مرتبے کو بھی ملحوظ رکھا
جائے گا۔ ادارہ مختلف ملکوں سے نرسوں کی بابت عام معلومات مثلاً ان کے فرائض و اختیارات ان کے لیے ضرو
قابلیت اور ان کی تنظیم کے حالات جمع کرے گا۔

یہ جائزہ ایک رپورٹ کی صورت میں مرتب ہوگا، اور اس پر ماہرین کی اس کمیٹی میں غور کیا جائے گا جو
اجلاس ادارے کے اہتمام اگلے سال کی دوسری ششماہی میں منعقد ہوگا، اس رپورٹ میں یہ بھی درج ہوگا
کہ آئندہ اس سلسلے میں کیا کام کرنا ہے۔ ادارے نے سب سے پہلے عالمی ادارۂ صحت سے یہ دریافت کیا
نرسوں کی پیشہ ورانہ استعداد و قابلیت کا کیا معیار ہو۔ علاوہ ازیں نرسوں سے متعلق بین الاقوامی ادارہ
بھی استفسار کیا جا رہا ہے۔



جلد ۱۰ شمارہ ۸] لاهور [نومبر ۵۷ء

اس شمارہ میں

علمی ماہ نامہ

آموزش

لاہور

نومبر ۱۹۵۷ء

جلد ———— ۱۰

شمارہ ———— ۸

سالانہ چندہ

پاکستان کے لیے ۶ روپے

غیر ممالک کے لیے ۸ روپے

قیمت فی پرچہ دس آنے

پبلشرز

یونی ورسٹی بک ایجنسی لاہور

آر۔ ایچ۔ ڈی خالد پرنٹر پبلشر نے دین محمدی پریس لاہور میں طبع کرا کے
یونیورسٹی بک ایجنسی ۲ کچہری روڈ لاہور سے شائع کیا

قومی سطح پر وظائف کی سکیم

یونیورسٹی تعلیم کا مقصد بلاشبہ قومی زندگی کے ہر میدان میں قابل اور بیدار مغز رہنما مہیا کرنا ہے۔ تاریخ کے ہر دور میں رہنماؤں کی تربیت کو خصوصی توجہ دی گئی ہے۔ لیکن ایک ایسے دور میں جب سائنس اور ٹکنالوجی ہوشربا تیزی کے ساتھ ترقی کر رہی ہو، رہنماؤں کی تربیت کو غیر معمولی اہمیت حاصل ہو جاتی ہے، جدید دور کی یہ تعلیمی ضرورت آبرومند قومی زندگی کے لیے اس قدر ناگزیر ہے کہ ترقی یافتہ ملکوں نے اسے پورا کرنے کے لیے اپنے نظامہائے تعلیم میں انقلابی تبدیلیاں کی ہیں۔ ثانوی تعلیم کو مفت اور لازمی قرار دیا گیا ہے۔ طلبہ کو کتابیں مفت مہیا کی جا رہی ہیں۔ مدرسے ہر قسم کی طبی سہولتیں مہیا کرنے لگے ہیں اور عدیہ ہے کہ متوازن غذا مہیا کرنے کی ذمہ داری بھی اب مدرسوں کو سونپی جا چکی ہے۔ اس ساری تگ و دو کا مقصد یہ ہے کہ قابل جوہروں کے منظر عام پر آنے کی راہ میں کوئی مشکل حائل نہ رہے اور یہ جوہر مناسب نشو ونما حاصل کر کے ملک و ملت کی خدمت کا بوجھ اٹھا سکیں۔

پاکستان جیسے نوزائیدہ ملک کے لیے یہ بات اور بھی ضروری ہے کہ نئی پود میں سے قابل جوہر ضائع نہ ہونے پائیں، بلکہ ان کا پوری طرح کھوج لگایا جائے اور ان کی موزوں تعلیم و تربیت میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی جائے اس کے بغیر پاکستان کی پائدار قومی تعمیر کا خواب پورا نہیں ہو سکتا لیکن جس ملک میں فی کس ماہانہ آمدنی کی اوسط بیس پچیس روپے سے زیادہ نہ ہو وہاں بیشتر قابل جوہروں کا موزوں تعلیم و تربیت سے محروم رہ جانا ایک حقیقی خطرہ ہے۔ تاہم یہ ایک ایسا خطرہ ہے جس سے کوئی ہوش مند قوم دیر تک آنکھیں بند نہیں کر سکتی۔ اگر پاکستان اپنی قومی زندگی کی تعمیر مضبوط بنیادوں پر کرنا چاہتا ہے تو اسے اس بات کا پورا پورا انتظام کرنا ہو گا کہ نئی پود کی صلاحیتیں پوری طرح بروئے کار آئیں اور ہونہار بچوں اور نوجوانوں کو ہر قسم کی تعلیم حاصل کرنے کی پوری پوری سہولتیں حاصل ہوں۔

یہ امر موجب اطمینان ہے کہ حکومت پاکستان کو اپنی اس تعلیمی ذمہ داری کا احساس ہے۔ چناں چہ ۱۵ دسمبر کو مرکزی حکومت کے وزیر تعلیم نے کراچی یونیورسٹی کے طلبہ کو خطاب کرتے ہوئے کہا۔

"حکومت کو چاہیے کہ قومی سطح پر وظائف کا انتظام کرے۔ تاکہ افلاس کے باعث ہماری نئی پود کی صلاحیتیں مرجھا کر نہ رہ جائیں۔ میں اس سے بھی ایک قدم آگے جانا چاہتا ہوں۔ میں کراچی یونیورسٹی کو مشورہ دوں گا کہ وہ عمارتیں کرائے پر لے کر پوسٹ گریجوایٹ طلبہ کے لیے ہوسٹل کھول دے۔ میں اس بات کو بھی بہت اہمیت دیتا ہوں کہ طلبہ کو ہر قسم کی درسی کتابیں آسانی سے دستیاب ہوں، وزارت تعلیم ایک ایسے منصوبے پر غور کر رہی ہے جس کا مقصد یہ ہے کہ تمام معیاری درسی کتابیں خود ہمارے اپنے ملک میں طبع کی جائیں۔ جہاں تک طبی سہولتوں کا سوال ہے میرا خیال ہے کہ یونیورسٹی طلبہ کے لیے ایسی سہولتوں کا باقاعدہ انتظام ہونا چاہیے۔ میرے خیال میں اس کام کا آغاز خود یونیورسٹی کو کرنا چاہیے۔ یونیورسٹی کو چاہیے کہ اپنا الگ ہسپتال اور طبی افسر مہیا کرے۔"

وزیر تعلیم کے یہ خیالات نہایت خوش آئند ہیں۔ آج ملک کی منہ بولتی تعلیمی ضرورت یہ ہے کہ نئی پود میں سے قابل جوہروں کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر تلاش کیا جائے اور ان کی موزوں تربیت پر پوری توجہ صرف کی جائے۔ پاکستان جیسے مفلس ملک میں اس کی عملی صورت یہی ہو سکتی ہے کہ ہونہار طلبہ کو نہ صرف وظائف دیے جائیں بلکہ انہیں ہر قسم کی دوسری سہولتیں بھی مہیا کی جائیں۔

شہزادہ فلپ کا روئے زمین کے گرد سفر

فضل احمد

برطانوی دولت مشترکہ

دوسری عالمی جنگ کے بعد برطانوی قلمرو کی وسعت میں تیزی سے کمی واقع ہوئی ہے۔ پاکستان، ہندوستان، لنکا، برما، مصر، ملایا وغیرہ ممالک جو آج آزاد اور خود مختار ملک ہیں، دوسری عالمی جنگ کے خاتمہ تک برطانیہ کی محکومی میں تھے۔ قومی آزادی اور خود مختاری کا جو جذبہ پہلی عالمی جنگ کے فوراً بعد برطانیہ کے وسیع و عریض ایشیائی مقبوضات میں بھڑک اٹھا تھا، اور جس نے بالآخر ان ملکوں کو آزاد اور خود مختار بنا کر دم لیا۔ آج انگریزوں کے افریقی مقبوضات میں بھی ہل چل پیدا کر رہا ہے اور تاریک براعظم کی قومیں بھی برطانوی اقتدار کا جوا گلے سے اتار کر آزادی اور خود مختاری کا درجہ حاصل کرنا چاہتی ہیں۔ چنانچہ مغربی افریقہ کا ایک خاصہ بڑا حصہ نیم آزاد ہو چکا ہے۔

مگر اس ساری قطع و برید کے باوجود ابھی دنیا کی کئی قومیں برطانیہ کی محکومی میں ہیں۔ اب برطانوی سامراج زیادہ تر دنیا کے ان قطعوں تک محدود رہ گیا ہے جو بہت پسماندہ ہیں اور یا عالمی شاہراہوں سے بہت دور الگ تھلگ پڑے ہیں۔ دنیا کے یہ پسماندہ اور گمنام قطعات بھی قدرتی دولت کے اعتبار سے کچھ کم اہم نہیں۔ اس لیے زیادہ اہم مقبوضات کے ہاتھ سے نکل جانے کے بعد انگریز قوم اب اپنی توجہ ان علاقوں پر مرکوز کر رہی ہے۔

محکوم قوموں کو اپنی تقدیر پر شاکر رکھنے کے لیے برطانیہ نے جو سیاسی تصورات ایجاد کیے ان میں برطانوی دولت مشترکہ کا تصور سرفہرست ہے۔ جب غلام قوموں اور بالخصوص برطانیہ کی گوری نوآبادیوں نے اپنے لیے خود مختاری کا مطالبہ شروع کیا تو ان کی طفل تسلی کے لیے دولت مشترکہ کا تصور گھڑ لیا گیا اور انہیں یہ یقین دلانے کی کوشش کی گئی کہ برطانوی سامراج دراصل دنیا کی بہت سی قوموں کے بھائی چارے کا نام ہے۔ اس بھائی چارے میں شامل رہنا ان میں سے ہر قوم کے اپنے مفاد میں ہے۔ اور آج برطانیہ اس بھائی چارے کا محور ہے۔ گوری نوآبادیوں اور محکوم قوموں کے روز افزوں جذبہ آزادی کی تشفی کے لیے برطانوی دولت مشترکہ کے تصور میں کئی بار ترمیم ہو چکی ہے۔ لیکن تاج برطانیہ سے وفاداری

س تصور کا ہمیشہ مرکزی نقطہ رہا۔ چناں چہ دوسری عالمی جنگ کے خاتمہ پر برطانوی سامراج کے مشہور علمبردار
مسٹر چرچل نے اس موضوع پر ان الفاظ میں اظہار خیال کیا تھا۔
"آج برطانیہ کا سنہری حلقہ مختلف مذاہب رکھنے والی مختلف بولیاں بولنے والی اور مختلف قوموں
کو ایک مضبوط رشتے میں پروئے ہوئے ہے۔ اس سنہری حلقے میں ایسی بے پناہ کشش ہے کہ اس کی
خاطر یہ قومیں اپنی جان و مال اور اپنی قیمتی سے قیمتی متاع قربان کر دینے پر تیار ہو جاتی ہیں اور ان کے سپوت
خوشی خوشی موت سے ہم کنار ہونے کے لیے میدان جنگ کا رخ کرتے ہیں"۔
مسٹر چرچل کے یہ الفاظ کینیڈا، آسٹریلیا، نیوزی لینڈ، جنوبی افریقہ وغیرہ گوری نوآبادیوں پر تو صادق
آتے ہیں لیکن دوسری قوموں پر اس کا اطلاق صریح زیادتی ہے۔ ایشیا اور افریقہ کی جو بدنصیب قومیں کسی
سبب سے انگریزوں کی غلامی میں پھنس گئی تھیں انہوں نے کبھی بھی تاج برطانیہ کے ساتھ کوئی والہانہ عقیدت محسوس
نہیں کی کیوں کہ انگریزی قوم کے اور ان کے درمیان کوئی بھی شے مشترک نہیں تھی۔ دوسری عالمی جنگ نے برطانیہ
پر یہ حقیقت واضح کر دی تھی کہ جن ہندوستانی سپاہیوں نے دونوں عالمی جنگوں میں انگریزوں کے پہلو بہ پہلو اپنا
خون بہایا تھا وہ موقع ملنے پر اپنے ملک و قوم کے لیے انگریزوں کی پیٹھ میں چھرا بھی گھونپ سکتے تھے۔ اسی
احساس نے بالآخر برطانیہ کو اس بات پر مجبور کیا کہ پاکستان اور ہندوستان کو آزاد کر دے۔
ان تمام باتوں کے باوجود برطانوی دولت مشترکہ اب تک موجود ہے۔ پاکستان اور ہندوستان بالکل
آزاد اور خود مختار ہونے کے باوجود اس میں شریک ہیں۔ لیکن ان دو ملکوں کو چھوڑ کر جو دوسری سیاہ فام قومیں
دولت مشترکہ میں شامل ہیں وہ اپنی سیاسی بے بسی کے باعث اس تنظیم میں رہنے پر مجبور ہیں تاہم
برطانوی سامراج اس بات کے لیے بڑے بڑے جتن کرتا رہتا ہے کہ ان محکوم قوموں کو اپنی بے بسی کا احساس
نہ ہونے پائے اور وہ اپنے آپ کو برطانیہ کے ساتھ برابر کا شریک سمجھیں۔ اس مطلب کے لیے شاہی خاندان
کے افراد مختلف بہانوں سے قلم رو کے مختلف حصوں کا دورہ کرتے رہتے ہیں۔ اور مقامی رہنماؤں کے ساتھ ذاتی
مراسم بڑھانے کی کوشش کرتے رہتے ہیں۔
ملکہ برطانیہ کے شوہر کا دورہ ۱۹۵۶ء میں ملکہ الزبتھ ثانی کے شوہر شہزادہ فلپ ڈیوک آف اڈنبرا نے

اس قسم کا ایک دورہ کیا۔ تقریب صرف اس کی اتنی تھی کہ ملبورن (آسٹریلیا) میں جو اولمپک کھیلیں ہو رہی تھیں شہزادے کو ان میں شرکت کی دعوت دی گئی تھی۔ اس دعوت کو روئے زمین کے گرد سفر کا بہانہ بنالیا گیا اس سفر کے لیے "برے ٹینیا" نامی ایک خاص جہاز تیار کیا گیا جس میں بیٹھ کر ڈیوک آف اڈنبرا نے کرہ ارض کے گرد چالیس ہزار میل لمبا بحری سفر کر ڈالا۔ اس سفر کی مثال گویا اس فقیر کی تھی جس نے درزی کی دوکان کے اندر جھانک کر بڑی لجاجت سے کہا تھا:۔ کیا آپ ازراہ کرم اس بٹن پر ایک قمیص لگادیں گے؟

اس سفر سے غرض سیر و تفریح نہ تھی بلکہ قلمرو برطانیہ کے دور افتادہ حصوں کی وفاداری کو تازہ کرنا تھا، اور تاج برطانیہ کے ساتھ ان کی عقیدت کو از سر نو سہارا دینا تھا۔ چنانچہ ۱۹۵۶ء کا بڑا دن بھی ڈیوک نے بحر اوقیانوس جنوبی کے آبی ویرانے میں گذارا۔ کرسمس کے دن علی الصباح ڈیوک نے اپنے جہاز برے ٹینیا سے ایک پیغام نشر کرتے ہوئے کہا:۔ "میں "برے ٹینیا" کے کمرے میں بیٹھا ہوا بول رہا ہوں۔ اس وقت یہ جہاز بحر اوقیانوس جنوبی کے وسط میں ۵۵ درجے عرض بلد جنوبی اور ۱۲۳ درجے طول بلد مغربی پر کھڑا ہے یہ نقطہ نیوزی لینڈ اور کیپ ہارن کے تقریباً وسط میں واقع ہے۔ گلوب پر یہ نقطہ تلاش کرنے کے لیے آپ کو گلوب الٹانا پڑے گا۔ اس جگہ سے قریب ترین خشکی ۱۳۰۰ میل دور ہے اور برے ٹینیا اس وقت اپنے ملک سے دس ہزار میل کے فاصلے پر ہے۔"

تقریر جاری رکھتے ہوئے ڈیوک نے کہا:۔ "میں اس وقت ان لوگوں سے خطاب کر رہا ہوں جو دولت مشترکہ کی خدمات کے سلسلہ میں اپنے گھر سے دور پڑے ہیں۔ خواہ یہ افریقی طلبہ ہوں جو برطانیہ میں تعلیم پا رہے ہیں خواہ یہ ہندوستانی ہوں جو افریقہ میں کام کاج کر رہے ہیں۔ خواہ یہ ایشیائی ہوں جو آسٹریلیا میں علم حاصل کر رہے ہیں اور خواہ یہ حکمران۔ سائنس دان، آباد کار یا تعمیر کرنے والے لوگ ہوں۔ ہم تمام لوگ الفاظ کو جان بخشنے والے حقائق ہیں۔ ہم ہی گوشت و پوست کے وہ جیتے جاگتے پتلے ہیں جو تاج برطانیہ کے زیر سایہ دولت مشترکہ کو یکجا کیے ہوئے ہیں۔"

سفر کا آغاز

ڈیوک آف اڈنبرا نے اپنے بحری سفر کا آغاز ۱۶ اکتوبر ۱۹۵۶ء کو کیا۔ لیکن ڈیوک اور اس کے ساتھی

برے ٹینیا پر انگلستان سے نہیں مشرقی افریقہ سے سوار ہوئے۔ ڈیوک لندن سے ہوائی جہاز کے ذریعہ پہلے جبرالٹر پہنچا اور پھر وہاں سے تاریک بحر اعظم پر پرواز کرتا ہوا مباسہ (کینیا) میں۔

برے ٹینیا کی ساخت میں سفر کی مخصوص ضروریات کا خاص لحاظ رکھا گیا تھا۔ جہاز میں ہر قسم کی سہولتیں بہم پہنچانے کے علاوہ اسے اس قدر کشادہ بنایا گیا تھا کہ راستے میں شہزادہ فلپ جن حکمرانوں یا رہنماؤں سے ملاقات کرے ان کی خاطر خواہ آؤ بھگت بھی کر سکے۔ اس کے ساتھ ہی جہاز کو اس قدر مضبوط بنایا گیا تھا کہ وہ برفانی سمندروں کا سفر آسانی سے کر سکے۔ جہاز کی رفتار بھی کافی تیز رکھی گئی تھی، تاکہ چالیس ہزار میل کا مجوزہ سفر سہولت سے پورا ہو جائے۔ شہزادہ فلپ خود ایک تجربہ کار جہاز ران ہے۔ اس کے علاوہ برے ٹینیا پر انگلستان کے بہترین اور آزمودہ کار جہاز ران بھی موجود تھے۔

روئے زمین کے اس سفر کی تیاری میں شہزادہ فلپ نے ڈیڑھ سال کا عرصہ صرف کیا تھا۔ سفر کا مقصد کوئی نئے ملک دریافت کرنا نہ تھا، بلکہ قلمرو برطانیہ کے پرانے ملکوں کے باشندوں کے دلوں میں شاہی خاندان کی محبت کو بڑھانا تھا۔ شاہی خاندان کے افراد اس سے پہلے بھی قلمرو کی سیاحت کر چکے تھے، مگر ان کی سیاحت ملکوں کے دارالحکومتوں اور سیاسی اور تجارتی مرکزوں تک محدود رہی تھی۔ شہزادہ فلپ نے ان شاہراہوں اور زندگی کی گہما گہمی سے ہٹ کر اپنی سیاحت کے لیے ایک ایسا راستہ اختیار کیا جو قلمرو برطانیہ کے دور افتادہ اور گم نام گوشوں میں سے گذرتا تھا، اس سیاحت کے دوران میں شہزادہ فلپ نے خط استوا کو چار بار عبور کیا۔

شہزادہ فلپ کو جغرافیہ کے ساتھ گہری دل چسپی ہے وہ رائل جیاگرفیکل سوسائٹی کا رکن ہے اور ترقی سائنس کی برطانوی انجمن کا صدر رہ چکا ہے۔ ان جغرافیائی اور سائنسی دل چسپیوں کے باعث شہزادہ فلپ کو اچھی طرح علم تھا کہ برطانوی سائنس دان بین الاقوامی ارضی طبیعاتی سال کے سلسلے میں کرۂ ارض کے پیندے پر بیٹھے کس قسم کا تحقیقاتی کام کر رہے ہیں۔ لہٰذا بحر منجمد جنوبی کی سیاحت بھی شہزادے کے پروگرام میں شامل ہو گئی۔

(باقی آئندہ)

اُردو رسم الخط کی اصلاح کا مسئلہ

شیخ اصغر علی

دنیا میں بیسیوں زبانیں رائج ہیں اور کئی ایک رسم الخط۔ لیکن کوئی ایک رسم الخط بھی ایسا نہیں جس کے متعلق یہ کہا جا سکے کہ وہ ہر لحاظ سے کامل ہے۔ کسی میں یہ خامی ہے کہ وہ صوتیاتی اصولوں کے مطابق نہیں، یعنی یہ کہ وہ زیادہ سے زیادہ آوازوں کو ظاہر کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتا۔ کسی کے بارے میں یہ شکایت ہے کہ حروف کے نام ان کی آوازوں سے کوئی مناسبت و مطابقت نہیں رکھتے۔ کسی میں یہ نقص بیان کیا جاتا ہے کہ اس کے حروف و علامات بہت پیچیدہ ہیں۔ کسی میں حروف کی کمی کا شکوہ ہے اور کسی میں زیادتی کا۔ کسی میں ہجوں اور املا کی مشکلات ہیں اور کسی میں کتابت اور طباعت کی۔ غرض کہ اپنی اپنی جگہ پر اکثر ماہرین السنہ اپنی اپنی زبانوں کے رسم الخط کے مشکل اور پیچیدہ ہونے کی شکایت کرتے ہیں، اور ہر خط اس میں اصلاح کرنے کی تمنا رکھتے ہیں۔

یہی صورت حال اردو رسم خط کی ہے اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اردو رسم خط بھی ان خامیوں سے قطعی طور پر مبرا نہیں جن میں دنیا کے اور بہت سے رسم خط مبتلا نظر آتے ہیں، اور ہمارے وہ ماہرین تعلیم اور ماہرین زبان اردو جو اس میں اصلاح و ترمیم کے حامی اور متمنی ہیں حق بجانب ہیں۔ لیکن اس سلسلے میں جو تجاویز و ترامیم پیش کی جا رہی ہیں وہ کچھ اس قسم کی ہیں کہ اگر انہیں قبول کر لیا جائے تو خدشہ ہے کہ رسم خط بجائے سدھرنے اور سنورنے کے کہیں اور ناقص، پیچیدہ اور مشکل نہ ہو جائے۔ یہاں ہم اختصار کے ساتھ ان تجاویز کا جائزہ لیتے ہیں جو خط میں اصلاح اور ترمیم کے نام سے پیش کی جا رہی ہیں۔

پہلا نقص جو اس رسم الخط کا بیان کیا جاتا ہے یہ ہے کہ اس زبان کے حروف تہجی کے نام صوتی نہیں ہیں، بلکہ کسی حرف کے نام سے اس کی اپنی آواز کے علاوہ اور کئی ایک آوازیں پیدا ہوتی ہیں مثلاً حرف د کو جب ہم اس کے نام (دال) سے پکارتے ہیں تو اس میں اس کی اپنی آواز (د) کے علاوہ الف اور لام کی آوازیں بھی پیدا ہوتی ہیں۔ اسی طرح ل میں لام اور ف کی اور ج میں ی اور م کی آوازیں زائد ہیں بعض جن کا

کہنا یہ ہے کہ ایک اچھے رسم خط کے تمام حروف تہجی کے ناموں اور ان کی آوازوں میں ہم آہنگی ہونی چاہیے چونکہ اردو میں یہ خوبی موجود نہیں اس لیے اس کے اس نقص کو دور کرنا چاہیے اور اس کا حل یہ ہے کہ (ی) کو الف کے نام سے پکارنے کی بجائے صرف (اَ) کہنا چاہیے اور (ج) کو جیم کہنے کی بجائے صرف (جَ) اور (س) سین کہنے کی بجائے صرف (سَ) کہا جائے فرض کیجیے کہ ہم اس اصلاح کو رائج کرتے ہوئے حروف تہجی کے نام بدل کر مجوزہ صوتی نام رکھ دیتے ہیں، لیکن اس میں اس دقت کا علاج کیا ہوگا کہ پڑھنے والے (ا) کو (اُ) کی آواز کا نام دینے پر مجبور ہوں گے اور (اُ) (اُو) (اے) وغیرہ کے سمجھ کرتے وقت الجھن میں پڑجائیں گے۔ پھر اردو میں وہ حروف جو ساکن آتے ہیں انہیں کس نام سے اور کیسے پکارا جائے گا۔ لفظ شلم میں میم کو (م) کیسے کہا جا سکتا ہے اور لفظ آج میں (ج) کو جیم کہنے کی بجائے (جَ) کس طرح کہہ سکتے ہیں۔ ہندی میں جہاں ہر حرف کی آواز کو متحرک مانا گیا ہے۔ حرف کو اس کے صوتی نام سے پکارا جا سکتا ہے لیکن اردو میں یہ ممکن نہیں، اس لیے کہ اس میں متحرک اور ساکن دونوں طرح کی آوازیں پائی جاتی ہیں۔ ایک ہی آواز کبھی ساکن ہوتی ہے، کبھی متحرک اور پھر متحرک حالت میں اعراب کے مطابق تغیر آتا رہتا ہے اردو کے حروف تہجی دراصل غیر متحرک آوازوں کی علامت ہیں، اس لیے ان کے نام بھی ایسے ہیں جو ان کے سکون کے آئینہ دار ہیں۔ اردو کے حروف تہجی کے ناموں اور ان کی آوازوں کو اگر غور سے دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اگر ان میں قطعی ہم آہنگی نہیں تو کچھ ایسا بُعد بھی نہیں کہ حرف کی آواز اور اس کا نام بالکل ایک دوسرے کی ضد ہوں جیسے انگریزی میں (C) جب کہ وہ K (ک) کی آواز دے یا S جب وہ (ز) یعنی Z کی آواز دے یا G جب وہ (گ) کی آواز دے۔ بلکہ ہر حرف کا نام اسی آواز سے شروع ہوتا ہے جس کی وہ علامت ہے اور ہر حرف کا نام اپنی آواز کی طرف واضح اور کھلا اشارہ کرتا ہے۔ بظاہر صوتی و اسمی عدم ہم آہنگی بڑی بے اصولی کی بات معلوم ہوتی ہے۔ لیکن اگر ہم عملاً مشاہدہ کریں تو یہ بے اصولی کوئی ایسی نقصان دہ نظر نہیں آتی اس لیے کہ دو چار دن کی مشق سے طلبا، حروف کی آوازوں اور ان کے ناموں سے ایسے مانوس ہو جاتے ہیں کہ غلطی کا کوئی امکان نہیں رہتا، اور کوئی لڑکا (د) کو دال یا (ج) کو جیم نہیں لکھتا۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ خالص صوتیاتی رسم خط مثالی رسم خط کہلانے کا مستحق ہوتا ہے۔ لیکن صوتیاتی اصولوں پہ بنایا ہوا خط زیادہ پیچیدہ اور ناقابل عمل ہوتا ہے۔ اس لیے کہ ایک رسم خط اگر ایک علاقے کے لیے مثالی ہے تو اس زبان والے دوسرے خطے میں جہاں آوازوں اور لب ولہجہ میں فرق کا ہونا یقینی ہے وہ مثالی نہیں رہتا اور مخصوص علاقائی آوازوں کو ادا کرنے کی اہلیت و صلاحیت کھو بیٹھتا ہے۔ دور کیوں جائیں پنجابی تلفظ کو ہی لیجیے جگہ بہ جگہ بدلتا رہتا ہے۔ ایک ہی لفظ کہیں گ یا گھ سے بولا جاتا ہے اور کہیں ک سے اور کہیں ٹ سے بولا جاتا ہے اور کہیں ڈھ سے۔ اب اگر ہر صوت اور بدلتی ہوئی آواز کے لیے ایک نیا حرف بنایا جائے تو حروف تہجی کی تعداد اس قدر بڑھ جاتی ہے کہ طباعت و کتابت کا مسئلہ اور زیادہ مشکل اور پیچیدہ ہو جاتا ہے اور پھر حروف میں اضافہ کرنے کے بعد بھی یہ دعویٰ نہیں کیا جا سکتا کہ مجوزہ رسم خط کے تمام حروف تہجی مل ملا کر تلفظ کی ان باریکیوں کو ادا کر سکتے ہیں جن کا وہ متقاضی ہے۔ تحریر میں عملی آسانی کے پیش نظر اکثر ماہرین السنہ نے اس بات پہ اتفاق کیا ہے کہ لفظ کی تحریری صورت اس کے لفظ کا قطعی عکس نہیں ہو سکتی۔ بلکہ محض علامت ہو گی جو حتی المقدور اس تلفظ کو ادا کرے گی اور حروف کو آوازوں کا نام نہیں کہنا چاہیے، بلکہ آوازوں کی علامت مثلاً حرف م مَ کی آواز کا نام نہیں بلکہ اس آواز کی علامت ہے۔

اصلاح کی دوسری تجویز جو بعض بہی خواہان اردو پیش کرتے ہیں یہ ہے کہ اردو حروف تہجی میں سے ایسے دو دو تین تین حروف جو ایک ہی طرح کی آواز پیدا کرتے ہیں، خارج کر دیے جائیں۔ ماسوائے ایک کے جس کا باقی رکھنا ضروری ہو۔ مثلاً ز، ذ، ض، ظ، کم و بیش ایک ہی آواز دیتے ہیں۔ کیوں نہ ذ، ض، اور ظ کو خارج کر دیا جائے اور صرف "ز" سے کام چلایا جائے۔ اسی طرح س، ص، اور ث، میں سے صرف س کافی ہے۔ ت اور ط میں سے کوئی ایک یعنی ت رکھ لیا جائے گا اور ع بھی بظاہر ہم آواز ہی ہیں۔ صرف الف سے کام چل سکتا ہے۔ ک اور ق میں سے ک باقی رکھ لیا جائے۔ ح اور ہ میں سے کوئی ایک خارج کر دیا جائے۔ ان کے خیال میں ملتی جلتی آواز پیدا کرنے والے کئی ایک حروف کی۔

موجودگی ہماری زبان کا عیب ہے۔ ان زائد اور بے کار حروف نے ہمارے بچوں کے اذہان پر بہت غیر ضروری بوجھ ڈال رکھا ہے۔ ان سے ہمارے حروف تہجی کی تعداد خواہ مخواہ بڑھی ہوئی ہے جس سے ٹائپ میں دقتیں پیدا ہو رہی ہیں۔ انھی زائد حروف کی وجہ سے املا کی غلطیاں عام ہیں، اور بچے تو کیا بڑے بڑے اس چکر میں الجھے رہتے ہیں کہ آیا یہ لفظ "س" سے لکھنا ہے یا "ص" سے اور ک سے لکھنا ہے یا "ق" سے علاوہ ازیں املا کے ساتھ ساتھ تلفظ کی دقت بھی رفع ہو جائے گی۔

بادی النظر میں یہ اعتراض بڑا وقیع ہے اور ان حروف کا خارج ہونا ہی زبان کے حق میں مفید نظر آتا ہے، اور یہی معلوم ہوتا ہے کہ ان حروف کے چھٹتے ہی ہمارا رسم خط صاف اور بے عیب ہو جائیگا اور املا کی ساری مشکلات جاتی رہیں گی۔ لیکن بنظر عمیق دیکھیں تو مشکلات کا خاتمہ ہونا تو کجا بیسیوں اور الجھنیں پیدا ہوتی دکھائی دیتی ہیں۔

اول تو یہ کہنا کہ یہ سب مذکورہ بالا الفاظ ہم آواز ہیں۔ درست نہیں، اس لیے کہ الف اور عین اور ک اور ق کی آوازوں کے مخارج بالکل الگ الگ ہیں اور معمولی کوشش سے ان کی صحیح آواز نکالی جا سکتی ہے باقی آوازوں میں بھی سو فی صد مطابقت اور ہم آہنگی نہیں۔ بلکہ ان میں فرق اور اختلاف ہے۔ اگرچہ ان کی صحیح آواز نکالنا یہاں ضروری نہیں سمجھا جاتا۔ اس تجویز کو اپنانے کی صورت میں سب سے بڑی دقت تفہیم عبارت میں پیش آئے گی۔ اس لیے کہ اردو زبان میں الفاظ جو مختلف حروف سے لکھے جاتے ہیں، معانی کے اعتبار سے بالکل ایک دوسرے سے مختلف ہوتے ہیں۔ ایک قلب ہم ق سے لکھتے ہیں اور دوسرا ک سے (کلب) دونوں صوتی لحاظ سے ایک سہی (اگرچہ ایک نہیں ہیں) لیکن معانی کے اعتبار سے ایک دوسرے کی ضد۔ یہی صورت ذن اور ظن کی املا میں ہے۔ اردو میں ایسے دو چار الفاظ نہیں بلکہ سینکڑوں کی تعداد میں ہیں مثلاً :- سدا ، صدا - آم ، عام - نذیر ، نظیر - علم ، الم تان ، طعن - عرض ، ارض - ثواب ، صواب - سہی ، صحیح کمر ، قمر

اگر ہم آواز کے لیے صرف ایک ہی حرف رکھ لیں تو پھر معانی کے سمجھنے میں ایسی دقت پیدا ہو جائیگی

ذ تحریر اور املا کی دقت سے بھی بھاری ہوگی۔ مختلف حروف کے ہونے کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ الفاظ کے معانی خود بخود واضح ہو جاتے ہیں اور التباس یا الجھن پیدا نہیں ہوتی۔ اس فائدے کے علاوہ اور بھی بہت سے ائدے ہیں جو کہ ذیل میں درج کیے جاتے ہیں ۔

ہم آواز الفاظ کو ان کے مروجہ ہجوں سے لکھنے سے لفظوں کے مادوں کا پتہ چلتا ہے اور یہ معلوم ہو جاتا ہے فلاں لفظ کس خاندان کا ہے، کس زبان یا کس ملک سے آیا ہے۔ گرامر میں کیا ہے اور اس سے اور کون کونسے ئے الفاظ بنائے جا سکتے ہیں۔ علاوہ ازیں الفاظ پر غور کرنے سے بیش قیمت تاریخی اور جغرافیائی معلومات حاصل تی ہیں، اور مختلف قوموں اور ملکوں کے باہمی میل جول اور تعلقات کا بھید کھلتا ہے۔ ان زائد حروف کے خارج کر دینے ے نہ صرف زبان کم مایہ ہو جائے گی بلکہ نئے الفاظ بنانے کی راہیں مسدود ہو جائیں گی انکشاف اور تحقیق کے دروازے ہو جائیں گے۔ لفظوں کی اصل کا پتہ لگانے والے مارے مارے پھریں گے لیکن کھوج نہ لگا سکیں گے۔ المختصر ن وہ وسعت اور جامعیت کھو دے گی جو کسی بلند پایہ علمی و ادبی زبان کا طرۂ امتیاز ہوتی ہے۔ برسوں کی کوششوں بعد زبان اس مقام پر پہنچی ہے کہ اس کی املا کو معیاری کہا جا سکے۔ اس ترمیم اور تبدیلی سے نہ ... پھر ایک دفعہ ں اور کھلبلی سی مچ جائے گی۔ اور ہماری زبان ترقی کرنے کی بجائے الٹے قدم تنزل کی طرف لوٹنے لگے گی۔ پرانے ے جو مروجہ املا کے عادی ہیں نئے ہجوں میں لکھنے اور پڑھنے میں بڑی دقت محسوس کریں گے۔ اس لیے کہ یہ تبدیلی جو ہر بالکل معمولی معلوم ہوتی ہے پورے رسم خط میں ایک عظیم تغیر پیدا کر دے گی۔ اس تغیر اور انقلاب کو ملاحظہ کرنا ہو تو ت الفاظ کو مجوزہ ترمیم کی روشنی میں لکھ کر دیکھ لیجیے۔ اس کا ایک مختصر سا نقشہ یہاں پیش کیا جاتا ہے ۔

موجودہ صورت	مجوزہ صورت
عشق - عاشق	اشک - آشک (ع اور ق دونوں اڑ گئے)
طالب علم	تالب الم (ط اور ع کو خارج کرنے سے)
طرح	ترہ
حافظ	ہافز
صاحب	ساہب

عرض	ارز
عزت	ازت
مطلب	متلب
معانی - معنیٰ	مانی - مانا
قسم	کسم
قریب	کریب
صوت - صورت	سوت سورت
علامت - عار	الامت - آر
قیامت	کیامت
فرق - فراق	فرک - فراک
خصوصیت	خسوسیت
موضوع - واضح	موزو - وازہ
وضع قطع	وزاکتا
ذوق	زوک
اصغر حسین	اسغر ہسین
اقبال	اکبال
قائداعظم	کائدِ آزم
لیاقت علی	لیاکت آلی

اب ان الفاظ کو غور سے ملاحظہ کیجیے کہ یہ مجوزہ صورت میں لکھے جانے والے الفاظ کیا اردو ہی کے الفاظ معلوم ہوتے ہیں، اور کیا اس صورت میں ان کے معانی واضح ہو جاتے ہیں۔ اس کا جواب یہ دیا جا سکتا ہے کہ چوں کہ نگاہیں ایک خاص ڈھب اور انداز میں الفاظ کو دیکھنے کی عادی ہو گئی ہیں۔ اس لیے وہ جدید صورت سے

اجنبی ہیں۔ جب انھیں نئے ہجوں سے لکھنے اور دیکھنے کی عادت ہو جائے گی تو وہ اجنبیت اور غیر مانوسیت جاتی رہے گی بجا اور درست۔ لیکن جب نظریں الفاظ کو نئے الفاظ اور نئے روپ میں دیکھنے کی عادی ہو جائیں گی تو کہیں ایسا تو نہیں ہوگا کہ پرانے لبادوں اور چیتھڑوں میں لپٹے ہوئے الفاظ ہمارے لیے ایک معمہ اور چیستان بن جائیں۔ اور جو اجنبیت ہمیں نئے الفاظ کو دیکھ کر محسوس ہوتی ہے وہ ہماری نسلوں کو پرانے الفاظ دیکھ کر ہو۔ اس طرح تو ہمیں تمام ذخیرہ ادب اسی مجوزہ رسم خط میں منتقل کرنا پڑے گا، اس لیے کہ پرانی کتابیں دیکھنے اور پڑھنے میں وہی الجھن ہوگی جو آج کے ایرانی عالم کو اوستا کی تحریریں دیکھنے سے ہوتی ہے۔ اور پھر کون اردو داں ہے جو الفاظ مذکورہ بالا کو مجوزہ تحریر اور ہجوں میں دیکھ کر خوش ہو اور اسے بطیب خاطر قبول کرے۔ مجھے تو یقین ہے جس دن لفظ عشق اور عاشق اپنی جدید صورت میں سطح کاغذ پر ظاہر ہوئے جملہ عشاق میدان عشق سے دم دبا کر بھاگ جائیں گے۔ اور عاشق کہلانا ان کے لیے موجب عار ہو جائے گا۔ وہ لوگ جو انگریزی اور اردو دونوں زبانیں جاننے کے باوجود رومن میں لکھی ہوئی اردو اس لیے صحیح نہیں پڑھ سکتے کہ ان کی نگاہیں لاطینی رسم خط میں لکھی ہوئی اردو کو پڑھنے کی عادی نہیں ہیں وہ بہ نئی تحریر کیوں کر پڑھ سکیں گے۔ مختلف الفاظ اپنی معین صورت کے ساتھ ہمارے ذہنوں میں رچ اور بس چکے ہیں اور ہر لفظ کی صورت، اس کے تلفظ اور اس کے معانی میں کچھ ایسا ربط پیدا ہو گیا ہے کہ لفظ کی شکل سامنے آتے ہی سب کچھ ذہن میں آ جاتا ہے۔ اب اس ترمیم کا مطلب تو یہ ہوگا کہ ہم ایک بنے بنائے اور ان مٹ نقش کو مٹا کر ایک دوسرا نقش ذہن پر ثبت کرنا چاہتے ہیں، اور ایک پرانی عادت کو ختم کر کے ایک نئی لسانی عادت پیدا کرنا چاہتے ہیں اور یہ کام یقیناً بہت کٹھن ہے۔

ہمیں اس ترمیم پر غور کرتے وقت یہ نہ بھولنا چاہیے کہ اردو کا فارسی اور عربی سے ایک گہرا رشتہ ہے عربی اور فارسی کے پچاس فی صد سے زائد الفاظ اردو میں رائج ہیں۔ اردو رسم خط فارسی اور عربی رسم خط کی نقل ہے اردو کے حروف تہجی میں فارسی اور عربی کے تمام حروف تہجی شامل ہیں۔ آٹھ دس حروف کے خارج کرنے سے نہ صرف وہ تعلق ٹوٹ جائے گا۔ بلکہ اردو تہی دامن اور بے یار و مددگار ہو جائے گی اور قرآن مجید پڑھنے اور فارسی عربی کی کتابیں دیکھنے میں دقتیں پیدا ہوں گی۔

مختصر یہ کہ اصلاح کی یہ دوسری تجویز بھی پہلی کی طرح ناقابل عمل ہے اس لیے کہ اس کے اپنانے میں فائدہ کم

مان زیادہ ہے ۔

اصلاح و ترمیم کے سلسلے میں تیسری تجویز یہ پیش کی جاتی ہے کہ اُردو کے حروف تہجی کو ملا کر لکھنے کی بجائے ی رسم خط کے تتبع میں الگ الگ لکھا جائے۔ تاکہ حروف اپنی انفرادی صورت کو برقرار رکھیں۔ بچوں کو حروف ملا کر لکھنے اور لکھے ہوئے حروف کو پڑھنے میں بڑی دقت ہوتی ہے۔ حروف کی ترکیبی شکلوں کی پہچان میں ی مشکل کا سامنا ہوتا ہے۔ ایک ایک حرف کی تین تین، چار چار ترکیبی صورتیں ہوتی ہیں۔ ان سب کا تحریر کرنا اور رکھنا بڑا مشکل ہے۔ اگر ترکیبی شکلوں کو اڑا دیا جائے اور حروف کو الگ الگ لکھنا شروع کر دیا جائے تو یزی کی طرح اس کا ٹائپ مختصر اور آسان ہو جائے گا، اور طباعت کی دشواریاں، سہولت اور آسانی میں بدل یں گی۔

پیشتر اس کے کہ اس تجویز کے فوائد و نقائص اور محاسن و عیوب پر تبصرہ کیا جائے، یہ ضروری ہے کہ مجوزہ ہم کو عملی طور پر تحریر کی صورت میں بطور نمونہ یہاں پیش کر دیا جائے۔

موجودہ طرز تحریر	مجوزہ طرز تحریر
اردو کا رسم خط نہایت خوبصورت اور	اُ ر د و ک ا ر س م خ ط ن ہ ا ی ت
عمدہ ہے۔	خ و ب ص و ر ت ا و ر ع م د ہ ہ ے ۔
یہ تجویز ناقابل عمل ہے۔	ی ہ ت ج و ی ز ن ا ق ا ب ل ع م ل ہ ے
اردو ہماری ملکی اور قومی زبان ہے۔	ا ر د و ہ م ا ر ی م ل ک ی ا و ر ق و م ی ز ب ا ن
اسے ترقی دینا ہم سب کا اہم فرض ہے۔	ہ ے ۔ ا س ے ت ر ق ی د ی ن ا ہ م س ب ک ا ا ہ م ف ر ض ہ ے
بعینہٖ - قطعاً	ب ع ی ن ہ ی ق ط ع ا ن

ان تمام جملوں میں سوائے "اردو" اور "اور" کے جن سے ہماری نگاہیں مانوس ہیں، باقی تمام الفاظ کا پڑھنا مشکل ہے۔ بالخصوص اس صورت میں جب سامنے سے موجودہ طرز تحریر کو ہٹا دیا جائے اور نہایت کو "ن ہ ا ی ت" اور بشیر کو "ب ش ی ر" اور جاناں کو "ج ا ن ا" لکھنا محض تضیع اوقات اور بچوں کا مشغلہ

معلوم ہوتا ہے۔ اس تجویز کو عملی جامہ پہنانے کی صورت میں اردو میں اختصاریت کا جوہر چاتا رہے گا۔ اور جو بات ایک سطر اور ایک منٹ میں تحریر کی جاتی ہے اسے دو سطروں اور دو منٹوں میں لکھا جا سکے گا۔ گویا کتابت و طباعت کے مصارف بجائے گھٹنے کے بڑھ جائیں گے۔ کام کی رفتار سست ہو جائے گی اور نجی خط و کتابت میں آج کی نسبت دگنا وقت اور کاغذ صرف ہوگا ـــــ یہ بات کہ اس کے اپنانے سے اردو تحریر کا سیکھنا بہت آسان ہو جائے گا، ٹھیک نظر نہیں آتا۔ اول تو موجودہ صورت میں اس کا لکھنا کوئی ایسا مشکل نہیں کہ طلبہ اسے سیکھ نہ سکیں۔ انگریزی حروف کی بناوٹ اور الفاظ کے لکھنے میں ناکام ہو کر طلبہ کو تعلیم سے بھاگتے اور اس سے متنفر ہوتے دیکھا ہے۔ لیکن اردو رسم خط سے گھبرا کر بچوں کو تعلیم سے متنفر ہوتے کم دیکھنے میں آیا ہے۔ اس لیے کہ اگر طریقے اور سلیقے سے بالترتیب حروف و الفاظ کو لکھنا سکھایا جائے تو تمام دقت رفع ہو جاتی ہے۔ دوسرے عملی طور پر ایک لفظ کے حروف کو الگ الگ لکھ کر اس کا پڑھنا مشکل نظر آتا ہے، بہ نسبت اس کے ملا کر لکھنے اور پڑھنے سے، ہمارے رسم خط میں ترکیبی صورتیں اپنی اصل انفرادی شکل کے چہرے یا سرے کو ضرور ظاہر کرتی ہیں۔ اور جیسے جس طرح اپنے دوستوں اور عزیزوں کو محض ان کے چہروں سے پہچان لیتے ہیں۔ اور انہیں ان کے لباس اور جسم کے باقی اعضا دیکھنے کی حاجت نہیں ہوتی۔ بعینہٖ وہ حروف کی ترکیبی صورتوں سے ان کی اصل شکلیں پہچان لیتے ہیں۔ پھر اردو کی ترکیبی اور انفرادی صورتوں میں اتنا بُعد ہرگز نہیں ہوتا جتنا انگریزی کے بعض کتابی اور تحریری حروف یا بڑے اور چھوٹے حروف میں ہے۔ وہاں تو ہمیں یہ خامی نظر نہیں آتی۔ اس لیے کہ عملاً کوئی ایسی مشکل پیش نہیں آتی۔ لیکن یہاں یہ بات خواہ مخواہ عیب اور سُقم بن جاتی ہے۔ انگریزی کے بعض حروف میں اختلافِ شکل ملاحظہ فرمائیے۔

کتابی چھوٹے حروف	تحریری چھوٹے حروف	بڑے حروف
a	a	A
b	b	B
g	g	G
z	z	Z
f	f	F
t	T	T

اگر ہمارے بچے ایک غیر ملکی زبان کے حروف کی تین تین مختلف شکلیں یاد رکھ سکتے ہیں تو کیا وہ اپنی زبان کی ان ترکیبی صورتوں کو جو اپنی انفرادی شکلوں سے بالکل ملتی جلتی ہیں یاد نہیں رکھ سکتے۔

فرض کیجیے کہ ہم اس تجویز کو مفید پاکر اسے قبول کر لیتے ہیں اور ہمارے ہاتھ اور ہماری نگاہیں اس نئے طرز تحریر کی عادی ہو جاتی ہیں، لیکن اردو کے اس قدیم مایۂ ادب کا کیا ہوگا جو اسی موجودہ طرز تحریر کا نمائندہ ہے۔ کیا نئی پود کی نگاہیں اس نئے اسلوب کو اپنانے کے بعد پرانی کتابت اور تحریر کے نمونے پڑھ سکیں گی، نہیں ہرگز نہیں! تو پھر اس کا مطلب یہ ہوگا کہ یہ سارا ذخیرۂ ادب و تاریخ بجائے کتب خانوں کے عجائب خانوں کی زینت بن جائے گا اور صرف بلند پایہ محققین ہی اس سے استفادہ کر سکیں گے۔

چوتھی تجویز یہ پیش کی جاتی ہے کہ حروف کی شکلیں بدل دی جائیں تاکہ انفرادی اور ترکیبی صورتوں کا جھگڑا ختم ہو جائے یعنی کسی حرف کی پوری شکل لکھنے کی بجائے صرف اس کے چہرے یا سرے سے کام چلایا جائے مثلاً ب پ ت کی پوری شکل کی بجائے بـ پـ تـ تحریر کیا جائے اور ج چ ح خ کی بجائے جـ چـ حـ خـ اور س ش ص ض کی جگہ سـ شـ صـ ضـ۔ یعنی حروف کے پھیلاؤ کو اس قدر کم کر دیا جائے کہ اگر اسے لاطینی طرز تحریر کے تتبع میں الگ الگ لکھا جائے تو یہ جگہ کم گھیرے جملہ حروف تہجی کو درمیان سے کاٹ دینے کی یہ تجویز اسی صورت میں قابل غور سمجھی جا سکتی ہے جب ہم یہ فیصلہ کر لیں کہ اردو حروف کو ملا کر لکھنے کی بجائے الگ الگ لکھا جائے۔ اس حالت میں بھی الفاظ کی دم یا اس کے جسم کا کچھ حصہ کاٹ دینا مناسب معلوم نہیں ہوتا، اس لیے کہ اس سے ہمارا رسم خط بڑا بھونڈا اور بدزیب ہو جائے گا، اور اس بدصورتی کو بھی برداشت کر لیا جاتا، اگر اس سے کوئی گراں قدر فائدہ حاصل ہو سکتا۔ لیکن افسوس کہ صورت حال اس سے برعکس ہے۔ ہماری زبان کے حروف کو ملا کر لکھنا جس قدر مفید اور سہل ہے اتنا الگ الگ لکھنا فائدہ مند اور آسان نہیں۔

عراق و ایران نے بڑے بڑے عمدہ خطاط اور خوش نویس پیدا کیے ہیں اور نسخ و نستعلیق کی ایجاد کا سہرا انہی کے سر ہے۔ وہاں اس بات کے بھی تجربے ہوئے ہیں کہ عربی و فارسی کے حروف کو لاطینی کی پیروی میں الگ الگ لکھا جائے کہ وہ اپنی انفرادی صورت کو قائم رکھ سکیں۔ وہاں یہ بھی کوشش

کی گئی ہے کہ آسانی کے خیال سے حروف تہجی کے گھیرے ختم کیے جائیں، اور ان کی لمبائی۔ چوڑائی اور موٹائی میں تخفیف کردی جائے۔ لیکن یہ دونوں طرح کے تجربے کامیاب نہ ہو سکے اور کسی ایک کو بھی قبول عام کی سند نہ ملی اور کامیاب ہوئے تو وہ نستعلیق کی بجائے نسخ رائج کرنے میں۔ اب کیا ضرورت ہے کہ دوسروں کے ناکام تجربوں کو دہرا کر اپنا وقت ضائع کریں۔ دانا تو وہ ہے جو دوسروں کے تجربات سے فائدہ اٹھائے۔

اسی سلسلے میں ایک اور تجویز بھی دیکھنے میں آئی ہے وہ یہ کہ اردو رسم خط کو صوتیاتی بنانے اور اس میں تلفظ کی صحت کو برقرار رکھنے کے لیے مزید اعراب وضع کیے جائیں۔ ہمارے ہاں اس وقت زَبَر۔ زِیر۔ پیش ُ۔ جزم ْ۔ تشدّ ّ اور مدّ ٓ رائج ہیں۔ تجویز یہ ہے کہ ان اعراب کی تعداد بڑھا دی جائے جملہ مجوزہ اعراب کی تفصیل ذیل میں دی جاتی ہے۔

زبر	سیدھا زبر	(ـَـ)	بَارَہ	یہ اس وقت بھی رائج ہے۔
	الٹا زبر	(ـَـ)	رَحمت	—
	گول زبر	(ـَـ)	بھَینسا	—
	کھڑا زبر	(ـٰـ)	اعلیٰ	اس کا استعمال بھی ہوتا ہے۔
زیر	سیدھا زیر	(ـِـ)	پِٹنا	رائج ہے
	الٹا زیر	(ـِـ)	محِنت	—
	کھڑا زیر	(ـٖـ)	بِبِنہ	موجود ہے
پیش	سیدھا پیش	(ـُـ)	دُور	موجود ہے
	الٹا پیش	(ـُـ)	مُور	—
	کھڑا پیش	(ـٗـ)	سلمہٗ	موجود ہے
جزم	سیدھا جزم	(ـْـ)	چلْ	اسوقت جزم کی ایک علامت رائج ہے
	الٹا جزم	(ـْـ)	رَنْگ	اور اس کی شکل (ْ) ہے۔
	کھڑا جزم	(ـٚـ)	بالْ	اردو میں موجود ہے۔
	گول جزم	(ـْـ)	دُنْبہ لہ	شد اور مد بدستور

لہ مضمون اردو املا ... مرزا خلیل بیگ

مختلف الفاظ کے تلفظ کی ادائیگی میں مختلف آوازیں پیدا ہوتی ہیں۔ کہیں آواز زیادہ کھلی ہوتی ہے کہیں کم کہیں آواز واضح ہوتی ہے اور کہیں باریک اور کم واضح۔ ان آوازوں کی ادائیگی کے لیے ہمارے ہاں اعراب تو رائج ہیں لیکن تعداد میں اتنے نہیں کہ ہر قسم کی آواز کے لیے رہ نمائی کر سکیں۔ اسی ضرورت کے پیش نظر مندرجہ بالا اعراب پیش کیے گئے ہیں۔ جہاں تک رسم خط کو سائنٹیفک بنانے اور تکنیکی لحاظ سے مکمل بنانے کا سوال ہے یہ تجویز معقول اور احسن ہے لیکن اس سے جو مشکلات عملاً ہمیں پیش آئیں گی ان کو نظر انداز کرنا ناممکن ہے پیشتر اس کے کہ ان اعراب کی حامل تحریر کا نمونہ پیش کیا جائے۔ اس ضمن میں چند ایک اور اصلاحات کا ذکر کرنا ضروری ہے۔

۱۔ تمام عبارات بالخصوص بچوں کی کتابوں پر کامل اعراب لگائے جائیں بالکل اسی طرح جس طرح عربی میں رائج ہیں۔

۲۔ جدید فارسی کے تتبع میں یائے مجہول کو حروف تہجی سے خارج کر دیا جائے۔

۳۔ مد (آ) کو الف کی لمبی آواز کے لیے استعمال نہ کیا جائے۔ بلکہ وہاں دو الف کام میں لائے جائیں (جیسا کہ انگریزی میں رائج ہے) مثلاً آم کو اام لکھا جائے اور آنا کو اانا۔ پکارنے وقت جب آواز کو لمبا کرنے کی ضرورت ہو تو مد کا استعمال کیا جائے۔ مثلاً :—

بھآئی — جآن۔

۴۔ ک کی ترکیبی صورت (کا) کو خارج کر دیا جائے۔ کل کی بجائے کل لکھا جائے۔

۵۔ ش کو کشش (ش) سے نہ لکھا جائے۔

۶۔ نستعلیق کی تراکیب جو خوب صورتی کے لیے رائج کی گئی تھیں ختم کر دی جائیں۔

مندرجہ بالا تمام تجاویز کو اپنانے کے بعد ہماری اردو تحریر کی صورت حسب ذیل ہو گی۔

دُوُدَ اَاُنِیْ کِیْ اَاُرْدُوْ دِیمِیْ دَوُ

نَانَا اَاُتِیْ ، تَوُ دَادَا کَھَاُنَا کَھَاتِیْ

دَادَا جُھجِیْ اَاُم بِلِیْ ؟

باجی آ اکی آ آڈو لی تو
دارا جائی جاکی جو تو لی
آ آئی بجائی آ ائی

اس نئی صورت میں اردو لکھنا پڑھنا آسان ہوگا یا مشکل ۔ اس کا فیصلہ ہم قارئین پر چھوڑتے ہیں
طباعت کی مشکلات جو پہلے ہی ہمارے رسم خط کی ترقی میں حائل ہیں بڑھیں گی یا گھٹیں گی، اس کا اندازہ
آپ خوب لگا سکتے ہیں۔ دراصل اعراب کی کثرت نے جہاں رسم خط کو صوتیاتی بنانے میں مدد دی ہے وہاں
اس کی تحریر کو اور طباعت کو قدرے مشکل بنا دیا ہے تعلیم کے نقطہ نظر سے بھی اس میں بڑی مشکل یہ پیدا
ہوگئی ہے کہ اعراب کی کثرت بچوں کو پریشان کر دیتی ہے۔ بچے سیدھے زبر اور الٹے زبر۔ سیدھے زیر اور
الٹے زیر اور کھڑے زبر اور گول زبر میں تمیز کرنے میں بڑی دقت محسوس کرتے ہیں۔ جزم کی علامت ہر جگہ
کچھ ایسی ضروری معلوم نہیں ہوتی پھر تمام الفاظ کے ہر ہر حرف پر علامت دینے اور اعراب لگانے سے
عبارت اعراب کے بوجھ تلے دب جاتی ہے۔ اس سے بچوں کے لیے یہ ممکن نہیں ہوتا کہ وہ عبارت کو روانی
سے پڑھ سکیں۔ بچوں کی نظریں چھوٹی چھوٹی لکیروں اور جزموں میں کھو سی جاتی ہیں۔ مجوزہ صورت میں
اردو کے اعراب کی تعداد عربی سے بہت بڑھ جاتی ہے۔ قرآن مجید بار بار پڑھنے کی وجہ سے اس میں
کچھ روانی آجاتی ہے۔ لیکن اردو میں چوں کہ ہر روز نئی عبارت سے سابقہ پڑے گا، اس لیے یہاں روانی
پیدا نہ ہو سکے گی۔ کسی لغت کی کتاب میں الفاظ کو اس طرح کے اعراب کے ساتھ تحریر کیا جا سکتا ہے تاکہ
تلفظ واضح ہو۔ لیکن عام درسی کتابوں کو اس طرز تحریر میں شائع کرنا سود مند نہ ہوگا، اس لیے کہ اگر بچے اس طرح
پڑھنے کے عادی ہو گئے تو لائبریری کی کتابوں اور رسالوں کے پڑھنے میں دقت محسوس کریں گے۔ اعراب پر ضرورت
سے زیادہ بھروسہ کرنے لگیں گے۔ طباعت میں غلطیاں بڑھ جائیں گی، اور اعراب کے اوپر تلے ہونے سے
الفاظ کا تلفظ غلط ہو جائے گا۔ قرأت کے علاوہ بچوں کو لکھنے میں دقت ہوگی۔
خود عربی کی کتابوں میں جہاں اعراب اور حرکات و سکنات پر عبارت کا مفہوم منحصر ہوتا ہے اتنے اعراب
نہیں لگائے جاتے۔ اور کوشش یہ کی جاتی ہے کہ کم سے کم اعراب سے کام چلایا جائے۔ پھر اردو میں ہر حرف پر حرکت

یا سکون کی ضرورت نہیں ہوتی۔ جس حرف پر اس کی ضرورت ہو لگا دیا جائے اور باقی حروف خالی چھوڑ دیے جائیں۔ آج کل یہی طریق اردو میں رائج ہے۔

اب رہا یائے مجہول کو حروف تہجی سے خارج کرنے کا مسئلہ۔ کسی زمانے میں یہ حرف (ے) ہمارے تہجی میں موجود نہ تھا۔ بعد میں التباس اور الجھن کو دور کرنے کے لیے اسے رائج کیا گیا تاکہ 'ہی' اور 'ہے'۔ 'سی' اور 'سے' میں امتیاز کرنے میں دقت نہ ہو۔ فارسی میں یائے مجہول نہ تحریر میں آتی ہے اور نہ ہی اب تلفظ اور آواز میں اسے شامل کیا جاتا ہے۔ اردو میں اس کے برعکس اس کی آواز جگہ جگہ ادا کی جاتی ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ اسے 'ی' سے تمیز کرنے کے لیے کوئی امتیازی نشان دیا جائے وہ نشان الٹی زیر (یٖ) کی صورت میں تجویز کیا گیا ہے۔ میری ناقص رائے میں اگر یائے مجہول کو بجنسہٖ رہنے دیا جائے تو بہتر ہوگا اس لیے کہ اعراب کی علامت۔ طباعت اور ٹائپ میں اڑ جاتی ہے۔ اور کتابت میں اس کا جگہ جگہ پر التزام مشکل ہوتا ہے۔ اس کے برعکس ایک انفرادی شکل کی موجودگی لکھنے پڑھنے کے کام کو آسان کر دیتی ہے۔ چوں کہ ایک ایک جملے میں یہ نقطہ کئی کئی بار استعمال ہوتا ہے۔ اس لیے محض علامت سے کام چلانا مشکل ہے۔ 'رو ئی' اور 'رو ئے'۔ 'آئی' اور 'آئے'۔ 'دی' اور 'دیے' میں امتیاز کرنے کے لیے ی کے الٹے زیر پر نظر رکھنا ہوگی۔ یا پھر فقرے کے مفہوم سے اندازہ لگانا ہوگا کہ یہاں کیا لفظ مراد ہے۔ اس طرح پڑھنے میں ضرورت سے زیادہ وقت صرف ہوگا۔ نجی کاروبار اور خط و کتابت میں اس علامت کا خاص خیال رکھنا ہوگا، اور جب تک اس کی خوب عادت نہ ہو جائے یہ ممکن نہ ہوگا۔

اردو رسم خط کی خوبیوں میں سے ایک خوبی یہ بھی بتائی جاتی ہے کہ یہاں آواز کو لمبا کرنے کے لیے (بالخصوص الف کی آواز کو) مدّ سے کام لیا جاتا ہے اگر آم کو مد کی بجائے دو الف (اا) سے 'اام' لکھا تو پھر محاسن میں ایک خوبی کی کمی واقع ہو جائے گی۔ برسوں سے ایک رائج چیز کو بلا ضرورت بدلنا مناسب نہیں۔ اسی طرح رہا کو رہا اور کل کو کل لکھنا۔ اس میں اصل چیز تو ٹائپ اور طباعت کی سہولت کو پیش نظر رکھنا ہے۔ اگر ٹائپ میں کل لکھنے اور ہا کی جگہ ہا لکھنے میں کوئی آسانی پیدا ہو سکتی ہے تو مجوزہ اصلاح کو اپنا لینے میں کوئی مضائقہ نہیں۔ اس کے علاوہ عام لکھنے پڑھنے میں اس سے اگر کوئی سہولت ہو گی تو وہ یہ کہ ک کی ایک ایسی ترکیبی صورت

خارج ہو جائے گی۔ جس کی پہچان بچوں کے لیے ک کی نسبت قدرے مشکل ہے۔ لیکن جو بچہ (ہ) لکھ لیتا ہے اور ق کا سرا (و) بنا لیتا ہے۔ اس کے لیے (کا) لکھنا کیا مشکل ہوگا۔ کا کو کا لکھنا کچھ غیر مانوس سا ہے تمام تحریروں میں کا۔ کل۔ کالا رائج ہے۔ اسے کا۔ کل اور کالا میں بدلنا مناسب معلوم نہیں ہوتا جب تک کہ اس کی اشد ضرورت نہ ہو۔ نسخ میں اس کی جو صورت موجود ہے وہ نہایت مناسب ہے، عام تحریر میں اگر مروجہ صورت ہی چلتی رہے تو نامناسب نہ ہوگا۔

رسم خط میں اصلاح کرتے وقت یہ چیز پیش نظر رکھنی چاہیے کہ یہی رسم خط تھوڑے تھوڑے تغیر کے ساتھ فارسی اور عربی کے لیے رائج ہے۔ اور یہ دونوں مضامین یہاں بحیثیت مضمونِ تدریس رائج ہیں۔ اس لیے ایسی ترامیم جو اردو کو ان زبانوں سے دور کر دیں اور جو ان میں مغائرت پیدا کرنے کی ذمہ دار ہوں۔ نامناسب ہوں گی۔

رسم خط کے سلسلے میں سب سے بہتر تجویز جو اس وقت اردو کے لیے قبول کی جا چکی ہے یہی ہے کہ طباعت کے لیے نسخ ٹائپ استعمال کیا جائے اور اس کو جس قدر ممکن ہو فروغ دیا جائے۔ نستعلیق ٹائپ بنانے کے سلسلے میں بہت سے تجربے ہو چکے ہیں۔ چوں کہ کوئی بھی کامیاب نہیں ہوا، اس لیے اس کا خیال ترک کر دیا جائے۔ نجی تحریروں کے لیے موجودہ رسم خط اپنی مروجہ صورت میں چلتا رہے۔ البتہ اس میں املا کی جو مشکلات نظر آتی ہیں انھیں آسان کیا جائے۔ املا اور الفاظ کی بناوٹ کے قاعدوں پر نظر ثانی کی جائے، اور جہاں اصلاح کی گنجائش ہو وہاں اصلاح کر دی جائے۔ ہائے ہوز (ہ) اور ہائے مخلوط (ھ) کے استعمال کا کوئی مخصوص ضابطہ نہیں۔ کوئی ہے کو (ہ) سے لکھتا ہے اور کوئی (ھ) سے۔ یہی صورت "لاہور" اور اس قبیل کے دوسرے الفاظ کی املا کی ہے۔ انہی، انھی، انہیں، انھیں، دونوں طرح سے لکھا ہوا دیکھنے میں آتا ہے۔ اس سے بڑوں اور تعلیم یافتہ حضرات کو کوئی دقت نہیں ہوتی۔ البتہ بچوں اور نوآموزوں کو ضرور الجھن ہوتی ہے۔ اس اشتباہ کو دور کرنے کے لیے یہ طے کیا جا سکتا ہے کہ ہائے مخلوط (ھ) صرف وہاں استعمال کی جائے جہاں (ہ) کی آواز کسی دوسرے حرف کے ساتھ مل کر مرکب آواز دیتی ہو۔ باقی تمام موقعوں پر ہائے ہوز (ہ) کا استعمال ہو نھ کی جگہ پر (ٹھہ) کا استعمال غلط قرار دیا جائے تاکہ ٹھہرنا اور ٹھہرنا سے اشتباہ نہ ہو۔

لہجہ، قصہ، سینہ، مہینہ وغیرہ کی طرح کے الفاظ بعض اوقات سینے مہینے کے تلفظ سے پڑھے جاتے ہیں مثلاً میرے سینے میں درد ہورہا ہے یا یہ واقعہ پچھلے مہینے کا ہے۔ املا کے اعتبار سے سینہ اور مہینہ لکھنا جائز ہے لیکن تلفظ اور ادائیگی کے لحاظ سے سینے اور مہینے۔ اس حالت میں اگر ہم املا میں ترمیم کرکے لفظ کی تحریر کو اس کے تلفظ کے مطابق کردیں تو قاری کو پڑھنے میں دقت نہ ہوگی۔

حتیٰ اور اعلیٰ کی قبیل کے عربی الفاظ جو اردو میں رائج ہیں املا کے اعتبار سے عربی طرز پر ہی لکھے جاتے ہیں۔ انجمن ترقی اردو اور بعض دوسرے اہل علم کی ترغیب پر یہ الفاظ یوں بھی لکھے جانے لگے ہیں حتاکہ۔ اعلا۔ ادنا۔ دعوا۔ وغیرہ۔ ایسی ترامیم کے لیے محکمہ تعلیم کو ایک کمیٹی مقرر کرنی چاہیے جو اس قسم کی تمام ترامیم کا جائزہ لے کر ان پر مہر تصدیق ثبت کردے۔ تاکہ آٹھویں جماعت تک کی درسی کتابوں میں انھیں نافذ کردیا جائے۔ اس کمیٹی کو مدرسہ کے طلبا کی سہولت کے لیے اس بات کا بھی فیصلہ کردینا چاہیے کہ کون کون سے الفاظ میں وصل جائز ہے اور کون کون سے الفاظ کا علیحدہ لکھا جانا ضروری ہے۔ قواعد وضوابط کے مقرر ہوجانے سے وہ سب جھگڑے ختم ہوسکتے ہیں جو کبھی کبھی دیکھنے میں آجاتے ہیں۔ بعض لوگ فصل کے اس قدر حامی ہیں کہ وہ نہ صرف چوں کہ۔ چناں چہ نامور ایسے الفاظ میں فصل قائم کرنا چاہتے ہیں۔ بلکہ اس بات کے بھی خواہشمند ہیں کہ دلوانا کو دل وانا۔ بھجنا کو بھیج نا اور پچنا کو پی نا۔ جانور کو جان ور لکھا جائے۔ اس طرح لکھنا تو گویا لاطینی طرز خط کا ہو بہو تتبع کرنا ہے۔ غیر زبان کے الفاظ کو ٹکڑے ٹکڑے کرکے لکھنا بھی احسن سمجھا جاتا ہے۔ مثلاً کانفرنس کو کان فرنس۔ کانگرس کو کانگ رس۔ یونیورسٹی کو یو نی ور سٹی۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ ڈاکٹر کو ڈاک ٹر انسپکٹر کو انس پک ٹر اور ایکٹرس کو ایکٹ ریس لکھنا کچھ مہمل سا نظر آتا ہے۔ اسی طرح طبلچی کو طبل چی۔ خزانچی کو خزان چی۔ سنسکرت کو سن سکرت لکھنا بھی موزوں معلوم نہیں ہوتا۔

املا کا قدیم رجحان یہ تھا کہ الفاظ کو اس حد تک ملا کر لکھا جائے جہاں تک کہ اس کا مفہوم اور مطلب خبط نہیں ہوتا۔ ہمارے خطاطوں اور خوشنویسوں نے اسے بطور ایک فن کے اپنائے رکھا ہے۔ اور الفاظ کو ملانے میں وہ خوش نویسی کا کمال دکھاتے رہے ہیں۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ فصل کو ناجائز سمجھتے تھے۔ نہیں بلکہ حسب ضرورت وہ تزئین اور سجاوٹ کے لیے الفاظ کو الگ بھی لکھتے تھے۔ اس کے برعکس

جدید رجحان یہ ہے کہ جہاں تک ہو سکے مختلف الفاظ کو الگ الگ لکھا جائے تاکہ طلبہ کو پڑھنے اور لکھنے میں سہولت رہے اور تلفظ کی اغلاط نہ ہونے پائیں۔ چناں چہ حالانکہ کو حال آں کہ۔ بلکہ کو بل کہ، بشرطیکہ کو بہ شرطے کہ تاوقتیکہ کو تا وقتے کہ اور خوشگوار کو خوش گوار۔ ہمسر کو ہم سر۔ ہمدرد کو ہم درد۔ بیہودہ کو بے ہودہ لکھا جانے لگا ہے۔

اردو میں جس قدر الفاظ سابقوں اور لاحقوں کی مدد سے بنائے گئے ہیں ان میں سے بیشتر اکٹھے یعنی ملا کر لکھے جاتے رہے ہیں۔ جدید رجحان یہ ہے کہ سابقے اور لاحقے کو اصل لفظ سے بالکل الگ رکھا جائے تاکہ تلفظ، املا اور تفہیم عبارت میں آسانی رہے اور یہ پتہ چل سکے کہ اس لفظ کا اصل مادہ کیا ہے۔ لفظ میں کیا اضافہ ہوا اور کیا تغیر آیا۔ اس طرز املا سے بلاشبہ تحقیق الفاظ اور فہم و درک میں آسانیاں پیدا ہو گئی ہیں لیکن یہ کہنا کہ الفاظ کو ملا کر بالکل غلط ہے۔ نادرست ہے۔ درست نادرست کا فتویٰ حاصل کرنا ابھی مشکل ہے، اس لیے کہ معیاری اور درست املا کے قواعد و ضوابط طے کرنے کے بعد ہی ایسا ہو سکتا ہے۔

"املا کی غلطیاں" خود ایک الگ مضمون ہے اور اس وقت اس پر کچھ تفصیل سے لکھنا مضمون کو طوالت دینا ہے۔ لہٰذا اسے کسی اور وقت پر اٹھا رکھتے ہیں ٭

ذہنی صحت

ڈاکٹر عبدالرؤف

انسان آج ایک نیم مجنون دور سے گذر رہا ہے۔ جنگ وجدل، کشت وخون، تلخیوں اور حادثوں کی تعداد پہلے سے بہت بڑھ گئی ہے۔ مادیت کے امنڈتے ہوئے سیل نے اعلیٰ انسانی قدروں کو متزلزل کر دیا ہے۔ صنعتی ترقی نے جہاں زندگی میں راحت اور آرام کے عنصر کا اضافہ کیا۔ وہاں ساتھ ہی انسان کو بھی مشین کا ایک پرزہ بنا کر رکھ دیا۔ معیار زندگی بہت اونچا چلے جانے اور اس میں تصنع اور پیچیدگی آجانے سے بیسویں صدی کے انسان کی روزمرہ زندگی بے انتہا مصروف، چپکی اور میکانکی ہوتی چلی جارہی ہے۔ آج دنیا بھر میں ایسے بدنصیب افراد کی تعداد بڑھتی چلی جارہی ہے جو سکون اور مسرت کو ترستے ہیں اور یوں محسوس کرتے ہیں جیسے انہوں نے زندگی کی کوئی بیش بہا نعمت کھو دی ہو۔ ایسے افراد بہت نایاب ہیں جو مایوسی، پژمردگی اور دکھ درد کی زد سے محفوظ ہوں۔

افسردگی کی یلغار

ہماری گھریلو زندگی ہی کو لیجیے۔ وہ گھر جو کبھی مسرت اور شادمانی کا محور ہوا کرتے تھے آج افسردگی، یاس اور الجھنوں کا مرکز نظر آتے ہیں۔ بازاروں میں ہاتھا پائی۔ ترش روئی اور بداخلاقی کے مظاہرے عام ہو گئے ہیں ہمارے تعلیمی ادارے اور ثقافتی مرکز۔ ہمارے دفاتر، کارخانے اور دکانیں سبھی ان مریضانہ حالات سے متاثر ہو رہے ہیں۔ ذہنی اور جسمانی مریضوں کی تعداد کا اندازہ ہمارے ہسپتالوں کی بڑھتی ہوئی آبادی سے خوب لگایا جاسکتا ہے۔

ہماری زندگی کے تمام افسوسناک پہلو ہمیں اس بات پر سوچنے پر مجبور کر رہے ہیں کہ آخر جینے کا کچھ لطف یا مقصد ہونا چاہیے۔ انسان کی زندگی کا سب سے بڑا المیہ یہ ہے کہ اس نے اپنے مادی ماحول اور مادی ضروریات کے بارے میں کافی بحث اور تحقیق کی ہے جس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ زندگی کی روزمرہ نعمتوں اور آسائشوں میں بیش قابل قدر اضافہ ہوا ہے۔ مگر ایک بڑی بدقسمتی یہ رہی ہے کہ انسان نے اپنے آپ اور اپنی سمجھ اور بہتری

کے اہم پہلو کو اس حد تک نظرانداز کیے رکھا ہے کہ وہ آج اپنی اس غفلت کی سزا بھگت رہا ہے۔ آج انسان اپنے کیے پر سخت پشیمان نظر آتا ہے۔ ذہنی صحت تمام انسانوں کو زندگی کا پیغام دیتی ہے جو اپنے آپ کو یاس، افسردگی اور بیماری کی یلغار سے واقعی محفوظ رکھنا چاہتے ہوں۔

پچھلی جنگ عظیم کے بعد مغرب میں ذہنی مریضوں کی تعداد اس قدر بڑھ گئی تھی کہ ماہرین نفسیات علاج معالجہ کے کام میں رات دن مصروف رہنے لگے۔ معاشرے کے ان محسنوں کی شبینہ روز کوششوں کا ایک نتیجہ یہ بھی نکلا کہ علم ذہنی صحت ایک واضح اور باضابطہ سائنس کی حیثیت سے معرض وجود میں آگیا۔ یہ علم اب اس قدر ترقی کر چکا ہے کہ انسانی صحت اور ترقی کی آس پھر بندھ گئی ہے۔ علم ذہنی صحت نے صحت کا ایک ایسا جامع تصور پیش کیا ہے جس کے مبادیات کو ٹھکرانا خطرے سے خالی نہیں۔

ذہنی صحت کا مقصد

ذہنی صحت کا مقصد یہ ہے کہ انسان کے من کی دنیا میں توازن قائم کیا جائے اور اسے طرح طرح کی ذہنی بیماریوں سے محفوظ رکھا جائے۔ یہ توازن اور یہ حفاظت اسی صورت میں ممکن ہے جب ہماری شخصیت ایک منظم اور ایک اکل کی حیثیت سے کام کرے۔ پیدائش کے وقت فطرت ہر انسان کو چند جبلتیں ودیعت کرتی ہے۔ مثلاً بقائے ذات یا خطرے سے بھاگنے کی جبلت۔ غصہ اور نفرت کی جبلتیں۔ پدری جبلتیں۔ بیکسی کی حالت میں التجا کرنے کی جبلت جنسی جبلت۔ تجسس۔ گروہی اور تعمیری جبلتیں وغیرہ وغیرہ۔ ہر جبلت کا ایک مخصوص دائرہ عمل ہوتا ہے۔ ایک منظم شخصیت میں تمام جبلتوں کو اپنے اپنے مخصوص دائرہ میں پورا ہونے کے باقاعدہ مواقع میسر آتے رہتے ہیں۔ ان مختلف جبلتوں میں تصادم یا تو واقع ہی نہیں ہوتے اور اگر ہوتے ہیں تو شخصیت ان میں سمجھوتے کا کوئی نہ کوئی حل ڈھونڈ لیتی ہے، جس کا مجموعی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ انسان اپنی زندگی میں مسرت اور توازن محسوس کرتا ہے اور اپنے روزمرہ مشاغل میں کامیابی سے شرکت کرتا ہے۔

فطری جبلتوں کے علاوہ انسان اپنی زندگی میں متعدد اکتسابی صلاحیتیں بھی حاصل کر لیتا ہے۔ مثلاً لکھنا، پڑھنا۔ روزمرہ کردار کے آداب۔ روزی کمانے کا کوئی مناسب ذریعہ۔ جی بہلانے کے مختلف ڈھنگ وغیرہ وغیرہ۔ ان صلاحیتوں کی تحصیل کے لیے فرد کو بہت محنت اور تگ و دو کرنی پڑتی ہے۔ جبلتوں کی طرح

ان اکتسابی صلاحیتوں کا بھی مخصوص دائرہ عمل ہوتا ہے۔ ایک منظم اور صحت مند فرد مشاہدوں اور تجربوں کی روشنی میں اپنے اندر یہ سلیقہ پیدا کر لیتا ہے کہ ان صلاحیتوں میں تصادم اور الجھاؤ پیدا نہ ہو اور ہر صلاحیت کو مناسب وقت اور مناسب مقام پر مناسب طریق سے پورا ہونے کا مناسب موقع میسر آجائے۔

صحت مند انسان

انہی فطری جبلتوں اور اکتسابی صلاحیتوں کے بہتر اور مکمل اظہار اور ان کے مابین مطابقت اور ہم آہنگی کا نام ذہنی صحت ہے۔ ذہنی طور پر تندرست فرد ایک ایسا انسان ہے جو محبت کے جذبوں کی مناسب طریقے سے تشفی کرتا ہے۔ ذوق تجسس کی تشفی کے لیے تحصیل علم کرتا ہے۔ خطرے اور برائی سے گریز کرتا ہے۔ راحت اور اچھائی سے لگاؤ رکھتا ہے۔ خود خوش رہتا ہے اور دوسروں کو خوش رکھتا ہے۔ غرض کہ وہ اپنی صلاحیتوں کے جامع اور متوازن اظہار اور ان میں نظم ولسق اور ہم آہنگی کے لیے صحیح سمتوں میں کوشش کرتا رہتا ہے۔ مگر فطری اور اکتسابی صلاحیتوں کا مکمل اظہار اور اُن میں ہم آہنگی اس وقت تک ناممکن ہے جب تک انسان کے سامنے زندگی کا کوئی مقصد، کوئی اصول، کوئی نصب العین نہ ہو۔ ذہنی صحت کا مطلب پھر یہ ہوا کہ اپنی فطری اور اکتسابی صلاحیتوں کو اظہار اور مطابقت کے ایسے ایسے مواقع مہیا کرنا جس سے زندگی کے معیار اور نصب العین پورے ہوں۔

بات کی وضاحت کے لیے ہم ذہنی صحت کے ان مختلف اجزا کو علیحدہ علیحدہ سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ مکمل اظہار کا مطلب یہ ہے کہ ہم اپنی تمام صلاحیتوں کو پوری طرح بیان ہونے کے معقول مواقع دیں۔ ہماری مختلف صلاحیتیں مثلاً محبت کا ولولہ یا کسی فن میں مہارت پیدا کرنے کا شوق ہماری زندگی۔ ہماری سیرت اور ہمارے اخلاق کے لیے ضروری ہیں۔ اگر انہیں اظہار کا موقع نہ دیا جائے یا انہیں کچل دیا جائے تو ہماری شخصیت کو نقصان پہنچتا ہے، ہم میں کام کی صلاحیت کم ہو جاتی ہے۔ ہماری سیرت میں فرق پڑ جاتا ہے اگر انہیں کچلنے کا سلسلہ زیادہ ہی شدید ہو تو ممکن ہے ہم اپنا ذہنی توازن مکمل طور پر کھو دیں اور کسی نہ کسی ذہنی بیماری میں مبتلا ہو جائیں۔

ہم آہنگی کی ضرورت | اسی طرح تمام فطری اور اکتسابی صلاحیتوں میں نظم مطابقت اور ہم آہنگی

ضروری ہے۔ اگر یہ نہ ہو تو ہماری شخصیت میں ایک کہرام اور ایک ابتری مچ جائے۔ ہمارا سکونِ قلب جاتا رہے راحت مفقود ہو جائے۔ ہم افسردہ و پژمردہ رہنے لگیں۔ ذہنی صحت کے لیے ضروری ہے کہ ہماری مختلف صلاحیتیں اور فطری تقاضے جسم کے مختلف اعضا کی طرح ایک دوسرے سے تعاون اور مطابقت کریں۔ ان میں باہمی الجھاؤ اور کشیدگی رونما نہ ہو۔

ہمارے فطری تقاضوں اور اکتسابی صلاحیتوں کے صحت مندانہ اظہار اور ان میں باہمی ربط و ہم آہنگی کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ ہمارے سامنے زندگی کے چند اصول اور معیار ہوں۔ اصولوں اور معیاروں کے بغیر فرد یوں محسوس کرتا ہے، جیسے وہ کوئی منزل متعین کیے بغیر کسی لمبے سفر پہ جا رہا ہو۔ روزمرہ مشاغل بلکہ ساری زندگی بے معنی اور پھیکی دکھائی دینے لگتی ہے اور امنگوں کو بہتر سمتیں دینے کی تڑپ ماند پڑ جاتی ہے۔

موزوں نصب العین

جس طرح زندگی کا کوئی نصب العین نہ ہونے سے ذہنی صحت خطرے میں پڑ جاتی ہے اسی طرح کوئی غلط یا غیر موزوں نصب العین سامنے رکھ لیا جائے تو بھی پریشانی اور بیماری کا خطرہ لاحق ہو جاتا ہے۔ مثلاً اگر کوئی شخص اپنے آرام اور اپنی مسرت کے لیے ہر دوسرے شخص کو محض ایک ذریعہ کے طور پر استعمال کرنے ہی کو زندگی کا مقصد بنا لے تو اس سے اس کی اپنی بہتری اور مسرت کے امکان گھٹ جاتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ایسے خود غرض شخص کا اکثر لوگوں سے الجھاؤ ہوگا۔ اس الجھاؤ کی وجہ سے کشیدگی اور تنازعہ پیدا ہونا یقینی ہے جس سے افسردگی اور یاس کے امکان زیادہ ہو جاتے ہیں۔ اسی طرح کوئی انتہا پسندانہ معیارِ زندگی وضع کر لینا بھی اپنے من سے بڑی زیادتی ہے۔ مثلاً دنیا چھوڑ چھاڑ کر تارک بن جانا اور رات دن صرف عبادت ہی میں لگے رہنا اپنے آپ کو زیادہ نیک زیادہ بہتر اور زیادہ خوش رکھنے کے امکانات سے دور لے جانے کے مترادف ہے۔ زندگی کے معیار اور نصب العین وضع کرنے میں میانہ روی صحت مندی کی علامت ہے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "بہترین راستہ درمیانی راستہ ہے"۔ زندگی کا درمیانی راستہ ایسا راستہ ہے جس میں زندگی کے ہر شعبے کا کچھ نہ کچھ حصہ بلکہ لب لباب شامل ہے۔ اس قسم کے جامع اور متحمل نصب العین ہی سے انسان کو اپنی صلاحیتوں کے بے باک اور متوازن اظہار کے بہترین مواقع میسر آتے ہیں جس سے انسان کی ذہنی صحت

متعدد خطروں سے محفوظ رہتی ہے اور وہ ایک بہتے ہوئے دریا کی طرح زندگی کی تمام منزلیں بڑے خوشگوار طریقے سے طے کرتا چلا جاتا ہے۔

ذہنی صحت کا معیار دوسرے معیاروں سے قدرے مختلف ہے، ذہنی صحت کے معیار کا چند دوسرے معیاروں سے موازنہ کیا جائے تو یہ نکتہ اچھی طرح سمجھ میں آجاتا ہے۔ مثلاً علم حیاتیات محض جسمی چالاکی اور جسمانی توانائی ہی کو معیار زلیست قرار دیتا ہے۔ اگر ایک فرد اپنے فرائض خوب اچھی طرح انجام دیتا ہے، اس کے اعضا درست ہیں اور وہ روزمرہ زندگی میں کامیاب نظر آتا ہے تو اس معیار کے مطابق وہ صحت مند فرد ہے یہی وفا معیار ہے جسے سامنے رکھ کر عام ڈاکٹر کسی فرد کو تندرست یا بیمار قرار دیتے ہیں۔ وہ ارباب صنعت و حرفت جن کا واحد مطمح نظر اپنے کارخانوں میں نظم و نسق قائم رکھنا اور کام کاج کی رفتار کو تیز کرنا ہی ہوتا ہے۔ اسی معیار کو اپنا رہنما بناتے ہیں۔ اکثر حالتوں میں وہ اساتذہ بھی اسی معیار کے مقلد معلوم ہوتے ہیں، طلبہ کو امتحان پاس کروانے یا وظیفہ دلوانے ہی کو اپنا فرض اولین سمجھتے ہیں۔

صحت کے چند محدود معیار

اب ظاہر ہے کہ اس قسم کا محدود معیار ذہنی صحت کے لیے قابل قبول نہیں ہو سکتا۔ ہمارہ روزمرہ مشاہدہ گواہ ہے کہ کئی ایسے افراد جنہیں ڈاکٹر "فٹ" یعنی تندرست قرار دے دیتے ہیں بیشمار ایسی الجھنوں کا شکار نکلتے ہیں۔ جو انہیں نہ صرف مسرت سے نا آشنا رکھتی ہیں بلکہ ان کے جسم پر ایک مستقل بوجھ بن کر انہیں زندگی کے کئی مشاغل میں کامیاب مشارکت سے محروم ہی کر دیتی ہیں۔ اسی طرح وہ کارخانہ دار جو اپنے کارخانہ میں ظاہری نظم و نسق اور کاریگروں کے کام کی رفتار ہی کو اپنا نصب العین بنا لیتا ہے۔ اپنے عملہ کی ذہنی صحت ہی برباد نہیں کرتا بلکہ مالی اعتبار سے بھی گھاٹے میں رہتا ہے۔ وہ معلم جو امتحان پاس کرنے اور وظیفہ حاصل کرنے ہی کو اپنے طلبہ کی کامیابی اور صحت سمجھتا ہے تعلیم کے بنیادی اصولوں ہی کا خون نہیں کرتا بلکہ اکثر طلبہ کی صحت اور صلاحیت برباد کرنے کا ذمہ دار بھی بنتا ہے۔ جانچنے کے ان مخصوص طریقوں کی روشنی میں ڈاکٹر کارخانہ دار اور معلم سب کے نزدیک یہ افراد تندرست اور کامیاب ہیں۔ مگر اس امر میں قطعی شک نہیں کہ بہت زیادہ امکان ہے کہ ان میں سے اکثر افراد کسی ایسی خرابی۔ علت۔ عادت۔ وہم۔ غم۔ خوف وغیرہ کا

شکار ہوں جوان کی صحت اور مرض یہ کامیابی میں سدِّ راہ بنی ہو۔

اس لیے ذہنی صحت کے اعتبار سے حیاتیاتی معیار قابلِ اعتماد نہیں کیونکہ ایک فرد جو اس معیار کی رو سے صحت مند اور ٹھیک ٹھاک قرار دیا جاتا ہے مریض یا ناقابل ہو سکتا ہے۔ مگر اس کا مطلب یہ بھی نہیں کہ ذہنی صحت الطبیت کے حیاتیاتی معیاروں کو بالکل نظر انداز کر دیتی ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ جہاں عام ڈاکٹر جسمانی اعضا کی ساخت اور عمل کو صحیح پا کر کسی شخص کو صحت مند قرار دے دیتا ہے وہاں ذہنی طبیب ان عناصر کے علاوہ اس بات کو بھی قابلِ غور قرار دیتا ہے کہ کیا اُس فرد میں یہ قابلیت بھی موجود ہے کہ وہ اپنے جسم کو اس طرح استعمال کرے کہ اس کی تمام صلاحیتوں کو مکمل اور متوازن طور پر بیان ہونے کا موقع ملے۔ اس کی سیرت اور شخصیت پھلے پھولے اور وہ اپنی اور دوسروں کی مسرت کا باعث بنے۔ اسی طرح کارخانہ میں کام کرنیوالا فرد زیادہ کام کرنے کی وجہ سے صحت مند قرار نہیں دیا جا سکتا، بلکہ یہ بھی دیکھنا پڑتا ہے کہ آیا وہ اپنا کام رضا و رغبت اور دلجمعی سے بھی کرتا ہے یا نہیں، اپنے ساتھیوں سے خواہ مخواہ الجھتا تو نہیں، یعنی اس کے کام کی نوعیت اور رفتار کے علاوہ کام کے دوران میں اس کا ذہنی رجحان دونوں امور مل کر اس کی ذہنی صحت سے متعلق مناسب مواد بہم پہنچاتے ہیں۔

معاشرتی مطابقت

اسی طرح متوازن زندگی کے لیے محض معاشرتی مطابقت ہی کوئی جامع معیار نہیں ہو سکتا۔ حیاتیاتی معیار کی طرح معاشرتی معیار بھی بہت مفید ہے۔ بجا ہے کہ ہم لوگوں سے کٹی ہوئی تنہا اور جوگیانہ زندگی بسر نہیں کر سکتے۔ ہمیں خاندانوں، گروہوں اور جماعتوں میں رہنا پڑتا ہے، اس لیے اپنے گرد و پیش کے افراد سے حسن اور مطابقت کامیاب زندگی کے لیے ضروری بھی ہے اور مفید بھی۔ یہ معیار بھی تنگ نظر دکھائی دیتا ہے۔ ایسے بس اسے ہی زندگی کا رہنما بنا لینا ذہنی صحت کے اصولوں کے منافی ہے۔ بعض افراد اس حد تک سوشل یا گروہ پسند ہو جاتے ہیں کہ انہیں اپنے آپ اور اپنے بیوی بچوں کا قطعی دھیان نہیں رہتا۔ معاشرتی معیار کی رُو سے تو ایسے لوگ صحت مند ہیں۔ مگر ذہنی صحت کے اعتبار سے کافی حد تک مریض۔ اپنی انفرادیت اور خصوصی صلاحیتیں اجاگر کرنے کے لیے یہ امر ضروری ہے کہ معاشرے کی اندھا دھند تقلید اور اس میں ہر وقت گم رہنے کی بجائے ہم کبھی کبھی

کی طرف بھی متوجہ ہوا کریں۔ بلکہ اگر ہم محسوس کریں کوئی گروہ یا معاشرہ غلط سمتوں کی طرف مائل ہے تو ایسی حالت
اس سے کنارہ کشی یا سرکشی عین صحت کی نشانی ہے۔ بسا اوقات معاشرہ اور اس کے فکر اور کردار کے انداز بڑی
ی سے رنگ بدل لیتے ہیں۔ اب اگر ایک فرد بھی گرگٹ کی طرح رنگ بدلتا جائے تو اسے تندرست کہنا بہت زیادتی
۔ مگر ذہنی صحت کے معیار میں معاشرتی مطابقت کو نظر انداز ہی نہیں کیا گیا۔ ذہنی صحت کا تقاضہ ہے کہ ہم معاشرے
بہتر افراد سے تعاون کریں اور ان کے بہتر اعمال میں مناسب شرکت کریں تاکہ ہماری صلاحیتیں اجاگر ہوں اور
ایک صحت مند فرد بن جائیں۔

اقی معیار

اسی طرح خالص اخلاقی معیار بھی ذہنی اعتبار سے ہماری مکمل رہنمائی نہیں کر سکتا۔ دنیا میں بے شمار ایسے
موجود ہیں جو تمام اخلاقی اصولوں پر کاربند ہونے کے باوجود تندرست نہیں ہیں، ایسے لوگوں کی کمی نہیں
بے حد بااخلاق ہیں مگر پریشانی کم خوابی وغیرہ کا شکار رہتے ہیں۔ بے شمار نیک۔ خدا ترس اور مذہبی
وں کے پابند لوگ ڈر خوف اور طرح طرح کی جنسی پریشانیوں میں مبتلا رہتے ہیں۔ یہ ساری باتیں اس
ثبوت ہیں کہ محض نیک ہونا ہی صحت کے لیے کافی نہیں۔ کامیاب زندگی کے لیے من کی بستی کا علم بھی
ی ہے۔ مگر ذہنی صحت کا معیار اخلاقی اصولوں کی تحقیر بھی نہیں کرتا۔ بلکہ اخلاقی اصولوں کے احترام کو ذہنی
کی ایک علامت قرار دیتا ہے، جہاں اخلاقی معیار۔ نرے اخلاقی ضابطوں اور اصولوں کی پابندی ہی
ستی اور زندگی قرار دیتا ہے۔ وہاں ذہنی صحت کا معیار ان اصولوں کو انسانی شخصیت کا نقطہ ایک جزو
ہے۔ نبی اکرم صلعم نے فرمایا "جس نے اپنے آپ کو پہچانا اس نے اپنے رب کو پہچان لیا" یعنی جو شخص
کی دیکھ بھال اور اس کی صحت کے لیے کوشش کرتا ہے وہ اپنی ذہنی صحت کی بنا پر خدا سے تعلق
نے۔ نیک بات سمجھنے اور اس پر عمل کرنے کے قابل بھی ہو جاتا ہے، اپنے من کو پہچاننے سے انسان میں
جاتا ہے اور اس کی صلاحیتیں اس حد تک پھلتی پھولتی ہیں کہ وہ خدا کو بھی پا لیتا ہے۔

ظاہر ہے کہ صحت کے باقی معیاروں کے برعکس ذہنی صحت کا معیار محدود نہیں بلکہ بہت جامع ہے، اگر
کو سامنے رکھا جائے تو ہماری شخصیت اور زندگی کے تمام پہلوؤں میں مسرت توازن اور ترقی کے امکان

بہت بڑھ جاتے ہیں۔

ذہنی صحت کی اہمیت

ذہنی صحت کے اصولوں پر عمل کرنے کے فوائد بے شمار ہیں۔ ان اصولوں پر عمل کیا جائے تو فرد اور معاشرہ دونوں کو بے پناہ فائدہ پہنچتا ہے۔ ایک ایسے فرد کا تصور کیجیے جس کا جسم خوب ہٹا کٹا ہو جس کے پاس دولت و ثروت کے انبار لگے ہوں اور جسے دنیا کی ہر مادی آشائش مہیا ہو۔ مگر فقط ایک کمی رہ گئی ہو کہ اسے سکون قلب یا ذہنی توازن کی نعمت سے محروم کر دیا گیا ہو۔ ایسے بدنصیب شخص کے لیے تمام مادی آشائشوں کا ہونا یا نہ ہونا ایک برابر ہے اس کے برعکس ایک عام آدمی جسے ذہنی صحت کی وجہ سے مسرت و شادمانی کی نعمتیں میسر ہوں کس قدر خوش نصیب ہے اس کے سامنے زندگی کے مادی میدان میں کامیابی اور ترقی کے تمام زینے ہر وقت کھلے ہیں۔

ذہنی صحت اور معاشرہ

ذہنی صحت کے اصولوں کو ملحوظ خاطر رکھنے سے معاشرے کو بھی بے حساب فائدہ پہنچتا ہے۔ صحت مند افراد اپنی صلاحیت اور قابلیت کی بنا پر معاشرے کے مختلف شعبوں میں قابل قدر خدمات سرانجام دینے کے ذمہ دار بنتے ہیں۔ مختلف اداروں دفتروں کارخانوں وغیرہ کی کامیابی کا انحصار انہی افراد پر ہوا کرتا ہے جس کے برعکس فقط ایک بیمار یا ناقص فرد کئی دوسروں کی صحت اور خوش حالی کی بربادی کا ذمہ دار بھی بن سکتا ہے۔ کسی خاندان، دفتر، ادارے یا کارخانے میں فقط ایک بد مزاج یا ایک ذہنی مریض کے وجود سے اس قدر بھیانک نتائج پیدا ہو سکتے ہیں جن کی زد میں ان گنت لوگ آ سکتے ہیں اور جن کی روک تھام اور علاج ممکن ہے ساری دنیا کی دولت و ثروت صرف کرنے سے بھی نہ ہو سکے۔ بد مزاج، غصیلے اور جھگڑالو افراد لڑائی جھگڑوں میں اضافہ کا موجب بن کر پولیس عدالت اور جیل کی مصروفیات بڑھا دیتے ہیں۔ ایک ذہنی مریض کئی دوسروں کو مریض بنا کر ہسپتالوں کی آبادی اور اخراجات میں اضافہ کا باعث بن جاتا ہے۔ اگر اس قسم کے ذہنی مریض سیاسی میدان میں چلے جائیں اور اپنی طرح کے چند دیوانے اپنے ہم خیال بنا لیں تو طاقت کے غلط استعمال کی وجہ سے وہ ظلم و ستم اور جنگ و جدل کا باعث بن جاتے ہیں۔ اس صورت میں نہ صرف ان کا اپنا وطن بلکہ ساری دنیا کی صحت اور امن خطرے میں پڑ سکتے ہیں۔ ابھی چند سالوں کی بات ہے کہ دنیا کے ایک چھوٹے سے ملک میں ایک سرپھرے

مجنون کو اس قسم کا موقع ہاتھ آگیا۔ اس نے نہ صرف اپنے ملک ہی میں خوف و ہراس کی لہر بپا کردی بلکہ ایک ایسی عالم گیر جنگ کا باعث بھی بنا جس کے شعلوں نے تمام دنیا کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ مگر ہٹلر کو بچپن ہی سے کسی ماہر نفسیات کے زیر علاج رکھا گیا ہوتا تو دنیا اس عالم گیر تباہی سے بچ گئی ہوتی اور علم و ادب، سائنس اور انسانیت کے وقار کو اس قدر مہلک ٹھیس نہ لگی ہوتی۔

اس میں قطعی شک نہیں کہ ہماری اپنی ذاتی بھلائی۔ ہمارے بیوی بچوں اور خاندان کی بہتری ہمارے وطن اور معاشرے کی ترقی اور تمام دنیا اور اس میں بسنے والی تمام قوموں کی فلاح و بہبود کے لیے یہ بات بے حد ضروری ہے کہ ہم سب ذہنی صحت کی اہمیت کو سمجھیں۔ اس کے اصولوں پر خود عمل کریں اور دوسروں کو بھی عمل پر آمادہ کریں ۃ

نصاب تعلیم

محمد ابوالفتح

نصاب تعلیم ان تجربوں، سرگرمیوں اور تحریکوں کی ایک فہرست ہے جسے ماہرین تعلیمات و نفسیات موجودہ اور آنے والے حالات کا جائزہ لے کر فلاسفروں کے مشورے سے مرتب کرتے ہیں اور یہ حکومت وقت کی منظوری سے رائج ہوتا ہے۔

اسے مرتب کرتے وقت ذیل کے بنیادی اصولوں کو پیش نظر رکھا جاتا ہے۔

(i) یہ بچے کی ذہنی، جسمانی، روحانی اور جذباتی تربیت کر سکے اور اس کے جمالیاتی وقوف کو بڑھا سکے۔

(ii) یہ بچے کی فطری جبلتوں کی تصعید کر سکے، اس کی خصوصی صلاحیتوں کو بروئے کار لا سکے اور اسے معاشرے کا ایک سرگرم اور مفید و باعمل رکن بنا سکے۔

(iii) قوم نے جو کلچر حاصل کیا ہے، یہ اس سے بچے کو نہ صرف آشنا کرائے بلکہ اس میں اضافہ کرکے بھی قابل بنائے۔

(iv) تعلیم کے جملہ مقاصد بوجوہ احسن حاصل ہوں اور اس غرض کے لیے قومی، ملکی اور مقامی مسائل کے علاوہ منتظمین مکاتب کے مالی وسائل، اساتذہ اور تدریسی سامان کو بھی سامنے رکھا جائے۔

بے شک قیام پاکستان کے بعد محکمہ تعلیم نے نصاب میں انقلابی تبدیلیاں کرکے اسے ایک آزاد اور ترقی پسند قوم کے شایان شان بنانے کی کوشش کی ہے۔ مگر جہاں انسانی ذہن فعال اور ترقی پسند ہے وہاں زمانہ بھی تغیر پذیر ہے۔ اس لیے موخرالذکر کی روز افزوں ضروریات کو پورا کرنے کے لیے نصاب تعلیم میں وقتاً فوقتاً تبدیلیاں کرتے رہنا لازمی ہو گیا ہے۔

حالات حاضرہ کا تقاضہ ہے کہ نیا نصاب مرتب کرتے وقت ذیل کے امورات کو بھی زیر نظر رکھا جائے۔

(1) سلیبس کمیٹی میں دور افتادہ علاقوں کے دیہاتیوں بالخصوص سرپنچوں، نمبرداروں اور استادوں کو بھی نمائندگی دی جائے تاکہ وہ بھی اپنی مشکلات اور ضروریات کو بیان کر سکیں۔

(۲) اساتذہ کی رہنمائی کے لیے فن تدریس پر ایسی کتب شائع کی جائیں جو تربیت حاصل کرنے کے بعد بھی انکی مدد کر سکیں۔ ان کتب میں درسی مشکلات کا حل بھی ہو۔ اس سے جہاں تدریس مؤثر ہو سکے گی وہاں خلاصوں اور نوٹوں کی وبا بھی کم ہو جائے گی۔

(۳) محکمہ تعلیم کو سلیبس کمیٹی کی سرپرستی میں ایک ایسا ماہوار رسالہ جاری کرنا چاہیے جس میں عام تعلیمی مسائل کے علاوہ تدریسی اور تحقیقاتی مقالے بھی شائع ہوں۔

(۴) قیام پاکستان سے پہلے پرائمری درجے میں عام طور پر صرف تین بڑے بڑے مضامین پڑھائے جاتے تھے۔ مگر اس کے بعد دینیات۔ واقفیت عامہ (شہریت۔ تاریخ۔ جغرافیہ) جیومیٹری فنون عملی (ڈرائنگ۔ دستکاری) اور ابتدائی سائنس (روزمرہ کی عام سائنس، زراعت۔ حفظان صحت) کے علاوہ متعدد تعلیمی تحریکوں اور سرگرمیوں کا اضافہ ہوا ہے۔ مگر تعلیمی اوقات وہی ہیں۔ اس سے بالخصوص وقت کی کمی کی وجہ سے بچوں کی قابلیت محدود ہو کر رہ گئی ہے اور نتائج گرتے چلے جا رہے ہیں اس لیے ضروری ہے کہ

(ا) کچھ تو تعطیلات کم کر دی جائیں

(ب) کچھ اوقات مدرسہ میں اضافہ کیا جائے اور

(ج) کچھ نصاب کو مختصر کیا جائے۔

(۵) ایک ہی نصاب پر لکھی ہوئی کتب کو بغور دیکھا جائے تو ان کے مفاد میں ایک نمایاں فرق نظر آتا ہے یکسانیت اور ہم آہنگی پیدا کرنے کی خاطر آئندہ نصاب کو مفصل اور واضح طور پر لکھا جائے۔

(۶) ہمارے ملک میں زبان کا مسئلہ سب سے زیادہ اہم اور قابل توجہ ہے۔ ایک چھوٹے بچے کو اپنی مادری زبان مثلاً پنجابی کے علاوہ اردو بطور ذریعہ زبان سیکھنی پڑتی ہے اور عربی بطور مذہبی زبان کے۔ ان تینوں زبانوں کے ساتھ ساتھ بعض والدین محض نام و نمود کی معاشری برتری حاصل کرنے کی خاطر اپنے بچوں کو ایسے سکولوں میں داخل کر دیتے ہیں جہاں فیس زیادہ اور انگریزی تعلیم کا ابتدا سے ہی انتظام ہو۔ ایسے سکول تعلیمی اوقات کا ایک معتدبہ حصہ اس زبان کی نظر کر دیتے ہیں جس سے بچوں کے دیگر مضامین خاص طور پر

حساب۔ اُردو وغیرہ کمزور اور دینیات بمنزلہ صفر کے رہ جاتی ہے۔ ان حالات میں ایسے تمام منظور شدہ پرائمری مدارس کے لیے لازمی قرار دیا جائے کہ وہ ہفتے میں دو پیریڈوں سے زیادہ انگریزی پر صرف نہ کریں۔

(۷) دینیات کو ایک لازمی مضمون قرار دیا جائے اور اس میں پاس ہونا ضروری ہو۔

(۸) تعلیم کو باکار اور ضروریات زندگی کے عین مطابق بنانے کی خاطر پروجیکٹ میتھڈ (تعلیم بذریعہ منصوبہ بندی) کی حوصلہ افزائی کی جائے اور اس طرح تعلیم کو الگ الگ مضمون وار پڑھانے کی بجائے اسے ایک واحد اکائی کی صورت میں پیش کرنے کے اقدامات کیے جائیں

(۹) املا اور خوش خطی کو بہتر بنانے کے لیے پانچویں جماعت تک تختی کا استعمال ضروری قرار دیا جائے اور تیسری جماعت تک لوہے کے قلم کے استعمال کی ممانعت ہو۔

(۱۰) اردو کی اضافی کتاب کو خارج از نصاب قرار دے کر اس کی بجائے لائبریری کی کتابیں اور بچوں کے رسالے پڑھائے جائیں۔

(۱۱) قواعد اردو کے اسباق درسی کتاب میں ہی شامل ہوں اور اس کے لیے الگ کوئی کتاب نہ ہو۔

(۱۲) دیہاتی اور شہری ضروریات کا الگ الگ التزام کیا جائے، اور کتابوں میں بعض ایسے متبادل اسباق ہوں جو صرف ایک خاص قسم کی آبادی یا صرف مقامی ضروریات کو پورا کر سکیں مثلاً :-

(۱۳) <u>دیہاتی مسائل</u>

(i) اکثر طلبا پرائمری کے بعد تعلیم جاری نہیں رکھ سکتے، اس لیے ان کے لیے رومن کی تعلیم کا انتظام کیا جائے اس سے انہیں ناموں کے صحیح لکھنے اور انگریزی پڑھنے میں بھی مدد ملے گی۔

(ii) کاغذات پٹوار سے واقفیت دلائی جائے۔ اور مختلف پرچوں کے حصول کا طریقہ اور ان کی اُجرت بتائی جائے

(iii) درخواست خرابہ، راہداری، رسیدات وغیرہ کے لکھنے میں مہارت پیدا کرائی جائے۔

(iv) شرح۔ معاملہ۔ آبیانہ۔ لوکل ریٹ۔ آب ضائع تاوان، چوکیدارہ، چولھا ٹیکس وغیرہ بتا کر ان پر حسابی سوالات بھی حل کرائے جائیں۔

(v) (i) نہری پیمانے بتائے جائیں اور

(ب) آبپاشی کے سلسلے میں حساب وارہ بندی سمجھایا جائے اور بتایا جائے کہ مختلف رقبوں کی سیرابی کے
کتنا وقت اور کتنا پانی صرف ہوتا ہے۔

(ج) دن کو دھوپ گھڑی کے ذریعہ اور رات کو چاند اور ستاروں کے ذریعے وقت معلوم کرنا سکھایا جائے۔

(iii) عام دیہاتی نقد کی بجائے جنس کے عوض ضروریات زندگی خریدتے ہیں اس لیے حساب میں
اس قسم کے سوال بھی شامل کیے جائیں۔

(۱۴) شہری مسائل

(i) ہر بچے کو سکول میں داخل ہوتے ہی اپنا، اپنے باپ کا نام، گھر کا پورا پتہ اور گھر سے سکول تک کا راستہ
یاد کرایا جائے۔ نیز اپنی حفاظت کے طریقے بتائے جائیں۔ اس سے گم شدگی کی وارداتیں کم ہو جائیں گی۔

(ii) بچوں کو بتایا جائے کہ بجلی ایک فرماں بردار خادم مگر خطرناک آقا ہے۔ اس لیے اس سے پوری احتیاط سے
کام لیا جائے۔ وہ بجلی سے چلنے والے عام آلات۔ مثلاً پنکھا۔ بلب۔ ریڈیو وغیرہ استعمال کر سکتے ہوں۔
انہیں میٹر پڑھنا اور بجلی کے علاوہ پانی کا بل تیار کرنا بھی آتا ہو۔

(iii) بجلی اور پانی کے کنکشن حاصل کرنے کا طریقہ بتایا جائے اور یہ بھی سمجھایا جائے کہ راشن بک کیسے حاصل کی جاتی
ہے، بجلی۔ پانی، اور خوراک کے متعلق قانون کی ضروری ضروری شقیں اور قاعدے بتائے جائیں۔ اور مختلف
مقدار کے راشنوں کی قیمتیں نکالنی سمجھائی جائیں۔

(iv) زمین حاصل کرنے اور مکان کا نقشہ منظور کرانے کا طریق کار بتایا جائے۔ نیز مختلف مکانات کے تعمیری
اخراجات پر بھی سوال حل کرائے جائیں۔

(v) ٹریفک کے قوانین کی عملی تعلیم دی جائے اور ان کی خلاف ورزی کرنے کی صورت میں جن خطرناک نتائج
سے دوچار ہونا پڑتا ہے ان سے آگاہ کیا جائے۔ اسی طرح ٹریفک کے چالان، مجسٹریٹ کے سامنے
پیشی اور سزا نیز جرمانہ وغیرہ کے متعلق واقفیت دلائی جائے۔

(vi) اموات و پیدائش کا اندراج کیوں اور کس طرح کرانا چاہیے۔ اور اس سے غفلت برتنے کی صورت میں
محکمہ صحت کیا کارروائی کرتا ہے اور کیا جرمانہ ہوتا ہے۔

(viii) عام شہری لوگ اچھی غذا اور صاف ہوا کس طرح حاصل کر سکتے ہیں۔ اور وہ دیہاتی بھائیوں کی طرح کس طرح صحت مند مضبوط اور جفاکش بن سکتے ہیں۔

(۱۵) مشترک مسائل

(i) ذرائع آمد و رفت :- اپنے گھر سے مختلف مقامات کے فاصلوں اور کرایوں کا جاننا اور ریلوے ٹائم ٹیبل کا استعمال کر سکنا۔

(ii) عام گھریلو ضروریات :- پارچات۔ مختلف عرض کے تھانوں سے قمیض سلوار وغیرہ کتنی لمبائی کے بنتے ہیں۔ لحاف، تکیہ میں کتنی روئی ڈالی جاتی ہے۔ اور سوئیٹر پر کتنی اون لگتی ہے۔ وغیرہ

(iii) ڈاک خانہ :- منی آرڈر فارم پر کرنا۔ سیونگ بنک میں حساب کھولنے کے لیے درخواست لکھنا مختلف اوزان کے پارسلوں اور خطوں کے محصول اور مختلف رقوم کے بیموں اور منی آرڈروں کی فیسیں وغیرہ

(iv) مقامی اہل کار :- ان کے فرائض اور اختیارات۔ ہمیں ان سے کیا کیا اور کس طرح استفادہ کرنا چاہیے نیز ان میں سے ہر ایک کی تنخواہ اور سالانہ ترقی کیا ہے؟

(v) بچوں کی مجلسیں :- مجلسی اور سیاسی شعور پیدا کرنے کی خاطر ہر سکول میں بچوں کی مختلف مجلسیں ہوں ان کے انتظامیہ اراکین جمہوری اصولوں کے مطابق منتخب ہوں۔

(۱۶) کتب

(i) کتب تصاویر اور توضیحات سے مزین ہوں۔ مگر ہر کتاب کے دو ایڈیشن ہوں ایک میں معمولی کاغذ اور سادہ تصویریں ہوں اور دوسرے میں بڑھیا کاغذ اور رنگین تصویریں ہوں۔

(ii) ناشر حضرات منظور شدہ کتب کا پہلا ایڈیشن تو معیاری چھاپتے ہیں۔ مگر اس کے بعد رفتہ رفتہ طباعت کا معیار گرنے لگ جاتا ہے اور تصاویر کی تعداد میں کمی ہونے لگ جاتی ہے۔ ہر ناشر کو کتب میں فہرست توضیحات بھی شامل کرنی چاہیے۔ اور سرورق پر قیمت کے علاوہ طبع ہونے والی کتب کی کل تعداد اور سن بھی لکھنا چاہیے۔

(iii) ہر کتاب کے آخر میں متعلقہ مضمون کے متعلق چند ایسے قابل عمل پروجیکٹ بھی ہوں جن کا زندگی کے ساتھ

بچہ اور فطرت

منور جہاں رشید

بچہ پیدائش کے وقت گوشت اور ہڈیوں کا نازک اور انتہا کمزور وجود ہے۔ اس بے بس وجود کے اندر لامحدود بالیدگی کی قوتیں ہیں۔ یہ قوتیں جسمانی نشوونما کے لیئے بھی مچل رہی ہیں۔ اور ذہنی تخلیقی قوتوں کو بروئے کار لانے کے لیے بے قرار ہیں۔ نفسیاتی رہنمائی کا فرض اولین یہی ہے کہ جسمانی وتخلیقی بالیدگی کی قوتوں کو ایسی شاہراہ پر گامزن کرے۔ کہ بچہ کی ہمہ گیر نشوونما ہو۔ بچے کی شخصیت کی گہرائیوں میں اتحاد۔ اس کو دماغی وجسمانی صحت نصیب ہو۔ اس کے گہرے دماغ میں اطمینان ہو۔ اسے ماحول سے یکسوئی حاصل ہو۔ اس کا جسم ودماغ اپنے گہرے وجود کے ساتھ ہم آہنگ ہو۔ اس کی تخلیقی قوتیں مکمل طاقت سے بروئے کار آئیں۔ وہ گہرے سکون سے کام کر سکتا ہو۔

انسانی بچہ بڑھتا ہے۔ یہ بالیدگی ایک مسلسل کڑی ہے۔ جس میں ہر منزل پر تبدیلی آتی ہے۔ اس میں ایک منزل کی تبدیلی سے گہرا رشتہ ہے۔ بالیدگی کی ہر تبدیلی بچہ کی زندگی کی تاریخ میں بہت اہمیت رکھتی ہے۔ ہر بچہ کے اندر ایک پُر جوش طاقت ہے۔ جو مسلسل اس کوشش میں ہے کہ وہ زندگی میں اپنا ہست وبود قائم کرے۔ یہ طاقت بچے کی صحت مند ریختہ نشوونما کرتی ہے۔ اس کو خود مختار ہونا سکھاتی ہے۔ اس کو اپنی رہنمائی خود کرنے کے قابل بناتی ہے۔ انسانی دماغ وشخصیت کی متوازن نشوونما کے لیئے ماحول کا فطری تقاضوں کے مطابق ہونا ضروری ہے۔ ایک بچہ قدرت کے مقرر کیئے ہوئے سانچے کے مطابق پرورش پائے۔ قدرت کی عطا کی ہوئی تخلیقی قوتوں کی نشوونما کا سرح قدرت کے منتخب کیئے ہوئے ڈیزائن کی مطابقت میں ہو۔ بچہ خود بھی پہچانے اور اعتراف کرے۔ دوسرے بھی پہچانے اور قبول کریں۔ اور تب ہی بالیدگی کی قوتوں کا مکمل استعمال ہو سکتا ہے۔ اور اسی طرح بالیدگی کے جوش کی تسکین ہو سکتی ہے۔

بچہ کی ہمہ گیر نشوونما اور بالیدگی کی قوتوں کے مکمل استعمال کے لیئے چند بنیادی ضرورتوں کا پورا ہونا لازمی ہے یہ ضرورتیں جسمانی نفسیاتی اور ذہنی ہیں۔ جسمانی ضرورتیں جسم کی صحت مند نشوونما کے لیئے ضروری ہیں۔ نفسیاتی ضرورتیں نفسیاتی صحت کے لیئے۔ اور ذہنی اُن تخلیقی قوتوں کو بروئے کار لائے گی جو بچے کے گہرے وجود میں سو رہی ہیں۔ اور موقع ملنے پر جاگ اٹھیں گی۔ اور بچے سے نیا کام کرائیں گی۔ یہ ضرورتیں ایک دوسرے سے بالکل جدا

نہیں بلکہ ایک دوسرے سے مربوط ہیں۔ ایک سے غفلت کا اثر دوسرے کی صحت پر نمایاں نظر آجاتا ہے۔ بھوکا بچہ جذباتی لحاظ سے غیر متوازن ہے۔ جذباتی بیمار بچے کو کئی جسمانی بیماریاں ہو جاتی ہیں مثلاً بستر پر پیشاب نکل جانا۔ قبض وغیرہ۔ یہ ضرورتیں بچے کی زندگی کے ساتھ ہی شروع ہو جاتی ہیں۔

جسمانی ضرورتیں

خوراک۔ نیند و لباس جسم کی صحت مند نشوونما کے لیئے ضروری ہیں بچے کی پیدائش سے پہلے ماں کی جسمانی ونفسیاتی صحت بچے کی جسمانی ونفسیاتی صحت پر گہرا اثر رکھتی ہے۔ بچہ اچھی خوراک کھا کر اچھی طرح غسل کر کے اور گہری نیند سو کر جسمانی نشوونما بھی کرتا ہے۔ اور جذباتی سکون بھی حاصل کرتا ہے۔ جیسے وہ ذرا بڑا ہوتا ہے تو وہ ہاتھ پاؤں مار کر قسم قسم کے کھیل کھیلتا ہے اور اپنے اعضائ استعمال کرتا ہے۔ اِس سے اس کے پٹھے متوازن ہوتے ہیں۔ اور کھیل سے جذبات کے لیئے خوشی مہیا ہوتی ہے۔ جسم طاقت میں اور صباحت میں بڑھتا ہے۔ سکول میں بچوں کو تیز بھاگ دوڑ کا کھیل مہیا کرنا چاہیئے۔ جس سے پٹھے متوازن و توانا ہوں بالیدگی کی قوتیں جسم کی نشوونما کریں۔ ڈاکٹری معائنہ کا انتظام ہو۔ ماہر ڈاکٹر آنکھ۔ کان۔ ناک۔ دانت۔ گلے۔ جلد وغیرہ کا جداگانہ معائنہ کریں۔ مجموعی صحت کا معائنہ کریں۔ سکول خوراک کا انتظام کرے۔ صحت کے لیے مفید غذا دی جائے۔ خوراک کے ماہر خوراک کا روزنامچہ تیار کریں۔ والدین کو آگاہ کریں۔ سستی خوراک۔ گنا۔ گاجر۔ مکئی۔ لسی۔ وغیرہ کی غذائیت پر روشنی ڈالیں۔ تاکہ غذا سستی بھی ہو سکے اور مفید بھی۔ اور بالیدگی کی قوتوں کا پورا استعمال ہو سکے۔ صحت کے ریکارڈ رکھے جائیں جس میں بچے کا قد وزن اور جسمانی نشوونما کی رفتار درج ہو۔ بیماروں کی غور و پرداخت ہو۔ تشخیص ہو۔ علاج ہو۔ طبی معائنہ کے ریکارڈ محنت سے تیار کیے جائیں ریکارڈ باقاعدگی سے درج ہوں۔ تاکہ وہ درست ہوں اور ڈاکٹر کی رہنمائی کر سکیں۔ وبا کے دوران میں ٹیکے لگائے جائیں۔ تخلیقی کام کے لیئے بشاش بچے کے لیئے تندرست جسم لازم و ملزوم ہے۔

جذباتی ضرورتیں

بچہ صرف جسم ہی نہیں اُس میں حس بھی ہے۔ وہ پیار کو بہت تیزی سے محسوس کرتا ہے۔ غفلت برتی جائے تو بہت شدت سے رنج کھاتا ہے اس کو اپنی نفسیاتی صحت کے لیئے پیار کی بے حد ضرورت ہے۔

پیار و تحفظ کا احساس اس کے دماغ کو پُرامن کرتا ہے۔ جذبات کو سکون بخشتا ہے۔ خوش بچہ ہی کام کر سکتا ہے۔
ناخوش بچہ رنج سے بے قابو ہوا جاتا ہے۔ بہت غصیلہ ہو جاتا ہے۔ سب کچھ تباہ و برباد کرنا چاہتا ہے۔ یا وہ بہت
شرمیلا ہو گیا ہے۔ اندر ہی اندر کڑھ رہا ہے۔ اور زبان پر خاموشی ہے۔ اس بچے کا رنج زیادہ گہرا اور زیادہ شدید
ہے اور زیادہ خطرناک ہے۔ ماں سب سے پہلی انسانی ہستی ہے جس کو بچہ پیار کرتا ہے۔ سب سے زیادہ
پیار کرتا ہے اور اس پیار کی اسے سب سے زیادہ ضرورت ہے۔ ماں وہ چٹان ہے جو اسے زندگی کے شدید
طوفانوں کے بالمقابل سہارا دیتی ہے۔ بچے کی جذباتی زندگی بہت جلد شروع ہو جاتی ہے۔ جن بچوں کو
بوتلوں سے دودھ پلایا جاتا ہے ان کو وہ احساس تحفظ نصیب نہیں ہوتا۔ جو ان کو ہوتا ہے جن کو کہ ماں خود
دودھ پلاتی ہے۔ مطالعہ اور مشاہدے نے ثابت کیا ہے کہ اگر بچہ و ماں دودھ پیتے وقت کسی طرح
ناخوش ہو جائیں تو بچے کا احساس تحفظ کمزور ہو جاتا ہے۔ اور آئندہ زندگی میں بچے میں کمزوری کی بنیاد رکھ
دی جاتی ہے۔ چند گلی محلے کے غریب شیر خوار بچوں کو لے جا کر ان کو آراستہ و پیراستہ کمروں میں رکھا جہاں پر
امرا کے شیر خوار بچوں کو رکھا جاتا تھا۔ ان کو وہ سب امیرانہ ٹھاٹھ مہیا کیے جو کہ امرا کو نصیب ہوں اس
کے باوجود بچے بے سُدھ و سست پڑے تھے۔ صرف سانس لے رہے تھے۔ ان کی چونچالی۔ غول غال
ہاتھ پاؤں مارنا۔ پنگورے میں لوٹنیاں لگاتے پھرنا بالکل مفقود تھا۔ کیونکہ ماں کا ہاتھ جس میں گہرا پیار و احساس
تحفظ پنہاں ہے غیر موجود تھا۔ ان کا نیم جان ہونا قابل رحم تھا۔ پنگورے میں بچہ روتا ہے۔ ماں ہاتھ رکھ دیتی ہے تو وہ
مطمئن ہو جاتا ہے اور رونا بند کر دیتا ہے۔ باپ بھی بہت ضروری ہے وہ پشت پناہ بھی ہے۔ بچے کی مجلسی دنیا بہن
بھائیوں سے مکمل ہوتی ہے۔ یہ روز مرّہ کا معمول بچے کی تندرست نشوونما کے لیے اشد ضروری ہے۔ گھر کے لوگ
بچے کو پیار کریں۔ اور جو پیار وہ دیتا ہے اس کی قدر کریں۔ سکول میں استاد ماں کا نعم البدل ہے وہ پیار و
تحفظ مہیا کرے۔ بچے کو احساس ہو۔ یقین کامل ہو کہ ماں بچے کو چاہتی ہے۔ اس کی آرزو مند ہے۔ ماں بچے کا مقبوضہ
ہے اور بچہ ماں کا اور سکول میں استاد کا رابطہ بچے کے ساتھ اسی احساس پر مبنی ہو۔

ہمجولیوں اور ہم جماعتوں کے ساتھ زندگی باعث خوشی ہو۔ اس سے بچے کو جذباتی سکون حاصل ہوگا۔
داخلے کے وقت استاد یہ دیکھے کہ بچہ باقیوں میں بلا تکلف مل جل جاتا ہے اور وہ عمر میں اور تعلیمی ترقی میں باقیوں

کے معیار کا ہے۔ جو بچہ کسی وجہ سے معیار سے دور ہے وہ ہمجولیوں سے الگ تھلگ ہے۔ وہ اداس ہے۔ اس کی مجلسی زندگی میں بڑا خلا ہے۔ یہ اداس و تنہا بچہ پڑھائی میں ناخوش ہو گا۔ اور تعلیمی ترقی مناسب نہ کر سکے گا۔ خوشی تخلیقی کام و تعلیمی ترقی کے لیے بے حد ضروری ہے۔

مجلسی ضرورتیں

بچہ مجلس کا خواہش مند ہے۔ وہ مجلس میں پیدا ہوتا ہے۔ اسے اس مجلس کی ضرورت ہے۔ گھر میں ماں باپ بہن بھائی اس کے آرزومند ہوں۔ اس کی صحبت کے خواہاں ہوں۔ گھر والوں کی بے نیازی بچے کو آزردہ کر دے گی وہ آداب محفل بھول جائے گا۔ رنج سے بے قابو ہو کر غصیلہ اور تباہی کن عادات و جوشیلی حرکات کا کاہل ہو جائے گا۔ یا وہ اندر ہی اندر کڑھے گا۔ دن کے وقت جاگتے ہوئے خوشگوار خواہیں دیکھے گا۔ اپنے پیدا کیئے ہوئے تصورات کی دنیا میں رہے گا۔ یہ الجھا ہوا کردار ہے کہ سکول کی سوسائٹی میں جائے گا۔ اپنے آزردہ گھر سے ماغ کے کردار اساتذہ اور ہم جماعتوں میں دیکھ کر اُن سے الجھے گا۔ اس کی مجلسی دنیا اور پیچیدہ ہو جائے گی۔ بچے کی مجلسی دنیا بہت ابتدا سے شروع ہوتی ہے۔ ماں کی گود سب سے پہلی مجلس ہے۔ جہاں پر روتے ہوئے کو پیار ملتا ہے بھوکے کو غذا ملتی ہے۔ ماں اور بچہ ایک دوسرے کی صحبت میں خوشگوار گھڑیاں گزارتے ہیں۔ تندرست اور خوش بچہ مسکراتا ہے۔ ہنستا ہے۔ کلکاریاں مارتا ہے۔ جو سامنے آئے اس کو دیکھ کر مسکراتا ہے۔ وہ بہت کم روتا ہے جیسے ہی وہ بڑا ہو جاتا ہے اس میں ماحول کے افراد میں خوش ہو کر بیٹھنے کی صلاحیت نشوونما پاتی ہے۔ وہ مل کر کھیلنا جانتا ہے۔ ایک خوش اور تندرست بچہ بغیر کسی کوشش کے خود بخود محفل میں شریک ہو جاتا ہے۔ اور بے تکلف اس محفل کا فرد بن جاتا ہے۔ جو بچہ اکیلا کھیلے یا تنہا رہے وہ نفسیاتی بیمار ہے۔ اس کی نشوونما الجھ گئی ہے۔ اس کو رہنمائی کی ضرورت ہے۔ اس کو نفسیاتی علاج کی ضرورت ہے۔

ا۔ بچے کے جذبات غیر متوازن ہیں۔ گھر سے دماغ میں فطری ضرورتوں کے خلا کا احساس ہے۔ وہ بہت ناخوش ہے۔ وہ رنج سے بے قابو ہوا جا رہا ہے۔ اس کے اعصاب کمزور ہیں۔ اس کی آواز و جسم میں ارتقاش ہے۔ وہ دوسروں سے لڑتا جھگڑتا ہے۔ غصہ میں آجاتا ہے۔ طوفانی غصہ میں بہ کر توڑنے پھوڑنے اور مارنے پر تل جاتا ہے وہ محفل میں رہ نہیں سکتا۔ باقی بچے غصہ میں دیوانے بچے سے پرے رہنا چاہتے ہیں۔

۲ ماں باپ کے بے جا لاڈ و پیار نے ضدی کر دیا ہے۔ وہ ہم جولیوں سے بے جا تعریفوں کا متوقع ہے۔ جب اسے تعریف اور بے جا تعریف نہیں ملتی تو وہ خفا ہو کر الگ ہو جاتا ہے۔ ہمجولی پرواہ نہیں تے۔ اپنی کھیل کود میں مصروف رہتے ہیں۔ اور وہ تنہا رہ جاتا ہے اور تنہا کھیلنے لگ جاتا ہے۔

۳ وہ اکلوتا بچہ ہے۔ اس کو مل کر رہنا۔ دوسروں کے ساتھ مل کر چیزیں استعمال کرنا آتا ہی نہیں کیونکہ گھر کے ماحول نے ایسے تجربہ کے امکانات پیش ہی نہیں کیے

۴ گھر کا ماحول ایک بچے کو بہت ذلیل و حقیر کرتا ہے۔ وہ سکول میں شرماتا ہے اندر ہی گھٹا رہتا ہے اس اپنے اوپر بھروسہ نہیں اس کی جذباتی نشوونما میں ایسے خلا ہیں کہ اس کی جذباتی پختگی اپنی عمر سے کم ہے۔

۵ وہ باقی ہم جماعتوں سے بڑا ہے یعنی جسمانی طاقت اور دماغی پختگی کے لحاظ سے باقیوں سے بڑا ہے۔ باقی سب اس سے گھبراتے ہیں۔ اور ان سے پرے رہنا چاہتے ہیں۔ وہ ان پر حکومت کرتا ہے۔ بچے اس سے گریز کرتے ہیں۔ وہ اکیلا رہ جاتا ہے۔

۶ وہ پڑھنے میں کھیلنے میں اور باقی خوبیوں میں بہت کم معیار کا ہے۔ باقی بچے اس سے گریز کرتے ہیں

۷ کوئی جسمانی نقص، یا غربت بچے کو باقیوں سے الگ کر دیتی ہے۔ وہ تنہا رہ جاتا ہے۔

۸ بچے میں قدرت نے خصوصی عطیات دیے ہیں۔ ایسے عطیات عام طور پر ایک سے زیادہ ہوتے ہیں۔ کسی کو جلن ہے کہ وہ کھیلوں میں اعزازی معیار کا ہے۔ کسی کو فن نقاشی سے حسد ہے۔ کسی کو موسیقی میں خوبصورت آواز سے جلن ہے۔ کوئی اعلٰے انشا پردازی سے خار کھاتا ہے۔ کسی کو پڑھائی میں اعزاز کا غم کھائے جا رہا ہے خصوصی عطیات۔ اعزازی نتائج ہم جماعتوں کو خار بن کر کھٹکتے ہیں۔ اور وہ بچے کو رقابت میں جل کر شریک کرنے سے انکار کر دیتے ہیں۔ لے زد قسمتِ طبع تو بر من بلا شدی۔ خوبیاں مسئلہ زیرِ غور بن کر رہ گئیں۔ گروہ مقابلہ پر تل جاتا ہے اور بچہ تنہا حریف گروہ کے بالمقابل خود بخود بلا ارادہ صف آرا ہو جاتا ہے

سکول کا فرض ہے کہ بچے کی رہنمائی کرے۔ مجلسی زندگی کے آداب کی صحیح تربیت کرے اور بچے میں درست مجلسی رنگ پیدا کرے۔ کھیل اور کھیلنے کی آزادی مہیا کرے۔ بچہ کھیل میں اپنے غصیلے جذبات نکال پھینکے گا۔ اعصابی ارتعاش دور کرے گا۔ اور جذباتی توازن حاصل کرے گا۔ سکول امداد باہمی کے مواقع

مہیا کرے۔ رہنمائی کرنا۔ مدد کرنا۔ بچہ کی تعلیم و مجلسی تربیت کو بیک وقت پورا کرے گا۔

ذہنی ضرورتیں

بچہ میں قدرتی طور پر ذہانت و دیعت ہوتی ہے۔ وہ ماحول کی دنیا کو جاننا چاہتا ہے اس کی ہر چیز کو غور سے دیکھتا ہے۔ اس کا ذہنی تجربہ پنگوڑے کی عمر سے شروع ہو جاتا ہے۔ دونوں ہاتھوں میں چیزیں پکڑ کر کھیلتا ہے وہ ایک ہاتھ کی چیز کا دوسرے ہاتھ کی چیز سے مقابلہ کرتا ہے۔ ان کے رابطوں کا اور اختلافات کا جائزہ لیتا ہے۔ وہ حسی نشوونما کرتا ہے۔ پکڑتا ہے۔ دیکھتا ہے۔ بجا کر سنتا ہے۔ اور کھیلتے ہوئے پنگوڑے کی دیوار پر چیزوں مار کر بجا کر جانچتا ہے۔ پنگوڑے میں سب سے پہلے وہ ہاتھوں اور پاؤں سے کھیلتا ہے۔ بعد ازاں کھلونوں سے اور اس کھیل میں وہ ان کو استعمال کرتا ہے۔ ان سے تجربہ حاصل کرنے کے بعد وہ ان کے متعلق معلومات اپنے ذہن میں عکس کر لیتا ہے۔ جب وہ بڑا ہو کر چلنے پھرنے کے قابل ہو جاتا ہے تو وہ کھیلتا ہے اور کھیل میں ماحول کی اشیاء کو چھوتا ہے۔ پکڑتا ہے۔ غور سے دیکھتا ہے۔ استعمال کرتا ہے۔ کائنات میں نیچر و سائنس کی معلومات اپنے علمی تجربہ و مشاہدہ سے براہ راست حاصل کرتا ہے۔

روحانیت

بچہ میں روحانیت بکثرت موجود ہے۔ وہ کائنات کے ہر ذرے میں روحانیت کی گہرائی محسوس کرتا ہے۔ وہ آسمان پر چلتے ہوئے بادلوں کو دیکھتا ہے۔ وہ ستاروں کا نکلنا۔ چمکنا اور غائب ہو جانا مشاہدہ کرتا ہے کہاں سوال کے جواب کا متلاشی ہے۔ پرندوں کی آوازیں سنتا ہے۔ یہ دیکھتا ہے۔ اختلافات و یکسانیت پر غور کرتا ہے۔ وہ تخلیق کی گہرائیاں محسوس کرتا ہے۔ غیب کی روحانی طاقت سے دوچار ہوتا ہے۔ پودے بوئے جاتے ہیں۔ اگتے ہیں۔ بڑھتے ہیں۔ پھول و پھل دیتے ہیں۔ مرجھا جاتے ہیں۔ اور مر جاتے ہیں۔ زندگی کی منازل کو جانچتا ہے۔ وہ روحانیت کے متعلق سوچتا ہے۔ وہ روحانی غیبی طاقت جو تمام تخلیق کا منبع ہے محسوس کرتا ہے بچوں کو خدا اور اس تخلیق کے بارے میں وسیع و گہرا احساس نشوونما ہونے کے موقع مہیا ہونے چاہئیں۔ دعا اور زمرہ مانگیں۔ روحانی کہانیاں سنیں۔ مذہب کے روحانی ارفع پہلو کو جانیں۔

زبان۔ بچے میں زبان دانی کو وسیع کرنے کی قوتیں بیشتر موجود ہیں۔ اس کی کو وسیع کرتے کے مواقع

مہیا کرنے سے اُن کی نشو و نما مکمل و تندرست ہو سکتی ہے۔

آرٹ

تمام بچوں کو فنون لطیفہ سے مس ہے۔ ہر بچے کو رنگ اور رنگ آمیزی پسند ہے۔ نقاشی۔ رنگ کو ہاتھوں سے سلنا۔ مٹی کے کھلونے بنانا۔ گتے سے چیزیں بنانا۔ مختلف قسم کا ہاتھ سے بنایا ہوا کام پسند ہے۔ ان شغلوں کی طرف بچے کا فطری میلان ہے۔ بچوں کو موسیقی مرغوب ہے۔ سنتے بھی ہیں اور گاتے بھی ہیں۔ ہر مشکل سے مشکل سُر گاتے ہیں۔ راگیوں کی طرح سر ہلا ہلا کر اپنی ہی سر نکال کر گاتے ہیں۔ اور گا کر خوش ہوتے ہیں۔

کھیل

کھیل بچے کی تندرست نشو و نما کے لیے اشد ضروری ہے۔ کھیل نفسیاتی بیماریوں کی روک تھام کر دیتا ہے۔ نفسیاتی بیمار کا کھیل کے ذریعے علاج کیا جاتا ہے۔

بچے تمدن کی ابتدا سے کھیلتے چلے آئے ہیں۔ کسی ماں نے بچے کو یہ نہیں کہا کہ آؤ بچے تمہیں کھیلنا سکھاؤں۔ کھیل بچے کی زندگی میں بہت جلد شروع ہو جاتا ہے۔ ہاتھ اور پاؤں کی انگلیاں سب سے پہلا سامان کھیل ہے جس کو کہ بچہ استعمال کرتا ہے۔ وہ جلد ہی دوسری چیزوں کو پکڑنا شروع کر دیتا ہے۔ کبھی وہ ایک ہاتھ میں پکڑتا ہے اور کبھی وہ دوسرے ہاتھ میں۔ وہ ہوا میں گھماتا ہے۔ پنگوڑے میں ٹھوک ٹھوک کر بجاتا ہے۔ چوستا ہے اور پھر پھینک دیتا ہے۔ اس کی دلچسپی جسمانی حرکات اور حواس کی تربیت میں ہے۔ اس کو چیز کی مطلقاً پرواہ نہیں۔ چیز خواہ ہیرے کی انگوٹھی ہے یا چاء کی پیالی ہے۔ یا گھڑی ہے یا چمچہ ہے جو ہاتھ میں آئے اس کا ایک ہی استعمال ہے۔ شارلٹ۔ بیوہلر۔ اس کھیل کو "کام کا کھیل" کہتی ہے۔ اس کھیل میں بچہ اپنے پٹھوں کو مضبوط و متوازن کرتا ہے۔ اور جسمانی حرکات پر عبور حاصل کرنا چاہتا ہے۔

۲ سال سے پانچ سال کے بچے کا کھیل فرق رخ اختیار کرتا ہے۔

۱ پٹھوں کو مضبوط کرنے والا کھیل

بچے کو حرکات مرغوب ہیں۔ بچہ ایسے کھیل کھیلتا ہے جس میں جسم سے بیشتر حرکت کرے وہ دھکیلتا ہے۔ چڑھتا۔ اترتا۔ گھسیٹنا۔ لڑھکنا۔ جھولنا۔ اٹھانا۔ بوجھ لادنا۔ اتارنا۔ دوڑنا۔ کودنا۔ کھودنا۔ اور بیشمار ایسے

جسمانی حرکات کرتا ہے۔اس سے اس کے پٹھے مضبوط و متوازن ہوتے ہیں۔

۲۔ تخیل کا پرواز

وہ خیالی دنیا میں رہتا ہے۔ یہ جھوٹ موٹ کی دنیا اس نے خود تیار کی ہے۔ لیکن اس کیلئے حقیقت کا انداز رکھتی ہے۔اس دنیا میں وہ اپنی ناممکن خواہشات کو پورا کر لیتا ہے وہ ایک لکڑی کو لے کر گھوڑا کہے گا اور اس پر سوار بن کر گھوڑا دوڑائے گا۔اس کھیل میں وہ اپنی جذباتی مشکلات کا حل بھی ڈھونڈھتا ہے۔ وہ ناممکن انتقامات کھیل میں لے کر اپنے مشتعل جذبات کو ٹھنڈا کر لیتا ہے۔ وہ ایک گڑیا کو اسی طرح مارے گا جیسے اس کو مار پڑی تھی۔ وہ گڑیا کو سخت سے سخت سزا دے کر اپنی سختی کا بدلہ لے گا۔ ان خیالی دھندلکوں میں اس کے انتقام کی آگ ٹھنڈی ہو گئی۔

۳۔ بڑوں کی نقل و گھرداری کا کھیل

وہ ماں اور باپ کا ڈرامہ کھیلتا ہے۔ دودھ والا۔ سبزی فروش بن کر گھر پر آتا ہے۔ اور بیچتا ہے۔ تہوار ورسومات کا کھیل کھیلتا ہے۔ اس کھیل میں وہ اپنے ماحول کا مطالعہ کرتا ہے اور اپنے آپ کو آئندہ ذمہ داریوں کے لیے تیار کرتا ہے۔

۴۔ تعمیری کھیل

تعمیر بچے کا فطری تقاضا ہے۔ وہ لکڑی کی اینٹوں کے مکان۔ مساجد و دکانیں اور مینار وغیرہ تعمیر کرتا ہے۔ وہ کھیل کے سامان کو سستی و پرانی چیزوں سے مہیا کر لیتا ہے۔ تعمیری کھیل میں خیالی جھوٹ موٹ کا کھیل بھی کھیلتا ہے۔ اور جو کچھ اس کے گہرے دماغ میں الجھا ہوا ہے وہ خیالی کھیل میں بہ جاتا ہے۔ اور اس کے جذبات پر سکوت ہو جاتے ہیں۔

۵۔ حسّی کھیل

کچھ ایسا کھیل بھی ہے جس کے ذریعہ بچہ حواس کی تربیت کرتا ہے۔ وہ اس کھیل میں اشکال کے اختلاف اور ناپ کے اختلاف کو جانچتا ہے چھوٹے و بڑے۔ گول و چکور۔ تنگ و وسیع۔ ڈھلوان و سطح۔ ہلکا و بوجھ۔ سخت و ملائم باقاعدہ اور بے قاعدہ کے بارے میں سیکھتا ہے۔ اور اختلاف کو پہچانتا ہے۔ وہ ان کو چن کر جوڑے بناتا ہے

متضاد کا مقابلہ کرتا ہے۔ جو اس کی نشوونما کرتا ہے۔ مختلف اوزاروں سے مختلف سطح پر کوٹتا ہے۔ اور اوزاروں کا فرق پہچانتا ہے۔

ذہنی کھیل

وہ ماحول کا گہرا مطالعہ کرتا ہے۔ وہ چیزوں کو تلاش کرتا ہے۔ حقیقتوں کو جوڑتا ہے ان کے متعلق سوچتا ہے دلیل استعمال کرتا ہے۔ فیصلہ کرتا ہے۔ ماحول میں جو کچھ ہے اس کو ڈھونڈ نکالنے کی کوشش کرتا ہے وہ معلومات حاصل کرتا ہے۔ اور اپنے ذہنی دائرے سے وسیع کرتا ہے۔

تخلیقی کھیل

تخلیقی کھیل میں بچہ آرٹ۔ بینڈ ورک۔ مٹی کے کھیل میں مشغول ہے۔ اداکاری بھی اسی کھیل کی کڑی ہے۔ آزاد ہیں وہ اپنا ذوق لطیفہ بھی پورا کرتا ہے۔ اور پاؤں کی تھاپ میں اپنے مشتعل جذبات کو اپنے نظام عصبی سے نکال دیتا ہے اور جذباتی سکون حاصل کرتا ہے۔

پانی کا کھیل

تمام بچے پانی سے کھیلتے ہیں۔ وہ فطری ضرورت و شوق ہے یہ کھیل بچوں کو کھیلنا چاہیئے۔ یہ بچوں کی صحت مند نشوونما کے لیے مفید ہے۔ اس کھیل میں بہت سی جسمانی حرکات ہیں۔ جن سے بچہ پٹھوں کو توانا و متوازن کرتا ہے۔ بالیدگی کی قوتیں بروئے کار آتی ہیں۔ جھوٹ کا کھیل جب پانی کے کھیل میں کھیلا جاتا ہے تو بچے کے مشتعل جذبات اور تباہی کی خواہشات تسکین پاتی ہیں۔ اور جذباتی سکون حاصل ہوتا ہے

ریت کے کھیل

ریت کے کھیل کے بھی ایسے فوائد ہیں

کھیل کے مشغلے

کچھ مرغوب مشغلے ایسے بھی ہیں جو کہ بچوں کو کھیل کی طرح مرغوب ہیں۔ اور کھیل کے رنگ میں ہی کیے جاتے ہیں۔ یہ بچے کی تندرست و ہمہ گیر نشوونما کے لیے مفید ہیں۔ یہ سامان کھیل کے بغیر کھیل کی خوشی اور نفسیاتی خوشی محسوس کر سکتا ہے۔

۱۔ بچہ باورچی خانہ میں ماں کے ساتھ کام کرنا چاہتا ہے۔ مثلاً مٹر چھیلنا چیزیں پکڑنا۔ جھاڑن سے برتن صاف کرنا۔ وغیرہ۔ بعض اوقات وہ صرف ماں کو کام کرتا ہوا دیکھنا چاہتا ہے۔ وہ خاموش کھڑا دیکھتا رہتا ہے

۲۔ باغ اور باغبانی کے اوزار خوب ہیں۔ وہ پانی کا کام خوشی سے کرتا ہے۔ نیچر کا قرب باعث مسرت ہے

۳۔ پرندوں کو پالنا۔ مرغیوں کے انڈے اور بچے نکالنا باعث تفریح ہے۔ اور معلومات بھرپور ہے۔

۴۔ کپڑے دھونا بہت مرغوب ہے۔

۵۔ بچوں کو کاٹنا۔ پھاڑنا۔ اور جمع کرنا پسند ہے۔ کاغذ کاٹ کر۔ ٹکڑے پھاڑ کر تصویریں بنانا میگزین سے کاٹ کر تصویریں چپکانا۔ ان کی کاپیاں اور البم بنانا مفید ہے۔

۶۔ کہانیاں سننا۔ نظمیں کہنا۔ تصویریں دیکھنا وہ خاموش کھیل ہیں جو بچوں کی خوشی کا باعث ہوں۔

۵ سے ۷ سال کے بچے کا کھیل ویسا ہی ہے جیسا کہ دو سال سے ۵ سال کے بچے کا۔ لیکن علمی مشاغل اور علمی جستجو فروغ پر ہے۔ اور کھیل میں نمایاں نظر آتی ہے۔ آزاد کھیل میں تعلیمی تجربات حاصل ہوتے ہیں۔ اور نصاب برائے آموزش آزاد کھیل۔ بے ساختہ عمل۔ اور تعلیمی تجربہ سے شروع ہوتا ہے۔ بچہ اپنا نصاب خود مرتب کرتا ہے۔ وہ آزاد کھیل و عمل سے تعلیمی تجربہ حاصل کرتا ہے۔ اس تعلیمی تجربہ سے کئی سوالات پیدا ہوتے ہیں۔ ایک چوبند استاد ان مواقع کو آموزش کا ڈھنگ دے کر کھیلتے ہوئے بچے کو کھیل کھیل میں سبق سکھا دیتی ہے بچے کا کھیل کارآمد عمل ہے۔ آموزش کھیل میں ایک تجربہ ہے۔" گھرداری کے کھیل میں بچہ مہمانوں کا منتظر ہے۔ ان کے لیے میز لگاتا ہے۔ کرسیاں۔ پلیٹیں۔ چمچے۔ گلاس اور نیپکن وغیرہ۔ ان کو گنتا ہے۔ اور زیادہ کو نکال دیتا ہے۔

نوی مدرسوں میں اُردو کی تعلیم

ر علی قریشی

سکولوں میں طلبہ کا ہجوم | ہائی سکولوں میں موجودہ ہجوم قیام پاکستان کے بعد اس قدر ہوا ہے کہ آزادی
کے بعد سرکاری اور غیر سرکاری بہت سے نئے ہائی سکول جاری ہوتے ہیں. مگر پھر بھی تل دھرنے کو جگہ
ہیں آتی. طلبہ کی تعداد ہر سال بڑھتی چلی جا رہی ہے اور یونیورسٹی امتحانوں کے نتائج بھی کئی سالوں سے گرتے
ہے ہیں. میٹرک کے امتحان میں شریک ہونے والوں کی تعداد بھی کئی سالوں سے صرف ایک تہائی تک
اب ہوتی ہے. مگر پھر بھی ہائی سکولوں میں طلبہ کا ہجوم کم ہونے میں نہیں آتا اور نہ ہی پرائیویٹ تعلیمی
، کی گہما گہمی گھٹتی نظر آتی ہے. پرائیویٹ ٹیوشن بھی ایک ایسا پُر منفعت کاروبار ثابت ہوا ہے کہ لاہو
میوں تک اس کے اڈے جا بجا قائم ہیں جو سب کے سب ہاتھ رنگ رہے ہیں. اس تعلیم کی یہ
، اس قدر ناقابلِ تسکین کیوں ہے؟ اس کی چند وجوہ بیان کی جا سکتی ہیں۔

اس کی پہلی وجہ یہ ہے کہ پچھلے دس پندرہ سالوں سے ہر چیز کی قیمت کہیں سے کہیں تک پہنچ
ہے. مزدوریاں بھی کافی بڑھ چکی ہیں مگر ہائی سکولوں کی فیسوں میں کوئی اضافہ نہیں ہوا. یعنی تعلیم ہی ایک
نس ہے جس کے دام نہیں بڑھے۔ دوسری وجہ قیام پاکستان کے بعد آبادی کا بے تحاشہ اضافہ
بادی کا یہ سیلاب ہائی سکولوں کی تعداد میں اب ہر جگہ دکھائی دیتا ہے، نہ صرف ہندوستان کی سرحد کے
انے والے مسلمان مہاجروں کا تانتا بندھا ہوا ہے. بلکہ ملکی آبادی بھی کافی تیزی سے بڑھ رہی ہے
سالوں تک ہماری آبادی دگنی ہو جائے گی. آبادی بڑھنے کے ساتھ روزگاروں میں بھی اضافہ ہوا.
اضافے کی رفتار آبادی کے اضافے کی رفتار سے مقابلہ میں بہت کم ہے۔

تیسری وجہ یہ بھی ہے کہ عوام کو نوکری کے علاوہ اور کوئی پیشہ نظر نہیں آتا جسے وہ معزز پیشہ
ن. کاشتکاری میں گنتی کے لوگ ہیں جو مصروفِ کار ہیں. تجارتی کاروبار کے لیے آج سے دس بارہ برس

پہلے کافی مواقع تھے۔ مگر اب اس میدان میں بھی کافی سرمائے کے بغیر قدم رکھنا ممکن نہیں۔ صنعتی ممالک کی طرح یہاں اتنے ٹیکنیکل اور فنی پیشے بھی موجود نہیں جو تعلیم یافتہ نوجوانوں کو جذب کر سکیں۔ کاشتکاری کاروبار اور ملازمت کے علاوہ باقی تمام پیشے محنت مزدوری کا درجہ رکھتے ہیں۔ اس لیے والدین بھی اپنے بچوں کو محنت مزدوری کے درجہ سے بلند دیکھنے کے لیے سکول میں بھیج دیتے ہیں۔ مگر ہائی سکول کی تعلیم کے بعد نوکری کا مل جانا ضروری نہیں۔ البتہ امید کی ہلکی سی کرن ضرور دکھائی دیتی ہے۔ میٹرک کرنے کے بعد تعلیم یافتہ نوجوان بھی اپنے آپ کو کھیتی باڑی کے کام سے بلند سمجھنے لگتے ہیں۔ مگر چودہ پندرہ برس کی عمر میں کسی کام کا ملنا محال نظر آتا ہے۔ اس لیے والدین سمجھتے ہیں کہ بیٹے کو کیوں نہ ہائی سکول میں داخل کرا دیا جائے۔ تعلیم حاصل کر لینے کے بعد تو ملازمت آسانی سے مل ہی جائے گی۔ کتنا غلط اور گمراہ کن خیال ہے۔ حالانکہ تعلیم کا مقصد یہ ہے۔ کہ بچے کو اس قابل بنایا جائے کہ وہ اپنی زندگی بطریق احسن گزار سکے۔

سکول کے طلبا :۔ ذہنی پختگی کے لحاظ سے ہائی اسکولوں کے طلبہ کی عام حالت یہ ہے کہ ہر ایک جماعت میں تین تین درجے ہونے کے باوجود بھی ہر ایک درجے میں تقریباً پچاس ساٹھ طالب علم بیٹھے ہوئے نظر آتے ہیں۔ مگر ان کے علمی ذوق کا یہ حال ہے کہ وہ اپنے طور پر اردو کی کتاب کو ہاتھ تک لگانا پسند نہیں کرتے۔ ان کی زبان دانی بھی بالکل معمولی قسم کی ہوتی ہے۔ استاد کے بتائے ہوئے معانی یا تشریحات یاد کرنے سے زیادہ انہیں اور کسی چیز کی پیاس نہیں۔ میں نے مڈل کلاسز کے اکثر بچوں میں اردو پڑھنے میں خامی کے کچھ اسباب دیکھے ہیں۔ جن کا تجرباتی لحاظ سے ذکر کرنا مناسب سمجھتا ہوں۔

خامی کے اسباب و تدارک :۔

(۱) پست ذہنیت

(۲) انگلی کی مدد سے پڑھنا

(۳) گفتار میں نقص

(۴) اسباق کا دلچسپ ہونا

(۵) العبارت میں کمی

(۶) جھجک اور شرمیلا پن

۱) پست ذہنیت :- چوں کہ مدرسین کی اپنی علمی قابلیت بھی پست ہوتی ہے، اور بعض کتابیں بھی ادبی میّا سے خالی ہیں جو ان میں مضامین کا موزوں انتخاب نہیں۔ جس کی وجہ سے بچے کی ذہنی طاقت صحیح طور پر پروان نہیں چڑھتی، اور یہ خامی پڑھنے میں اس کی کمزوری کا باعث بنتی ہے۔

۲) انگلی کی مدد سے پڑھنا :- چھوٹی جماعتوں میں تو بچوں کو انگلی کی مدد سے پڑھنا چاہیے کیوں کہ ان کے دماغ میں الفاظ کا تصور پختہ کرنا ہوتا ہے۔ مگر جب بچے بڑی جماعتوں میں پہنچ جائیں تو انہیں انگلی کے بغیر پڑھنا چاہیے کیوں کہ پڑھنا صرف آنکھ کا کام ہے، اور آنکھ کی حرکت کی رفتار الفاظ کی شناخت کی طاقت پر انحصار رکھتی ہے۔ اگر بچے حروف پر انگلی رکھ کر پڑھیں گے تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ آنکھ خود بخود حرکت کرنے کی بجائے انگلی کے ساتھ حرکت کرے گی جس سے پڑھنے کی رفتار تیز نہیں ہوگی۔

۳) گفتار میں نقص :- چوں کہ بچہ بنیادی کمزوری پرائمری سے اپنے ساتھ لایا ہے جس کی وجہ سے پڑھنے میں کافی جھجک پیدا ہو چکی ہے نہ صاف اور رواں نہیں پڑھ سکتا، بعض میں لکنت (توتلاپن) بھی ہوتا ہے۔ جو پڑھنے میں کمزوری کا باعث بن جاتا ہے۔ اگر شروع میں اس کی طرف توجہ دی جائے تو یہ رفع بھی ہو سکتا ہے کیوں کہ لکنت جبڑے یا گلے کا نقص ہوتا ہے، جو ڈاکٹر کے مشورے اور علاج سے رفع ہو سکتا ہے۔ دماغی نقص بھی ہوتا ہے کہ ایک لفظ کی ادائے گی سے پہلے ہی دوسرے لفظ کا تصور دماغ میں اترنے لگتا ہے، جس سے ایک الجھن سی پیدا ہو جاتی ہے اور زبان فیصلہ نہیں کر سکتی کہ کس لفظ کو پہلے ادا کیا جائے۔ ایسے لڑکے کو انگلی کی مدد سے پڑھوانا چاہیے۔

۴) اسباق کا دلچسپ نہ ہونا :- اگر اسباق دلچسپ نہیں، یا بچوں کی قابلیت کے معیار کے مطابق نہیں تو بچے بد دل ہو جائیں گے اس لیے استاد کو چاہیے کہ پڑھائی کے سبق میں خود دلچسپی پیدا کرنے کی کوشش کرے۔ اور بچوں کو کہانی کا زبانی حال مختصر طور پر بیان کرے۔ اس کے متعلق ان سے زبانی سوالات کر کے ان کے جوابات ہاں یا نہ میں لے، صحیح اور غلط بیانات میں تمیز پیدا کرائے۔ اس سے بچوں میں دلچسپی زیادہ پیدا ہوگی، اور کمزور بچے بھی اگر ترقی نہ بھی کریں گے تو پڑھنے میں ضرور چل نکلیں گے، مقابلے کا جوش پیدا ہوگا، اگر کسی موقع پر معمولی سا انعام بھی دیا جائے تو اچھا ہے۔

(۵) بصارت میں کمی :- کئی بچوں کی نظر بے احتیاطی کی وجہ سے کمزور ہو جاتی ہے جو الفاظ کو جلد شناخت کر کے اچھی طرح نہیں پڑھ سکتے۔ کیونکہ بچوں کو پرائمری مدارس میں بتایا ہی نہیں گیا کہ گھر میں پڑھائی یا لکھائی کا کام کرتے وقت ان باتوں کا خاص خیال رکھنا چاہیے ۔

(i) پڑھتے یا لکھتے وقت روشنی بائیں جانب سے آئے یا پیچھے سے، اس طرح نظر کمزور نہیں ہو گی اگر لیمپ یا سورج کی روشنی پڑھتے یا لکھتے وقت سامنے سے یا دائیں جانب سے آئے گی تو نظر کمزور ہو جائے گی۔

(ii) کھانا کھانے کے بعد فوراً لکھنا یا پڑھنا نہیں چاہیے، اس سے بھی نظر کمزور ہو جائے گی، بلکہ کھانا کھانے کے ایک گھنٹہ بعد پڑھنا لکھنا چاہیے۔ اس سے نظر کمزور نہیں ہو گی ۔

(iii) کتاب پر سر کو جھکا کر نہیں پڑھنا چاہیے۔ یہ بھی نظر کی کمزوری کا باعث ہے، کتاب پڑھتے وقت کتاب اور آنکھوں کا درمیانی فاصلہ ایک فٹ کا ہونا چاہیے ۔

(iv) لیٹ کر پڑھنے سے بھی نظر کمزور ہو جاتی ہے ۔

(v) رات کو لیمپ کی مدھم روشنی یا اندھیرے میں پڑھنے سے نظر کمزور ہو جاتی ہے۔ پڑھتے اور لکھتے وقت روشنی اچھی خاصی ہونی چاہیے۔

(vi) دن کے وقت اندھیرے کمروں میں نہیں پڑھنا چاہیے ۔

(۶) جھجک اور شرمیلا پن :- کئی بچے شرم و حیا کی وجہ سے بلند آواز سے نہیں پڑھتے۔ اور استاد انہیں کمزور سمجھتا ہے۔ اور انہیں پڑھنے کے لیے وقت دینا وقت کو ضائع کرنا خیال کرتا ہے، اور صرف ہوشیار طلبہ کو پڑھنے کا وقت دیتا ہے۔ بلکہ ایسے طلبہ کی طرف استاد توجہ دینا چھوڑ دیتا ہے، جس کی وجہ سے دوسرے بچے بھی ان کی طرف پرواہ نہیں کرتے اور وہ بے چارے کس مپرسی کی حالت میں رہ کر پڑھنے میں دلچسپی لینا چھوڑ جاتے ہیں اور پڑھنے میں کمزور ہو جاتے ہیں۔ ایسے بچوں کے لیے استاد کو ان کی ترقی کے وسائل پر غور کرنا چاہیے اور اصلاح کرتے وقت مدرس کو ان کی حوصلہ افزائی کرنی چاہیے، بلکہ جب وہ ذرا سی جھجک چھوڑ دیں۔ یا پڑھنا شروع کریں، تو انہیں شاباش دے کر یا کسی دوسرے طریقوں سے ان کی

حوصلہ افزائی کی جائے تو یہ خامی بھی خود بخود دور ہو جائے گی۔

بچوں میں آوارگی بچوں کو کئی نئے پڑھنے کی کئی کمزوریوں میں مبتلا ہو چکے ہیں۔ تعلیمی کام تھوڑا نا معلوم ہوتا ہے جس کی وجہ سے گھر میں بیٹھ کر پڑھائی کا کام کرنے کو دل نہیں چاہتا۔ والدین کے کہنے سے باہر ہو چکے ہیں۔ اپنے والدین کو کسی جھوٹے بہانے سے دھوکا دیا اور گھر سے باہر نکل گئے اور شام تک اپنے ہمجولیوں کے ساتھ ادھر ادھر گھوم گھما کر اپنے قیمتی وقت کو ضائع کر دیا۔ جس کی وجہ سے ان کی تعلیمی کمزوری پختہ اور مضبوط ہو جاتی ہے۔ سکول کے کام کو چھٹی ہونے کے بعد ہاتھ تک نہیں لگاتے، اور اگلے روز سکول میں جا کر گھر کا کام دکھاتے وقت کوئی نہ کوئی جھوٹا بہانہ بنا کر استاد سے اپنا پیچھا چھڑواتے ہیں۔ جس کی وجہ سے جھوٹ بولنے کے عادی ہو جاتے ہیں۔

میں نے تعطیلات میں اکثر بچوں کو آوارہ پھرتے دیکھا ہے جس کی وجہ یہ بھی ہے کہ دیہاتی طلبہ کی تفریح کے لیے سامان موجود نہیں، اور نہ ہی دیہاتی مدارس کے طلبہ فرصت کے اوقات کا بہترین استعمال جانتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ایک طرف تو مدرسین شکایت کرتے ہیں کہ لڑکے تعطیلات میں کھیل کود میں مصروف رہے ہیں اور سکول کھلنے پر بالکل کورے واپس آ گئے ہیں۔ دوسری طرف بچوں کے والدین بھی تعطیلات میں چلاتے رہے۔ کیوں کہ ان کے لیے بچوں کا سنبھالنا مشکل ہو جاتا ہے۔ اس مقصد کو پورا کرنے کے لیے زائد مطالعہ کی ضرورت ہے جس کے لیے لائبریری مفید ہو سکتی ہے، جو دو حصوں میں تقسیم کی جا سکتی ہے۔

(۱) تمام سکولوں کے لیے لائبریری۔

(۲) کلاس لائبریری۔

کلاس لائبریری میں بہت سی جلدیں ہونی چاہئیں جو ہر ایک ٹیچر انچارج کے پاس ہوں۔ اگر ایک ہی کتاب کی بہت سی جلدیں ہوں، تو بہتر ہے۔ مگر کتابیں تقسیم کرنے سے پہلے استاد کو تمام کتابوں کا مطالعہ کر لینا چاہیے۔ تاکہ وہ بچوں میں دلچسپی پیدا کرنے کے لیے سرسری طور پر کچھ بتا سکے اور طلبہ اسے شوق سے پڑھیں، اور پڑھی ہوئی کہانی کا انجام معلوم کر سکیں۔ ہفتہ میں طلبہ کو ایک دن کتابیں دینے اور واپس لینے کے لیے مقرر کرنا چاہیے۔

بچوں کو خاموش مطالعہ کی عادت ڈالنی چاہیے، اور انہیں خاموش مطالعہ کرنے کا طریقہ بتا دینا چاہیے تاکہ وہ اطمینان سے اپنی جگہ پر بیٹھ کر پڑھ سکیں جس کا طریقہ یہ ہے کہ بچے کتاب کو کھولتے ہی فوراً خاموش مطالعہ شروع

کردیں اور خاص مقصد کو مدنظر رکھیں، تاکہ اس سے لطف اندوز ہو سکیں اور اپنی واقفیت میں اضافہ کریں مگر صرف اس میں اتنا وقت صرف کریں کہ تھکان محسوس نہ ہو۔ اگر مطالعہ میں کوئی فقرہ یا شعر انہیں پسند آئے تو اسے زبانی یاد کرلیں یا اپنی نوٹ بک میں لکھ لیں۔

خاموش مطالعہ کے وقت بچوں کو ہونٹ ہلائے بغیر پڑھنا چاہیے، اور یہ عادت بھی بچوں میں شروع ہی سے ڈالنی چاہیے۔ کیوں کہ اکثر بچے ہونٹ ہلائے بغیر نہیں پڑھتے جس کی وجہ سے انھیں بڑے ہو کر بعض اوقات بڑی دقت پیش آتی ہے اور دوسرے پاس بیٹھنے والوں کو بھی یہ طریقہ ناگوار ہوتا ہے۔

بعض ہائی سکولوں میں تو ہیڈ ماسٹر صاحبان بھی ٹائم ٹیبل میں خاموش مطالعہ کا وقت دیتے ہیں جو لائبریری کتب کا مطالعہ استاد کی زیر نگرانی ہوتا ہے۔ یہ نہایت بہترین طریقہ ہے۔ اگر طلبہ گھر پر لائبریری کی کتابیں مطالعہ کے لیے لے جائیں تو کوئی مضائقہ نہیں، مگر اس مقصد کے لیے کتابیں صرف حاضر باش طلبہ کو دینی چاہئیں اور انھیں یہ کہہ دینا چاہیے کہ اگر کوئی کتاب کسی لڑکے سے گم یا خراب ہو گئی تو اس لڑکے کو اس کی جگہ نئی کتب لاکر دینی پڑے گی اس طرح بچے کتابیں حفاظت سے رکھیں گے اور انھیں لائبریری کی کتابیں وقت پر دینے یا لینے کا عادی بنانا بھی نہایت ضروری ہے۔ تاکہ ہر روز اس کام کے لیے وقت ضائع نہ ہو۔

جب کوئی طالب علم لائبریری کی کتاب پڑھ چکے تو وہ اپنی کاپی (نوٹ بک) میں کتاب کے مضمون کا مختصر طور پر زبانی حال لکھے جو اس کے لیے بہت مفید ثابت ہوگا۔ اس کے علاوہ جماعت کے کمرہ میں ایک چارٹ آویزاں کیا جائے جس میں جماعت کے تمام طلبہ کا نام، اور جو کتب انھوں نے پڑھی ہوں ان کے نام کے سامنے درج کی جائیں۔ لائبریری کتب کی ایک فہرست بھی کمرہ جماعت میں آویزاں کرنی چاہیے۔

لائبریری کتب کا انتخاب:— اردو کتب کا انتخاب کرنا نہایت اہم کام ہے۔ اس میں ان باتوں کا خاص خیال رکھنا ضروری ہے۔ کتابیں بچوں کے لیے آسان اور مفید ہوں۔ بچوں کے ذہنی معیار اور عمر کے مطابق ہوں۔ بچوں کی واقفیت میں اضافہ کرنے والی ہوں۔ اخلاق پر اچھا اثر ڈالنے والی ہوں۔ جن میں اخلاقی کہانیاں اور تاریخی افسانے ہوں سائنس کی ایجاد کے متعلق اور مشاہدہ قدرت کی کتب بھی بچوں کے لیے مفید ثابت ہو سکتی ہیں۔

ریڈنگ روم:— لائبریری کے علاوہ بچوں کے لیے ریڈنگ روم بھی سکول میں ہونا چاہیے جس میں

جس میں مبیزوں پر اخبارات اور رسالے بالترتیب رکھے جائیں۔ مگر بچوں کے رسالے دل کش اور خوب صورت ہوں جس میں دل چسپ مضامین ہوں، فقرات بالکل سادہ اور آسان ہوں جن کو پڑھنے میں بچے دل چسپی لیں، اس کے علاوہ مدرسین خود بھی ادبی رسالوں اور تعلیمی اخبارات کا مطالعہ کریں۔

جب بچے ہائی سکول میں آتے ہیں تو وہ اپنے ساتھ بہت سی کمزوریاں لیکر آتے ہیں۔ انھیں اگلی جماعت کا کام شروع کرا دیا جاتا ہے۔ مگر ان کی بنیادی کمزوریوں کو رفع کرنے کا موقع ہی نہیں ملتا جسکی وجہ سے ان کی کمزوریاں دن بدن بڑھتی جاتی ہیں۔ اور اردو تعلیم کو معمولی سمجھ کر مڈل کلاسز میں تو طلبہ بالکل توجہ ہی نہیں دیتے۔ یہی وجہ ہے کہ طلبہ اردو میں خطوط، درخواستیں اور مضامین لکھنے میں بالکل کورے ہیں۔ میٹرک کرنے کے بعد بڑے ہو کر جب دنیاوی معاملات میں تحریروں سے واسطہ پڑتا ہے۔ تو دوسروں کے دست نگر ہوتے ہیں ؛

معلومات عامہ

تقریباتِ حقوقِ انسانی

کراچی میں یوم حقوق انسانی کی نویں سال گرہ حسب معمول دسمبر میں شایانہ طریقے پر منائی گئی. پاکستان کی انجمن اقوام متحدہ کل پاکستان انجمن خواتین، طلبائے پاکستان کی انجمن خواتین، طلبائے پاکستان کی انجمن اقوام متحدہ اور دوسرے غیر سرکاری اداروں اور تعلیمی درس گاہوں نے ان تقریبات میں حصہ لیا۔

پاکستان کی انجمن اقوام متحدہ کا ایک عام اجلاس ۱۰ دسمبر کی شام کو چھ بجے بمبئی ہوم انگلش سکول میں زیر صدارت پروفیسر اے.بی.اے حلیم منعقد ہوا جس کی رسم افتتاح مسٹر جسٹس زیڈ ایچ لاری نے ادا کی. انہوں نے اپنی افتتاحی تقریر میں کہا کہ دنیا کے ہر حصے اور ہر زمانے میں انسانی حقوق کے تحفظ کے لیے کوششیں کی گئی ہیں لیکن دین اسلام نے نسلی، مذہبی، لسانی، قومی، جنسی اور خاندانی فرق و امتیازات کو مٹا کر انسانی حقوق کا جس طرح احترام کرایا ہے، اس کی نظیر مشکل سے مل سکے گی. انھوں نے دعویٰ کیا کہ اسلامی نظریات ہی کو بدل بدلا کر مختلف منشورات کی شکل دی گئی ہے :تاہم بین الاقوامی اعتبار سے اقوام متحدہ نے حقوق انسانی کا جو عالمی منشور مرتب کر کے نافذ کیا ہے وہ قابل تحسین ہے، اور اگر دنیا اس پر عمل کرنے لگے تو انسانیت کو غیر معمولی فائدہ پہنچ سکتا ہے۔

ان کے بعد مرکز اطلاعات اقوام متحدہ کے ڈائرکٹر ڈاکٹر عبداللہ فریاد نے اپنی تقریر میں بتایا کہ حقوق انسانی کا عالمی منشور کس طرح وجود میں آیا، اور اس کے اعلان کے بعد سے اب تک اس نے کس کس لحاظ سے ترقی کی ہے اور انسانی حقوق سے متعلق اقوام متحدہ کے کمیشن اور ذیلی کمشنوں نے کیا خدمات انجام دی ہیں اور آئندہ کیا کچھ ہونے والا ہے۔

کراچی کی مشہور سماجی کارکن بیگم شیریں عزیزا احمد نے عالمی منشور کی روشنی میں بتایا کہ ابھی حقوق کی اور بہت سی قسمیں باقی ہیں جن پر اقوام متحدہ کے کمیشن کو نظر ڈالنے کا موقع نہیں ملا، درآں حالیکہ ان کا لحاظ

رکھنا بھی ضروری ہے۔ اجلاس ختم ہونے سے پہلے اسکول کے طلبا اور طالبات نے ایک ورائٹی پروگرام پیش کیا، جسے حاضرین نے بہت پسند کیا۔

ریڈیو پاکستان کراچی نے حقوق انسانی کے موضوع پر اپنے ایک خاص پروگرام میں فضل حق قریشی کی تقریر پر اور مسٹر فضل احمد صدیقی کا ایک فیچر نشر کیا۔

دوسرے دن ۱۱ دسمبر کو طلبائے پاکستان کی انجمن اقوام متحدہ نے ایس۔ ایم لا کالج میں ایک جلسہ کیا جس میں انسانی حقوق کے عالمی منشور کی قانونی حیثیت پر روشنی ڈالی گئی۔

۱۳ دسمبر کو کل پاکستان انجمن خواتین کے شعبۂ امور اقوام متحدہ کے زیر اہتمام ایک عام اجلاس ہوٹل میٹروپول میں زیر صدارت بیگم فیروز خاں نون منعقد ہوا۔ اجلاس میں سیلون کے ہائی کمشنر ہز ایکسیلنسی محمود معروف وزارت خارجہ کے سکرٹری مسٹر احسان اللہ بیگم جواد حسین اور بیگم برلاس نے تقریریں کیں۔

انگریزی اور اردو کے بہت سے روزناموں نے اپنے مقالات افتتاحیہ میں حقوق انسانی کے عالمی منشور کی تعریف کرتے ہوئے اسے عہد حاضر میں ثقافت اور انسان دوستی کا ایک اعلیٰ کارنامہ بتایا

یہ تقریبات پاکستان کے اور شہروں میں بھی شایان شان طریقے پر منائی گئیں خصوصاً ڈھاکہ میں جہاں مرکز اطلاعات کے ڈپٹی ڈائرکٹر مسٹر ایم ایم تقی نے تقریبات کو کامیاب بنانے میں عملی حصہ لیا ۔

ہنگامی فوج کا اعلیٰ معیار صحت

مشرق وسطیٰ میں ایشیائی انفلوئنزا کی جو وبا حال ہی میں پھیلی تھی اس نے نوقوموں کے نوجوانوں پر کوئی اثر نہیں ڈالا جو اقوام متحدہ کی ہنگامی فوج میں شامل ہو کر غازہ کے علاقے اور صحرائے سینا میں امن قائم کر رہے ہیں۔

ہنگامی فوج کے اعلیٰ میڈیکل افسر لفٹننٹ کرنل فریڈرک ایلفسن نے جو ناروے کی فوج سے تعلق رکھتے ہیں، اطلاع دی ہے کہ بعض افراد ایک ایسی بیماری میں مبتلا ہوئے ہیں جو انفلوئنزا سے ملتی جلتی ہے۔ لیکن حقیقتاً کوئی وبائی صورت نہیں ہے۔ علامات اس قدر معمولی ہیں کہ ان سے کوئی تشویش پیدا نہیں ہوئی ہے۔

کرنل موصوف کا کہنا ہے کہ جب انہوں نے انفلوئنزا پھیلنے کی خبر سنی تو انہیں اندیشہ ہوا کہ کہیں فوج کے نوجوان اس وبا میں مبتلا نہ ہو جائیں۔ ان کے نزدیک فوج کا اس سے محفوظ رہنا اس لیے ممکن ہوا کہ اول تو ایک ملک سے دوسرے ملک تک پہنچتے ہوئے بیماری کا زور گھٹ گیا تھا اور دوسرے یہ کہ فوج کے نوجوان تندرست اور قوی ہیکل ہیں اور ان میں معمولی مرض کا مقابلہ کرنے کی سکت موجود ہے۔

یہ حقیقت ہے کہ ہنگامی فوج کی صحت کا روشن پہلو اس وقت سامنے ہے جس کا اندازہ پہلے نہیں ہو سکا تھا۔ اس میں شک نہیں ہے کہ انہیں پیچش، یرقان اور ورم جگر کا اندیشہ تھا کیوں کہ ان امراض میں بہت سے فوجی مبتلا ہو چکے تھے۔ جو دوسری جنگ عظیم کے دوران میں اسی علاقے میں متعین ہوئے تھے۔ لیکن خلاف توقع ہنگامی فوج کے بہت کم سپاہی بیمار ہوئے۔ امراض کے حملے تو ضرور ہوئے لیکن وہ زیادہ شدید نہیں تھے۔ اور نہ زیادہ دن قائم رہے۔ پیچش میں مبتلا جو بعض ہسپتال میں داخل ہوئے، ان کو آنتوں کی گیس نے پریشان رکھا۔ یہ بیماری عموماً مکھیوں کے ذریعہ پھیلتی ہے اور اس کا ایک سبب خراب غذا بھی ہے۔

بعض فوجی حادثات کا شکار ہو کر بھی ہسپتال میں داخل ہوئے۔ ان میں ٹریفک کے حادثات شامل ہیں اور ایک بارسرنگ پھٹ جانے سے بھی کچھ افراد کو نقصان پہنچا۔

کرنل ایلفن اس حقیقت کی کوئی وجہ نہیں بتا سکے کہ اس علاقے کے دوسرے فوجیوں کی بہ نسبت ہنگامی فوج کے نوجوان کیوں کم بیمار ہوئے۔ البتہ انہوں نے کہا کہ جو بیماریاں آج سے ۱۵ سال پہلے اس جگہ عام تھیں اس وقت کہیں کہیں اپنا رنگ جماتی ہیں۔ انہوں نے اس کا سبب یہ بتایا کہ مہاجرین فلسطین سے متعلق اقوام متحدہ کے ادارۂ بحالیات و امور نے اس علاقے میں عمدہ صحتی خدمات انجام دی ہیں اور اس نے مہاجرین کی گنجان آبادی میں حفظانِ صحت کا معیار زیادہ بلند کر دیا ہے۔

کرنل موصوف کی رائے ہے کہ فوج کو راشن میں جو عمدہ غذا ملتی رہی اس نے بھی صحت بحال رکھنے میں مدد دی اور فوج نے بعض احتیاطی تدابیر بھی اختیار کیں۔ مثلاً (۱) چیچک، موتی جھرہ اور ہیضہ جیسی متعدی بیماریوں سے بچانے کے لیے فوجیوں کے برابر ٹیکے لگتے رہے۔ (۲) تمام فوجیوں کے لیے پینے کے پانی میں کلورین ملائی گئی تاکہ وہ جراثیم اور دوسری آلودگیوں سے صاف رہے (۳) کھانا نہایت صفائی سے تیار کیا گیا۔ حالاں کہ باورچی خانوں اور طعام خانوں کی

کیا گیا۔ حالاں کہ باورچی خانوں اور طعام خانوں کی صحیح سہولتیں وہاں میسر نہیں آسکتی تھیں۔ (۴) راشن کی مقدار بہت ٹھیک تھی۔ لذیذ اور مختلف النوع ہونے کے اعتبار سے بھی نوجوانوں نے اسے پسند کیا اور لطف اٹھایا۔ غذا کی اوسط ۵ ہزار حرارے کے برابر رہی۔ اس میں روٹی گوشت اور سبزیاں وغیرہ سبھی کچھ شامل تھا۔ پھر ان کی قومی غذاؤں کا خاص خیال رکھا گیا۔ مثلاً بھارتی سپاہیوں کو چاول زیادہ مرغوب تھے تو اسکنڈے نیویا کے نوجوان مچھلی اور پنیر پسند کرتے تھے۔

قتل عام سے باز رکھنے والے قانون کی توثیق

اقوام متحدہ نے قتل عام سے باز رکھنے اور ارتکاب جرم کرنے والوں کو سزا دینے کے لیے جو قانونی دستاویز تیار کی ہے پاکستان نے بھی اس کی توثیق کر دی ہے۔ اس طرح توثیق کرنے والے ملکوں کی تعداد ۵۶ ہو گئی ہے۔

اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی نے یہ قانون ۹ دسمبر ۱۹۴۸ء کو منظور کیا اور اعلان کر دیا کہ بین الاقوامی قانون کے مطابق قتل عام ایک جرم ہے، خواہ اس کا ارتکاب زمانۂ امن میں ہو یا دوران جنگ میں۔ دستاویز پر دستخط کرنے والے ملک ذمہ لیتے ہیں کہ اگر قومی، نسلی، مذہبی یا لسانی اعتبار سے کسی قوم یا جماعت کو ختم کرنے کے لیے قدم اٹھایا جائے تو اسے جرم سمجھا جائے گا اور ارتکاب کرنے والوں کو سزا دی جائے گی یہ قانون ۱۲ جنوری ۱۹۵۱ء سے نافذ ہے۔

اب تک افغانستان۔ البانیہ۔ ارجنٹائن۔ آسٹریلیا۔ بلجیم۔ برازیل۔ بلغاریہ۔ بائیلو رشیا۔ کمبوڈیا۔ کنیڈا۔ سیلون چین۔ چلی۔ کوسٹاریکا۔ کیوبا۔ چیکوسلواکیہ۔ ڈنمارک۔ ایکوئے ڈور۔ مصر۔ ال سلویڈور۔ حبشہ۔ فرانس۔ جمہوریت جرمنی یونان۔ گواٹی مالا۔ ہائٹی۔ ہونڈورس۔ ہنگری۔ ہالینڈ۔ رومانیہ۔ سعودی عرب۔ سویڈن۔ شام۔ تیونس۔ ٹرکی۔ یوکرین۔ اور روس نے بہ استثنائے دفعات ۱۶ اور ۱۲۔ آئس لینڈ۔ ایران۔ اسرائیل۔ اٹلی۔ اردن۔ جمہوریت کوریا۔ لے اوس۔ لبنان۔ لائبیریا۔ میکسیکو۔ موناکو۔ نکاراگوا۔ ناروے۔ پاکستان۔ پاناما اور فلپائن نے بہ استثنائے دفعات ۴، ۶، ۷ اور ۹ برما نے بہ استثنائے دفعہ نمبر ۶ اور ۸ اور ویت نام اور یوگوسلاویہ نے بلا استثنا اس قانون کو منظور کیا ہے۔ پاکستان نے اپنا توثیق نامہ ڈاک کے ذریعہ نیو یارک بھیجا تھا۔

انسداد جرائم کے لیے علمی اجتماع

مشرق بعید میں جرائم کے انسداد اور مجرمین کی اصلاح کے لیے اقوام متحدہ کا دوسرا علمی اجتماع حال ہی میں

بمقام ٹوکیو منعقد ہوا جس میں علوم جرم و سزا سے متعلق تقریباً اسی ماہرین شریک ہوئے تھے۔ یہ سیمینار ۵ نومبر کو شروع ہو کر ۲ دسمبر کو ختم ہوا۔ عصمت فروشی۔ نوجوانوں کی بے راہ روی۔ قیدیوں کی اصلاح اور جیلوں میں کام لینے کے اقتصادی عناصر ایجنڈے کے خاص موضوعات تھے۔

ساٹھ ملکوں کے نمائندے اجلاس میں شریک ہوئے۔ ان کے علاوہ اقوام متحدہ کے مخصوص اداروں مثلاً اقوام متحدہ کے تعلیمی، سائنسی اور ثقافتی ادارے۔ بین الاقوامی ادارۂ عمال اور متعدد غیر سرکاری اداروں نے جو ان مسائل سے تعلق رکھتے ہیں اپنے مبصرین بھیجے۔ یہ اجتماع حکومت جاپان کی وزارت انصاف کے مشیر خاص ڈاکٹر بسیجر واولو اور اقوام متحدہ کے شعبہ امور معاشرت کے ایک افسر ڈاکٹر ایڈورڈ گالوے کی نگرانی میں ہوا۔

لندن پروبیشن سنٹر کے ایک افسر اعلیٰ مسٹر سلیسن نارمر نے آزمائشی نظام اور بے راہ نوجوانوں کی اصلاح کے موضوع پر ایک مقالہ پڑھا۔ کولمبو (سیلون) کے کمشنر جیل خانہ جات مسٹر ڈی ایس پلائی اور وٹس دل انسٹی ٹیوٹ برن (سوئٹزرلینڈ) کے ڈائرکٹر مسٹر کیلر بالر اس کوشش میں ہیں کہ جیل خانوں میں کیے جانے والے کام اور قومی اقتصادیات میں رابطہ قائم ہو جائے۔

پاکستان (لاہور) کے انسپکٹر جنرل جیل خانہ جات۔ لفٹننٹ کرنل بشیر احمد ملیلا کے ڈائرکٹر جیلخانہ جات ڈاکٹر الفریڈ وبٹے نے اصلاح مجرمین کے موضوع پر اظہار خیالات کیا۔ ڈاکٹر گوری نیر جی نے جو ٹاٹا انسٹی ٹیوٹ آف سوشل سائنسز میں پروفیسر ہیں عصمت فروشی کی روک تھام پر اور ویبل تھاوٹ نے نوجوانوں کی بے راہ روی کے مسائل پر اپنے خیالات کا اظہار کیا۔

بہت سی حکومتوں نے جن میں جاپان۔ برما۔ جمہوریت کوریا۔ جمہوریت انڈونیشیا۔ جمہوریت چین۔ فلی پائن اور ہانگ کانگ شامل ہیں، اپنے علاقوں کے حالات پر بیان دیے۔ ان ملکوں کے نمائندوں نے علی الخصوص بحث میں حصہ لیا۔ پاکستان، افغانستان۔ برما۔ لے اوس۔ ملایا۔ شمالی بورنیو۔ فلی پین۔ سنگاپور۔ تھائی لینڈ۔ چین۔ کمبوڈیا۔ سیلون۔ ہانگ کانگ۔ بھارت۔ انڈونیشیا۔ جمہوریت کوریا اور ویت نام۔

یہ کانفرنس ٹوکیو کے ایک نو تعمیر ہال۔ سانکی کیشکان میں منعقد ہوئی جس کا نقشہ چھوٹے پیمانے پر اقوام متحدہ کے جنرل اسمبلی ہال سے ملتا جلتا ہے۔ جاپان کے عوام اور صحافیوں نے اس اجتماع میں خاص دلچسپی کا اظہار کیا —

یونی سیف کے تہنیتی کارڈ

دنیا کے ہر حصے میں ہر عمر کے بچے اور نوجوان جب اپنے جذبات شوق کا اظہار کرنا چاہتے ہیں تو ترجمانی کے لیے تصویروں، شکلوں اور رنگوں کا سہارا لیتے ہیں۔ چناں چہ چیکوسلواکیہ کی ایک سات سال کی خوب صورت بچی جب یونی سیف کی فراہم کردہ ادویات سے تندرست ہو گئی اور اسی کی بھیجی ہوئی غذا کے استعمال سے اس کے جسم میں طاقت آ گئی تو اس نے سوچا کہ اقوام متحدہ کے بچوں کے فنڈ کا شکریہ ادا کرنا چاہیے۔ اس نے اپنے خیالات کو کرسمس کے موقع پر ایک تہنیتی کارڈ کی صورت میں پیش کیا اور یہیں سے یونی سیف کے کارڈوں کی ابتدا ہو گئی۔

یہ بچی ایک گاؤں میں رہتی تھی جو جنگ کے دوران میں بری طرح تباہ ہوا، اور فصل خراب ہو جانے کے باعث وہاں کے لوگوں کو قحط کا سامنا کرنا پڑا۔ جب پیٹ بھرنے کے لیے روٹی کا ایک ٹکڑا میسر نہ آ سکے تو بچوں کے لیے دودھ کا انتظام کیسے ہو۔ صحیح غذا نہ ملنے کے باعث وہ کمزور ہو گئے اور طرح طرح کی بیماریوں میں بھی مبتلا ہو گئے۔ ان کی حالت زار پر ترس کھا کر یونی سیف نے امداد کا سلسلہ شروع کیا، اور جن بچوں کو امداد ملی، ان میں وہ بچی بھی شامل تھی جس نے فنڈ کے لیے تہنیتی کارڈوں کی بنیاد ڈالی۔ اگرچہ یونی سیف کے بجٹ کے لیے اور مالی ذرائع بھی موجود ہیں۔ تاہم کارڈوں کی آمدنی سے اس میں قابل ذکر اضافہ ہوتا ہے۔

چیکوسلواکیہ کی صرف ایک بچی کو یونی سیف کی امداد نہیں ملی تھی، بلکہ اور بھی بہت سے بچے متعدی امراض اور خرابی غذا سے پیدا ہونے والی بیماریوں میں گھرے ہوئے تھے، اور وہ سب امداد کے مستحق تھے۔ تندرست ہو جانے کے بعد ان سبھی نے کارڈوں کے نمونے بنائے تھے۔ ان کی تخلیقات کو فن کے اعتبار سے جانچا جائے تو ممکن ہے کہ وہ کسی اعلیٰ معیار پر نہ اتریں، لیکن جن جذبات کا اظہار کیا گیا ہے وہ لائق تحسین ہیں ۱۹۴۹ء میں بچوں کے بنائے ہوئے کارڈ کرسمس اور دوسرے تہواروں پر فروخت کیے گئے اور ان سے خوب آمدنی ہوئی۔

اس کے بعد دنیا بھر کے فن کاروں نے توجہ دی اور وہ اس مقصد عظیم کے لیے اپنے شاہ کار پیش کرنے لگے کیوں کہ انھیں یونی سیف کے انسان دوستی کے مقاصد سے دل چسپی پیدا ہو گئی تھی اور ان کی تکمیل میں خود بھی حصہ لینا چاہتے تھے۔ یہ سلسلہ اتنا مقبول ہوا کہ یونی سیف کو بیک وقت کئی کئی نمونوں کی اشاعت کا انتظام کرنا پڑا۔ کیوں کہ شاہ کاروں کی کثرت نے انتخاب کا کام دشوار کر دیا تھا۔

پچھلے سال تقریباً ۱۸ کروڑ ۰۰ لاکھ بچوں اور ماؤں کو یونی سیف کے امدادی پروگرام سے فائدہ پہنچا۔ پروگرام میں فراہمی خوراک کے علاوہ تپ دق اور ملیریا کے خلاف مہمیں۔ خارش کی روک تھام۔ امراض چشم اور جذام کا علاج بھی شامل ہے۔ ماؤں اور بچوں کی فلاح و بہبود سے متعلق شفاخانوں کو آلات اور دیگر سامان بھی فراہم کیا گیا۔ اس سال یونی سیف سے ۹۵ ملکوں اور علاقوں کے ۴ کروڑ ۵۰ لاکھ سے زیادہ بچوں اور ماؤں کو امداد دی جا رہی ہے۔

ہر سال دنیا کے مشہور فن کاروں نے یونی سیف کے کارڈوں کے ڈیزائن تیار کیے ہیں۔ اس سال کے پروگرام میں چار نام قابل ذکر ہیں (۱) لڈویک بیلمان نے جن کا وطن آسٹریا تھا اور اب امریکہ میں رہتے ہیں "موسیقی برائے اطفال" کے عنوان سے پانچ نمونے پیش کیے ہیں۔ ان میں مختلف ملکوں کے بچوں کو موسیقی سے محو ہوتے دکھایا گیا ہے (۲) مشہور چینی کے فن کار مائی تھو نے دو کارڈ بنائے ہیں ایک میں دیت نام کی ایک عورت چھوٹی بچیوں کو بیننے کا فن سکھا رہی ہے اور دوسرے میں تین بچے چینی حروف لکھنے کی مشق کر رہے ہیں (۳) امریکہ کی ایک خاتون گلیڈس روکوڈیوس نے ایک ماں اور بچے کی تصویر میں ممتا کے عالمگیر جذبے کی ترجمانی کی ہے (۴) سوئٹسان کے رہنے والے ہنس ارنی نے جدید طرز مصوری کے مطابق سیاہ زمین پر سفید خطوط کے ذریعہ تمثیلی انداز میں دو نقش پیش کیے ہیں۔ ایک کا عنوان "بھائی بھائی ہے" اور دوسرے کا "انسانی برادری" ان تمثیلی نقوش کے ذریعہ اقوام متحدہ کے اغراض و مقاصد پر روشنی پڑتی ہے۔

یونی سیف کے کارڈ خریدنا گویا ادارے کی ان کارگذاریوں میں شریک ہونا ہے جو انسان دوستی اور خدمت خلق کی خاطر عمل میں آتی ہیں۔ ہر کارڈ کا منافع پانچ بچوں کو دودھ کا ایک ایک گلاس پیش کر سکتا ہے یا تپ دق سے بچانے کے لیے ایک بچے کے ٹیکہ لگ سکتا ہے۔ پورے ایک ڈبے کا نفع ایک بچے کو خارش سے یا آنکھوں کی بیماری سے محفوظ کر دیتا ہے۔ کتنی بڑی بات ہے اور پھر یہ رقم کسی سے محض چندے کے طور پر پیش نہیں کی جاتی۔ کارڈوں کی قیمت نہ صرف واجبی بلکہ بہت قلیل ہے، جسے ہر شخص برداشت کر سکتا ہے۔ تہواروں پر یوں بھی تہنیتی کارڈ خریدے ہی جاتے ہیں۔ کیوں نہ یونی سیف کارڈ خریدے جائیں اپنا بھلا ہو اور دوسروں کا بھی۔ دس کارڈوں اور ان لفافوں کی قیمت صرف پانچ روپے رکھی گئی ہے۔

مزدوروں کے تعلیمی پروگرام کا جائزہ

بین الاقوامی ادارۂ عمال نے ایسے ماہرین کا ایک اجلاس طلب کیا ہے جو مزدوروں کی تعلیم کے ضمن میں ادارے کی گذشتہ کارگذاریوں کا جائزہ لینے اور آئندہ کے لیے سفارشات پیش کرتے ہیں۔

یہ اجلاس ادارے کے صدر مقام پر ۹ دسمبر کو شروع ہوا اور ۱۴ دسمبر تک جاری رہا۔ اس میں ۱۸ ماہرین شریک ہوئے جنہوں نے قومی یا بین الاقوامی تجارتی انجمنوں اور تعلیمی اداروں کی نمائندگی کی۔ ادارے کے پروگرام کا جائزہ لینے کے علاوہ اجلاس میں مزدوروں کے تعلیمی پروگرام کے دائرہ عمل اور نوعیت اور طریقہ کار پر بھی غور کیا گیا۔

اپنے دستوری مقاصد کے بموجب بین الاقوامی ادارہ عمال نے ہمیشہ مزدوروں کی تعلیم کو فروغ دینے کی کوشش کی ہے۔ سنہ ۱۹۵۲ء میں اس نے مزدوروں کے ایک تعلیمی پروگرام کی تجرباتی بنیاد پر خاص اہتمام کے ساتھ اپنی کوششیں شروع کی تھیں۔

سنہ ۱۹۵۶ء میں اور اس سال ادارے نے حسب ذیل خدمات انجام دی ہیں۔

(۱) مزدوروں کے لیے تعلیمی نصاب اور دوسرے تعلیمی سامان پر ایک سلسلۂ مطبوعات۔

(۲) صوتی و بصری مطبوعات کے ایک کتب خانے کا قیام جس کے پڑھنے کے لیے کتابیں دی جاتی ہیں۔

(۳) مزدوروں کی تعلیم سے متعلق جلسوں، علمی اجتماعوں اور نصابوں میں شرکت۔

(۴) مشاورتی خدمات۔

(۵) دنیا کے مختلف حصوں میں مزدوروں کی تعلیم سے متعلق جو خدمات انجام دی گئی ہیں ان کی تفصیلات ا دیگر معلومات کا مرقع ہے

دسمبر

ـري

آموز

۱۰ شمارہ ۱۰] لاہور [دسمبر ۱۹۵۷

اس شمارہ میں

آموزش

لاہور

دسمبر ۱۹۵۷ء

جلد ــــــــــ ۱۰

شمارہ ــــــــــ ۹

سالانہ چندہ

پاکستان کے لیے ۶ روپے

غیر ممالک کے لیے ۸ روپے

قیمت فی پرچہ دس آنے

پبلشرز

یونی ورسٹی بک ایجنسی لاہور

آر۔ ایچ۔ ڈی خالد پرنٹر پبلشر نے دین محمدی پریس میں طبع کرا کے
یونیورسٹی بک ایجنسی ۲ کچہری روڈ لاہور سے شائع کیا

بین الاقوامی اسلامی مجلس مذاکرہ

ایم۔ اے مخدومی

پنجاب یونیورسٹی مبارک باد کی مستحق ہے کہ وہ ۱۹۵۷ء کے خاتمہ پہ ایک بین الاقوامی اسلامی مذاکرے کا اہتمام کر رہی ہے۔ اس مذاکرے کا افتتاح ۲۹ دسمبر کو صدر جمہوریہ اسلامیہ پاکستان میجر جنرل اسکندر مرزا فرمائیں گے اور یہ ۸ جنوری ۱۹۵۸ء تک جاری رہے گا۔ جو مندوبین اس میں حصہ لے رہے ہیں ان کی تعداد کوئی ڈیڑھ سو کے قریب ہے اور وہ کوئی تین درجن اقوام کی نمائندگی کر رہے ہوں گے۔ یہ مذاکرہ صرف پاکستان میں نہیں بلکہ دنیائے اسلام میں اپنی قسم کا پہلا علمی اجتماع ہوگا اور دنیا میں اپنی نوعیت کا دوسرا اجتماع۔

آج دنیا کو چند در چند مشکل مسائل کا سامنا ہے۔ ایک طرف سائنس اور ٹکنالوجی اس برق رفتاری سے ترقی کر رہی ہیں کہ مادی فراوانی کی جنت نوع انسان کے بالکل زیر قدم نظر آنے لگی ہے۔ دوسری طرف مختلف نظریہ ہائے حیات میں اس شدت کی کشاکش جاری ہے کہ وہ ایک دوسرے کو ملیامیٹ کر دینے کے درپے نظر آتے ہیں۔ جدید سائنس نے تباہی اور ہلاکت کے جو بے پناہ ہتھیار انسان کے ہاتھ میں دے دیے ہیں ان کو دیکھتے ہوئے یہ کہنا کوئی مبالغہ نہیں کہ اگر ایک تیسری عالمی جنگ کے شعلے بھڑک اٹھے تو وہ جدید تہذیب اور اس کے سارے کارناموں کا خاتمہ کر کے رکھ دیں گے۔

اسلام نے دنیا کو محبت، سلامتی، رواداری، عدل و انصاف اور مساوات پر مبنی بھائی چارے کا پیغام دیا تھا۔ ایک ایسا عالمی بھائی چارہ جو رنگ و نسل اور ملک و قوم کی وفاداریوں سے آزاد تھا۔ آج دنیا کو اس قسم کے بھائی چارے کی سخت ضرورت ہے۔ یہ وہ جادو اثر نسخہ ثابت ہو سکتا ہے جو محدود نظریہ ہائے حیات سے پیدا ہونے والی تمام تنگ نظریوں کو ختم کر کے نوع انسان کو لامحدود ترقی اور خوش حالی کی راہ پر ڈال دے اور جدید دنیا کو

اس قابل بنائے کہ وہ سائنس اور ٹکنالوجی سے انسانی بہبود کے لیے بھرپور خدمت لے ۔

جدید عالمی حالات اس بات کے لیے بے حد موزوں ہیں کہ اسلام کے چودہ سو سال پرانے پیغام کا موجودہ عالمی ضروریات کی روشنی میں جائزہ لیا جائے ۔ اسلام تاریخ کی ایک عظیم الشان اور حیات بخش قوت ہے ۔ اس قوت نے تاریخ کے مختلف ادوار میں بڑے بڑے کارنامے انجام دیے ہیں ۔ اس کی بدولت دنیا کے ثقافتی اور علمی ذخائر میں بے اندازہ اضافہ ہوا ہے ۔ آج جبکہ نوع انسان خوف و ہراس کے عالم میں مستقبل کی طرف نگاہیں اٹھائے دیکھ رہی ہے اس بات کی حقیقی ضرورت ہے کہ دنیا کے مفکر اسلامی نظریہ حیات پر ایک بے لاگ نگاہ ڈالیں اور یہ معلوم کرنے کی کوشش کریں کہ یہ نظریہ حیات موجودہ دور کے مشکل مسائل پر کیا روشنی ڈالتا ہے ۔

مجوزہ بین الاقوامی اسلامی مذاکرے میں جن موضوعات پر مقالے پڑھے جائیں گے وہ یہ ہیں :-

(۱) اسلامی ثقافت

(۲) جدید تصورات ۔ اقدار اور اسلامی معاشرے پر ان کا اثر

(۳) اسلام میں اجتہاد اور قانون سازی کا نظام

(۴) ریاست کا اسلامی تصور ۔

(۵) سائنس اور معاشیات کے معاملے میں اسلامی نقطہ نگاہ ، بالخصوص زمین کی ملکیت اور زرعی اصلاحات کے بارے میں اس کا زاویہ نگاہ ۔

(۶) مغربی تاریخ اور ثقافت پر اسلام کا اثر

(۷) دوسرے مذاہب کے متعلق اسلام کا طرز عمل اور ان کے ساتھ اس کے مراسم

(۸) عالمی امن کی ترقی میں اسلام کا حصہ ۔

یہ تمام مسائل بے حد اہم ہیں ۔ بین الاقوامی اسلامی مذاکرے کے موقع پر دنیا کے بعض مشہور عالم اور مفکر ان پر اپنے خیالات ظاہر کرنے والے ہیں ۔ ان کے افکار یقینی طور پر بعض مشکل عالمی مسائل کے حل پر عملی روشنی ڈالیں گے اور تعلیمی دنیا پر بھی ان کا ایک پائدار اثر ہوگا ۔

شہزادہ فلپ کا روئے زمین کے گرد سفر

فضل احمد

مسلسل نمبر ۲

ڈیوک آف اڈنبرا نے اپنے بحری سفر کا آغاز ۱۶ اکتوبر ۱۹۵۶ء کو کیا۔ روئے زمین کے اس سفر کی تیاری میں شہزادہ فلپ نے ڈیڑھ سال کا عرصہ صرف کیا تھا۔ سفر کا مقصد کوئی نئے ملک دریافت کرنا نہ تھا بلکہ ملکہ برطانیہ کے پرانے ملکوں کے باشندوں کے دلوں میں شاہی خاندان کی محبت کو بڑھانا تھا۔ گزشتہ شمارے میں اس سفر کے متعلق کچھ تفصیلاً عرض کیا جا چکا ہے۔ اس کا بقیہ حصہ ملاحظہ ہو۔

دل چسپ مشاہدات

افریقہ کے مشرقی ساحل سے روانہ ہو کر شاہی جہاز سب سے پہلے مڈغاسکر کے شمال میں سی شیلز نامی جزیرے میں رکا۔ ایک روایت کے مطابق اس جزیرے کو "باغ عدن" کا نام دیا جاتا ہے۔ شہزادہ فلپ جب جزیرے کے دارالحکومت وکٹوریہ میں پہنچا تو شہر کی چالیس ہزار آبادی بمع گورنر استقبال کے لیے باہر نکل آئی۔ آتش بازی نے ایک عجیب سماں پیدا کر دیا تھا۔

یہاں سے چل کر جہاز نے جزائر مالاپو کا رُخ کیا۔ جب یہ جزیرے قریب آئے تو ایک بحری افسر نے نہانے کے ارادے سے سمندر میں غوطہ لگایا۔ ابھی چند منٹ نہ گذرنے پائے تھے کہ بحر ہند کی ایک شارک مچھلی اس کی طرف بڑھی۔ افسر نے اپنے بچاؤ کے لیے فوراً مچھلی پر گولی چلا دی۔ گولی سے مچھلی کا خاردار حصہ جسم سے اڑ کر دور جا گرا اور اگلے لمحے مچھلی افسر کے اوپر سے گذر گئی۔ اب افسر نے پوری قوت سے ساحل کا رُخ کیا اور چند منٹوں میں صحیح سلامت خشکی پر جا کھڑا ہوا۔

جزائر مالاپو سے شاہی جہاز لنکا کو چل دیا۔ اس کے کولمبو کی بندرگاہ میں داخل ہوتے ہی تجارتی جہازوں نے بگل بجا بجا کر آسمان سر پر اٹھا لیا۔ لنکا کا گورنر جنرل۔ وزیر اعظم اور کابینہ کے وزیر شہزادہ فلپ کے استقبال کو آئے لیکن سرکاری استقبال کے ٹھاٹھ کی نسبت شہزادے نے مقامی مسائل میں زیادہ دل چسپی ظاہر کی۔ وہ بدھ بھکشوؤں کی جھونپڑیوں میں گیا

جا نکلا۔ اور ان سے طرح طرح کے سوال پوچھے۔ وزیراعظم کے ساتھ دسترخوان پر بیٹھے بیٹھے شہزادے نے حکومت کی ان کوششوں کی تفصیلات معلوم کیں جو قدیم نظام آبپاشی کو از سرِ نو بحال کرنے کے لیے کی جا رہی ہیں۔

کولمبو سے روانہ ہو کر شاہی جہاز لنکا کے گرد چکر کاٹ کر جزیرے کی مشرقی بندرگاہ ٹرنکومالی میں جا پہنچا۔ دوسری عالمی جنگ کے زمانے میں شہزادے نے کچھ عرصہ اس بندرگاہ میں گذارا تھا۔ اس زمانے میں یہ بندرگاہ اتحادی جنگی جہازوں اور کشتیوں سے اٹی پڑی تھی۔ اس کے مقابلے میں اب یہ خالی نظر آ رہی تھی۔ ساحل پر قدم رکھتے ہی شہزادہ کا پرتپاک استقبال کیا گیا۔ شہزادہ سیدھا اس عظیم الشان بدھ مندر میں پہنچا جہاں سب سے پہلے گوتم بدھ کے ارشادات کو پانچ سو سال کے بعد ضابطہ تحریر میں لایا گیا تھا۔ شہزادے نے اس مندر میں گوتم بدھ کو خراجِ عقیدت ادا کیا، اس سے لنکا کے بدھوں میں خوشی کی ایک لہر دوڑ گئی۔

لنکا سے شاہی جہاز نے ملایا کے سرسبز ساحل کا رُخ کیا۔ سنگاپور میں ان دنوں قوم پرستوں نے شورش برپا کر رکھی تھی۔ چنانچہ سنگاپور کی بجائے جزیرہ لنگ کاوی کا رُخ کیا گیا۔ اس مقام کی حد درجہ گرم مرطوب آب و ہوا بڑی صبر آزما تھی۔ لیکن شہزادہ فلپ اور اس کے ساتھی جہاز سے اترے اور ڈیڑھ میل کا فیصلہ پیدل طے کر کے جزیرہ کے صدر مقام کواہ میں پہنچے۔ سڑک پر دونوں طرف چاند جیسے چہروں والے بچے قطاریں باندھے کھڑے تھے شہزادے کے اعزاز میں ایک پر تکلف دعوت چائے دی گئی۔ دعوت جاری تھی کہ استوائی بارش نے میزبانوں اور مہمانوں دونوں کو بھاگنے پر مجبور کر دیا۔ اگلے روز پینانگ میں شاہی مہمان کا پرجوش استقبال کیا گیا۔ یہاں سے شہزادہ فلپ ملایا کے صدر مقام کوالالمپور گیا اور نو سلطانوں کے ساتھ مل کر کھانا کھایا۔

ملایا سے روانہ ہو کر شاہی جہاز نے ایک اور لمبی دوڑ لگائی اور وہ جزائر شرق الہند میں سے گذرتا ہوا تین ہزار میل سے زیادہ سفر طے کر کے پاپوا کے جزیرے میں آن پہنچا۔ اس لمبے بحری سفر میں شہزادے نے راستے میں صرف دو مقامات پر مختصر سی تفریح کی۔ جزیرہ پاپوا کی بندرگاہ سورزبی میں داخل ہوتے ہی شاہی مہمان کا سرگرم استقبال کیا گیا۔ یہاں آسٹریلیا کا گورنر جنرل شہزادہ فلپ کی آؤ بھگت کے لیے موجود تھا۔ شہر کو بڑے ٹھاٹھ کے ساتھ سجایا گیا تھا۔ جزیرے کی آبادی شہزادے کو دیکھنے کے لیے امڈ آئی۔ اس انبوہ میں گورے۔ گندمی اور نیم وحشی لوگ سب شامل تھے۔ وحشی قبائل نے اپنے عجیب و غریب لباس زیب تن کر رکھے تھے اور ان کے سرداروں نے اپنے چہروں

جسموں کو طرح طرح کے رنگ و روغن سے مزین کر رکھا تھا۔ یہ رنگ رلیاں پورے دو دن تک جاری رہیں۔

شہزادہ آسٹریلیا میں

موزربی کی بندرگاہ سے شاہی جہاز کو مرمت وغیرہ کے لیے سڈنی بھیج دیا گیا، اور شہزادہ فلپ ہوائی جہاز میں بیٹھ کر آسٹریلین نیوگنی کے صدر مقام لی میں پہنچا۔ اس مقام پر شاہی مہمان کا جو استقبال کیا گیا وہ اپنی رنگینی اور بوقلمونی کے باعث اپنی مثال آپ تھا۔ نیوگنی کے تمام قبائل کے سردار لی میں جمع تھے۔ ان میں سے جو قریب کے مقامات میں رہتے تھے وہ پیدل چل کر آئے تھے۔ دور و دراز مقامات پر سرسبز سطوح مرتفع میں رہنے والے نیم وحشی سرداروں کو ہوائی جہازوں میں بٹھا کر لایا گیا تھا۔ ان لوگوں نے اس موقع کو اپنی دولت و عظمت کی نمائش کا بہانہ بنایا۔ ان میں سے بیشتر سروں پر پگڑیاں باندھے تھے، جن میں پرندوں کے رنگ برنگ چمکیلے پر گڑے تھے۔ ان کے ماتھوں، ہونٹوں اور ٹھوڑیوں پر سیپ وغیرہ کے زیورات آویزاں تھے۔ بہتوں کی کمر سے اوپر کا حصہ ننگا تھا اور پیٹ کے عین اوپر بانس کی تیلیوں سے بنا ہوا ایک مستطیل آویزہ لٹک رہا تھا۔ تیلیوں کی تعداد آویزہ کے مالک کی مقبوضہ اشیا کی تعداد کو ظاہر کرتی تھی۔ ان مقبوضہ اشیاء میں بیوی، گھونگے، کلہاڑے وغیرہ سب کچھ شامل تھا۔ یہ وحشی سردار بڑے اشتیاق کے ساتھ شہزادہ فلپ کے گرد جمع تھے، اور اس انہماک کے ساتھ اس کے چہرے پر آنکھیں گاڑے تھے کہ پل بھر کے لیے نگاہ نہ اٹھاتے تھے۔

نیوگنی اپنے سونے، مویشیوں، جنگلات، قہوے اور کوکو کے لیے مشہور ہے۔ لی سے شہزادہ فلپ ہوائی جہاز میں بیٹھ کر اردگرد کے علاقے کی سیر کو نکلا اور اس نے اپنی آنکھوں سے نیوگنی کی دولت کے ذخیروں کو دیکھا۔ اسی سیاحت کے دوران میں شہزادہ ایک گاؤں میں بھی گیا۔ اصلی باشندوں کے دو مسلح دستوں نے شہزادے کا استقبال کیا۔ گاؤں کے باشندے ڈھول بجاتے اور دیوانہ وار شور مچاتے باہر نکلے اور شہزادے کو ایک چوبی احاطے میں لے گئے۔ یہاں ان لوگوں نے بے تحاشہ ناچنا شروع کیا۔ اس ناچ سے اس قدر گرد اڑی کہ اس نے مہمانوں اور قریب کے ناریل کے درختوں کو ڈھانپ لیا۔

وحشی قبائل کے اس جشن سے فارغ ہو کر شہزادہ فلپ واپس لی پہنچا اور یہاں سے ہوائی جہاز میں بیٹھ کر شمال مشرق میں نیو برٹن کے شہر رابل میں پہنچا۔ اس جگہ ایک دن تک شہزادے کی آمد میں سرکاری طور پر خوشیاں

منائی گئیں۔ یہاں سے شہزادہ فلپ جو ائیر ایڈمرلٹی میں مانوس کے فوجی اڈے میں پہنچا۔ یہ وہ مقام تھا، جہاں شہزادے نے دوسری عالمی جنگ کا بیشتر زمانہ گذارا تھا۔

اس جگہ سے شہزادہ قریب کے جزیرہ لاس نیگروس میں جا نکلا۔ اس موقع پر جزیرے کے مقامی باشندوں نے جہازرانی کے ایسے ایسے کرتب دکھائے کہ شہزادہ دنگ رہ گیا، اور یہ کہنے پر مجبور ہو گیا کہ جہازرانی کے فن میں یہ نیم وحشی لوگ ترقی یافتہ قوموں سے کسی طرح پیچھے نہیں۔ اس بحری نمائش کا آغاز گیتوں سے ہوا۔ وحشی باشندے اپنی کشتیاں قطاروں میں کھڑی کیے ناچ اور گا رہے تھے۔ دفعتہً یہ ناچ اور گانا ختم ہو گیا اور کشتیاں پورے نظم و ضبط کے ساتھ مختلف سمتوں میں حرکت کرنے اور طرح طرح کی جنگی شکلیں دکھانے لگیں۔ آخر میں تمام کشتیوں نے ایک ساتھ حملہ کر کے دکھایا۔ بحری جنگ کی یہ نمائش بمشکل ختم ہوئی تھی کہ بندرگاہ میں بائیں طرف سے کشتیوں کا ایک اور بیڑہ نمودار ہوا ان کشتیوں میں ان اشیائے تجارت کی نمائش کی گئی تھی جو ان جزیروں کی پیداوار ہیں۔ ان میں مگرمچھ کی کھال، مچھلیاں سیپ، خشک مچھلی، ناریل وغیرہ شامل تھے۔

اس پُرلطف نمائش سے فارغ ہو کر شہزادہ اور اس کے ساتھی ہوائی جہاز میں بیٹھ کر ڈارون پہنچے۔ اگلی صبح شہزادہ نے موٹر کار میں بیٹھ کر ۵۰ میل سفر کیا اور شمالی آسٹریلیا کے اس رقبے کا ملاحظہ کیا جہاں سے یورینیم نکالا جا رہا ہے۔ اتنے میں شام ہو گئی۔ لیکن شہزادہ قریب کی ایک تنگ آبنائے میں جا نکلا اور اندھیرے میں ایک چھ فٹ لمبے مگرمچھ کا شکار کیا۔ غرض تقریباً ساری رات شکار اور سفر میں کٹ گئی اور صبح کے چار بجے کے قریب شہزادہ واپس ڈارون پہنچا۔

پانچ گھنٹے کے آرام کے بعد شہزادہ پھر ہوائی جہاز میں سوار ہوا، اور آسٹریلیا کے اس عظیم الشان زرعی منصوبے کو دیکھا جس کا مقصد تین کروڑ پونڈ سالانہ کی مالیت کا چاول پیدا کرنا ہے۔ یہاں سے شہزادہ اس پانچ ہزار میل رقبے کی طرف چل دیا جہاں مویشی پالے جاتے ہیں۔

جدید سائنس سے خدمت

آسٹریلیا ایک وسیع براعظم ہے مگر اس کی آبادی بہت تھوڑی ہے۔ دوسری عالمی جنگ میں جب جاپانی کچھ عرصہ کے لیے بحرالکاہل پر چھا گئے تو آسٹریلیا کے لیے سب سے بڑا اور دسمبر یہ تھا کہ اتنی چھدری آبادی کے ساتھ

حملہ آوروں کا مقابلہ کس طرح کیا جائے گا۔ اس تلخ سبق کا براہ راست نتیجہ یہ ہوا ہے کہ جنگ کے بعد یورپ کی گوری قوموں کو بڑی تعداد میں آسٹریلیا میں درآمد کیا گیا ہے۔ گو قریب ہی انڈونیشیا، جاپان، چین وغیرہ میں آبادی اتنی گنجان ہے کہ تل دھرنے کو جگہ نہیں۔ مگر آسٹریلیا کے گوروں کو یہ گوارا نہیں کہ ان کی رگوں میں ایشیائی خون کی آمیزش ہو۔ نتیجہ یہ ہے کہ ایشیاؤں پر آسٹریلیا کے دروازے بند ہیں۔ مگر دور دراز یورپ سے لاکھوں سفید فام مہاجروں کو آسٹریلیا میں لا کر بسایا گیا ہے۔ مگر اس کے باوجود آسٹریلیا کی آبادی ابھی چھدری ہے جس کے باعث ایک جگہ سے دوسری جگہ جانے اور تعلیم کی نشر و اشاعت میں بڑی دشواریاں درپیش ہیں۔ آسٹریلیا نے ان دشواریوں پر جدید سائنس کی مدد سے قابو پایا ہے۔

براعظم کے اندرونی خشک علاقوں میں جہاں گھاس کے سوا کچھ نہیں ہوتا اور مویشی پالے جاتے ہیں آبادی غیر معمولی طور پر چھدری ہے۔ ایسے علاقوں میں بچوں کی تعلیم کے لیے مدرسے کھولنا ممکن نہیں۔ مویشی پالنے والے گھرانے ایک دوسرے سے میلوں کے فاصلے پر رہتے ہیں۔ اس مشکل پر قابو پانے کے لیے بچوں کو ریڈیو کے ذریعہ تعلیم دی جاتی ہے۔

ایلس سپرنگز کے مقام پر شہزادے نے بچوں کو ہوا کی لہروں سے تعلیم حاصل کرتے دیکھا۔ چھوٹے بچے بڑی جانفشانی کے ساتھ ریڈیو سیٹ سے کام لے رہے تھے اور اپنے اسباق کو توجہ سے سن رہے تھے۔ شہزادے نے ان طالب علموں کو خود بھی ایک نشری تقریر کے ذریعے خطاب کیا۔

اس علاقے میں شہزادے کو یہ دیکھنے کا موقع بھی ملا کہ جدید سائنس کی مدد سے کس طرح فاصلے پر قابو پایا گیا ہے۔ شہزادے نے ہوائی طبی مدد کے مرکز کا معائنہ کیا۔ عین اس وقت اسّی میل کے فاصلے ریڈیائی پیغام موصول ہوا کہ ایک شخص بیمار پڑا ہے۔ ڈاکٹر نے فوراً بہت سے سوالات پوچھے۔ جوابوں کی روشنی میں اس نے مرض کی تشخیص کی اور چند منٹ بعد ایک ہوائی جہاز دوائی لے کر مریض کی طرف روانہ ہو گیا۔

اولمپک کھیلوں کا افتتاح

۲۲ نومبر کو بعد دوپہر وہ اہم تقریب منعقد ہوئی جس کی خاطر شہزادے نے یہ سفر اختیار کیا تھا۔ دن کے ٹھیک ۲ بجے شہزادہ اولمپک کھیلوں کے میدان میں داخل ہوا۔ ایک لاکھ سے اوپر تماشائیوں نے تالیاں بجا بجا کر شاہی

مہمان کا استقبال کیا، کوئی ۲۳۰۰ کھلاڑی کھیلوں میں حصہ لینے کے لیے جمع تھے۔ شہزادہ کار میں بیٹھا تھا اس نے کھیلوں کے میدان کا ایک چکر لگایا اور پھر ایک مختصر ترین تقریر سے کھیلوں کا افتتاح کیا۔ اس کے الفاظ یہ تھے :۔

" میں ملبورن کی اولمپک کھیلوں کا افتتاح کرتا ہوں جو عصر جدید کا سولھواں اولمپک اجتماع ہے"

اس کے بعد شہزادہ اکثر کھیلوں کے میدان میں آتا رہا۔ مگر یہ آنا بالکل غیر رسمی تھا۔ وہ خود اپنی کار چلاتا ہوا آتا۔ راستے کے چوراہے میں جہاں اس کی کار سبز روشنی کے انتظار میں رکتی وہ ٹرک ڈرائیوروں سے باتیں کرنے لگتا۔ کھیل کے میدان میں وہ کھلاڑیوں کے گروہ میں کھو جاتا اور ان سے باتیں کرنے لگتا۔ غرض کھیلوں کا حد درجہ شائق ہونے کے باوجود شہزادے نے اپنے سفر کے حقیقی مقصد کو پل بھر کے لیے نگاہ سے اوجھل نہ ہونے دیا۔ وہ قلمرو برطانیہ اور اس میں لینے والوں کے متعلق زیادہ سے زیادہ معلومات فراہم کرنا چاہتا تھا۔

شہزادے نے آسٹریلیا کے اس معرکتہ الآرا انجینئرنگ منصوبے کا معائنہ کیا جس کا مقصد یہ ہے کہ سنوئی پہاڑوں سے نکلنے والے سنوئی دریا کا رخ سمندر کی طرف سے تبدیل کر کے نیو ساؤتھ ویلز، وکٹوریہ اور جنوبی آسٹریلیا کے خشک علاقوں کی طرف پھیر دیا جائے۔ سڈنی میں شہزادے نے شہر کے میئر کے ساتھ شہر پر پرواز کی تاکہ وہ بڑھتی ہوئی آبادی سے پیدا ہوتے والے مسائل کو خود سمجھ سکے۔ نیوزی لینڈ میں شہزادے نے بڑی حیرت سے دیکھا کہ لوگ تیل کی تلاش میں نہیں بلکہ بھاپ کی تلاش میں زمین کے سینے میں سوراخ کر رہے ہیں۔ تاکہ بھاپ کے فواروں سے صنعتی قوت کا کام لیں۔

نیوزی لینڈ سے شہزادہ قریب کے نارفاک جزیرے میں جا پہنچا۔ جزیرے کو گھنی دھند کی سفید چادر نے اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا۔ مگر اس کے باوجود اس کے زمردین میدانوں، شاداب وادیوں اور سرسبز درختوں کا حسن نگاہوں کو خیرہ کیے دیتا تھا۔ اس جزیرے میں اول اول قیدیوں کو سزا کے طور پر بھیجا جاتا تھا۔ مگر آج یہ جزیرہ روئے زمین کے حسین ترین ٹکڑوں میں شمار ہوتا ہے۔

براعظم انٹارکٹکا کو روانگی

برے ٹینیا کی انگلستان سے روانگی کے وقت فلیٹ سٹریٹ کے بحری ماہروں نے جو بحر منجمد جنوبی کے حالات سے بالکل ناآشنا ہیں اسے بہتی ہوئی چٹان کا نام دے دیا تھا۔ مگر آسٹریلوی بندرگاہ میں پوری طرح ٹھیک ٹھاک

کیے جانے کے بعد اس کی روانگی کا وقت آیا تو حالات سے باخبر لوگوں نے واضح طور پر رائے دی کہ بحر منجمد جنوبی کے غیر یقینی طوفانوں کے سامنے یہ جہاز محض ایک کھلونا ہے اور اسے اکیلے سفر کرنے کی اجازت نہ دینی چاہیے۔

ان تمام باتوں کے باوجود برے ٹینیا کے کپتان اور شہزادہ فلپ کو اپنے جہاز پر بھروسہ تھا۔ روانگی سے پہلے موسمیات کے ماہروں نے پیش گوئی کی تھی کہ جہاز کو راستے میں چالیس فٹ بلند طوفانی لہروں کا سامنا کرنے کے لیے تیار رہنا چاہیے۔ ان طوفانی ریلوں کی چوڑائی ۲۰۰ سے ۳۰۰ فٹ بتائی گئی۔

مگر نیوزی لینڈ میں شہزادہ فلپ کو ایک عجیب وغریب تحفہ دیا گیا تھا۔ یہ ایک سبز پتھر کا تعویذ تھا جو نیلسن کے میئر نے شہزادے کو پیش کیا تھا۔ یہ تعویذ نیوزی لینڈ کے اصل باشندوں سے میئر کے ہاتھ لگا تھا۔ اس تعویذ کے متعلق یہ ضمانت دی جاتی تھی کہ وہ جس کے پاس ہو اسے آفات سے محفوظ رکھتا ہے۔ معلوم نہیں اسے اس تعویذ کی تاثیر سمجھنا چاہیے یا حسن اتفاق کہ آسٹریلیا سے چل کر جزائر چیتھم تک موسم بالکل پرسکون رہا اور سمندر میں کوئی طوفان نہ آیا۔

جزائر چیتھم سارا سال سرد ہواؤں کی زد میں رہتے ہیں۔ شدید موسم اور تند و تیز جھکڑوں کے باعث یہاں تھوڑی بہت گھاس کے سوا کچھ نہیں اگتا۔ صرف کہیں کہیں کوئی جھکا ہوا درخت نظر آجاتا ہے۔ اچھی چراگاہوں کی بھی یہ حالت ہے کہ ایک ایکڑ رقبے میں پانچ سے زیادہ بھیڑیں نہیں پل سکتیں۔ ان جزیروں کی ساری دولت بھیڑیں ہیں۔ اہل جزائر ہر سال کوئی ۳۰ ہزار بھیڑیں اور اون کے تقریباً تین ہزار گٹھے باہر بھیجتے ہیں۔ کل آبادی ۶۰۰ سے زیادہ نہیں۔ باشندے زیادہ تر نیوزی لینڈ کے اصل باشندوں کی اولاد ہیں۔

جزائر چیتھم میں شہزادے کا بڑے تپاک سے استقبال کیا گیا۔ اور اس کے اعزاز میں گوشت کی ایک بڑی دعوت دی گئی۔ گوشت ایک خاص ترکیب سے تیار کیا گیا۔ سخت گرم پتھروں کی سطح پر گیلا گھاس پھیلایا گیا۔ اس پر باریک تاروں کے طشتوں میں ایک گائے اور پانچ بھیڑوں کا گوشت جو کوبھی کے پتوں میں لپٹا ہوا تھا رکھ دیا گیا اب اس گوشت پر ایک موٹی چٹائی ڈال کر اوپر مٹی ڈال دی گئی۔ پورے چار گھنٹے تک گوشت بند شدہ بھاپ میں پکتا رہا اس کے بعد اسے مہمانوں کے آگے رکھا گیا۔ دعوت کے بعد گھوڑ دوڑ کا اہتمام کیا گیا تھا۔ مگر یہ دوڑ سرکاری افسروں کی ساری کوشش کے باوجود کوئی دس پندرہ منٹ دیر سے شروع ہو سکی۔ وجہ یہ کہ دوڑ میں حصہ لینے والا ایک آدمی گوشت

کھانے سے بس نہ کرتا تھا۔ آخر خدا خدا کر کے وہ دسترخوان سے اٹھا اور گھوڑ دوڑ شروع ہوئی۔

کرسمس کی آمد

جزائر چیستھم کو خیرباد کہہ کر بڑے ٹینیا نے جنوبی سمندر کی طرف بڑھنا جاری رکھا۔ خط تاریخ کو عبور کرنے کے کچھ دن بعد جہاز گرجیلے چالیسوں میں جا پہنچا۔ جنوبی سمندروں کا یہ حصہ جو چالیس اور پچاس درجے عرض بلد کے درمیان واقع ہے اپنی تیز و تند آندھیوں کے لیے مشہور ہے جو تقریباً سارا سال چلتی رہتی ہیں گرجیلے چالیسوں میں پہنچ کر شاہزادہ فلپ نے اپنے ساتھیوں کو مشورہ دیا کہ اب ڈاڑھیاں رکھ لینی چاہئیں، چناں چہ شہزادے سمیت سب نے ڈاڑھیاں بڑھانا شروع کر دیں۔

کرسمس کے لیے بڑے زور سے تیاریاں شروع تھیں۔ آخر بڑا دن آن پہنچا۔ اہل جہاز نے شہزادہ کی نشری تقریر سنی۔ اس کے بعد ملکہ کا نشری پیغام موصول ہوا۔ اس کے بعد اہل جہاز خوشیاں منانے میں لگ گئے۔ اگرچہ سہ پہر کو موسم قدرے خراب ہو گیا اور جہاز ہچکولے کھانے لگا۔ مگر کرسمس کی خوشیوں میں کوئی کمی نہ آئی۔ کرسمس سے اگلے دن بڑے ٹینیا والوں نے پہلا آئس برگ دیکھا۔ یخ کا یہ پہاڑ کوئی ½ میل لمبا اور سطح آب سے کوئی سو فٹ اونچا تھا ۳۱ دسمبر کو بڑے ٹینیا کا ملاپ ویل مچھلی پکڑنے والے برطانوی جہاز ”سدرن ہارویسٹر“ سے ہوا۔ یہ جہاز دراصل ویل مچھلیوں سے تیل تیار کرنے کا کارخانہ تھا جو سطح سمندر پر تیر رہا تھا۔ اس کے ساتھ مچھلیاں پکڑنے والے دو جہاز بھی تھے۔ جب بڑے ٹینیا سدرن ہارویسٹر کے ساتھ چھونے کو تھا تو دونوں جہازوں کی ٹکر کو روکنے کے لیے درمیان میں کسی بفر شے کا ہونا ضروری تھا اس مطلب کے لیے ایک پچاس فٹ لمبی ویل مچھلی استعمال کی گئی جسے مرے ہوئے ایک ہفتہ گذرا تھا جس وقت بھی دونوں جہازوں کو ایک دوسرے کے ساتھ ملحق کرنے کی ضرورت پیش آتی اسی ویل مچھلی کو استعمال کیا جاتا۔ لیکن اس سے ایسا تیز تعفن پیدا ہوتا کہ بڑے ٹینیا کے تمام لوگوں کے سر چکرانے لگتے۔ شہزادہ اور اس کے کچھ ساتھی سدرن ہارویسٹر پر گئے اور تیل تیار کرنے کے کارخانے کو دیکھا۔ اس کارخانے کو چالو رکھنے کے لیے بارہ ویل پکڑنے والے جہاز مصروف کار رہتے ہیں۔ پچھلے سال اس کارخانے نے ۵۸ دنوں میں دو ہزار ویلوں سے تیل تیار کیا۔ وقتاً فوقتاً ایک بیڑا اس کارخانے کے سامنے آتا ہے اور جلانے کا تیل دے کر، ویل مچھلی کا تیل واپس لے جاتا ہے۔

یخ بستہ دنیا | بڑے ٹینیا اب تیزی سے یخ بستہ بحر منجمد جنوبی کی طرف بڑھ رہا تھا۔ کچھ دنوں بعد شاہی جہاز کا

ملاپ ایک اور چھوٹے سے جہاز سے ہوا جس پر آٹھ سائنس دان موجود تھے، یہ لوگ سب کے سب رضاکار تھے، اور بین الاقوامی ارضی طبیعیاتی سال کے سلسلے میں دائرہ قطب جنوبی میں مشاہدات اور تجربات کر رہے تھے۔

دائرہ قطب جنوبی میں شہزادہ فلپ جزیرہ الوزبیں اترا۔ یہ جزیرہ ہیل تا مت سیلوں۔ پینگوائن اور بعض دوسرے برفانی پرندوں کا گھر ہے۔ جب شہزادہ ساحل پر اترا تو سیلوں نے اس کی طرف مطلق توجہ نہ دی اور مزے سے ساحل پر لیٹی رہیں۔ پینگوائن کے غول بھی اپنے حال میں مست رہے۔ لیکن بعض دوسرے پرندوں نے غصے سے برہم ہو کر جہاز پر حملہ کر دیا۔ وہ چھپٹیلے ہوائی جہازوں کی طرح جھک جھک کر جہاز پر لپکتے تھے اور چیختے ہوئے اوپر اڑ جاتے تھے۔ شہزادے نے اس منظر کی بہت سی تصویریں لیں۔

سفر کو جاری رکھتے ہوئے شہزادہ فلپ نے جزائر فاک لینڈ کے بارہ ماتحت جزیروں میں سے سات جزیروں کا ملاحظہ کیا۔ حد درجہ شدید بد موسم میں یہ کارنامہ کوئی معمولی کارنامہ نہ تھا۔ ایک جزیرے کی بندرگاہ میں پہنچے تو گھنی دھند کی سفید چادر نے اس کی گذرگاہ کو اس طرح سفید چادر میں لپیٹ رکھا تھا کہ کچھ نظر نہ آتا تھا۔ ناچار برے ٹینیا کو بندرگاہ سے باہر کھڑا کرنا پڑا، اور شہزادہ ایک چھوٹی سی کشتی میں بیٹھ کر ساحل کی طرف بڑھا۔ ساحل سے ریڈیائی پیغام کشتی کی رہنمائی کر رہے تھے۔ بندرگاہ میں پہنچے تو اس کا منظر بھی عجب بھیانک پایا۔ یہ ایک ڈوبے ہوئے جوالامکھی کا دہانہ تھا۔ آس پاس سے بھاپ کے باریک فوارے زمین کے سینے کو چیرتے ہوئے ہلکی سیٹی پیدا کر رہے تھے، اور اس بات کی نشان دہی کر رہے تھے کہ یخ بستہ سطح سے نیچے گرم پانی کے چشمے کھول رہے ہیں۔ ساحل تمام کا تمام ویل مچھلیوں کے کوہ پیکر ڈھانچوں سے اٹا پڑا تھا۔ اس بھیانک پس منظر میں ویل مچھلی سے تیل تیار کرنے کا ایک اجڑا ہوا کارخانہ سر اٹھائے کھڑا تھا۔ لیکن اس دل بٹھا دینے والے ماحول میں بھی سائنس دانوں کی ایک چھوٹی سی جماعت تحقیقی کام میں معروف تھی۔ یہ لوگ خوشی سے اچھلتے ہوئے شاہی مہمان کے استقبال کو آئے اور شہزادے کو اپنی قیام گاہ پر لے گئے۔

اب برے ٹینیا نے جزائر فاک لینڈ کا رخ کیا۔ ۷ جنوری کی صبح کو برے ٹینیا مشرقی فاک لینڈ کے سامنے جا پہنچا۔ یہ ایک پست میدان تھا جسے موٹی گھاس نے ڈھانپ رکھا تھا، درخت کہیں دیکھنے کو نہ تھا۔ لوگوں کے مکان بھی پست تھے، اور جگہ جگہ سبزیوں اور پھلوں کو برفانی ہواؤں سے محفوظ رکھنے کے لیے "سبزی خانے" نظر آتے تھے۔

گورنر نے شہزادے کو بتایا کہ جزائر فاک لینڈ کے باشندے بڑے محنتی اور جفاکش ہیں اور انہوں نے خود اپنے اوپر شراب نوشی کی بندش کر رکھی ہے۔ جو شخص بھول چوک کر شراب پی بیٹھتا ہے وہ خود جرائم کے رجسٹر میں اپنا نام درج کر دیتا ہے۔ پچھلے مہینے ایک آدمی اور اس کی بیوی نے اپنے نام اس رجسٹر میں درج کیے۔ مگر آدمی نے ساتھ یہ نوٹ بھی لکھ دیا۔ "مجھ سے زیادہ وفادار آدمی ان جزائر میں نہ ہوگا۔ اس لیے میری درخواست ہے کہ شہزادہ فلپ جب اس جگہ آئیں تو مجھے دو دن کے لیے قید سے رہا کر دیا جائے۔ تاکہ میں استقبال میں شریک ہو سکوں"۔

جزائر فاک لینڈ کا گذارہ کلی طور پر بھیڑوں پر ہے۔ جہاں جاؤ بھیڑیں ہی بھیڑیں نظر آتی ہیں۔ ان کی اون سے کپڑا تیار کیا جاتا ہے۔ آسٹریلیا کی طرح یہاں بھی طبی مدد کے لیے ریڈیو سے رجوع کیا جاتا ہے۔ جہاں کسی کسان یا کنبے کا کوئی فرد بیمار پڑا، بیماری کا پیغام فوراً نشر کر دیا گیا۔ یہ پیغام نہ صرف ڈاکٹر تک پہنچتا ہے۔ بلکہ اسے ہر وہ شخص سن سکتا ہے جو ریسیور اٹھالے۔

جزائر فاک لینڈ سے برے ٹینیا نے ساؤتھ جارجیا کا رُخ کیا۔ روانگی سے پہلے لوگوں نے اہل جہاز کو کہا کہ اگر اب تک آپ لوگ خراب موسم سے بچے رہے ہیں تو یقین جانیے کہ اس سفر میں پچھلی تمام کسر نکل جائے گی۔ مگر "برے ٹینیا" والوں کو اپنی ہمت اور سبز تعویذ پر بھروسہ تھا۔ جہاز کمال سکون کے ساتھ پانچ پانچ میل لمبے یخ کے پہاڑوں کے پاس سے گذرتا چلا گیا اور موسم پورے طور پر موافق رہا۔

ساؤتھ جارجیا میں شہزادہ برے ٹینیا کو چھوڑ کر ویل کے شکاری جہاز پر سوار ہو گیا۔ اس جہاز کا کپتان ساؤتھ جارجیا کا بہترین شکاری شمار ہوتا تھا۔ اس کی عمر اس وقت ۷۳ برس تھی مگر اس کی ہمت میں کوئی فرق نہ آیا تھا۔ اسے ویل کا شکار کرتے ۵۲ برس گذرے تھے، اور اس عرصے میں پانچ ہزار ویل مچھلیاں اس کی گولی کا نشانہ بن چکی تھیں۔ پچھلے موسم میں اس نے ساٹھ ویلوں کو مارا تھا۔

ساؤتھ جارجیا میں شہزادے کا پرتپاک خیر مقدم کیا گیا۔ بندرگاہ سے دس ہزار فٹ بلند برفانی چوٹیاں چمکتی ہوئی نظر آتی تھیں، دیکھنے والوں کو رہ رہ کر تعجب ہوتا تھا کہ برطانوی کوہ پیماؤں کی جماعت نے شیکلٹن کی رہنمائی میں ان فلک بوس یخ بستہ دروں کو پا پیادہ کس طرح عبور کیا تھا۔ شیکلٹن کی مہم نے سنہ ۱۹۰۹ تا ۱۹۰۳ء میں یخ بستہ جنوب کی سیاحت کی تھی اور یہ لوگ قطب جنوبی سے ۱۱۲ میل کے فاصلہ پر پہنچنے میں کامیاب ہو گئے تھے۔

اتنے میں شہزادے نے دیکھا کہ چار شکاری جہاز ویل مچھلیوں کے ایک گروہ کے پیچھے بھاگے جا رہے ہیں۔ چنانچہ برے ٹینیا اس نظارے سے لطف اندوز ہونے کے لیے ان جہازوں کی طرف ہو لیا۔ کوئی ایک گھنٹہ بعد دو ویل مچھلیاں ماری گئیں۔ ان میں سے ایک کے جب ضرب لگی تو وہ جست لگا کر پانی سے باہر ہوا میں کودی اور دھڑام سے دوبارہ پانی میں جا گری۔ آخر شکاریوں نے اسے آہستہ آہستہ اپنی طرف کھینچ لیا۔ سمندر میں ادھر اُدھر پہلے سے ماری گئی ویل مچھلیاں تیر رہی تھیں۔ ان کے جسم کے اندر ہوا بھر دی گئی تھی تاکہ ڈوب نہ جائیں اور ان پر جھنڈیوں کے نشان لگا دیے گئے تھے تاکہ بعد میں جمع کرنے میں آسانی رہے۔ شکاری جہاز ویل مچھلیوں کو مار کر اسی وقت تختہ جہاز پر نہیں لادتے، تاکہ جہاز میں غیر ضروری بوجھ نہ بڑھ جائے۔ مُردہ ویلوں کے جسم میں ہوا بھر کر انہیں سمندر میں رہنے دیا جاتا ہے اور شکار کے خاتمہ پر تمام مردہ ویلوں کو جمع کر لیا جاتا ہے۔

چند دنوں بعد برے ٹینیا جزیرہ گف کے ساحل پر جا پہنچا۔ اس جزیرے میں شاہزادے کے لیے خاص کشش تھی ۱۹۵۵-۵۶ء میں کیمبرج یونیورسٹی کے نوجوان سائنس دانوں کی ایک جماعت شہزادے کے ایما پر اس ناقابل رسائی جزیرے کے حالات معلوم کرنے آئی تھی۔ وہ لوگ اپنی خدمت انجام دے کر واپس جا چکے تھے۔ لیکن اب ان کی تعمیر کردہ جھونپڑی میں جنوبی افریقہ کے ماہرین موسمیات اقامت گزیں تھے۔ ان چند عارضی باشندوں کے علاوہ اس جزیرے کی ساری آبادی سیلوں اور پنگوائنوں پر مشتمل تھی۔

اگلے روز شہزادہ جزیرہ ٹرسٹن میں پہنچا۔ مردوں اور عورتوں کی ایک بڑی تعداد استقبال کے لیے موجود تھی۔ مگر عورتیں اور مرد الگ الگ قطاریں باندھے کھڑے تھے۔ پھولوں سے ایک استقبالیہ محراب تیار کی گئی تھی۔ جن گدھوں پر سوار ہو کر لوگ بندرگاہ تک پہنچے تھے انہیں جزیرے کی دوسری طرف ہانک دیا گیا تھا تاکہ وہ پھولوں کی محراب کو نہ کھائیں۔ جزیرہ ٹرسٹن کی کل آبادی صرف ۲۷۰ نفوس پر مشتمل ہے اور یہ دنیا کا بے حد الگ تھلگ جزیرہ شمار ہوتا ہے اس کے باشندوں کی دولت آلو ہے۔ جس قدر آلو کسی آدمی کے ذخیرے میں ہوں اسے اتنا ہی امیر شمار کیا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ یہ لوگ مچھلیاں بھی پکڑتے ہیں۔ شادی عموماً اکیس برس کی عمر سے پہلے نہیں ہوتی۔ جو نوجوان کسی لڑکی سے شادی کرنا چاہے وہ چپکے سے اس کے گھر میں آنے جانے لگتا ہے اور گھر والوں کے ساتھ مل جل کر بیٹھنے لگتا ہے، یہ سلسلہ اسی طرح جاری رہتا ہے۔ اگر لڑکی اس کی طرف مائل ہو جائے تو وہ اسے رنگدار پھولوں والی جرابیں بُن دیتی ہے اور اس کے کپڑے

دعوت دینے کی پیشکش کرتی ہے۔ اس کے بعد دونوں کی نسبت ہو جاتی ہے۔

نپولین کی آخری آرام گاہ

اب بڑے ٹینیا افریقہ کے مغربی ساحل کے متوازی شمال کو بڑھ رہا تھا۔ کچھ دنوں کے سفر کے بعد وہ سینٹ ہیلینا کے ساحل پر آن رکا۔ ساحل سمندر پر کھڑے ہو کر دیکھو تو جزیرہ ایسا سنسان نظر آتا ہے کہ کوئی شخص نپولین کے آخری ایام پر افسوس کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ لیکن جزیرے کا اندرونی حصہ حیران کن طور پر سرسبز اور خوب صورت ہے۔ ساحل سے متواتر چڑھائی شروع ہو جاتی ہے جو دو ہزار فٹ کی بلندی کو جا پہنچتی ہے۔ اس سے آگے پیالی کی شکل کی ایک شاداب وادی ہے جس میں طرح طرح کے بلند و بالا درخت سر اٹھائے نظر آتے ہیں۔

سینٹ ہیلینا کی کل آبادی کوئی پانچ ہزار ہے۔ پہلے ان لوگوں کا گذارہ صرف کتان کی کاشت پر تھا۔ لیکن اب تھوے کی کاشت بھی ہونے لگی ہے۔ جزیرے میں دیمک کی تباہ کاریوں کا یہ حال ہے کہ بڑے بڑے درخت جو دیکھنے میں تن آور معلوم ہوتے ہیں ذرا سا دھکا لگنے پر اوندھے منہ زمین پر آن گرتے ہیں۔ کیونکہ دیمک نے انہیں اندر سے کھوکھلا کر رکھا ہے۔

شہزادہ فلپ نپولین کی اقامت گاہ "لونگ وڈ" کو دیکھنے گیا۔ محکمہ آثار قدیمہ نے تاریخ کے اس عبرت کدہ کو اسکی اصلی حالت پر برقرار رکھا ہے۔ لونگ وڈ کے باغات جن میں شہنشاہ فرانس بے چینی سے چہل قدمی کیا کرتا تھا رنگا رنگ پھولوں سے اٹے پڑے تھے۔ باغوں کی روشیں بہت نیچی بنائی گئی ہیں۔ کیونکہ نپولین کو یہ پسند نہ تھا کہ پہرہ دار بیرونی باڑ کے اوپر سے جھانک کر اسے دیکھ سکیں۔ نپولین نے ۱۸۲۱ء میں اسی جلاوطنی میں وفات پائی تھی۔

سینٹ ہیلینا کے گورنر نے شہزادے کو ایک بوڑھا کچھوا دکھایا جس کی عمر ۱۸۰ برس بتائی جاتی ہے۔ کہتے ہیں جب نپولین نے کچھوے کو پہلی بار دیکھا تو اس کی عمر چالیس برس کی تھی۔

سفر کا خاتمہ

سینٹ ہیلینا سے آگے بڑے ٹینیا جزائر اسنشن میں جا رکا۔ یہ چھوٹے چھوٹے جزیرے لاوے کی راکھ سے بنے ہیں۔ اور ان کا کل رقبہ ۳۴ مربع میل ہے۔ دوسری عالمی جنگ تک برطانیہ ان جزیروں کو اپنا ایک جنگی جہاز تصور کرتا رہا ہے دوسری عالمی جنگ کے زمانے میں امریکیوں نے یہاں ایک ہوائی اڈہ قائم کیا اور اب امریکی یہاں براعظمی میزائل بموں کا

کھوج لگانے کے لیے ایک مشاہداتی مرکز قائم کر رہے ہیں۔ جزائر اسنشن کا ذریعہ معاش صرف کوئی ایک ہزار بھیڑیں ہیں جو سبز پہاڑ کی چوٹیوں پر پلتی ہیں۔

جزائر اسنشن سے روانہ ہو کر برے ٹینیا مغربی افریقہ کی ساحلی نوآبادی گیمبیا کے کنارے جا رکا۔ جبرالٹر سے پہلے برے ٹینیا کا یہ آخری قیام تھا۔ گیمبیا کی برطانوی نوآبادی دریائے گیمبیا کے دونوں کناروں کے ساتھ ساتھ پھیلتی چلی گئی ہے۔ مغربی افریقہ میں یہ برطانیہ کی سب سے پرانی نوآبادی ہے۔ دریائے گیمبیا اس علاقے کی سب سے بڑی شاہراہ ہے۔ لیکن مقامی آبادی اس شاہراہ سے بہت کم کام لیتی ہے۔ گیمبیا کے باشندے اپنے ملک سے باہر نہیں جاتے۔ وہ چاول اور مونگ پھلی کی کاشت کرتے ہیں۔ ان میں اکثریت مسلمانوں کی ہے۔

گیمبیا میں شہزادہ فلپ کا استقبال بڑے ٹھاٹھ کے ساتھ کیا گیا۔ بوائے سکاؤٹوں نے ۲۱ توپوں کی سلامی اتاری۔ اور مدرسوں کے چار ہزار طلبہ شہزادے کو سلامی دیتے ہوئے گذرے۔ ایک آدمی نے جس نے اپنے آپ کو رسیوں سے باندھ رکھا تھا۔ زمین پر رینگ کر شہزادے کے بوٹ کے تلے کو چوما۔ جلوس کے سامنے ایک اونٹ ناچ رہا تھا۔ اس کے ساتھ ہی دریا پر کشتیوں کا ایک جلوس نکالا گیا۔

اسی سہ پہر کو شہزادہ گورنر کی معیت میں مگرمچھ کے شکار کو گیا، اور استوائی علاقے میں فطرت کے بھڑکیلے حسن کا کچھ نظارہ کیا۔ اگلی صبح شہزادے نے حبشی سرداروں کی سالانہ کانفرنس کا افتتاح کیا۔ اس میں ۴۰ سرداروں نے شرکت کی جو ڈھیلے ڈھالے ریشمی لباس پہنے ہوئے تھے۔ گیمبیا کے موقع پر جو عورتیں اس موقع پر شہزادہ کو دیکھنے کے لیے جمع ہوئیں ان کے زرق برق لباسوں پر استوائی پرندوں کے بھڑکیلے رنگوں کا شبہ ہوتا تھا۔

آخر چار مہینوں کی غیر حاضری کے بعد اور روئے زمین کا چکر پورا کرنے کے بعد شہزادہ فلپ واپس انگلستان پہنچا لندن کے میئر نے اس کے اعزاز میں ایک دعوت دی۔ اس موقع پر تقریر کرتے ہوئے شہزادہ نے کہا: "تمام عمر میری کیفیت یہ رہی ہے کہ گھر سے چار ماہ کی غیر حاضری بالکل ایک معمولی بات ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر میں لگاتار چار ماہ تک گھر میں رہتا تو یہ زیادہ تعجب کی بات ہوتی۔ اس مرتبہ یہ چار مہینے کا عرصہ واضح وجوہ کی بنا پر میرے لیے زیادہ پُرمعنی ہے۔ میرا عقیدہ یہ ہے کہ دنیا میں بعض چیزیں ایسی بھی ہیں جن کی خاطر ذاتی آرام کو قربان کر دینا مناسب ہے۔ برطانوی دولت مشترکہ ان چیزوں میں سے ایک ہے" ٭ (ماخوذ از نیشنل جیوگرافک میگزین نومبر ۱۹۵۷ء)

رسہ اور ذہنی صحت

اکٹر عبد الرؤف

گھر کی فضا اور والدین کی تربیت بچے کی شخصیت اور کردار پر بہت گہرا اثر چھوڑتی ہے۔ گھریلو عناصر کے
اوہ مدرسہ کی زندگی بھی بچے کی ذہنیت کو بے حد متاثر کرتی ہے۔ پانچ چھ سال کا بچہ گھر کی چاردیواری سے
کر جب مدرسہ جانا شروع کرتا ہے تو اس کے جسم اور ذہن میں طرح طرح کے تغیرات رونما ہونے لگتے ہیں
رت بچوں میں اثر پذیری کا جذبہ بڑی فیاضی سے بھر دیتی ہے۔ اگر اس جذبے کو مدرسہ اچھی طرح بروئے کار
ے اور منظم تعلیم و تفریح کے ذریعہ سے بچوں کی امنگوں اور صلاحیتوں کو بہتر سمتیں دے تو ایسے بچے پروان
ھتے ہیں جن کے ذہن اور جسم صحت مند ہوتے ہیں اور جو مفید اور کارآمد بالغ ثابت ہوتے ہیں۔ اس کے
س اگر ارباب تعلیم بچوں کی تعلیم و تربیت اور کھیل کود کے بارے میں کسی قسم کی غفلت یا کج روی کے مرتکب
ں تو مدرسہ ایسے بچے پیدا کرنے کا ذمہ دار بنتا ہے۔ جو مختلف ذہنی اور جسمانی بیماریوں میں مبتلا رہتے ہیں۔
انجام کار نااہل اور خطرناک شہری ثابت ہوتے ہیں۔

لیم کا مقصد

مدرسے کی تعلیم کا مقصد بچوں کو اس قسم کی ابتدائی تربیت دینا ہے جس سے ان میں مختلف علوم کے مبادیات
ھنے۔ آئندہ زندگی میں کسی ہنر کو بطور معاش اختیار کرنے اور متمدن با اختیار، با اخلاق اور خوش مزاج
ری بننے کا سلیقہ پیدا ہو۔ یہ صلاحیتیں طلبہ میں اسی صورت اجاگر کی جاسکتی ہیں جب وہ ذہنی طور پر
ں قابل ہوں کہ اس تربیت کے نشیب و فراز اور اس کی غرض و غایت کو سمجھ سکیں۔ چونکہ یہ مدرسے کی علمی معاشرتی
تفریحی زندگی سے فقط وہی طلبہ مستفیض ہو سکتے ہیں وہ ذہنی طور پر صحت مند ہوتے ہیں۔ اس لیے معلم کو
یم و تربیت کے اس اہم پہلو سے کبھی بھی غفلت نہیں برتنی چاہیے۔ کوئی معلم بھی طلبہ کو تعلیم کی صحیح روح سے
شناس کرانے میں کسی صورت بھی کامیاب نہیں ہو سکتا، جب تک وہ ان کی ذہنی صحت کو برقرار رکھنے کا

خصوصی اہتمام نہ کرے۔

مدرسہ میں بے شمار عناصر بچوں کی ذہنی صحت پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ سمجھنے کی خاطر ان عناصر کو تین گروہوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

اول :- معلم کی شخصیت

دوم :- نصاب اور طریق تدریس۔

سوم :- مدرسہ کی تفریحی اور معاشرتی سرگرمیاں۔

معلم کی شخصیت : - اس حقیقت میں قطعی شک نہیں کہ معلم کی شخصیت بچوں پر بے پناہ اثر ڈالتی ہے۔ اگر معلم کی اپنی زندگی ذہنی صحت کی نعمتوں سے مالا مال ہو، وہ خوش و خرم رہتا ہو۔ اور اپنے فن میں عبور رکھنے کے علاوہ اس میں خوب دلچسپی لیتا ہو تو وہ خوش نصیب بچے جو اس سے تعلیم حاصل کرتے ہیں اس کی شخصیت اور کردار کے اکثر اوصاف کو اپنی شخصیت کا جزو بنانے میں عموماً کامیاب ہو جاتے ہیں۔ اگر معلم خود ہی ذہنی صحت سے محروم ہو تو بچوں کے اذہان کا صحیح سمتوں کی طرف ڈھلنا بہت مشکل ہو جاتا ہے۔ ایک ایسے معلم کا تصور کیجیے جسے پیٹ بھر کر کھانے کو نہ ملتا ہو، جو پھٹے پرانے کپڑے پہنتا ہو، جسے تفریح کا کوئی سامان میسر نہ ہو جس کے گھر کی کیفیت وحشت پیدا کرتی ہو، اور جسے معاشرے میں کوئی آبرومندانہ مقام حاصل نہ ہو۔ ایسے بدنصیب فرد سے یہ توقع رکھنا کہ وہ بچوں میں صحت، سلیقہ اور تمدن کی شعاع پیدا کرنے میں کامیاب ہو جائے گا، بہت بڑی غلط فہمی ہے۔

گھر میں جو مقام والدین کو حاصل ہے مدرسہ میں وہی مرتبہ معلم کو ملا ہے۔ بچوں کی تعلیم و تربیت کے بارے میں معلم پر بلکہ والدین سے بھی زیادہ اہم اور مشکل فرائض عاید ہوتے ہیں۔ اسی طرح بچے جو توقعات والدین سے رکھتے ہیں وہی توقعات وہ معلم سے بھی رکھتے ہیں، چنانچہ ہر بچہ یہ چاہتا ہے کہ معلم اس میں خصوصی دلچسپی لے، اس کے کام کو سراہے، اور اس سے شفقت اور مروت سے پیش آئے۔ ایک ایسا معلم جو بچوں میں ڈر، خوف اور مایوسی پیدا کر دیتا ہے ان کی ذہنی صحت ہی برباد نہیں کرتا بلکہ مدرسہ میں ایک ایسی ناسازگار فضا قائم کرنے کا باعث بنتا ہے جو نصابی تعلیم کے لیے بھی سم قاتل ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ بچے مسرت اور امید افزا ماحول میں زیادہ محنت اور توجہ سے کام کرتے ہیں، اور اگر ان کے ماحول میں جھڑک، سزا، تلخی، یاس اور محرومیت کا دور دورہ ہو تو ان کے

علو ے ماند پڑ جاتے ہیں، اور ان کی تخلیقی صلاحیتیں زنگ آلود ہو جاتی ہیں۔

معلم کی اقتصادی بدحالی:- بجائے کہ معلم کو اقتصادی اور معاشرتی مقام دے کر معاشرہ اپنے سارے نظام پر عموماً اور بچوں پر خصوصاً نہایت بھاری ظلم کا مرتکب ہوتا ہے۔ مگر معلم اس بنیادی بے انصافی کا انتقام مدرسے میں بچوں کی تعلیم و تربیت میں غفلت برتنے کی صورت میں لے تو یہ بھی بہت سنگین معاشرتی جرم ہوگا۔ اسے چاہیے کہ وہ معاشرے کو اس بات پر مجبور کر دے کہ اس کی مرکزی حیثیت کے پیش نظر اسے زیادہ سے زیادہ مادی آسائشیں مہیا کی جائیں معاشرے کو یہ لطیف نکتہ سمجھانے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ معلم مدرسہ میں اپنے تئیں ایک مثالی شخصیت کے طور پر پیش کرے، وہ درس و تدریس اور تعلیم و تربیت کے عمل میں گہری دلچسپی لے اور بچوں کی علمی، تمدنی اور معاشرتی فلاح و بہبود کے فرائض کو اس طرح سے سرانجام دے کہ معاشرہ اس کی محنت، خلوص اور ایثار سے متاثر ہو کر اسے بہتر مقام دینے پر مجبور ہو جائے۔

اپنی ذاتی مشکلوں کے باوجود بچوں کی تعلیم و تربیت کے کام میں گہری دلچسپی لینے کا ایک اور دور رس فائدہ بھی ہے۔ یہی بچے علم کے زیور سے آراستہ ہو کر مستقبل قریب میں زندگی کے مختلف شعبوں کے قائد بنتے ہیں۔ اگر معلم نے ان کی تعلیم و تربیت میں جاں فشانی، تدبر اور انفرادی جاں فشانی سے کام لیا تو کوئی وجہ نہیں کہ وہ اپنے محسن معلموں کے مقام اور وقار کو بلند کرنے کے لیے اپنے مخصوص حلقۂ اثر میں موثر جد و جہد نہ کریں۔ اگر وطن کے تمام معلم ان بدلے ہوئے زاویوں اور نئی امنگوں اور نئے ارادوں سے درس و تدریس کے کام کی طرف انہماک سے متوجہ ہوں تو اس سے نہ صرف ان کی اپنی اور مدرسہ کے بچوں کی حالت ہی سدھر سکتی ہے بلکہ سارے معاشرہ کی کایا پلٹ سکتی ہے۔

جذباتی لگاؤ:- معلم اور طلبہ کے مابین ایک جذباتی لگاؤ اور خوشگوار تعلق ہونا اتنا ہی ضروری ہے، جتنا کہ جینے کے لیے ہوا، پانی اور حیاتین۔ طلبہ سے خوشگوار تعلقات استوار نے کے لیے بہت محنت اور سلیقہ درکار ہے یہ رابطہ اور تعلق اسی صورت قائم ہو سکتا ہے جب معلم ہر طالب علم کی مشکلات کو سمجھنے کی کوشش کرے اور نہایت خلوص اور شفقت سے انھیں حل کرنے میں اس کی رہ نمائی کرے، وہ اپنی ذاتی زندگی سے اور کمرۂ جماعت میں درس و تدریس کے طلبہ کو یہ بات خوب اچھی طرح ذہن نشین کرا دے کہ مشکلوں اور الجھنوں سے ہنسی خوشی عہدہ برا ہونا اور اپنے اندر انسانیت کے اوصاف اجاگر کرنا ہی آئین زندگی ہے۔ اس قسم کا معلم اپنے طالب علموں کی ذہنی صحت کی کامیابی کا باعث ہی نہیں بنتا بلکہ طلبہ میں بہتری اور صحت کی ترویج پا تا دیکھ کر وہ خود بھی ہشاش بشاش رہنے

دینے لگتا ہے جس سے اس میں اپنے ذاتی مسائل کو بہتر طریق سے حل کرنے کی صلاحیت بھی تقویت پکڑتی ہے۔

نصاب تعلیم اور ذہنی صحت:۔ غیر موزوں نصاب بھی بچوں کی صحت بگاڑنے کا سبب بنتے ہیں۔ غیر موزوں نصاب بچے کے دل میں علم سے لگاؤ پیدا کرنے کی بجائے بیزاری اور نفرت کے جذبے ابھارتا ہے۔ کسی بچے کو کوئی مضمون روکھا پھیکا اور مشکل نظر آئے تو وہ یا تو اس میں مسلسل ناکامیوں کا شکار ہونے لگتا ہے۔ یا پھر جبراً اس کا مطالعہ کرتا رہتا ہے، یہ دونوں صورتیں خطرناک ہیں۔ کسی ایک سمت میں مسلسل ناکامیوں سے زندگی کی کئی اور سمتوں میں مزید ناکامیوں کے امکان پیدا ہو جاتے ہیں۔ اپنی مرضی اور پسند کے خلاف کسی مضمون کا جبراً مطالعہ کرنے سے ذہن پر ناخوشگوار بوجھ پڑتا رہتا ہے جس سے تخلیقی صلاحیتوں پر مہلک ضرب لگتی ہے۔ جبراً مطالعہ کیے ہوئے مضمون میں سطحی علم کی وجہ سے طالب علم کو خالص علمی زاویہ نگاہ سے بھی کوئی تمدنی فائدہ نہیں پہنچتا۔

مختلف عمر کے بچوں کے لیے موزوں نصاب وضع کرنا ایک ایسا لطیف اور رقیق عمل ہے جسے مسلسل مشاہدوں اور تحقیقوں کی مدد ہی سے سرانجام دیا جا سکتا ہے۔ ماضی میں ہمارے تعلیمی نظام نے اس بنیادی حقیقت کو نظر انداز کیے رکھا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ہم مدرسوں میں ایسے ایسے پُرتصنع نصاب پڑھاتے رہے جو نہ صرف بچوں کی ذہنی صحت کی بربادی کا باعث بنتے رہے، بلکہ علم و ہنر کے مخصوص زاویہ نگاہ سے بھی ان میں بوسیدگی اور سطحیت کے ماسوا اور کچھ پیدا نہ کر سکے۔ پاکستان کے قائم ہوتے ہی ارباب تعلیم نے اس اہم پہلو کی طرف توجہ شروع کر دی۔ چناں چہ اب ہمارے مدرسوں میں پہلے سے بہتر نصاب رائج ہونے لگے ہیں۔ مگر اس سلسلہ میں اب بھی مزید اصلاح و ترمیم کی کافی گنجائش ہے۔

ہر طالب علم کو ایک ہی قسم کے چند مخصوص مضامین پڑھنے پر مجبور کرنا بھی ذہنی صحت کے لیے خطروں کو دعوت دینا ہے۔ بعض طلبہ مشینوں اور پرزوں کی طرف خصوصی طور پر مائل ہوتے ہیں۔ ان طلبہ کے لیے نصاب تعلیم میں ایسے مضامین کا اہتمام ہونا چاہیے جنہیں پڑھ کر مشینوں اور پرزوں وغیرہ میں دلچسپی اور بصیرت بڑھے، اسی طرح ادب اور شعر و شاعری سے خصوصی مس رکھنے والے طلبہ کو اپنی فطرت کے منافی مضامین پڑھنے پر مجبور نہیں کرنا چاہیے۔ وہ طلبہ جو عین وہی مضامین پڑھتے ہیں جن میں انہیں فطری دلچسپی ہو تعلیم کے دوران میں بہت مسرت محسوس کرتے ہیں۔ انہیں پڑھائی کی گتھیاں اچھی طرح سمجھ آ جاتی ہیں اور وہ بالغ ہو کر ہنس مکھ شہری ہی ثابت

نہیں ہوتے بلکہ اپنے مخصوص حلقۂ علم و ہنر میں نام بھی پیدا کر لیتے ہیں۔ مگر وہ بدنصیب بچے جو ایسے مضامین پڑھنے پر مجبور کر دیے جاتے ہیں جو انھیں ناپسند ہوں۔ پڑھائی کے دوران میں ہر وقت کڑھتے رہتے ہیں اور اپنی بنیادی سطحیت کی وجہ سے انھیں آئندہ فنی زندگی میں بھی کوئی خاطر خواہ کامیابی نصیب نہیں ہوتی جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ان کی زندگی میں یاس محرومیت اور ناکامی کو ایک مستقل مقام مل جاتا ہے۔

طریقِ تدریس: ۔ نصاب کے مضامین کے علاوہ معلم کا طریقِ تدریس بھی بچوں کی ذہنی صحت پر اثر انداز ہوتا ہے تعلیم کا عمل جو پرانے زمانوں میں بے حد خشک اور بوسیدہ ہوا کرتا تھا آج بہت خوش گوار اور دل چسپ بنا دیا گیا ہے بصری اعانتوں نے تعلیم و تدریس کی دنیا میں ایک انقلاب برپا کر دیا ہے۔ آج کے مدرسوں میں خوش نما نقشوں، رنگ برنگ تصویروں اور دل چسپ فلموں کے ذریعہ سے طلبہ کو مختلف درسی مضامین پڑھائے جاتے ہیں جس سے انھیں مشکل سے مشکل مواد بھی بہت آسانی سے سمجھ آ جاتا ہے۔ جغرافیہ اور تاریخ وغیرہ کے بعض اسباق کے لیے طلبہ کو مختلف مقاموں پر لے جایا جاتا ہے۔ اسباق کے مختلف نکات پر آپس میں غور و خوض کرنے کے لیے طلبہ میں بحث و تقریر کے مقابلوں کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ اساتذہ کے تربیتی اداروں میں ہر بات کو آسان دل چسپ اور چچے تلے الفاظ میں پیش کرنے کے جدید ڈھنگ ذہن نشین کرائے جاتے ہیں۔ تعلیم میں ان باتوں کا مجموعی نتیجہ یہ نکلا ہے کہ بچوں کے ذہن میں مدرسہ اور مدرسہ کے علمی اور تمدنی مشاغل سے محبت کا جذبہ بیدار ہونے لگا ہے، وہ خوش نصیب بچے جو ایسے مدرسوں میں تعلیم پاتے ہیں جہاں تدریس کے جدید طریقے استعمال ہوتے ہیں۔ پڑھائی کے دوران میں ذہن پر بوجھ محسوس کرنے کی بجائے تعلیم کے عمل میں بہت مسرت اور لذت محسوس کرتے ہیں۔ نصابی تعلیم کے ساتھ ساتھ ان میں شخصیت اور کردار کے ایسے ایسے اوصاف بھی اجاگر ہونے جاتے ہیں جو بہتر اور کامیاب انسانیت کے لیے بے حد ضروری ہیں۔

تفریحی مشاغل کی نفسیات: ۔ نصابی تعلیم کے علاوہ مدرسہ کے تفریحی اور معاشرتی مشاغل بھی بچوں کی ذہنی صحت پر خوش گوار اثر ڈالتے ہیں۔ کھیل اور تفریح بچوں کی مناسب نشو و نما کے لیے لازمی ہے۔ ہر مدرسے میں کھیل اور تفریح کا معقول اہتمام ہونا چاہیے۔ معلم کو اس امر کا خیال رکھنا چاہیے کہ ہر بچہ کسی نہ کسی کھیل میں ضرور حصہ لے۔ کھیلوں میں شرکت سے جسم کے مختلف اعضا کو حرکت کا موقع ملتا ہے۔ بچوں میں مسرت کے

جذبے ابھرتے ہیں۔ ان کی توانائی بڑھتی ہے۔ انھیں چند ضابطوں اور اصولوں کا احترام کرنے اور دوسروں سے مل کر تفریح کرنے کی بہترین تربیت ہوتی ہے۔ کھیل کود میں حصہ لینے سے ذہنی صحت ہی میں اضافہ نہیں ہوتا، بلکہ درسی مضامین سمجھنے کی صلاحیت بھی بڑھتی ہے۔ کھیلوں میں باقاعدہ حصہ لینے والے بچے ذہنی بیماری کا بہت کم شکار ہوتے ہیں، ان کے مزاج خوش گوار رہتے ہیں اور وہ اپنے ساتھیوں، معلموں اور والدین سے بہت کم الجھتے ہیں۔ اس کے برعکس وہ بچے جو مدرسہ کی کھیلوں وغیرہ میں حصہ نہیں لیتے۔ کھیل کے میدان کی اس مفید ذہنی اور معاشرتی تربیت سے محروم رہ جاتے ہیں۔ ان میں متحدہ جدوجہد کرنے اور دوسروں سے مل بیٹھنے کی خاصیتیں خام رہ جاتی ہیں جس سے عزلت پسندی اور بدمزاجی کو ترقی پکڑنے کا موقع مل جاتا ہے۔ اس قسم کے بچوں کی ایک خاصی تعداد خلافِ فطرت حرکات اور مجرمانہ مشاغل کی طرف میلان بھی محسوس کرنے لگتی ہے۔

کھیل کود کے مناسب انتظام کے ساتھ ساتھ مدرسہ میں بچوں کی معاشرتی اور تمدنی دلچسپیوں کے سامان بھی موجود ہونے چاہئیں۔ لڑکوں کے سکاؤٹنگ اور لڑکیوں کے لیے گائیڈنگ کی تربیت بہت مفید ثابت ہوئی ہے۔ ان گروہوں کے رکن بننے سے بچوں کو ہنسی خوشی کام کرنے، ایک دوسرے سے نبھانے، زندگی کے اصول وضع کرنے اور ان پر کاربند رہنے کی بہت دلچسپ اور بے انتہا مفید عملی تربیت ملتی ہے جو انھیں آئندہ زندگی میں بہت آڑے آتی ہے۔

تمدنی مشاغل اور ذہنی صحت:- اسی طرح مدرسے میں مختلف تمدنی اور معاشرتی مجلسوں اور انجمنوں کے وجود سے بچوں کی مختلف خواہشیں اور فطری تقاضے بہتر طریق سے پورے ہوتے رہتے ہیں۔ ڈرامہ کلب میں شمولیت سے بچوں میں کسی کردار اور خیال کو اسٹیج پر پیش کرنے کی صلاحیت پیدا ہوتی ہے۔ بچے ڈرامہ کے دلچسپ شغل میں حصہ لے کر بے حد محظوظ ہوتے ہیں، ان میں شعور اور سلیقہ اجاگر ہوتے ہیں، اور اپنے آپ اور دوسروں کو سمجھنے اور بحث و مباحثہ کی انجمنیں بچوں میں دوسروں کے افکار اور دلائل کو سمجھنے، اپنے خیالات پیش کرنے اور ان میں مناسب ترمیم و اصلاح پیدا کرنے کا سلیقہ پیدا کرتے ہیں۔ اگر مدرسہ میں کبھی کبھی تمام طلبہ کے کھانے پینے کا کوئی منظم اجتماع بھی ہو جایا کرے تو اس سے آدابِ دسترخوان کی تربیت کا موقع بھی مل جاتا ہے۔ اکٹھے مل کر ہنسی خوشی کھانے پینے سے بچوں کی مسرت میں بہت اضافہ ہوتا ہے۔ مدرسہ کی زندگی کے ان تمدنی پہلوؤں کا

مجموعی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ بچے کو زندگی کے تقریباً تمام بنیادی تقاضوں اور خواہشوں کو پورا ہونے کے نہایت معقول مواقع میسر آجاتے ہیں، وہ یہ محسوس کرنے لگتا ہے کہ مدرسہ اسے کتابوں کے علم ہی سے آراستہ نہیں کرتا بلکہ زندگی کی تمام دلچسپیوں کے تمام معقول سامان بھی مہیا کرتا ہے۔ اس جامع تربیت اور اس لطیف احساس کی فضا میں پروان چڑھے ہوئے بچے ذہنی طور پر تندرست رہتے ہیں اور آئندہ چل کر معاشرے کے مفید اور کارآمد افراد ثابت ہوتے ہیں۔

ایک ایسا مدرسہ جس میں معلم اپنے فرائض کو بہترین طریقے سے انجام دیتے ہوں۔ جہاں تعلیم و تدریس کو دلچسپ بنانے کی ہر ممکن کوشش کی جاتی ہو اور جہاں بچوں کی تفریحی اور معاشرتی دلچسپیوں کے خاطر خواہ سامان موجود ہوں، بچوں کے لیے ایک ایسا خوش گوار ماحول پیدا کر دیتا ہے، جس میں ان کے پھلنے پھولنے کے وافر امکان موجود ہیں، ایسے مدرسہ کے بچوں کی ذہنی صحت بیشتر خطروں سے محفوظ رہتی ہے اور وہ پڑھنے لکھنے کے کام کاج میں خوب دلجمعی سے حصہ لیتے ہیں، آئندہ زندگی میں بھی مسرت اور کامرانی ان کے قدم چومتی ہے۔

نفسیاتی کلینک :۔ مگر اس امر کے باوجود ہر مدرسہ میں چند ایک ایسے بچے بھی نکل آتے ہیں جو گھر کی یا مدرسہ کی غفلتوں کا شکار ہو کر کسی نہ کسی قسم کی ایسی ذہنی الجھن کا شکار ہو جاتے ہیں جو ان کی زندگی میں سد راہ بن جاتی ہے۔ مدرسہ کی پڑھائی سے خوف کھانے والے بچے یا کسی مخصوص ذہنی عارضہ میں مبتلا ہو جانے والے بچے اس قسم کے بچوں کی چند مثالیں ہیں۔ اس قسم کے بچوں کے لیے علاج اور اصلاح کے لیے خصوصی اہتمام کی ضرورت ہے۔ ان کے مناسب علاج اور اصلاح کے لیے مدرسہ میں ایک ایسے ادارے کا قیام ضروری ہے جسے نفسیاتی کلینک کہا جاتا ہے۔

نفسیاتی کلینک ایک ایسے مرکز کا نام ہے جس میں بچوں کی رہنمائی کے مختلف ماہرین فن اس بات کا کھوج لگانے کا کام کرتے ہیں کہ کسی بچے کے بگڑنے کے اسباب کیا ہیں، اور بگڑے ہوئے بچے کو سنوارا کیسے جائے ماہر نفسیات بچے کے ذہن کا مکمل جائزہ لیتا ہے۔ وہ مختلف ذہنی آزمائشوں کی مدد سے یہ دریافت کرتا ہے کہ بچے کی ذہنی استعداد کس قدر ہے۔ اس کے طبعی میلان کس جانب ہیں۔ اور مدرسہ کے مشاغل اس کی انفرادی طبع کے لیے موزوں ہیں یا نہیں۔ اور اگر ان مشاغل میں کچھ رد و بدل کر دیا جائے تو بچے پر اس کا کچھ خاطر خواہ اثر ہو سکتا ہے یا نہیں

نفسیاتی کلینک کا ایک اور رکن معاشرتی کارکن ہے۔ یہ شخص بچے کے گھر اور گلی بازار کے ماحول کا مکمل جائزہ لیتا ہے۔ اور اس بات کی تحقیق کرتا ہے کہ بچے کی ذہنی صحت بگاڑنے یا مدرسے سے اس کا دل اچاٹ کرنے میں کن کن گھریلو عناصر نے نمایاں حصہ لیا ہے۔ جب بچے سے متعلق تمام ضروری معلومات اکٹھی ہو جاتی ہیں تو ایک بچے کے والدین اور اساتذہ کو کلینک میں مدعو کیا جاتا ہے۔ یہ تمام لوگ اکٹھے بیٹھ کر بچے کی تمام مشکلات پر آپس میں تبادلۂ افکار کرتے ہیں اور اس کی اصلاح اور علاج کے لیے ایک معقول لائحہ عمل وضع کرتے ہیں۔ مشکل بچوں کا مکمل علاج اس وقت تک ناممکن ہے، جب تک والدین اور اساتذہ کلینک کے اراکین سے پورا تعاون نہ کریں۔

اگر ہر مدرسہ کے ساتھ ایک نفسیاتی کلینک ملحق ہو تو بر وقت رہنمائی سے کئی بچے غیر موزوں سمتوں کی طرف بڑھنے اور اپنی ذہنی صحت برباد کرنے سے بچائے جا سکتے ہیں۔ مدرسوں میں ایسے کلینکوں کے قیام سے معلم کے درس و تدریس کا کام بھی بہت آسان ہو جاتا ہے۔ کیوں کہ کلینک میں علاج کا سلسلہ جب ذہنی، کام چور، نکمے، پھسڈی اور مجرم بچوں کی ذہنی صحت بحال کر دیتا ہے تو وہ مدرسہ کے تمام مشاغل میں پوری طرح شریک ہونے کے قابل ہو جاتے ہیں۔



بچوں میں خود ضبطی

منور جہاں رشید

تنظیم سے مراد ایسا طرز رہائش ہے جس میں ایک فرد اپنی ضروریات کو اس طریق احسن سے پورا کرتا ہے۔ کہ وہ دوسروں کی ضروریات میں مداخلت نہیں کرتا۔ اس کے گھر سے دماغ میں اطمینان ہے وہ اپنی رواداری طرز روش سے مجلس میں اطمینان قائم رکھتا ہے نہ صرف یہ بلکہ اس کا اٹھنا بیٹھنا اس قدر روادار اور محتاط ہے کہ وہ مجلس میں مل جل کر ہنسی خوشی رہنے کے امکانات مہیا کرتا ہے۔ اور مہیا کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

تنظیم دو قسم کی ہے ایک وہ جس میں رعب۔ دو بدبہ سے کسی آئین کو قائم کیا جاتا ہے۔ دوسرے وہ تنظیم جس میں بچہ کسی آئین پر زندگی کو کاربند کرنا خود بخود اپنی سمجھ سے سیکھتا ہے۔

بیرونی ضبط میں آئین کی پابندی ایک حاکم دوسروں پر جبراً نافذ کرتا ہے۔ ایک فرد قوانین کی پابندی اس لیے کرتا ہے کہ دوسرے اس کو سختی کے ذریعے اطاعت کراتے ہیں۔ قوانین کوئی بناتا ہے اور اس کی ضرورتوں کو نظر نہیں رکھا جاتا۔ قوانین کی پیروی زبردستی کرائی جاتی ہے۔ اگر وہ خلاف ورزی کرے تو اس کو سزا ہو جاتی ہے۔ یہ سزائیں مختلف قسم کی ہیں۔ کبھی کبھار بہت سخت ہو سکتی ہیں۔ اندھا دھند تقلید اور قوانین کی پابندی ہی اس میں شہریت کا احساس ہے۔ وہ قوانین کی گہری اہمیت کو نہیں سمجھ سکتا۔ بچہ ایک کٹھ پتلی کی طرح ہے۔ جو کہ حاکم کے اشاروں پر ناچتا ہے۔ وہ زنجیروں میں جکڑا ہوا ہے۔ وہ سہما ہوا ہے۔ اس کا دل بوجھل ہے اس کو ہر لمحہ حاکم اور سزا کا ڈر ہے۔

<u>بیرونی ضبط کا اثر</u>۔ اس میں کچھ فوری فوائد ہیں۔ اس ضبط میں تربیت بہت ہی جلدی ہو جاتی ہے۔ بچے آناً فاناً میں خاموش تابعدار ہو جاتے ہیں۔ لیکن وہ ایک ریوڑ کا گلہ معلوم ہوتے ہیں۔ بچے میں بے انتہا خاموشی بچپن کی موت ہے۔ بچے کی اس طریق سے تنظیم میں استاد بیچارہ کا کام کم ہوتا ہے۔ ایک بچے کے گال پر تھپڑ۔ ایک کی کمر پر چھڑی۔ ایک کے کان کو مروڑنے سے تمام جماعت موت کی طرح خاموش ہو جاتی ہے۔ بچہ غلام کی طرح خاموش اور حکم پر کام کرتا ہے۔ اس کے اندر بچپن مردہ ہو جاتا ہے۔ استاد نے نہ تو وقت خرچ کیا ہے اور نہ دماغی سوچ بچار کا استعمال

کیا ہے۔ تاکہ وہ ایسے طریقے اختیار کرے جن کے ذریعے سے بچے کے فکر و عمل کو ایسی شاہراہوں پر گامزن کرے کہ بچہ آئین شہریت سیکھ جائے۔ اور قوانین کی پابندی کی گہری خوبیاں جان جائے۔ اور یہ قوانین کی پابند انفرادی زندگی و مجلسی زندگی میں سکون کا باعث ہے۔

استاد بچے کو ایسے موقع مہیا کرے جس سے اصول پرستی بچے کے نظام عصبی میں گہری نشو و نما ہو۔ بچہ میں یہ احساس تربیت ہو کہ وہ صرف اپنے لیے ہی زندہ نہیں بلکہ اس کے قول و فعل کا اثر مجلس پر بھی ہے اس کے کندھے پر مجلسی ذمہ داریاں بھی ہیں۔ اس کی طرز رہائش مجلس میں سکون قائم رکھے۔ اور سکون قائم رکھنے کے امکانات پیش کرے۔ سکول اور گھر دنیا کا چھوٹا سا مرقع ہے۔ اس لیے ضبط کی تربیت اور آئین شہریت کے احساس کے لیے ایک اونچے پائے کی اعلےٰ تعلیم یافتہ اور بچوں کی ماہر کی ضرورت ہے۔ مار پیٹ اور سختی سے ضبط قائم کرنا ایک سست اور کم اہل استاد کا شیوہ ہے۔

<u>بیرونی ضبط کے نقصانات</u>۔ وہ ضبط جو کہ سختی و سزا کے ذریعے قائم کیا جاتا ہے۔ بچے کی تندرست نشوونما کے لیے بہت نقصان دہ ہے۔

۱۔ سب سے اول بچہ کی خودداری ضائع ہو جاتی ہے۔ اور وہ اپنی عزت اپنی نظروں میں کھو بیٹھتا ہے۔ ایک پٹے ہوئے بچے میں اور ایک غلام قوم میں کوئی فرق نہیں۔ دونوں خوفزدہ ہیں۔ دونوں کی انفرادیت ضائع ہو گئی ہے۔ دونوں میں اپنے ہست کو قائم رکھنے کا حق نہیں رہا۔ دونوں کو الٹے ڈھانچے میں زبردستی ڈھالا جاتا ہے۔ جو کہ اس کا اپنا نہیں اور اس کو زبردستی ایک بیرونی طاقت سے ایک غیر مانوس سانچے میں پیوست کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ دونوں کو سختی اور زد و کوب کے بعد تاثرات نے بری طرح سے سہما دیا ہے۔ دونوں کے دل بوجھل ہیں۔ دونوں کو جبر کی اطاعت جبراً کرنی پڑتی ہے۔ اور مجبوراً اس سخت گیر طاقت کی اطاعت کرتے ہیں۔ پیار کرتے ہیں جس نے ذلیل کیا۔ جس نے عزت کو انفرادی ہست کو خاک میں ملا دیا۔

اپنے بچے کی عزت کرو۔ تاکہ اسے عزت کرنے کی تربیت ہو۔ اس کو اپنا فیصلہ خود کرنے کا اختیار دو تاکہ وہ ایسی قومی تربیت حاصل کرے جس سے اسے خود مختاری اور آزادی کا احساس پیدا ہو۔ اسے آزادی دو تاکہ وہ آزادی کے استعمال کو سیکھے۔ وہ آزادی و ضبط کو یکجا کر سکے گا۔ کیونکہ آزادی شتر بے مہار کھیپ ہرگز نہیں آزادی

میں سوسائٹی کے مفاد کے لیے ضبط ہے۔ بیرونی ضبط میں یہ خود نافذکی ہوئی روک تھام کی سمجھ مفقود ہے۔

۲۔ قوتِ اختراع ضائع ہوجاتی ہے۔ وہ صرف حکم کی کٹھ پتلی کی طرح کونا جانتا ہے۔ خود فیصلہ کرکے قدم اٹھانا مفقود ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اس کے لیے کوئی اور آکر فیصلہ کرے۔ اور کسی مشیر و حاکم کا ساری عمر انتظار کریگا اور اپنے قیمتی کامیابی کے موقعوں کو کھودے گا۔ ہمارے ماحول میں رہنمائی بہت کمی ہے۔

تخلیقی کام۔ قوت ایجاد جو کہ اپنی سوچ اور اپنے کام اور اپنے فیصلے سے ظہور میں آتی ہے۔ وہ بچے کے گھر سے وجود میں خوابیدہ ہے۔ اس کے بغیر ہیں۔ وہ اپنی سوچ۔ دلیل۔ موازنہ۔ فیصلہ خود نہیں کرسکتا ہے۔ اسے صرف اطاعت کرنا واجب ہے۔

۳۔ جو بچہ اکثر پٹتا ہے اور ہر لحظہ اپنی مرضی کے خلاف مجبوراً جائز و ناجائز کی اطاعت کرتا ہے۔ وہ غم سے بے قابو ہوکر ہیجانی کیفیت پر پہنچ جاتا ہے۔ وہ غصہ کے طوفان میں بہ جاتا ہے۔ اس کے گھر سے بے خود دماغ میں انتقام و تباہی کا سمندر موجزن ہوجاتا ہے۔ اس کی تخلیقی قوتیں اس تلاطم کے سامنے کمزور اور بے حس ہوجاتی ہیں۔ اس کی نشوونما کی شاہراہیں تندرستی سے ہٹ کرنا تندرستی کی طرف چل پڑتی ہیں۔ تخلیق کی جگہ غصہ تباہی۔ توڑ پھوڑ نے لے لی ہے۔ بچہ ضدی ہوگیا ہے۔ وہ قانون توڑتا ہے وہ بچوں کو مارتا ہے۔ فرنیچر اور چیزوں کو توڑتا پھوڑتا ہے۔ وہ چارٹ پھاڑ دیتا ہے وہ دوسرے بچوں کے اچھے ریکارڈ پھاڑ ڈالتا ہے۔ یہ توڑ پھوڑ اور کمزور بچوں کو پیٹنا اس انتقامی جوش کی تسکین جو کسی بڑے کی سختی اور سختی کے سامنے بے بسی سے پیدا ہوئی تھی بچے کے بہت سے کرداری الجھاؤ' مار اور مار کی سختی سے پیدا ہوتے ہیں۔

ایک بچہ نے ایک استاد کو کسی بچے کو شدت سے مارتے دیکھا۔ اس منظر کا اس پر اتنا گہرا اثر ہوا کہ جب وہ گھر آیا تو اس نے کھانا نہ کھایا۔ رات کو نیند نہ آئی بمشکل تمام جب آنکھ لگی تو آدھی رات کو گڑبڑا کر کچھ بڑبڑاتا ہوا اٹھ بیٹھا۔ وہ رات بھر خواب میں چیخیں مارتا رہا اور صبح کو جان بوجھ کر اپنی بس نکال کر واپس آگیا بمشکل اسے سکول بھیجا لیکن وہ بہت بے دلی سے جاتا ہے اور ہمیشہ سکول جانے سے جان چراتا ہے۔ اور ایک دن اس نے کہا کہ وہ سکول جائے گا۔ لیکن اس استاد کی گھنٹی میں باہر درختوں کے نیچے جاکر بیٹھ جائے گا۔ اس استاد کے پاس بہت موٹا ڈنڈا ہے اور اسے اس سے بہت ڈر محسوس ہوتا ہے اس بچے کو گھر پر بہت آزادی حاصل تھی۔ اس

ہے وہ اپنے خیالات کا اظہار آسانی سے کر سکتا تھا۔ والدین نے استاد کے تعاون سے بچے کو اس جذباتی مشکلات سے نجات پانے میں مدد دی۔

صرف ایک نااہل استاد ہی بچے کو مار کر کام میں مصروف کرتا ہے۔ اور ایسا استاد بچوں کو پڑھانے کے لیے بہت ہی غیر مناسب ہے۔ کام میں دلچسپی خود بخود اچھے ماحول سے پیدا ہوتی ہے۔ چھڑی سے برانگیختہ نہیں کی جاتی۔ آئین شہریت نشوونما ہونا چاہیئے مجلس کے ممبران کی ضرورتوں کا احترام شخصیت میں بالیدہ ہو۔ تنظیم اور مناسب عادات وطوار نظام عصبی میں پرورش پائیں۔ ایک بشاش بچہ ایک تخلیقی کام میں مصروف بچہ درست تنظیم کی نشوونما کے ذریعے تربیت پاتا ہے۔

جو والدین ایک بچہ کو ماریں اور گالی دیں وہ نفسیاتی بیمار ہیں۔ اور ان کا نفسیاتی علاج ہونا چاہیئے مارپیٹ والدین کے دماغ میں گہری ناخوشی ہونے کا ثبوت ہے۔ دوسرے جب والدین کو فطرت کے مقرر کیے ہوئے اصول پر دان سے ناواقفیت ہو جبھی وہ ایسے مضر حربوں کے استعمال سے گریز نہیں کریں گے۔ ایسے والدین کا جذباتی توازن متزلزل ہے۔ ان کا مارپیٹ وگالی گلوچ کا سلوک ان پر رحم کا متقاضی ہے۔ وہ ایک مریض کی طرح کمزور وزخم خوردہ ہیں۔ ان کے دماغی سکون وگہری فطری ناخوشیاں کی طرح لگی ہوئی ہیں اور ان کو کمزور کیے جا رہی ہیں۔

دوسری قسم تنظیم کی خود ضبطی ہے۔ ایک فرد کا ہر فعل مجلس کے ممبران کے امن وسکون کو مدنظر رکھتا ہے ایک اچھے شہری کا نتہائے نظر مجلس کا امن ہے۔ ایک بچہ اپنے گھر میں ریڈیو کا بجانا بند کر دیتا ہے تاکہ پڑوس میں ایک بیمار کے بار خاطر نہ ہو۔ ایک بچہ کرکٹ کھیل کر کرکٹ کا گیند وبلا احتیاط سے واپس الماری میں رکھ دیتا ہے تاکہ ہم جلیسوں کو کھیلنے کا موقع ملے۔ اور جب وہ کھیلنا چاہیں تو ان کی کھیل کی خوشی کھیل کے سامان کی غیر موجودگی کی وجہ سے تلف نہ ہو جائے۔ یہ افعال پر روک نظام خود ساختہ ہے۔ اور بچہ اس حدبندی میں خوش ہے۔ وہ ایک اچھا شہری ہے۔ وہ ہم جلیسوں کی خوشی وضرورتوں کو مدنظر رکھتا ہے۔ وہ یہ بھی سمجھتا ہے کہ اگر ایک دوسرں کی دوستی وصحبت سے پورا فائدہ اٹھانا ہے تو ایک دوسرے کی ضرورتوں اور احساسات کا پورا خیال رکھنا چاہیئے۔ اور تب ہی وہ متحدہ منظم سوسائٹی کی طرح خوش وخرم زندگی بسر کر سکتے

ہیں۔ وہ سوسائٹی کو بے لوث خدمت دینا سیکھیں۔ تاکہ جب ان کو ضرورت ہو تو تمام سوسائٹی ان کی خدمت کرے

سکول ایسے مواقع مہیا کرے جن کی وساطت سے بچے عملی طریقے سے اچھا شہری بننا سیکھیں۔ بچوں کو انتظامی ذمہ داریاں سونپ دینی چاہئیں۔ تاکہ وہ عملی تجربہ سے غیر ذمہ داری کے نقصانات سے متعارف ہوں۔ جب وہ اپنے مجلسی مسائل کے حل خود کرتے ہیں۔ جب وہ انتظامی ذمہ داریاں خود سرانجام دیتے ہیں تو وہ قوانین بھی خود ہی مرتب کرتے ہیں۔ وہ قوانین اس لیے قائم کرتے ہیں کیونکہ ان قوانین کی اشد ضرورت ان پر پورے طور پر واضح ہے۔ وہ قوانین کی گہری اہمیت محسوس کرتے ہیں۔ اور ان قوانین کی پیروی انفرادی مجلسی سکون کے لیے اشد ضروری ہے۔ قوانین اور افعال پر ہلکی پھلکی روک تھام ہر ایک کی خوشی و سکون کا باعث ہے۔ چونکہ وہ قوانین کی گہری اہمیت محسوس کرتے ہیں۔ قوانین کو خود بناتے ہیں اس لیے ان کی پیروی ان کو بار خاطر نہیں۔ جیسا کہ عام طور پر ہو جاتا ہے۔ جبکہ قانون کوئی حاکم اور انتظام نافذ کرتا ہے۔

سکول میں "بچوں کا انتظام" یا "خود مختار حکومت" کھیل کھیل میں خود ضبطی سکھانے کا نہایت مفید آلہ ہے۔ جونیئر سکول میں ایک ایگزیکٹو کمیٹی ہو۔ اس سکول کی انتظامیہ و جنرل کمیٹی میں کچھ عہدے ہوں۔ صدر۔ نائب صدر۔ سیکرٹری۔ ایگزیکٹو ممبر۔ ہر جماعت سے آئے ہوئے نمائندے۔ ان نمائندوں کی اپنی جماعت میں ایک اور ماتحت وچھوٹی کمیٹی ہو۔ یہ جماعتی کمیٹی کے ممبر جنرل کمیٹی کے ممبران کے تعاون میں کام کریں۔ جنرل کمیٹی کے احکام کو بجالانے میں مدد دیں۔ اور سپرد کیے ہوئے فرائض کو خوش اسلوبی سے سرانجام دیں۔ ہر ایگزیکٹو آفیسر کے پاس مقرر کردہ فرائض ہوں۔ جنرل کمیٹی اور جماعتی کمیٹی متفقہ سکول میں خود ضبطی کے فروغ میں مددگار ہوں گے۔

انتظامی فرائض مندرجہ ذیل ہیں

۱ سکول میں کھیلوں سے متعلق مختلف انتظامی ذمہ داریاں۔ سکول میں ہوسز کے مابین کھیلوں کے مقابلہ کرانا میچ کرانا ہے۔ سکول کا دوسرے سکولوں کے ساتھ کھیل کے مقابلے اور منظم کھیلوں کے میچ کرانا اور ان سے متعلق تمام انتظام کرنا۔ مہمان ٹیم کی خاطر و تواضع بھی اسی انتظام میں شامل ہے۔ کھیل کے سامان کو احتیاط سے رکھنا۔ یہ دیکھنا کہ وہ درست حالت میں ہے۔ صاف ہے۔ ٹوٹنے پر مرمت ہو جائے۔ جو ناقابل ہے اس

کو جلانا یا نیلام کرنا اور اس کو ختم کرنے سے پہلے صدر معلم کے گوش گزار کر کے اجازت تحریری لینا وغیرہ اگر کوئی بچہ سامان کو توڑ پھوڑ دیتا ہے تو اس کی روک تھام و باز پرس کیوں کر کی جاتی ہے۔ سالانہ کھیلوں کا انتظام ایک بہت وسیع کام ہے۔ اس کے لیے دعوت نامہ لکھنا۔ دعوتی رقعوں کو سجانا۔ پروگرام لکھنا پروگرام کو نقاشی سے مزین کرنا۔ کھیل کے میدان پر مناسب سفید لکیریں کھینچنا۔ مختلف کھیلوں کے لیے سامان مہیا کرنا۔ نشانی پٹیاں تیار رکھنا۔ نشست و برخاست کا انتظام کرنا۔ راستہ آنے وجانے کے لیے بنانا۔ کرسیاں لگوانا۔ اعزازی مہمان کے لیے خاص جگہ مقرر کرنی۔ میز پر انعامات سجانے شربت وچائے پلانے کا انتظام ان کو مہمانوں کی خدمت میں کس وقت کس طرح پیش کرنا۔ نعرے کس وقت اور کتنے لگانے۔ کس نے نعرہ شروع کرنا۔ مختلف حصہ لینے والے گروہوں میں تنظیم قائم رکھنی۔ کھیل کے وقت خاموشی قائم رکھنا۔ کھلانے والے کے فیصلہ کو ماننا وغیرہ چند ایسے فرائض ہیں جو کہ بچوں کو سرانجام دینا ہیں۔ ان سے وہ ذمہ داری سرانجام دینا سیکھیں گے۔ قوانین بنائیں گے۔ پیروی کریں گے۔ اور خود ضبطی نشوونما ہوگی۔

ادبی مجلس

بچوں کے سکول میں ایک انتظامیہ کمیٹی ہو جس کا کام ادبی مشاغل کی سرگردگی ہو۔ سکول کی میگزین چلائیں بچوں میں ادبی مقابلے شروع کریں۔ یہ ادبی مقابلہ بچوں کے اپنے معیار کے ہوں مثلاً ہوسٹر میں خوشخطی کا مقابلہ کہانیاں لکھنے کا مقابلہ۔ جواب مضمون کا مقابلہ وغیرہ۔ سکول میگزین میں بھی شذرات بچے خود لکھیں اور اس میں ان کی دلچسپیوں کے مطابق ان کی سکول کی زندگی کے متعلق معلومات ہوں۔ مضامین ہیں کہانیاں۔ تاریخی جغرافیائی۔ نباتاتی۔ سائنسی مضامین وکہانیاں ہوں۔ دلچسپ معلومات و پہیلیاں ہوں۔ ذہانت کے معمے ہوں وغیرہ۔ سب ایڈیٹر۔ جائنٹ ایڈیٹر اور ایڈیٹر مضامین جمع کریں۔ بچوں کو شوق دلائیں کہ وہ محنت سے میگزین کے لیے احتیاط سے منتخب کریں۔ سرورق تیار کریں۔ اور جلد کی شکل میں یہ مختلف مضامین کا مجموعہ بچوں کے قلم سے لکھا ہوا تیار ہو۔ اس کی نگرانی۔ سرپرستی۔ طوالت و اختصار کا کام انتظامیہ کمیٹی کرے۔ بچوں میں شوق دلائے کہ وہ اسے زیادہ سے زیادہ کامیاب بنائیں۔

ڈرامہ کلب | بچوں کی انتظامیہ کمیٹی سکول میں ایک جنرل اسمبلی منعقد کرے۔ ایک مقررہ دن جو ایک مقررہ وقفہ پر

آتا ہو۔ تمام بچے ہال میں جمع ہوں۔ ایک سادہ سا سٹیج ہو۔ جس پر بچے نظمیں ہاتھوں کے اشاروں کے ساتھ سنائیں مختصر۔ سادہ بچوں کے معیار کے ڈرامے۔ اور مکالمے۔ ایکٹ ادا کیے جائیں۔ انتظامیہ کمیٹی پروگرام بنائے۔ مناسب انتخاب کرے غیر مناسب کو کاٹ دے۔ زبان شستہ ہو۔ مزاح نفیس ذوق کا پتہ دے۔ اخلاق آموز نظمیں ہوں۔ دعوتی رقعے مع پروگرام کے ہیڈ ماسٹروں و پرنسپل کو لکھے۔ ان کا استقبال کریں۔ ان کو کس طرح سے بچے بیٹھنے کے لیے کرسی پیش کریں۔ کس راستے سے ان کو لایا جائے۔ وہ راستہ خالی رکھا جائے وغیرہ۔ بچوں کی انتظامی کمیٹی کی انتظامی ذمہ داریوں میں شامل ہے۔ سکول کے بچوں کے لیے یہ بہت عمدہ تربیت ہے کہ وہ خاموشی سے قطاریں بنا کر اپنی جماعتوں سے ہال کمرہ میں کرسیاں اٹھا کر جائیں۔ قطاریں بنا کر کھڑے ہوں۔ اور خاموشی سے بیٹھ جائیں۔ ہر جماعت کا ایک ذمہ دار سرگروہ یا لیڈر ہو۔ وہ اپنی قطار میں خاموشی اور تنظیم کا نگران ہو۔ خاموشی و تنظیم کا مقابلہ جماعتوں میں قائم ہو۔ انفرادی مقابلے غیر مناسب ہیں۔ کسی ایک سکول میں پانچ منٹ میں تمام بچے اپنی کرسیاں لے کر ہال میں جمع ہو گئے تھے اور سکول کی فضا میں خاموشی طاری رہی تھی۔ سٹیج کا بنانا۔ لگانا۔ سجانا۔ بھی ایک فریضہ ہے۔ پروگرام میں درج کیے ہوئے نظموں ڈراموں لطیفوں وغیرہ کا اداکاری سے پہلے اعلان کرنا۔ ڈرامہ کے دوران میں کسی غیر متوقع مہمان کا یکایک آجانا۔ بعض مہمانوں کا دیر سے آنا۔ اور ان کا استقبال کرنا۔ اور مناسب جگہ پر بٹھانا۔ اور ادا ہوتے ہوئے پروگرام میں خلل نہ ہو۔ بچوں کو انتظامی تربیت کا موقع ہے۔ ڈرامہ ادا ہوتے ہوئے میں ایک اچھے سامعین کی محفل بننا۔ مناسب موقع پر داد اچھی طرح دینا۔ نقائص کو نظر انداز کرنا۔ تالیاں کس وقت اور کیونکر بجائی جائیں۔ شکریہ ادا کرنا۔ اور محفل کے ختم ہونے کا اعلان کرنا۔ بچے کی خود مختار حکومت کا مناسب فرض ہے۔ اور اس کو خوش اسلوبی سے ادا کرنا اعلیٰ تربیت کا موقع ہے۔ ڈرامہ ختم ہونے کے بعد سٹیج کو ہٹا دینا۔ بچوں کا کرسیاں اٹھا کر قطار در قطار خاموشی سے بغیر دھکا دیتے ہوئے جماعتوں میں واپس جانا۔ اور اس کی نگرانی انتظامیہ کمیٹی کی ذمہ داری ہے ہوسٹریں اور سکولوں کے مابین نظم خوانی و ڈرامہ۔ مکالمے اور لطیفوں کے مقابلہ قائم کرنا۔ اور ان کا انتظام بھی اسی کلب کا فریضہ ہے۔

سکول میں صحت وصفائی کا کلب

بچوں کی ایک انتظامیہ کمیٹی صحت وصفائی سے متعلق فرائض سرانجام دے۔

جماعت کے کمروں کی صفائی۔ سکول سے ملحق میدان و باغ کی صفائی غسلخانوں و پاخانوں کی صفائی۔ نالیوں

کی صفائی کے بچے نگران ہوں۔ جھاڑو لگی ہو۔ جھاڑ پونچھ ہوئی ہو۔ نالیوں اور پاخانوں میں فنائل ڈالی گئی ہو۔ غسلخانوں میں استعمال کے برتن۔ حمام۔ لوٹے۔ سلیفچیاں وغیرہ صاف ہوں۔ فرنیچر صاف ہو۔ دیواریں صاف ہوں۔ جالے وغیرہ نہ لگے ہوں۔ شیشے صاف ہوں۔ دروازے اور کھڑکیوں اور باقی فرنیچر کا پالش صاف ہو۔ جمعہ کا دن صفائی کے لیے مقرر ہو۔ تمام بچے ہر قسم کی صفائی و پالش کریں۔ اور یہ سب کام منتظمہ کمیٹی کی سرکردگی میں سرانجام پائے۔

بیمار کے کمرے کی صفائی کی نگرانی بھی بہت ضروری ہے۔ اور انتظامیہ کمیٹی کی ذمہ داری ہے۔ اس میں ضروری اور مناسب فرنیچر ہو۔ اور ایک گروہ اس کی دیکھ بھال کا اور کمرے کی آراستگی کا ذمہ دار ہو۔

فرسٹ ایڈ کے سامان کی الماری کی نگرانی بہت اہم ہے۔ دوائیوں کی الماری کی دیکھ بھال ضروری ہے۔ بچوں کی انتظامیہ کمیٹی صفائی کو دیکھے کہ مناسب ضروری سامان فرسٹ ایڈ اور روزمرہ کے استعمال کی ادویات ہر وقت موجود ہوں۔ جب کوئی دوا ختم ہو جائے تو فوراً مشیر استاد کو اطلاع دے۔ غریب و بیمار بچوں کی مفت طبی مدد کے لیے فنڈ ہو۔ اس فنڈ سے کسی فوری ضرورت پر بھی خرچ کیا جا سکتا ہے۔ ادویات کی بوتلیں صاف ہوں۔ ان پر لیبل لگے ہوں۔ ان پر نام لکھے ہوں۔ تاکہ استعمال کے وقت غلطی کا احتمال نہ رہے۔

سکول کے ڈاکٹر کے پاس جب بچے طبی معائنہ کے لیے جائیں تو لازم ہے کہ انتظامی کمیٹی کے ممبران اور نمائندہ کمیٹی کے ممبران بچوں کی قطاریں بنوائیں۔ ان کو خاموشی سے منظم ڈاکٹر کے پاس لے کر جائیں۔ اپنی باری پر اپنا طبی معائنہ کرائیں۔ اور یہ دیکھیں کہ ہر بچے کے پاس رپورٹ بک ہے جس پر کہ طبی معائنہ کی تفصیل ڈاکٹر نے درج کرنی ہے۔ جب سکول میں کوئی بچہ یکایک بیمار پڑ جائے تو بچے اس کی اطلاع فوراً استاد کو کریں۔ ڈاکٹر کو کریں۔ اور فوراً بیمار کے مخصوص کمرے میں لے جائیں۔

عجائب گھر ایک اچھے سکول میں بچوں کا خود تیار کیا ہوا ایک عجائب گھر ہونا ان کی تعلیمی ترقی و دلچسپی کا یقین ثبوت ہے۔ بچے عجائب گھر کی صفائی کی نگرانی کریں۔ اور یہ دیکھیں کہ مجموعات صاف ستھرے اور محفوظ ہیں۔ سکول کے بچوں میں یہ شوق دلائیں کہ وہ زیادہ اچھے نمونے عجائب گھر میں رکھنے کے لیے پیش کریں۔ اور ان کی فہرست احتیاط سے رجسٹر میں درج کریں۔ اس کی بھی بچوں کی ایک انتظامیہ کمیٹی ہو۔

نقاشی کا کمرہ بچوں کی انتظامیہ کمیٹی اس کی نگرانی کرے۔ اس کے ساز و سامان کی نگہداشت کرے اور نقاشی کے نمونوں کو دیواروں پر آویزاں کرے۔ اور مناسب وقفہ کے بعد ان کو بدل دے۔

تاریخ، جغرافیہ اور نیچر سٹڈی کے متعلق مجموعات ہوں۔ البم تصویری چارٹ، کتابیں وغیرہ احتیاط سے رکھی جائیں۔ طلبہ کو شوق دلایا جائے کہ وہ زیادہ دلچسپی لیں۔ اور زیادہ کامیاب بنانے کی کوشش کریں۔

تنظیم بچوں کی انتظامیہ کمیٹی کا ایک بہت اہم فریضہ ہے کہ وہ اس بات کی کڑی نگرانی کرے کہ جو قوانین جنرل کمیٹی اور جماعتی کمیٹی نے مرتب کیے ہیں۔ ان کی کمل پیروی ہو رہی ہے کہ نہیں۔ جس وقت ان قوانین سے غفلت کی جاتی ہے۔ اور ان کو توڑا جاتا ہے۔ اس وقت کیا قدم لیے جائیں کہ خلاف ورزی کی بیخ کنی ہو جائے اس کمیٹی کا یہ بھی کام ہے کہ بچوں کی تنظیم کو مختلف نکات سے جانچے مثلاً

۱۔ کچھ بچے گھر کا کام نہیں کرتے۔ کچھ کسی کا کام اٹھا کر اپنا کہہ کر دکھا دیتے ہیں۔ بعض بچوں کا گھر کا کام چرا لیتے ہیں۔ بعض دوسرے بچوں اور ہوشیار بچوں کا کام پھاڑ دیتے ہیں۔ کچھ تعلیمی ترقی کے چارٹ پر نمبر بدل دیتے ہیں دیوار پر لٹکی ہوئی تصویروں کو پھاڑ ڈالتے ہیں۔

۲۔ ان بچوں کو کس طرح سدھارا جائے جو اپنے فرائض سے غفلت برتتے ہیں۔

۳۔ بچے نگرانی کریں کہ کھانے کی چھٹی میں بچوں کے اداب موزوں ہوں اور اس بات کا خاص خیال رکھیں کہ کوئی بچہ کسی کا پھل و کھانا نہ کھا جائے۔ اگر ایسا ہو جائے تو اس کی جانچ پڑتال کریں۔

۴۔ بچے پھل و کھانے پینے کی دوکان پر مناسب آداب کا مظاہرہ کریں۔ قطار میں کھڑے ہوں۔ باری پر خریدیں اور فوراً قیمت ادا کریں۔ اور احتیاط سے پوری قیمت ادا کریں۔ اور بچے کے عام اطوار کا جائزہ لیں۔ ان کو اچھی عادات کا شوق دلائیں۔ آداب معیاری ہوں کا سبق تجربہ سے نشوونما کریں۔

۵۔ سکول کے ساز و سامان کی نگہداشت کریں۔ باغ کی دیکھ بھال کریں۔ گلدانوں کی سجاوٹ کی ذمہ داری پوری کریں۔ سکول میں پینے کے پانی اور دھونے کے لیے پانی و صابن کا انتظام ٹھیک ہو۔

سکول انتظام کے تجربات کے موقع مہیا کرے۔ بچوں کی انتظامیہ کمیٹی سکول کی تقریبات کے اچھے انتظام کا ذمہ ہے۔ سکول میں چند تقریبات ضرور ہوتی ہیں۔

۱ سالانہ کھیلوں کا مظاہرہ

۲- ہوسٹز اور سکولوں کے مابین کھیلوں کے مقابلے اور منظم کھیلوں کے مقابلے ۔

۳ یوم والدین اور پروگرام کے مختلف پہلو اور ان کا انتظام ۔

۴ سالانہ جلسۂ تقسیم انعامات

۵ سالانہ سکول کا ڈرامہ

۶ سکول کی سالانہ تعلیمی نمائش

۷ نیلا پرندہ ۔ بوائے اسکاؤٹ اور گرل گائڈنگ کی تحریکات کے سالانہ مظاہرے ۔

۸ پکنک

۹ تعلیمی سیر

۱۰ سکول میں پھولوں کی نمائش

۱۱ نقاشی و ہینڈ ورک کی سالانہ نمائش

۱۲ سکول میں ہوسٹز کے مابین اور شہر و ڈویژن میں سکولوں کے مابین مختلف مقابلے وغیرہ ۔

مندرجہ بالا میں سے ہر ایک میں انتظام کے لحاظ سے فرائض بالتفصیل ہیں اور بہت سے مددگاروں کی ضرورت ہے تاکہ انتظام خوش اسلوبی سے سرانجام پائے ایک بہت بڑی تعداد میں بچے انتظامی فرائض میں منہمک ہو جاتے ہیں ۔ اور امداد باہمی میں شریک ہو کر تقریب کے انتظام کو خوش اسلوبی سے سرانجام دینے میں مصروف ہو جاتے ہیں اور ان کو نہ تو یہ غم ہوتا ہے کہ وہ سٹیج پر کھڑے ہو کر ڈرامہ کر کے نہیں دکھا رہے اور نہ اس بات کی فکر ہوتی ہے کہ ان کا نام دیوار پر لٹکا اور ان کا نام جلی حرفوں میں دیوار پر نہیں لکھا گیا بلکہ اس کے برعکس وہ چستی سے انتظامی ذمہ داریوں کو بجا لانے میں مشغول ہیں ۔ اور اپنے آپ کو اہم چیز تصور کرتے ہیں ۔ سکول کے پس پشت پڑے نکتے لوگ نہیں سمجھتے ۔

بچوں کو سکول میں روزمرہ ایسے مواقع پیش آتے ہیں جہاں بچوں کو خود ضبطی کی نشوونما کرنے کا موقع مل جاتا ہے

۱ صبح کے وقت دعا کے لیے روزانہ تمام بچوں کا اجتماع ہوتا ہے بچے جماعتوں میں سے قطار بنا کر ہال میں آتے ہیں ۔ کونسی جماعت سب سے خاموش و مؤدب آتی ہے ۔ کونسی جماعت سب سے اچھے آداب محفل و اجتماع

کا مظاہرہ کرتی ہے۔ یہ روزمرہ کے سوالات کا جواب بچوں نے اپنی عادات کے ذریعے سے دینا ہے بچے نظار میں آئیں گہرے سکوت میں مؤدب ہو کر دعا مانگیں حمد گانے وقت خوبصورتی سے گائیں۔ پھر خاموشی سے واپس جائیں جماعت کے مانیٹر اپنی اپنی قطار کی عمدہ تنظیم اور خاموشی کے ذمہ دار ہوں اور چست نگرانی کریں دن میں جماعتیں کئی مرتبہ جماعت سے باہر آتی اور جاتی ہیں۔ کھیل کے گھنٹے میں۔ کھانے کے گھنٹے ہیں۔ نقاشی کے سبق کے لیے اور جب سکول ختم ہو جائے بچوں کے شوق کو ترغیب ہو کہ وہ ان اوقات میں اعلےٰ تنظیم کا مظاہرہ دیں اور آنا اور جانا خوش اسلوبی سے سرانجام دیں۔

سکول کا روزانہ اخبار نکلے جس میں مختلف نکتہ چینی ہو۔ مختلف اصلاحی مشورے ہوں۔ تبدیلیوں کی ترغیب ہو۔ سکول کے متعلق مختلف موضاعات پر بحث کی گئی ہو۔ اور اس کے متعلق تجاویز پیش کی گئی ہوں۔

لائبریری اچھے بچوں کو واضح ہونا چاہیئے کہ لائبریری سب کے استعمال کے لیے ہو۔ کتابیں لے کر بیٹھے رہنے سے دوسروں کا نقصان ہو رہا ہے۔ اور اس بچے کا اپنا بھی نقصان ہو سکتا ہے۔ کہ جبکہ اسے جس کتاب کی اشد ضرورت ہے وہ کوئی اور اس کی طرح لے کر بیٹھ گیا ہے۔ اچھی منظم سوسائٹی میں لائبریری کو تالے کی کوئی ضرورت نہیں۔ لائبریری کی کتب بغیر تالے کے محفوظ رہنی چاہیئں۔ ان کو احتیاط سے استعمال کریں۔ بچوں پہ اعتبار کرنا چاہیئے۔ ان کو کھلی الماریوں کا تجربہ ہونا چاہیئے۔ جنرل کمیٹی ایسے بچوں کا انتخاب کرے جو خاموشی سے بچوں کی چال ڈھال کی نگرانی کرے کہ وہ لائبریری کی کتب کا کیونکر استعمال کرتے ہیں۔

کہانیوں۔ ڈراموں۔ مکالموں اور نظموں کے ذریعہ ایمانداری کی خوبیوں کا سبق سکھایا جائے۔ مؤثر تقاریر بھی مفید ثابت ہو سکتی ہیں۔ لائبریری کا محتاط استعمال اور اچھے شہری کے فرائض ذہن نشین کیے جا سکتے ہیں اسلامی مذہبی کہانیاں۔ پرانی تاریخی کہانیاں۔ اخلاقی سبق اور ایمانداری کے سبق دیتے ہیں بہت مفید ہیں۔ وہ بچے میں اونچا کردار نشوونما کرنے میں مددگار ہیں۔ کہانیاں بے ساختہ اونچے کردار میں زندگی بسر کرنے کی ترغیب دیتی ہیں ڈرامہ کا نفس مضمون سبق آموز ہے۔ جب بچے نظمیں سیکھتے ہیں تو وہ الفاظ کو رٹتے ہیں اور الفاظ کے پس پشت جو خیالات ہیں وہ شخصیت میں بے ساختہ نشوونما پا لیتے ہیں۔ بچے چارٹ جو دیواروں پہ آویزاں ہیں روزانہ پڑھتے ہیں جو خیالات ان پہ تحریر ہیں وہ بلا تکلف بچے کے گہرے دماغ میں نقش ہو جاتے ہیں۔

استاد بچے کا مثالی کردار ہے ۔ وہ اس کا تمہا ئے نظر ہے ۔ بچے اس کی نقل کرتے ہیں ۔ اس کے عادات واطوار کا بے ساختہ اور گہرا اثر ہے ۔ اگر استاد لائبریری کی کتب وقت مقررہ پر واپس کرتا ہے تو وہ اس کو غور سے دیکھ کر عکس کر لیتے ہیں ۔ اس کی تقریر کا اتنا اثر نہیں جتنا کہ اس کے اپنے فعل کا ۔ وہ آہستہ سے بولتا ہے اور وہ وہی شستہ الفاظ سیکھ لیتے ہیں ۔ اگر وہ وقت پر آتا ہے تو بچے بھی وقت پر آتے ہیں اور وہ آنا چاہتے ہیں اگر استاد چلتے میں زمین پر سے پھینکا ہوا کاغذ کا ٹکڑا اٹھا کر ردی کی ٹوکری میں ڈال دیتا ہے تو بچے بھی ویسا ہی کریں گے ۔ اگر وہ کھانے وقت آہستہ سے چباتا ہے تو بچے بھی ویسا ہی کریں گے ۔ اور آہستہ سے چبائیں گے ۔ صدر استاد اور سٹاف ایسا نمونہ پیش کریں جن سے بچے اچھے شہری بننا سیکھیں ۔ اور سکول کا اخلاقی معیار نفیس ذوق کا پتہ دے ۔

تنظیم کی تربیت آزادی اور خود مختار حکومت کے ذریعے ایک مشکل مرحلہ ہے ۔ اس میں گہرے سوچ بچار کی ضرورت ہے ۔ شاگردوں اور مختلف حالات کو سنبھالنے کے لیے بہت دانش و سیاست کی ضرورت ہے ۔ مشیر استاد کو بہت تحمل برتنا ہے ۔ اور ہمدردانہ سلوک کی بہت ضرورت ہے ۔ استاد بچوں کے طور طریق کا خاموش مطالعہ کرے ۔ اگر کسی اہم غلطی اور مضر فیصلہ کا امکان ہے تو وقت پر مشورہ دے اور مضر نتائج سے آگاہ کرے اور لب و لہجہ ہمدردانہ رکھے ۔

خود مختار حکومت بچوں کو اپنی تربیت خود کرنے کے مواقع مہیا کرتی ہے ۔ بچے خود ضبطی عملی تجربہ سے سیکھتے ہیں قوانین کی اطاعت کرنا سیکھتے ہیں ۔ یہ آئین شہریت سیکھنے کا عملی طریقہ ہے ۔ بچے ذمہ داریاں اٹھاتے جاتے ہیں اور اس طرح سے ذمہ دار بنتے ہیں ۔ جو لیڈر بن سکتے ہیں ۔ ان کو لیڈر شپ کی تربیت ملتی ہے بچے اپنے لیے خود سوچنا اور اپنے فیصلے سے کام کرنا سیکھتے ہیں بچے مل جل کر رہنا سیکھتے ہیں ۔ سکول افراد کا اجتماع ہی نہیں بلکہ ایک محفل بن جاتی ہے ۔ جس میں ہر ایک ۔ بچہ اس محفل کا جزو ہے ۔ اور ضروری جزو ہے ۔ اور اس پر مجموعہ کی ذمہ داریاں عاید ہیں ۔ بچہ کو مجلس میں رہنے کا ڈھنگ آتا ہے جو ان کو دنیا کی مجلس میں رہنے کا اہل بناتا ہے ۔ آزاد عمل کا کھیل پراجیکٹ تیار کرنا ۔ تعلیمی کھیلیں ۔ گروہی تعلیمی مقابلہ ایسے طریقہ تعلیم ہیں جن میں بچے ٹیم کے لیے مل کر کام کرنا ۔ ایک نصب العین کے حصول کے لیے متفقہ کوشش کرنا سیکھتے ہیں مستقل مزاجی ۔ تحمل ۔ رواداری ۔ ایک دوسرے

احساسات کا لحاظ اور خود اعتمادی جیسی خوبیاں نشوونما پاتی ہیں اور ایک اچھا شہری تربیت پاتا ہے۔

بچے ضدی کیوں ہوتے ہیں۔ بعض اوقات سکول اپنی تمام کوششوں کے باوجود خود ضبطی کی تربیت سکتا۔ جو بچے شریر ہیں وہ نفسیاتی بیمار ہیں۔ ان کی تحلیل نفسی کے ذریعہ تشخص اور بعد میں علاج ہونا چاہیئے۔ سزا وں کو اپنے فرائض سے دور کر دیتا ہے۔ اور بچے زیادہ الجھ جاتے ہیں۔ شریر بچے ہمارے رحم و ہمدردی کے ہیں۔ ان کے جذبات غم سے شکستہ ہو رہے ہیں۔ فطری ضرورتیں پوری نہیں ہوئیں۔ اس خلا نے ان کے ے دماغ میں شکستگی پیدا کر دی ہے۔ ان کی گہری جذباتی و نفسیاتی مشکلات کو سمجھنا ہے۔ پھر اس سمجھ بوجھ رت بچے کو دلاتی ہے اور پھر وہ اپنے حل خود تلاش کرے گا۔ اپنے الجھے مسائل کو حل کرتے ہی وہ اچھا شہری ن جائے گا۔

ناخوش بچے ہی ضدی اور جھگڑالو ہوتے ہیں۔ جو بچے سوتیلے والدین کے پاس پرورش پاتے ہیں یا جن یتیم بچوں سی نے پالا ہوتا ہے جو ددھیال ننھیال میں پلتے ہیں۔ وہ بہت اداس ہوتے ہیں۔ ان کو والدین کی شفقت نصیب ہیں ہوئی ہوتی اور وہ ہماری سوسائٹی میں حقارت و ذلت کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں۔ سوتیلوں کی رقابت لامحدود کا نشانہ بنے ہوئے ہیں۔ وہ الجھے ہوئے کردار کے ہوتے ہیں وہ اکثر کمزور ہوتے ہیں۔ اور غم سے بے قابو ہو کر عجیب غم و غصہ کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ ماں۔ باپ۔ بہن بھائی گھر کے خوشگوار ماحول کی کمی کو کوئی شخص کوئی جگہ پوری نہیں کر سکتی اس کی غیر موجودگی اس پیار کے فاقے کے مصداق ہے جو بالیدگی کے فطری جوش کی تسکین کے لیے غذا ہے بچے کے جذبات غم سے شکستہ ہو جاتے ہیں۔ اس کے گہرے دماغ میں تباہی کا طوفان موجزن ہے۔ وہ غصہ اور انتقام سے بھر گیا ہے۔ وہ ہر ایک کو دکھ دینا چاہتا ہے تاکہ اس خلا کا بدلہ مل جائے۔ جس نے اس کو اس قدر آزردہ کر دیا ہے۔

بعض سگے والدین نادانستہ بچے کو اداس کر دیتے ہیں۔ وہ بہت مصروف ہیں۔ اور بچہ یہ محسوس کرتا ہے کہ نہ تو والدین کو پیار ہے اور نہ ان کو اس کی ضرورت ہے وہ صرف ایک بوجھ جس کو ماں باپ مجبور ہو کر اٹھا رہے ہیں۔ بعض اوقات ماں باپ محض جہالت سے بچوں کے چھوٹے چھوٹے اور بظاہر نہایت معمولی احساسات کا خیال نہیں کرتے اور بظاہر حقیر باتوں میں خاطر ملحوظ نہیں رکھتے۔ لیکن وہ نہایت معمولی بچے کے جذباتی نقطۂ نظر سے بہت اہم ہے۔ وہ اپنے آپ کو ماں باپ کی شفقت سے محروم جانتے ہیں۔ ماں باپ کو بچے اپنا

مقبوضہ سمجھتے ہیں۔ وہ ان دانست میں چھنتے دکھائی دیتے ہیں تو وہ ڈانواں ڈول ہو جاتے ہیں۔ اور دنیا ان کی نظروں میں اندھیر ہو جاتی ہے۔ بعض اوقات جہالت سے ایک بچے کو پیار اس طرح کرتے ہیں کہ دوسرے پر ترجیح دے دیتے ہیں۔ بچہ اپنے آپ کو باقیوں سے کم سمجھتا ہے۔ ماں باپ کی شفقت میں بھی اپنے آپ کو مقابلتاً کم درجے پر محسوس کرتا ہے۔ بہن بھائیوں میں رقابت کا بیج بو دیا جاتا ہے اکلوتا بچہ پیار بہت لیتا ہے سوسائٹی اور سکول میں وہ ویسی ہی خاص توجہ بننا چاہتا ہے۔ جب اسے نہیں ملتی تو وہ اور حربے استعمال کرتا ہے۔ جو کہ عام نظر عجیب عادات اور کرداری الجھاؤ ہے۔ زیادہ ہوشیار بچہ عجیب ہے۔ کیونکہ جماعت کے باقی بچے کم معیار کے ہیں۔ زیادہ کمزور بچہ سب کی حقارت تضحیک کا شکار ہے وہ سب سے ہر بات میں پیچھے ہے۔ اس کمتری کا احساس باقیوں کو شرارت و چھیڑنے پر آمادہ کرتا ہے، اس کا جواب کرداری الجھاؤ بن جاتا ہے۔

ہر کرداری الجھاؤ اور غیر منظم بچے کی اپنی تفصیلات ہیں کہ وہ اس عجیب پن پر کس طرح پہنچا۔ لیکن ایک قاعدہ کلیہ ہے ہر شریر، ضدی، جھگڑالو، توڑ پھوڑ کرنے والا بچہ قابل رحم ہے۔ وہ نفسیاتی بیمار ہے جس کی تشخیص و علاج۔ استاد و سکول۔ کا ضروری فرض ہے۔ تمام عجیب اور نقصان دہ کردار والے بچوں کو ایک ہمدرد دل کی ضرورت ہے وہ دل جو ان کی تکالیف کے احساس سے دھڑکے۔ سکول ان کی تکالیف کی گہرائیوں تک پہنچے۔ تمام بچے طبعاً فرمانبردار اور محنتی ہیں۔ وہ مل کر رہنا پسند کرتے ہیں۔ بچے اس فطرت سے ہٹ کر جھگڑے کی شاہراہ پر کیوں گامزن ہو گئے ہیں۔ سکول والدین کی خدمت ان بچوں کی خاطر کرتا ہے والدین سے دوستانہ اعتماد کا رابطہ قائم کرے۔ بچوں کی جذباتی مشکلات اور کرداری الجھاؤ پر مباحثہ کریں والدین کو خدمت کا احساس ہو۔ تحقیر کا احساس نہ ہو۔ بچے کے کرداری الجھاؤ کی گہری وجہ کی تحقیق کریں۔ خوش بچہ تخلیقی کام میں لگا رہتا ہے۔ معروف بچہ پاکستان کی عظمت کی امید ہے۔ "پاکستان زندہ باد"

سبقوں کے خاکے

جغرافیہ جماعت دوم و جماعت سوم

انور علی قریشی

جب بچے جماعت دوم میں قدم رکھیں تو انہیں اردو اور حساب کی تعلیم دلانے کے علاوہ جغرافیائی تعلیم بھی شروع کر دینی چاہیے جو ان کے گھر سے ہی شروع کی جا سکتی ہے۔ مثلاً کسی ایک لڑکے سے پوچھا جائے تمہارے گھر کا دروازہ کس طرف ہے۔ تمہارے مکان کے سامنے کس کا مکان ہے۔ تمہارے مکان کے پیچھے کس کا۔ تمہارے مکان کے باقی دونوں طرف کن کے مکان ہیں۔ جب وہ لڑکا بتا چکے تو پھر اسے بتایا جائے کہ یہ تمہارے مکان کا حدود اربعہ ہے۔ یعنی تمہارے مکان کی چاروں حدیں ہیں اور تمہارے گھر کی طرف آنے جانے والی گلی کے رخ کس طرف ہیں۔ جب بچوں کو اتنا علم ہو جائے تو پھر انہیں اطراف کا تصور دلایا جائے۔

اطراف: - تمام بچوں سے اجتماعی سوال کیا جائے کہ صبح کے وقت سورج کدھر سے نکلتا ہے تو وہ ہاتھ کھڑا کر دیں گے۔ پھر ان میں سے ایک لڑکے سے پوچھا جائے جب وہ بتا چکے کہ ادھر سے نکلتا ہے تو استاد انہیں بتا دے کہ اس طرف کا نام مشرق ہے۔ اس کے بعد یہ سوال کیا جائے کہ شام کے وقت سورج کدھر چھپتا ہے۔ جب کوئی بھی لڑکا بتا دے تو پھر استاد انہیں بتلائے کہ اس طرف کا نام مغرب ہے۔ اس کے بعد بچوں کے سامنے قطب نما پیش کیا جائے اور انہیں کہا جائے کہ دیکھو اس میں کیا چیز ہے وہ خود بخود بتائیں گے اس میں ایک سوئی لگی ہوئی ہے جس کا ایک سرا ایک طرف ہے اور دوسرا سرا دوسری طرف۔ پھر قطب نما کے سامنے گھما گھما کر وہ سوئی دکھائی جائے۔ تاکہ انہیں یہ معلوم ہو جائے کہ اس گھڑی کو کتنا بھی گھمایا جائے اس کی سوئی کا وہی رخ رہتا ہے۔ بعدہٗ استاد بچوں کو بتائے کہ اس گھڑی کی سوئی کا ایک سرا شمال کی طرف اور دوسرا جنوب کی طرف۔ اب بچوں کو بخوبی علم ہو جائے گا کہ چار اطراف ہیں۔ مشرق۔ مغرب۔ شمال۔ جنوب ان کے علاوہ دو طرفیں اور بھی ہیں یعنی اوپر و نیچے۔

یہاں مجھے ایک واقعہ یاد آ گیا ہے اور وہ یہ ہے کہ مذکورہ جماعت ایک سال راقم کے زیر

بچوں کو جغرافیہ کی تعلیم دینے کے بعد سوال کیا کہ اگر بادل ہو۔ سورج نظر نہ آئے اور قطب نما بھی ہمارے نہ ہو اور ہم کسی دوسرے گاؤں یا شہر میں گئے ہوئے ہیں۔ جہاں ہمیں مشرق مغرب۔ شمال جنوب کا علم ہی نہ ہو تو پھر ہم کس طرح اطراف معلوم کریں گے۔ کئی بچوں نے فوراً ہاتھ کھڑے کر دیے جب ایک لڑکے سے جواب پوچھا گیا تو اس نے بتایا کہ مسجد سے معلوم کریں گے۔ میں نے کہا وہ کس طرح تو لڑکے نے جواب دیا کہ مسجد کا محراب جہاں امام کھڑا ہو کر جماعت کراتا ہے تو اس کا رخ مغرب کو ہوتا ہے۔ اور مسجد کے کمرے کے دروازوں کا رخ مشرق کو اور مسجد کی باقی دو دیواریں ایک شمال کی طرف ہوگی دوسری جنوب کی طرف۔ تو جب ہم نماز پڑھنے کھڑے ہوں گے ہمارا منہ مغرب کی طرف ہوگا، پیٹھ مشرق کی طرف۔ دائیاں کندھا شمال کی طرف اور بائیاں جنوب کی طرف، اور مسجد کا رُخ کبھی بھی تبدیل نہیں ہوتا۔

نباتات :- چھوٹے بچوں کو ہفتہ میں ایک دو بار کھیتوں میں مطالعہ قدرت کے مناظر کا مشاہدہ کرانے کے لیے سیر بھی کرانی چاہیے۔ جب بچے کئی نئی چیزیں دیکھیں گے تو استاد سے ان کے متعلق بات چیت کریں گے جس سے ان کی عملی واقفیت میں اضافہ ہوگا، اور استاد خود بھی انہیں کئی نئی چیزیں بتائے گا۔ مثلاً زمین کی کیا اقسام ہیں یعنی میرا۔ روہی۔ بارانی۔ چاہی وغیرہ اور ان میں کس قسم کی فصلیں پیدا ہوتی ہیں۔

میرا زمین :- جس میں ریت زیادہ ہو اور مٹی بہت کم ملی ہوئی ہو اسے میرا زمین کہتے ہیں اس میں چنے اور تربوز پیدا ہو سکتے ہیں۔

روہی :- روہی وہ زمین ہوتی ہے جو بہت سخت ہو اس میں دھان کی فصل اچھی پیدا ہوتی ہے۔

بارانی :- بارانی ایسی زمین ہے جو صرف بارش سے سیراب ہوتی ہے۔ اس میں گندم اور چنے بوئے جا سکتے ہیں۔

چاہی۔ وہ زمین جو کنوئیں کے پانی سے سیراب ہوتی ہے۔ اس میں بہت سی فصلیں پیدا ہو سکتی ہیں مثلاً گندم۔ مکی۔ جوار باجرہ کپاس وغیرہ۔

اس طرح سیر کراتے وقت طلبا سے پوچھا جا سکتا ہے کہ تم نے کیا کیا اگی ہوئی چیزیں دیکھی ہیں۔ وہ بتائیں گے کہ کھیتیاں، درخت۔ جڑی بوٹیاں۔ گھاس وغیرہ۔ بعد میں انہیں بتایا جائے کہ ایسی چیزیں جو زمین سے

اگی ہوئی ہوں، انہیں نباتات کہتے ہیں ۔

جمادات :- بچوں نے سیر کرتے وقت کوئی نہ کوئی اینٹ، پتھر کا ٹکڑا، لوہا وغیرہ بھی اکثر دیکھا ہوگا۔ اسوقت ان سے پوچھا جائے کہ یہ کیا چیز ہے، وہ خود بخود بتائیں گے۔ بعد میں انہیں بتایا جائے کہ ایسی چیزوں کو جمادات کہتے ہیں، جو جمی ہوئی ہوں، اور خود بخود کوئی حرکت نہ کر سکیں۔ مثلاً اینٹ، پتھر، لوہا، سونا، چاندی، تانبہ وغیرہ یہ سب جمادات ہیں ۔

ٹیلہ :- سیر کراتے وقت بچوں کو کوئی اونچا ٹبہ بھی دکھانا چاہیے۔ کہ دیکھو بھئی کہ ایسی جگہ جو زمین سے کئی فٹ اونچی ہو اسے ٹبہ یا ٹیلہ کہتے ہیں، اور مٹی، اینٹ پتھر، ریت وغیرہ سے بنا ہوا ہو، اور اس ٹیلہ میں مٹی، اینٹ، پتھر کے ٹکڑے بچوں کو دکھائے جائیں اور اس کی تعریف بھی بتا دی جائے کہ ریت اور مٹی کا وہ ٹبہ جو زمین سے کئی فٹ اونچا ہو اسے ٹیلہ کہتے ہیں۔

پہاڑ :- اس کے بعد بچوں کو پہاڑ کا تصور دلایا جا سکتا ہے کہ مٹی اور پتھر کا وہ اونچا ٹیلہ جو زمین سے سینکڑوں یا ہزاروں فٹ اونچا چلا گیا ہو، اور کئی میلوں تک لمبا اور چوڑا ہو اسے پہاڑ کہتے ہیں ۔

جوہڑ :- سیر کراتے وقت بچوں کو کوئی جوہڑ دکھا کر بتانا چاہیے کہ یہ جوہڑ ہے۔ ایسے ہی بہت سے جوہڑوں کے پانی کو اکٹھا کیا جائے تو وہ بہت سی جگہ میں پھیل جائے گا اسے چھنب کہتے ہیں، اس طرح چھنب کا تصور بچوں کے ذہن نشین ہو جائے گا۔

جھیل :- جب ایسے ہی بہت سے چھنبوں کے پانی کو اکٹھا کیا جائے گا تو وہ میلوں تک پھیل جائے گا اسے جھیل کہتے ہیں۔

سمندر :- جب ایسی ہی جھیلوں کے پانی کو اکٹھا کیا جائے گا تو وہ سمندر بن سکتا ہے، بعد میں سمندر کی تعریف بتائی جائے کہ سمندر وہ ہوتا ہے کہ اس کے ایک کنارے پر کھڑے ہو کر دیکھیں تو اس کا دوسرا کنارہ نظر نہ آئے ۔

سیلاب :- جب زیادہ بارش ہو چکی ہو تو اس کے بند ہونے کے بعد استاد بچوں کو اپنے ہمراہ لے کر سکول سے باہر نکلے، اور بہت سا پانی جس جگہ بہ رہا ہو وہاں طلبہ سے پوچھا جائے کہ یہ اتنا زیادہ پانی کیوں بہ رہا ہے

تو وہ خود بخود جواب دیں گے کہ یہ بہت سے گلی محلوں کا پانی اکٹھا ہو کر بہ رہا ہے تو اس وقت انہیں استاد بتائے کہ جب پانی اس طرح اکٹھا ہو کر بہنے لگتا ہے تو ایک نالہ بن جاتا ہے۔

ندی :- جب بارش کے پانی سے بہت سے نالے مل کر ایک جگہ بہنے لگتے ہیں تو وہ ایک ندی بن جاتی ہے۔

دریا :- اسی طرح جب بارش کے پانی سے بہت سے ندی نالوں کا پانی پہاڑوں سے نکل کر ایک جگہ بہنے لگتا ہے تو وہ ایک دریا بن جاتا ہے۔ جو میدانی علاقوں میں بہتا ہوا سمندر میں جا گرتا ہے۔

جب تک بچے مطالعہ قدرت کے مشاہدات نہ کریں اس وقت تک اصطلاحات کی تعریفیں رٹانا بے سود اور ان کے دماغ پر بلاوجہ بوجھ ڈالنا ہے۔ جیسے چشمہ کا تصور بغیر ماڈل کے بچوں کے ذہن نشین کرنا۔ اور صرف اس کی تعریف یاد کرانے سے کوئی فائدہ نہیں کیوں کہ جب بچوں کو چشمہ کی یہ تعریف بتائی جائے گی کہ چشمہ وہ ہوتا ہے جو زمین سے پانی اوپر کی طرف نکلتا ہو، اسے چشمہ کہتے ہیں تو ایسی صورت میں بچے کنوئیں کو بھی چشمہ سمجھیں گے نلکہ کو بھی۔ مگر جب صحیح طور پر چشمہ کا ماڈل بنا کر بچوں کو دکھایا جائے گا تو بچوں کے دماغ میں چشمے کا صحیح تصور آ جائے گا۔

منبع اور دہانہ :- بچوں کو منبع اور دہانہ کا نقشہ ماڈل کے ذریعے دلانا چاہیے۔ بعد میں ان کی تعریف بتائی جائے۔ کہ منبع وہ ہوتا ہے جہاں سے دریا نکلتا ہو۔ اور دہانہ اسے کہتے ہیں جہاں دریا سمندر میں جا کر گرتا ہے۔ جب بچے ایسے قدرتی مناظر کے مشاہدات کر چکیں گے، اور ماڈلوں کے ذریعہ جغرافیائی تعلیم حاصل کریں گے تو انہیں اس طریقہ سے دی ہوئی تعلیم کبھی نہیں بھولے گی۔ ٹیلہ۔ پہاڑ۔ دریا۔ چشمہ وغیرہ کے ماڈل سکول میں بچوں سے بنوائے جائیں۔ یا استاد انہیں خود ماڈل تیار کر دے ایسے ماڈلوں کے دیکھتے ہی بچوں کی واقفیت تازہ ہو جایا کرے گی اور سکول کا صحن بھی خوش نما معلوم ہوگا۔

جغرافیہ جماعت سوم — لڑکوں کی عمر آٹھ نو سال

استاد :- آج ہم تمہارے گاؤں کے لوگوں کی زندگی کے متعلق بات چیت کریں گے۔ کیوں کہ میرا ارادہ ہے کہ میں تمہارے ضلع کے متعلق تمہیں کچھ حالات بتاؤں۔ اچھا بھئی تمہارے گاؤں کے کتنے گھر ہوں گے؟

شاگرد :- ڈیڑھ سو

استاد :- تمہارے گاؤں کی آبادی کتنی ہے ؟
شاگرد :- پندرہ سو۔
استاد :- تمہارے گاؤں کے لوگ کیا کیا کام کرتے ہیں ؟
شاگرد ۱ :- زمیندار۔ محنت مزدوری۔ لوہار۔ کمہار۔
شاگرد ۲ :- کوئی موچی (جوتے بنانے والا) ہے۔ کوئی جولاہا ہے (کپڑا بننے والا) کوئی ترکھان ہے۔
استاد :- یہ تمام لوگ ایک ہی کام کیوں نہیں کرتے ؟
شاگرد :- ایک ہی کام کرنے سے ایک دوسرے کی ضرورتیں کس طرح پوری ہوں گی۔
استاد :- ہاں بے شک اگر یہ تمام لوگ ایک ہی کام کریں تو ایک دوسرے کی ضروریات پوری نہیں ہو سکتیں۔ کیونکہ زمیندار سال بھر میں بہت سی فصلیں پیدا کر کے اناج اکٹھا کرتا ہے اس میں سے سال بھر کا خرچ نکال کر بہت سا اناج اس کے پاس بچ رہتا ہے۔ پھر وہ کچھ گاؤں میں بیچ دیتا ہے اور باقی دوسرے گاؤں یا شہر میں بیچنے کے لیے لے جاتا ہے، مگر اتنی زیادہ جنس کو دوسرے گاؤں یا شہر میں کیسے لے جاتا ہے ؟
شاگرد :- گدھوں پر۔ چھکڑوں پر۔ ریل گاڑی پر اور ٹرکوں پر لاد کر۔
استاد :- گدھے بھی تمہارے گاؤں میں ہیں۔ اور چھکڑے بھی چلتے ہیں۔ مگر ریل اور ٹرک تو تمہارے گاؤں میں نہیں چلتے۔
شاگرد :- ریل تو لائن پر چلتی ہے، اور ٹرک کچی یا پکی سڑکوں پر چلتے ہیں۔
استاد :- شاباش! تمہارے ضلع میں کچی اور پکی سڑکیں بھی ہیں اور ریلیں بھی۔
شاگرد :- جی ہاں۔
استاد :- اچھا بھئی تمہارے گاؤں میں جولاہا تو سال بھر کپڑا بنتا رہتا ہے۔ کیوں کہ کپاس کافی پیدا ہوتی ہے مگر موچی اتنا چمڑا کہاں سے لاتا ہے جو تمام گاؤں والوں کے لیے جوتے تیار کرتا رہتا ہے۔
شاگرد :- شیخوپورہ سے۔
استاد :- کیا وہ موچی شیخوپورہ پیدل جاتا ہے۔

شاگرد :- نہیں جناب، وہ ریل یا لاری پر جاتا ہے۔

استاد :- ریل پر کس مقام سے سوار ہوتا ہے۔

شاگرد :- قلعہ ستار شاہ سے۔

استاد :- کیا وہاں ریل کھڑی ہوتی ہے؟

شاگرد :- جی ہاں وہاں اسٹیشن ہے۔

استاد :- تمہارے ضلع میں کتنے ریلوے اسٹیشن ہیں؟

شاگرد :- بہت سے

استاد :- کیا یہ ریلیں اور سڑکیں گاؤں والوں نے بنا رکھی ہیں؟

شاگرد :- نہیں جناب۔

استاد :- تو پھر کس نے بنائی ہیں؟

شاگرد :- جناب آپ بتا دیجیے، ہمیں تو معلوم نہیں۔

استاد :- ریلیں، اور سڑکیں ہماری سرکار نے لوگوں کے آرام کے لیے بنا رکھی ہیں۔ تاکہ اپنی فالتو چیزیں ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جاسکیں اور اپنے رشتہ داروں کو لاری یا ریل پہ سفر کر کے مل سکیں۔

اچھا بھئی حامد تم کتنے بھائی ہو؟

حامد :- ہم تین بھائی ہیں۔

استاد :- کیا وہ تم سے چھوٹے ہیں یا بڑے؟

حامد :- ایک مجھ سے چھوٹا ہے اور ایک مجھ سے بڑا۔

استاد :- تمہارا بڑا بھائی کیا کام کرتا ہے؟

حامد :- وہ گورنمنٹ ہائی سکول شرقپور میں جماعت نہم میں پڑھتا ہے۔

استاد :- کیا تمہارے ضلع میں اور سکول بھی ہیں۔

حامد :- ہاں جناب، بہت سے۔

استاد :- بے شک تمہارے ضلع میں بہت سے سکول ہیں جن میں کئی پرائمری، کئی مڈل اور کئی ہائی سکول بھی ہیں۔ جس طرح تم سکول میں تعلیم حاصل کرتے ہو۔ اسی طرح تمہارے ضلع بھر میں بہت سے سکول بچوں کی تعلیم کے لیے، دیہاتوں، بڑے بڑے قصبوں اور شہروں میں ہماری سرکار نے جاری کر رکھے ہیں۔ اچھا بھئی حمید کئی روز سے سکول میں نہیں آیا وہ کہاں چلا گیا ہے۔

شاگرد :- وہ بیمار ہے۔

استاد :- اب اس کا کیا حال ہے۔

شاگرد :- جناب اس کا بخار تو اتر گیا ہے، مگر کمزوری باقی ہے، ابھی چل پھر نہیں سکتا۔ اس کا باپ ہسپتال سے اسے دوائی لا کر دیتا ہے۔ امید ہے جلدی چلنے پھرنے لگ جائے گا۔

استاد :- ہسپتال تمہارے گاؤں میں تو نہیں ہے۔ اس کا باپ کہاں سے دوائی لاتا ہے؟

شاگرد :- ہمارے گاؤں سے دو میل کے فاصلہ پر ایک قصبہ شرقپور ہے وہاں سے لاتا ہے۔

استاد :- ہاں بھئی تم نے یہ ٹھیک کہا ہے۔ اسی طرح تمہارے ضلع میں مریضوں کے لیے بڑے بڑے قصبوں اور شہروں میں بہت سے سرکاری ہسپتال ہیں۔ جن میں مریضوں کی ہر قسم کی بیماری کا علاج کیا جاتا ہے۔ جو مریض بیماری میں زیادہ مبتلا ہو، یا کسی مہلک مرض میں مبتلا ہو۔ اس کو وہیں ہسپتال میں رکھا جاتا ہے اور اس کا علاج بڑی احتیاط سے کیا جاتا ہے، ڈاکٹر صاحب اس کی ہر وقت خود دیکھ بھال کرتے ہیں اور اسے ہر طرح آرام پہنچانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اچھا بھئی رشید بھی آج کلاس میں دکھائی نہیں دیتا۔ اس کے آج نہ آنے کی وجہ کسی کو معلوم ہے؟

شاگرد :- جناب کل چار بجے اس کے ماموں کی بیماری کا خط لاہور سے آیا تھا۔ وہ اپنے ماں باپ کے ساتھ اپنے ماموں کی بیمار پرسی کے لیے گیا ہے۔

استاد :- لاہور سے خط کیسے آیا؟

شاگرد :- جناب ڈاک خانہ سے چٹھی رساں لایا تھا۔

استاد :- ڈاک خانہ کہاں ہے؟

شاگرد :- شرقپور میں۔

استاد :- ہاں بھی اسی طرح تمہارے ضلع میں (دیہاتوں قصبوں اور شہروں میں) بہت سے ڈاکخانے ہیں۔

شاگرد :- جناب ڈاکخانے میں صرف خط ہی آتے ہیں۔ یا اس کے اور بھی کوئی فائدے ہیں؟

استاد :- ہاں اور بہت سے فائدے ہیں خطوں کے علاوہ۔ اخبارین۔ رسالے۔ کتابیں۔ اور کئی چیزوں کے پارسل۔ روپے۔ ایک جگہ سے دوسری جگہ تھوڑے سے خرچ پر پہنچائے اور منگائے جاتے ہیں۔ ہمارے ضلع کا سب سے بڑا ڈاکخانہ شیخوپورہ میں ہے۔ اسے ہیڈ آفس کہتے ہیں جس کے ماتحت کئی سب آفس اور ان کے ماتحت کئی برانچ آفس ہیں، جن کے ذریعہ ہر روز بے شمار چٹھیاں اور ہزار ہا روپے آتے اور جاتے رہتے ہیں۔ کئی سب آفسوں میں تار گھر بھی ہیں جن کے ذریعہ ایک جگہ سے دوسری جگہ فوراً خبر پہنچائی جاتی ہے۔ اس کے علاوہ ٹیلیفون بھی لگے ہیں جن کے ذریعہ بات چیت کی جاتی ہے۔

شاگرد :- جناب سرکار نے تو ہمارے آرام اور فائدوں کے لیے بہت سے انتظام کر رکھے ہیں۔

استاد :- ہاں بھئی سرکار پاکستان نے اس کے علاوہ اور بھی بہت سے انتظام کر رکھے ہیں۔ جن کا ابھی تمہیں پورا علم نہیں۔ اچھا بھئی وہ سامنے لوگوں کا اتنا بڑا ہجوم کیوں ہے۔ اور لوگ تیزی سے ادھر ادھر آجا رہے ہیں۔

شاگرد :- جناب آج رات ہمارے گاؤں میں ایک گھر میں چوری ہو گئی ہے تو یہ لوگ کھوج نکال رہے ہیں کہ تھانے میں رپورٹ کرا دی جائے۔ پھر پولیس آئے گی اور چور کا سراغ لگائے گی۔

استاد :- تھانہ کہاں ہے؟

شاگرد :- شرقپور میں۔

استاد :- ہاں تم نے ٹھیک کہا۔ شرقپور میں تھانہ ہے۔ جب یہ لوگ وہاں اطلاع دیں گے تو پولیس چوری کا سراغ نکالے گی اور چور کو سزا ملے گی۔ اگر ہماری سرکار نے تھانے نہ بنائے ہوتے تو لوگوں کو زندگی گذارنا مشکل ہو جاتا۔ یہ بدمعاش۔ چور اچکے اور ڈاکو لوگوں کو دن کو بھی آرام نہ لینے دیتے۔ اگر کہیں کوئی لڑائی جھگڑا ہو جائے اور گاؤں والوں سے نپٹ نہ سکے تو پولیس اس کا فیصلہ کرتی ہے۔ میلوں بھی

جاکر چوروں اچکوں سے لوگوں کو محفوظ رکھتی ہے۔ اسی طرح تمہارے ضلع میں بہت سے تھانے ہیں۔ جو اپنے ضلع بھر کے دیہاتوں اور لوگوں کی حفاظت کرتے ہیں۔

شاگرد :- جناب مجھے کل کی رخصت چاہیے۔

استاد :- رخصت کس لیے ؟

شاگرد :- جناب ہمارے گاؤں سے دو میل کے فاصلے پر شاہ نجاری کا میلہ ہے۔ وہاں جاؤں گا۔

استاد :- بہت اچھا۔ مگر کل کی رخصت کی درخواست بھیج دینا۔ اچھے لڑکے باا جازت جاتے ہیں۔ میلہ میں جاکر کیا کرو گے۔ وہاں جانے کا کیا مقصد ہے !

شاگرد :- کھیل تماشے دیکھوں گا۔ قریب ایک نہر ہے وہاں جاؤں گا اور اس میں نہاؤں گا اور تیرنے کی مشق کروں گا۔ میلے میں لگی ہوئی قسم قسم کی دوکانوں سے مٹھائی اور پھل وغیرہ خریدیں گے اور خوب مزے سے کھائیں گے۔

استاد :- مٹھائی اور پھل تو تم اپنے گھروں میں بھی کھاتے ہو، اور نہاتے بھی ہو۔ البتہ کھیل تماشے اپنے گھروں میں تو تم نہیں دیکھتے۔ البتہ یہی ایک چیز ہے جس کے لیے تم جا رہے ہو۔

شاگرد :- جی ہاں۔

استاد :- سنو بھئی وہاں میلہ میں تمہیں صرف کھانے پینے کی چیزوں کے لیے ہی نہیں جانا چاہیے۔ بلکہ وہاں جاکر اپنی علمی واقفیت میں اضافہ کرنا چاہیے۔ مثلاً :- میلہ میں کیا کیا چیزیں آئی ہیں۔ اور کہاں کہاں سے آئی ہیں کھیل تماشے کس قسم کے ہیں۔ مثلاً تاریخی کھیل ہے یا کسی کھیل میں کوئی سائنسی کرشمہ دکھایا جاتا ہے۔ سرکس میں جانور کس قسم کے ہیں۔ وہاں میلہ ہونے کی وجوہ کیا ہیں۔ ہاں تو اور بھی کسی جگہ میلہ ہوتا ہے۔

شاگرد :- جی ہاں بہت سی جگہوں پر ہوتا ہے۔

استاد :- کہاں کہاں ؟

شاگرد :- شاہ کوٹ۔ موضع سکھانوالی۔ شاہ نجاری وغیرہ

استاد :- ہاں واقعی تمہارے ضلعے میں بہت سے میلے اور عرس ہوتے ہیں، جو کسی نہ کسی کی یادگار میں منائے جاتے ہیں

مثلاً نتح ریحان اور شیخوپورہ میں بیر بہار شاہ کی یاد میں۔ خانہ کوٹ میں عرس شاہ ابوالخیری لولکھ جوہڑکا
شرقپور میں مولوی شیر محمد صاحب کا عرس وغیرہ۔ اچھا یہ تو بتاؤ کہ آج سعید کیوں نہیں آیا؟

شاگرد :- جناب آج وہ اپنے باپ کے ساتھ چوہڑکانہ منڈی میں گندم فروخت کرنے کے لیے گیا ہے۔

استاد :- منڈی کسے کہتے ہیں

شاگرد :- جہاں بہت سی چیزیں ہوں۔

استاد :- نہیں منڈی اسے کہتے ہیں، جہاں فروخت کرنے والی چیز کو زیادہ مقدار میں لاکر رکھا جائے۔ اور وہاں سے خریدار اپنی ضرورت کے مطابق جنس خرید کر اپنے گھروں میں لے جائیں۔ منڈیاں کس قسم کی ہوتی ہیں۔

شاگرد ۱ :- غلہ منڈی

" ۲ :- مال منڈی

" ۳ :- سبزی اور میوہ منڈی وغیرہ

استاد :- تمہارے ضلع میں مال منڈی تو صرف سال بھر میں ایک ہی جگہ ایک دفعہ لگتی ہے۔ مگر تجارتی (غلہ) منڈیاں بہت سی جگہوں پر ہیں۔ اور سبزی منڈی یا میوہ منڈیاں بڑے بڑے قصبوں یا شہروں میں ہوتی ہیں۔ اچھا بھئی یہ تو بتاؤ کہ تمہاری غلہ منڈیوں سے کچھ غلہ دوسرے شہروں یا ملکوں میں بھی بھیجا جاتا ہے؟

:- جی ہاں۔ گیہوں۔ چاول۔ کپاس۔ روئی۔ کھالیں۔ تیل نکالنے والے بیج وغیرہ باہر بھیجے جاتے ہیں۔

:- ایسی چیزیں جو باہر بھیجی جائیں انہیں اشیائے برآمد کہتے ہیں۔ اچھا بھئی یہ تو بتاؤ کہ گندم کا آٹا کس طرح تیار کیا جاتا ہے۔

گندم کو چکی میں پیس کر آٹا تیار کیا جاتا ہے۔

:- ٹھیک ہے۔ لیکن تم جانتے ہو کہ یہ چکیاں کس طرح چلائی جاتی ہیں۔ سنو! ایک چکیاں تیل سے چلنے والے انجن چلاتے ہیں اور دوسری پن چکیاں ہیں جو پانی سے چلتی ہیں۔ اچھا یہ بتاؤ کہ یہ کپڑے جو تم نے پہن رکھے ہیں کس طرح تیار ہوتے ہیں۔ اور پیتل تانبے کے برتن جو تمہارے گھر میں

روزمرہ استعمال ہوتے ہیں کہاں بنتے ہیں۔

:- کارخانوں میں

:- کارخانوں میں کس چیز سے بنتے ہیں۔

:- لوہے کی مشینوں سے۔

:- یہ مشینیں کہاں سے آتی ہیں۔

:- جناب ہم نے اپنے کارخانے کا انجن تھوڑے دن ہوئے پاکستان سے باہر دوسرے ملک سے منگوایا ہے۔
ہاں ٹھیک ہے۔ ایسی اشیا جو دوسرے ملکوں سے اپنے ملک میں آتی ہوں ان کو اشیائے درآمد کہتے ہیں مثلاً
شیشے اور چینی کا سامان۔ مشینیں۔ چمڑے کا سامان اور انجن وغیرہ

ایسے طریقے سے بچوں کو جغرافیہ پڑھانے میں بہت آسانی رہتی ہے۔ بچوں کو جغرافیہ یاد بھی ہو جاتا ہے اور کوئی مشکل بھی پیش نہیں آتی جس سے وہ گھبرا جائیں۔ اور تمام جغرافیہ بہت تھوڑے وقت میں ختم ہو جاتا ہے جس میں ذرائع آمد و رفت، کچی پکی سڑکیں، ریلوے لائن، سکول، ہسپتال، ڈاک خانہ جات، تھانے، میلے اور عرس، منڈیاں، اشیائے برآمد اور درآمد کے اسباق نہایت آسانی سے پڑھے جا سکتے ہیں۔

اسی طرح ضلع بھر کے مشہور قصبے ریلیں تحصیلیں وغیرہ کے اسباق بچوں کے ذہن نشین کرائے جا سکتے ہیں۔

ایسے طریقے سے کام کرانے کا مجھے ایک واقعہ یاد ہے کہ جماعت سوم راقم کے زیر تعلیم تھی تو سالانہ معائنہ کے وقت اے۔ ڈی۔ آئی صاحب نے جغرافیائی تعلیم جانچنے کے لیے جماعت سے ایک لڑکے کو کھڑا کر کے سوال کیا کہ "تم کہاں کھڑے ہو"۔ تو اس لڑکے نے فوراً کہہ دیا کہ جناب میں ایم۔ بی پرائمری سکول کمرہ ع۲ جماعت سوم تحصیل بٹالہ ضلع گورداسپور میں کھڑا ہوں۔ اس جواب سے اے۔ ڈی۔ آئی صاحب بہت خوش ہوئے۔

جغرافیہ کی تعلیم دیتے وقت نقشہ جات کا استعمال نہایت ضروری ہے۔ تاکہ استاد بچوں کو مشہور قصبے تحصیلیں۔ ریلوے لائن اور اسٹیشن۔ کچی پکی سڑکیں۔ دریا۔ ندی۔ نالے، ان کے علاوہ اور جو کچھ بچوں کو نقشہ پر دکھانا چاہیے دکھا سکے، اور بچے مقامات کو اچھی طرح ذہن نشین کر سکیں۔

مدارس کی تعلیم کا معیار کیسے بلند ہو سکتا ہے؟

ملک فلک شیر خان صاحب نے یہ مقالہ ڈویژنل تعلیمی کانفرنس بہاولپور میں پڑھا تھا۔ ملک صاحب ضلع مظفر گڑھ کے ڈسٹرکٹ انسپکٹر مدارس ہیں، اور اس مقالے میں انہوں نے اپنے ذاتی تجربات بیان کیے ہیں مکتبہ بیت المعلمین بہاولپور اس مقالے کو ایک کتابچے کی صورت میں شائع کر چکا ہے۔ ——————— (نائب مدیر)

اس امر پر سب اتفاق کرتے ہیں کہ تقسیم برصغیر کے بعد تعلیمی معیار بہت پست ہو گیا ہے۔ اس پستی معیار کی کئی وجوہ ہیں قبل از تقسیم انگریزوں اور غیر مسلموں کا غلبہ تھا۔ ان کے کام کا معیار بلند تھا۔ علاوہ ازیں مسلمان ہندو افسر سے اور کسی حد تک ہندو مسلمان افسر سے ڈرتا تھا مسلم اور غیر مسلم اداروں میں صحت مند تقابل کا جذبہ بھی کارفرما تھا۔ کام کافی محنت سے ہوتا تھا، کیونکہ من حیث القوم ہندو زیادہ محنتی تھے، ان کی دیکھا دیکھی اور کچھ غیر مسلم افسران کے ڈر سے مسلم اساتذہ زیادہ کام کرتے تھے۔ علاوہ بریں یہ امر قابل ذکر ہے کہ حصول آزادی کے بعد معاشرے کی اخلاقی حالت میں نمایاں پستی واقع ہوئی اور عوامی زندگی کے جملہ شعبہ جات میں کارکردگی کا معیار بتدریج روبہ انحطاط ہوتا چلا گیا، اور اس سے محکمہ تعلیم بھی مستثنیٰ نہیں رہا۔ ان حالات کے بدل جانے کی وجہ سے تعلیمی معیار پر بُرا اثر پڑا، اور معیار روز بروز پست ہوتا چلا گیا۔ جاں فشانی کی جگہ تساہل نے لے لی۔ اس حقیقت سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ آجکل مڈل، میٹرک، ایف۔اے یا بی۔اے بلحاظ قابلیت تقسیم سے پہلے کے مڈل، میٹرک، ایف۔اے، اور بی اے کا ہم پلہ نہیں ہے، اور یہ بھی درست ہے کہ مختلف امتحانات کے نتائج سال بسال خراب تر ہوتے جا رہے ہیں۔ امسال مڈل کا نتیجہ ۵۲ فیصد میٹرک کا ۴۵ الف اے کا ۲۵ فیصد سے کم اور بی اے کا ۲۶ فی صد سے بھی کم رہا۔ طلبہ اور تعلیم کی یہ پستی نہایت تشویشناک اور اہم قومی مسئلہ ہے، ہم سب کو بالخصوص محکمہ تعلیم کے افراد کو نہایت سنجیدگی سے اس کا حل سوچنا چاہیے۔ مجھے اس ضمن میں اپنی کم مائگی کا اعتراف ہے۔ تاہم اس بارے میں اپنے خیالات کے اظہار کرنے کی جسارت کرتا ہوں۔ میرے خیال میں اگر مندرجہ ذیل تجاویز پر عمل کیا جائے تو تعلیمی معیار کے بلند ہونے کی کافی توقع ہو سکتی ہے۔

۱۔ معلمی کے پیشہ میں جاذبیت پیدا کرنا۔

معلمی کے پیشہ میں کشش اور جاذبیت پیدا کرنے کے لیے تنخواہوں کے بہتر سکیل مقرر کیے جائیں۔ تاکہ اہل علم یہ پیشہ اختیار کر کے معیار تعلیم کو بلند کرنے میں ممد اور معاون ثابت ہوں اور اپنے فرائض منصبی کو باطمینان سرانجام دیں ورنہ اساتذہ اپنا بیشتر وقت ٹیوشن کرنے اور ناشرین کے لیے کتابیں لکھنے میں صرف کرتے رہیں گے۔ یا مقابلہ کے امتحان میں قسمت آزمائی کے لیے پرائیویٹ امتحانوں کی تیاری میں معروف رہیں گے۔ ضروری ہے کہ اساتذہ کی ضروریات زندگی کی فراہمی میں ہر قسم کی سہولتیں بہم پہنچائی جائیں خصوصاً محکمہ تعلیم سے متعلق افراد کے بچوں کے لیے بلاامتیاز تنخواہ وعہدہ مفت تعلیم کا انتظام کیا جائے۔ جیسا کہ دوسرے محکمہ جات اپنے ملازمین کو عام رعایات سے محروم نہیں کرتے۔ مثلاً محکمہ انہار وریلوے بلاامتیاز تنخواہ وعہدہ اپنے ملازمین کو مراعات دے رہے ہیں۔

روس کے سولہ لاکھ اساتذہ میں سے ایک لاکھ اساتذہ کو نہایت عمدہ کام کرنے کے عوض امتیازی بلے اور انعامات دیے جاتے ہیں اور دیگر مراعات سے بھی نوازا جاتا ہے۔ مثلاً مکان بنانے کے لیے مفت زمین اور عمارتی سامان دیا جاتا ہے۔ باغیچہ، سبزی اور مویشیوں کی چراگاہ کے لیے گورنمنٹ انھیں مفت زمین دیتی ہے پچیس سال کے بعد انھیں پنشن ملتی ہے۔ اگر اس عرصہ کے بعد بھی کام کرنا چاہیں تو انھیں پنشن کے علاوہ پوری تنخواہ دی جاتی ہے جو انجینیروں اور فنی ماہرین کی تنخواہ کے برابر ہوتی ہے۔ اس کے مقابلہ میں ہمارے ہاں ہزاروں میں سے کوئی ایک آدھ افسر پچیس تیس سال کی ملازمت کے بعد ایک انجینیر اور فنی ماہر کی تنخواہ اور گریڈ تک پہنچتا ہے اس سلسلہ میں ہمیں جاپان، چین، روس اور ترکی ایسے ممالک کے تجربات سے فائدہ اٹھانا چاہیے جن کے حالات ہمارے ملک کے حالات سے زیادہ مطابقت رکھتے ہیں۔

۲۔ مقررہ وقت پر تنخواہوں کی برآمدگی۔

ایسے انتظامات کیے جائیں کہ ہر ایک درس گاہ کے معلم کو مقررہ تاریخ پر تنخواہ مل جائے۔ اگر ڈسٹرکٹ انسپکٹر اسسٹنٹ ڈسٹرکٹ انسپکٹر، ہیڈ ماسٹر صاحبان اور متعلقہ برانچ کے اہل کار زرہ زیادہ توجہ اور محنت سے کام لیں تو تنخواہوں کی برآمدگی بروقت ہوسکتی ہے۔ میرے ضلع میں گذشتہ بارہ ماہ میں پانچ چھ ماہ کی تنخواہ اساتذہ کو ہر ماہ کی دو، چار تاریخ تک ملتی رہی ہے۔ صرف ان مہینوں میں تنخواہ کی بروقت برآمدگی نہیں ہوسکی، جب کہ ڈسٹرکٹ بورڈ

کے خزانے میں رقم نہیں تھی۔ اگر گورنمنٹ کی طرف سے تمام سال کی گرانٹ ایک ہی قسط میں یک مشت ادا کی جائے تو تنخواہوں کی بروقت ادائیگی میں آسانی رہے گی، اس ضمن میں یہ نہایت ضروری ہے کہ بورڈ تعلیمی اخراجات کا اپنا حصہ ماہ بہ ماہ دیتا رہے، اور سرکاری گرانٹ کو دوسری مدوں پر خرچ نہ کرے۔

۳- تدریسی اوقاتِ کار میں تخفیف

استادوں کے کام کو ہلکا کیا جائے۔ ہر استاد کے پیریڈ بجائے تیس چھتیس، چوبیس۔ اٹھائیس ہونے چاہئیں زبان دانی اور سائنس کے اساتذہ کے پیریڈ تو کسی صورت میں چوبیس سے زیادہ نہیں ہونے چاہئیں۔ روس میں پرائمری درجہ کے ایک استاد کو پینتالیس منٹ کے صرف تین پیریڈ یعنی سوا دو گھنٹے تعلیم دینی پڑتی ہے، اس کے مقابلہ میں ہمارے ملک کے استاد کو دوگنا سے زیادہ وقت دینا پڑتا ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ اصول تعلیم کے مطابق درس نہیں دے سکتا۔ کام کی زیادتی کی وجہ سے تحریری کام بھی صحیح طریقہ سے نہیں کرایا جا سکتا۔ نہ ہی ایک تھکا ماندہ استاد تحریری کام کی درستی بطریقِ احسن کر سکتا ہے۔ اور نہ ہی دن میں تقریباً چھ گھنٹے کی دماغ سوزی کے بعد وہ اس قابل رہتا ہے کہ سکول کی اہم تحریکات وماورائے نصابی مشاغل (جو بچوں کی صحیح نشوونما اور تربیت کے لیے ضروری ہیں) کو تسلی بخش طریقہ پر سرانجام دے سکے اور ذاتی مطالعہ بھی جاری رکھ سکے۔

۴- استادوں کے کام کا سالانہ اندراج

سابقہ دستور کے مطابق ہر ہائی اور مڈل سکول کا خواہ گورنمنٹ کا ہو یا کسی اور ادارے کا۔ سالانہ معائنہ باقاعدہ ہونا چاہیے۔ اور اساتذہ کے کام کا اندراج بھی ضروری ہونا چاہیے۔ اندراج میں ہیڈ ماسٹر کی رائے کو زیادہ وقعت دی جائے، اس لیے کہ اس نے استاد کا کام سال بھر دیکھا ہے، وہ استاد کی عمومی صلاحیتوں سے آگاہ ہوتا ہے۔ سابقہ پنجاب کے گورنمنٹ سکولوں میں کام کے اندراج کے اڑ جانے کی وجہ سے کام پر برا اثر پڑتا ہے، جب یہ دستور رائج تھا تو قابلِ قدر اندراج حاصل کرنے کے لیے بہت سے اساتذہ کوشاں رہتے تھے۔ کام کی داد حاصل کرنا فطری تقاضہ ہے

۵- سندات کارکردگی: متواتر کئی سال کام کرنے والے استادوں کی حوصلہ افزائی سندات کارکردگی ونقد انعامات کے ذریعہ کرنا چاہیے۔ جس طرح دیگر ممالک میں اساتذہ کی حوصلہ افزائی کی جاتی ہے۔

۶۔ نااہل اور سہل انگار اساتذہ کو تنبیہ

جن اساتذہ کا کام تسلی بخش نہ ہو، انھیں مناسب تنبیہ ہونی چاہیے۔ مثلاً استاد کی ترقی اس سال کے لیے روک دینی چاہیے جس سال اس کا کام غیر تسلی بخش ہو جس استاد کا متواتر دو سال کا کام غیر تسلی بخش رہے اس کی دوسرے سال کی ترقی بھی روک دی جائے۔ جس کا کام متواتر تین سال تک غیر تسلی بخش رہے، اسے ابتدائی گریڈ پر لگا دیا جائے جس کا کام متواتر چار سال تک غیر تسلی بخش رہے اسے ملازمت سے علیحدہ کر دیا جائے۔ البتہ افسران معائنہ کو کام لکھتے وقت تمام حالات کا پورے طور پر جائزہ لینا چاہیے۔ ساتھ ہی اساتذہ کی تکلیف کو پیش نظر رکھنا بھی ضروری ہے۔

۷۔ ہر مضمون کے لیے مخصوص اساتذہ کا طریقہ

SUBJECT TEACHER SYSTEM رائج کیا جائے۔ جو استاد چھٹی میں ایک مضمون پڑھاتا ہے وہی آٹھویں تک پڑھائے۔ اس طرح تین سال تک اس کی ذمہ داری قائم رہے گی۔ اس طریقہ کار کا فائدہ یہ ہوگا کہ استاد بالعموم وہی مضمون پڑھائے گا جس پر وہ پورے طور پر حاوی ہوگا۔ اس کے برعکس کلاس ٹیچر سسٹم میں اس کو چند ایسے مضامین بھی پڑھانے پڑتے ہیں جن پر اس کو پورا عبور نہیں ہوتا۔ اس صورت میں ذمہ داری بھی اس پر صرف ایک سال کی ہوگی۔ مگر یہ طریق کار جب مفید ہو سکتا ہے کہ ٹریننگ سکولوں میں اساتذہ کو خاص خاص مضامین پڑھانے کی تربیت دی جائے ورنہ ہو سکتا ہے کہ ایک استاد جو چھٹی جماعت کو ایک مضمون صحیح معیار تک پڑھا سکتا ہے وہ آٹھویں جماعت کو تسلی بخش حد تک نہ پڑھا سکے۔

۸۔ تربیتی اداروں میں امیدواروں کا داخلہ

داخلہ کے وقت اس امر کا خیال رکھا جائے کہ امیدوار ادبی مذاق کا حامل ہو۔ انتخاب کے وقت امیدوار کی شخصیت، اس کے خاندان کی تعلیمی خدمات۔ علاقہ کی پس ماندگی، امیدوار کا طرز گفتگو، نشست و برخاست غرضیکہ تمام امور کو پیش نظر رکھا جائے۔ ان تمام امور کے الگ الگ نمبر ہونے چاہئیں۔ لنگڑے، کانے اور دوسری قسم کے جسمانی نقائص والے امیدوار کو ہرگز نہ لینا چاہیے۔ تعداد وظائف زیادہ ہونی چاہیے، اور وظیفہ کی رقم میں اضافہ بھی ضروری ہے۔ یہ وظائف امتحان اور انٹرویو کے نتیجہ کی بنا پر قابلیت کے پیش نظر حسب گنجائش ۷۰ یا ۷۵ فی صد طلبہ کو دیے جائیں۔ جے وی کے داخلہ کے لیے امیدواران مڈل سکول امتحان فرسٹ ڈویژن اور میٹرک پاس ہونے کی صورت میں

کم از کم سیکنڈ ڈویژن ہوں، اور سرکاری مضامین میں اُردو ضرور لیا ہو۔ ایک اوسط درجے کے مڈل پاس سے یہ توقع کرنا کہ وہ ایک دو سال ٹریننگ اور چند سالہ تعلیمی تجربہ کے بعد مڈل کی جماعتوں کو موثر انداز میں تعلیم دے سکے گا، عبث ہے۔ ایس۔وی کے امیدوار کو کم از کم میٹرک فرسٹ ڈویژن ہونا چاہیے۔ یا وہ استاد ہو جس نے مڈل یا جے وی کا امتحان فرسٹ ڈویژن میں پاس کیا ہو اور جس کا گذشتہ سہ سالہ کام قابل تعریف رہا ہو۔ یہ زیادہ بہتر ہوگا کہ جے وی کے امیدوار کے لیے کم از کم تعلیم کی شرط بجائے مڈل پاس، میٹرک پاس ہونے کی ہو۔

۹۔ سنگل ٹیچر سکول کا خاتمہ

ایک استاد پانچ جماعتوں کے تمام مضامین کی کما حقہٗ تعلیم نہیں دے سکتا خواہ طلبہ کی تعداد کم ہی کیوں نہ ہو اگر یہ سسٹم بحالت مجبوری کچھ وقت کے لیے رکھنا تا گزیر ہو تو سنگل ٹیچر سکول کی تعداد طلبہ بیس سے زائد نہ ہونی چاہیے۔

۱۰۔ ابتدائی تعلیم کی اصلاح

پرائمری سکول ہی ہمارے نظامِ تعلیم کی بنیاد ہیں۔ اس لیے ان کی اصلاح کی طرف خاص توجہ کی ضرورت ہے مضامین کی تعداد میں اضافہ کی وجہ سے طالب علم اور استاد دونوں پر کافی بوجھ آن پڑا ہے۔ اگر مضامین کم نہیں کیے جا سکتے تو نصاب ضرور ہلکا ہونا چاہیے۔ خاص طور پر پرائمری میں مضامین کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ پرائمری سکول کے معائنے سال میں کم از کم دو مرتبہ باقاعدگی کے ساتھ ہوں۔ پرائمری سکول کا اول مدرس بالعموم اپنی ذمہ داری محسوس نہیں کرتا خصوصًا ایسے پرائمری سکول میں جہاں اساتذہ دو یا تین ہوں۔ نیز معائنہ کے دوران میں کام کی پڑتال بڑی احتیاط سے ہونی چاہیے۔ افسران معائنہ ایمانداری سے تعلیم کے بنیادی نقائص معلوم کر کے اصلاح کے لیے مفید مشورہ دیں۔

۱۱۔ جماعت پنجم کے سنٹر امتحان کی اصلاح

جماعت پنجم کے سنٹر کے امتحان کا سسٹم اصلاح طلب ہے۔ ضلع کے سکیل پر سنٹر کے امتحانات مختلف جگہوں پر مختلف تاریخوں میں ہونا چاہئیں۔ پرچہ جات چھپے ہوئے ہوں اور دوسرے مدارس کے اساتذہ کی امداد سے ڈی۔آئی۔ یا اے۔ڈی۔آئی صاحبان امتحان لیں۔

۱۲۔ مڈل سکول امتحان محکمانہ ہو۔

ہائی مدارس اور مڈل سکول خواہ اے وی ہوں یا دیگر اقسام کے۔ سب کے لیے مڈل سکول کا محکمانہ امتحان لازمی

قرار دیا جائے۔ اس کے تین فائدے ہوں گے

(ا) اساتذہ اور طلبہ زیادہ محنت سے کام کریں گے۔ جیسا کہ میٹرک کے اساتذہ اور طلبہ زیادہ کام کرتے ہیں۔ طلبا شوق اور محنت سے پڑھیں گے۔ کیوں کہ انھیں علم ہوگا کہ وہ سفارش سے پاس نہیں ہو سکیں گے۔

(ب) ہیڈ ماسٹر صاحبان مقامی ذی اثر لوگوں کی سفارشات سے بچ جائیں گے۔

(ج) میٹرک کا نتیجہ خود بخود اچھا ہو جائے گا۔ بعض ہیڈ ماسٹر صاحبان اس تجویز کی اس لیے مخالفت کرتے ہیں کہ ان کے اختیارات میں فرق پڑتا ہے۔ مگر قومی مفاد کے پیش نظر اس قسم کے اختیارات کی قربانی دینا ہی ہیڈ ماسٹر صاحبان کے شایان شان ہے۔ بعض اصحاب شاف کی کمی وجہ سے ان کی مخالفت کرتے ہیں۔ مگر اس کے جواب میں کہا جا سکتا ہے کہ میٹرک کے امتحان میں بھی باوجود شاف کم ہونے کے طلبہ بھیجے جاتے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ اس تجویز کو عملی جامہ پہنانے کی صورت میں بعض مدارس کے نتائج ایک دو سال تک خراب رہیں گے۔ لیکن اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ عوام، اساتذہ اور محکمہ کے ارباب اختیار کو اس مسئلہ کی نزاکت کا زیادہ سے زیادہ احساس ہوگا اور شاف کی کمی کو پورا کرنے کی ہر ممکن کوشش کی جائے گی۔ دو تین سال کے بعد نتائج اچھے ہو جائیں گے۔

۱۳۔ تعلیمی خرچ میں کمی

موجودہ حالات میں ایک عام آدمی کو ہائی سکول میں تعلیم پر صرف کتابوں اور فیسوں کے سلسلے میں اتنا خرچ کرنا پڑتا ہے، جو پاکستان کا غریب اور متوسط درجہ کا آدمی برداشت نہیں کر سکتا۔ ایک پاکستانی کی اوسطاً ماہوار آمدنی سوا انیس روپے ہے۔ اس لیے غریب عوام کی بھاری اکثریت ہائی سکول کی تعلیم سے مستفید نہیں ہو سکتی، اور کالج کی تعلیم کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ لہٰذا ضروری ہے کہ مڈل تک تعلیم بالکل مفت ہو، جیسا کہ سابق صوبہ سرحد اور سابق ریاست بہاولپور میں دستور تھا، اور ہائی سکول میں بھی فیس بالکل معمولی ہو۔ بلکہ غریب طلبہ کو کتابیں بھی گورنمنٹ مہیا کرے۔

۱۴۔ کلاس ٹیسٹ و امتحانات:۔ ہر جماعت کا آزمائشی امتحان ہر دو ماہ بعد لیا جائے اور اس کا باقاعدہ ریکارڈ رکھا جائے۔ سال میں دو بار باقاعدہ امتحانات لیے جائیں، اور ان کے نتائج سے بچوں کے والدین کو آگاہ

کیا جائے۔ اس قسم کی رفتار ترقی کی رپورٹوں سے خاطر خواہ نتائج برآمد ہوتے ہیں۔ سالانہ امتحان کے وقت آزمائشی امتحان کا ریکارڈ پیش نظر رکھا جائے۔

۱۵۔ اصلاح امتحانات | موجودہ نظام امتحانات بھی فوری اصلاح کا محتاج ہے۔ نگرانی کا موجودہ تصور جو بے اعتمادی پر مبنی ہے۔ بنیادی طور پر بچوں اور اساتذہ کی شخصیت کے ارتقا کے منافی ہے۔

۱۶۔ پرچہ جات | پرچے ایسے بنائے جائیں جن سے طلبہ کی عام قابلیت جانچی جا سکے، اور رٹ بازی کی حوصلہ افزائی نہ ہو سستی اور گھٹیا قسم کی کتابیں۔ نام نہاد ماڈل ٹیسٹ پیپرز۔ خلاصے اور دیگر گھٹیا قسم کی امدادی کتب کی اشاعت قانوناً بند کر دینی چاہیے۔

۱۷۔ جلسہ تقسیم انعامات اور یوم والدین | طلبہ کے والدین کو ادارہ کی سرگرمیوں کے مشاہدہ کا موقع بہم پہنچانے کے لیے ضروری ہے کہ ہر سال جلسہ تقسیم انعامات اور یوم والدین منعقد کیا جائے۔ اس سے وہ اندازہ لگا سکیں گے کہ ان کے بچوں کی ذہنی صلاحیتوں کو اجاگر کرنے کے لیے کون کون سے ذرائع اختیار کیے جا رہے ہیں۔ مزید برآں اس سے طلبہ کی حوصلہ افزائی بھی ہو گی۔ کمزور طلبہ کے والدین کو مدرسہ میں وقتاً فوقتاً بلا کر بچوں کے حالات سے باخبر کیا جائے۔ پڑھے لکھے والدین کو بچوں کی تعلیم میں دلچسپی لینی چاہیے۔ اس ضمن میں ہمارے ہاں اَن پڑھ اور پڑھے لکھے والدین کا ایک ہی حال ہے۔

۱۸۔ مدارس کی درجہ بندی | سکولوں کی درجہ بندی۔ اے بی سی۔ وغیرہ ان کے تعلیمی کام۔ محکمانہ اور یونیورسٹی نتائج۔ کھیلوں میں کامیابی اور دیگر تحریکات کی بنا پر ہونی چاہیے۔ اس میں تعداد طلبہ یا عمارت ادارہ کو زیادہ اہمیت نہیں دینی چاہیے۔ اکثر جگہ تعداد خود بخود بڑھ رہی ہے اور عمارت سرکاری ہوتی ہے۔

۱۹۔ اے کلاس سکولوں کی حوصلہ افزائی | ایسے سکولوں کی حوصلہ افزائی سپیشل گرانٹیں دے کر اور اساتذہ اور طلبہ کو سندات و نقد انعامات دے کر کرنی چاہیے۔

۲۰۔ زائد مطالعہ | زائد مطالعہ اخبار بینی وغیرہ کو سکول ٹائم ٹیبل کا ایک جزو لازمی قرار دیا جائے۔ موجودہ سکول ٹائم ٹیبل میں اس کے لیے نصف گھنٹہ مخصوص کیا جائے۔ یہ وقت اس طرح نکالا جا سکتا ہے کہ پندرہ منٹ تعلیمی اوقات سے کم کیے جائیں اور پندرہ منٹ زائد وقت دیا جائے۔ یہ ہفتہ میں دو بار ہونا چاہیے۔

۲۱۔ صبح کی دعا اور تقریری پروگرام | صبح کی دعا تمام قسم کے مدارس میں باقاعدہ ہونی چاہیے۔ بعض مدارس میں دعا بالکل نہیں کرائی جاتی۔ ضبط مدرسہ کی اصلاح اس کے بغیر مشکل ہے۔ دعا کے بعد حاضری موقعہ پر فوراً درج کر دینی چاہیے۔ تاکہ بچے وقت پر آنے کے پابند ہوں۔ دعا کے بعد ہفتہ میں کم از کم دو دفعہ باقاعدگی کے ساتھ بچوں کی صفائی کی پڑتال کی جائے۔

۲۲۔ گروپ سسٹم | مختلف جماعتوں کو مختلف گروپوں میں تقسیم کیا جائے۔ گروپوں کے نام مشاہیر اسلام اور ممتاز تاریخی شخصیتوں کے نام پر رکھے جائیں۔ ہر گروپ اپنا سکرٹری اور نائب سکرٹری خود منتخب کرے۔ ہر ایک کے لیے علیحدہ علیحدہ نشستیں مقرر ہوں۔ اس کا صدر طلبہ میں سے کوئی ایک ہو جو سینیر استاد کی نگرانی میں گروپ کی رہنمائی سرانجام دے۔ سکول کی تقریباً تمام تحریکات از قسم بزم ادب۔ قلمی میگزین۔ تقریری مقابلے۔ خوش خطی کے مقابلے۔ انٹرگروپ ٹورنامنٹ۔ ماس ڈرل۔ مارچنگ۔ باغیچہ وغیرہ اس گروپ سسٹم کے مطابق چلائی جائیں۔ اس تنظیم کا بڑا فائدہ یہ ہے کہ ایک ہی وقت میں طلبہ کی زیادہ سے زیادہ تعداد مختلف تحریکات میں حصہ لے سکتی ہے۔ علاوہ ازیں صحت مند تقابل کے خوش گوار جذبہ کی نہ صرف تخلیق ہوتی ہے بلکہ چھوٹی اور بڑی جماعت کے طلبہ کے ایک جگہ بیٹھنے۔ مجوزہ مقصد کے حصول کے لیے سوچنے اور پھر عملی جامہ پہنانے سے طبقاتی تفریق مٹ جاتی ہے۔ میں نے بحیثیت ہیڈ ماسٹر ہائی مدارس تقریباً سات سال تک اس سسٹم کو سکول کے لیے بہت مفید پایا ہے۔

۲۳۔ نظم و نسق کی اصلاح | صفائی۔ حاضری تعلیم۔ چارٹس وغیرہ کے مقابلے کرائے جائیں۔ اور ان کی شیلڈیں جاری کی جائیں۔ کلاس مانیٹر اور ڈرل مانیٹر کا تقرر کرنا ضروری ہے۔ پاس سسٹم رائج کیا جائے ضبط شکن اور شرارت پسند عناصر کی اصلاح کے لیے کنڈکٹ رجسٹر کھولا جائے۔ سکول کے بچوں کے لیے ایک وردی کا ہونا بھی ضبط پر اچھا اثر رکھتا ہے۔

(باقی آئندہ)

مفید معلوماتِ عامہ

یونیسکو کے نئے پروگرام کا اعلان

اقوامِ متحدہ کے تعلیمی، سائنسی اور ثقافتی ادارے (یونیسکو) کے ڈائرکٹر جنرل ڈاکٹر لیوتھر ایونز نے ان تجاویز کا اعلان کیا ہے جن پر یونیسکو اپنے سنہ ۶۰-۱۹۵۹ء کے پروگرام میں خاص توجہ دے رہا ہے۔ تجاویز میں تین باتیں شامل ہیں (۱) جہالت کا قلع قمع (۲) صحرائی زمینوں کی بازیابی کے لیے سائنسی تحقیقات اور (۳) مشرق و مغرب میں ثقافتی مفاہمت۔ یہ اعلان ایک پریس کانفرنس میں کیا گیا جو واشنگٹن میں منعقد ہوئی تھی۔

پروگرام کا مسودہ اور میزانیہ کی ایک نقل یونیسکو کے ۷۹ اراکین کو برائے غور و خوض بھیجی جائے گی اور نظرثانی کے بعد دوسرا مسودہ ادارے کی جنرل کانفرنس میں پیش ہوگا جو اگلے سال نومبر میں ہو گی۔

ڈاکٹر ایونز نے اپنے اعلان میں بتایا کہ دو سال کے لیے یونیسکو کا کل بجٹ دو کروڑ ۲۴ لاکھ ڈالر سے کچھ زیادہ ہے۔ اس میں سے ۳۰ لاکھ ڈالر کی رقم مذکورہ بالا تین بڑے منصوبوں کے لیے مخصوص کی گئی ہے۔ سنہ ۵۸-۱۹۵۷ء کے بجٹ میں اسی مقصد کے لیے جتنی رقم محسوب کی گئی تھی اس میں تین لاکھ ۸۰ ہزار ڈالر کا اضافہ ہوا ہے۔ اور سارے بجٹ میں ۱۴ لاکھ ڈالر کا اضافہ ہے۔ تین بڑے منصوبوں کی تفصیل یہ ہے

(۱) جنوبی امریکہ کے ساتھ تعاون تاکہ سنہ ۱۹۶۷ء تک تعلیم کے لائق ہر بچہ مدرسے میں داخل ہو سکے

جنوبی امریکہ میں جہالت کو دور کرنے کے مسائل بہت دشوار ہیں۔ مدرسوں کی تعداد میں اضافے کی کوششیں کی جا رہی ہیں، لیکن وہ بڑھتی ہوئی آبادی کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ یونیسکو نے دو لحاظ سے مدد کی ہے اول استادوں کی تربیت کے مرکز قائم کرنے میں امداد دی ہے اور دوسرے فنی ماہرین بھیجے ہیں جو فروغِ تعلیم کی مہموں میں حکومتوں کے ساتھ تعاون کر رہے ہیں۔

(۲) خشک بنجر اراضی پر تحقیقاتی کام۔ دنیا میں خشکی کا ایک چوتھائی حصہ بنجر ہے جس کے باعث

۷۰ ملکوں کے باشندوں کو مشکلات کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ چناں چہ بہت سے سائنسدان یونیسکو کے تعاون سے یہ معلوم کرنے کی کوشش کر رہے ہیں کہ مشرق وسطی میں ۱۸ ہزار میل کے ساحلی صحرا کو کس طرح درست کیا جائے تاکہ وہاں کے کھارے پانی کو آبپاشی کے کام میں لایا جا سکے۔ یونیسکو اور بھی بہت سے ملکوں میں صحراؤں کی چھان بین میں مدد دے رہا ہے اور طاقت کے وسائل کو قبضے میں کرنے کے لیے نئے طریقے معلوم کیے جا رہے ہیں۔ ان میں سورج کی تمازت، زمین کی حرارت اور صحرائی ہوا کی طاقت شامل ہے۔

(۳) مشرق اور مغرب کی ثقافتی قدروں کا باہمی اعتراف۔ ایشیائی اور مغربی ملکوں کے مابین جو غلط فہمیاں پھیلی ہوئی ہیں ان کو دور کرنے کے لیے یونیسکو انتہائی کوشش کر رہا ہے۔ وہ ان بیانات کی حقیقت جاننی چاہتا ہے کہ مغرب مادہ پرست ہے اور ایشیا روحانیت کا دعویدار ہے۔ یونیسکو نے ایسے پروگرام بنائے ہیں جن کے ماتحت ایشیا اور مغرب کے ملکوں کے مابین طلبا، اساتذہ اور تعلیمی سامان کا تبادلہ کیا جا سکے۔ اس مقصد کے لیے اسے مدرسوں اور عجائب گھروں اور دوسرے اداروں سے قریبی تعلق قائم رکھنا پڑتا ہے۔ اس مد میں یونیسکو ۶۹-۱۹ اور ۱۹۷۰ میں ۷ لاکھ ڈالر سے زیادہ رقم صرف کرے گا۔

ڈاکٹر ایونز کا کہنا ہے کہ اس زمانے میں بین الاقوامی کشیدگی کا سب سے بڑا سبب یہ ہے کہ بہت سی قومیں اپنی ثقافت کو دوسروں کی ثقافت سے بہتر سمجھتی اور اس لیے ان کے خلاف حملے کرتی ہیں۔ برتری کا احساس کچھ اقتصادی نظام کے اختلاف نے پیدا کر دیا ہے۔ انفرادی حقوق، خاندانوں کی اہمیت اور ایسی ہی دوسری باتیں بھی نظر انداز ہو رہی ہیں۔ مشرق و مغرب کا منصوبہ بہت ہی اہم ہے۔ اس سے بڑے پیمانے پر رواداری کا جذبہ پیدا ہوگا اور عام طور پر اس حقیقت کو تسلیم کیا جانے لگے گا کہ بہت سی قومیں ظاہری اعتبار سے مختلف ہوتی ہیں لیکن بنیادی طور پر ان میں زیادہ اختلاف نہیں ہوتا۔

مذکورہ بالا منصوبوں کے علاوہ یونیسکو تین اور کام بھی انجام دے گا، جو شاید آگے چل کر اہم منصوبوں کی صورت اختیار کر لیں ان کی تفصیل یہ ہے:-

(د) اس لحاظ سے جائزہ لینا کہ صنعتی فروغ اور فنیات کے تغیر نے معاشرہ پر کیا اثر ڈالا ہے اس کام پر ادارہ ۷۰ ہزار ڈالر خرچ کرے گا۔ صنعتی فروغ سے کسانوں پر جو اثر پڑ رہا ہے وہ ریاست ہائے متحدہ میں سب نے محسوس کر لیا ہے۔ مثال کے طور پر نساگو کے علاقے میں پہاڑی علاقوں کے دیہاتی لوگ اس قدر تعداد میں ترک وطن کر کے جنوب کی وسطی ریاستوں میں آ گئے ہیں کہ ایک دشوار مسئلے کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے خصوصاً اس لیے کہ وہ عام شہری زندگی میں مدغم ہونا بھی نہیں چاہتے۔

(ب) استوائی افریقہ میں ثانوی اور پیشہ ورانہ تعلیم کی ترقی پر ۶ ہزار ڈالر صرف کیے جائیں گے۔ جنوبی امریکہ میں یونیسکو نے ابتدائی اور بنیادی تعلیم کا سلسلہ شروع کر دیا ہے۔ وہاں کے تجربات کو افریقہ میں بھی آزمایا جائے گا۔ یونیسکو اب بھی لازمی ابتدائی تعلیم کو عالمگیر بنانے میں زور دے رہا ہے۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ فنی ماہرین کو تربیت دینے کی ضرورت بھی محسوس کر لی گئی ہے تاکہ وہ مشینوں کے کل پرزوں کو سمجھیں اور انھیں چلا سکیں

(ج) نئے طالب علموں کے لیے تعلیمی سامان کی تیاری بھی ضروری ہے۔ ڈائرکٹر جنرل کا کہنا ہے کہ یونیسکو نے جہالت کے خلاف جو عالمگیر مہم شروع کی ہے اس کے ضمن میں محض لکھنا پڑھنا ہی کافی نہیں ہے۔ کیوں کہ جن بالغوں نے آج لکھنا پڑھنا شروع کیا ہے۔ وہ مناسب تعلیمی سامان نہ ملنے پر کل تک سب کچھ بھول جائیں گے۔ لہٰذا یونیسکو نے تہیہ کیا ہے کہ وہ نو تعلیم یافتہ لوگوں کے لیے تعلیمی سامان تیار کرانے میں حکومتوں کی مدد کرے گا، تاکہ جہالت کا پوری طرح قلع قمع ہو سکے۔

ایجنڈے کی اور شقیں یہ ہیں (۱) سائنس کی تعلیم کو ترقی دینے کے لیے ایک وسیع پروگرام، اس ضمن میں لڑکیوں کے لیے درسی مواقع بڑھانے پر بھی زور دیا جائے گا (۲) فلسطین کے عرب مہاجرین کی تعلیم و تربیت میں امداد کا سلسلہ جاری رکھا جائے (۳) تعلیم بالغاں کے موضوع پر ایک عالمگیر کانفرنس منعقد کی جائے (۴) مواصلاتی وسیلوں کی ترقی پر توجہ مبذول کی جائے (۵) صحافیوں کو تربیت دی جائے (۶) فلم کا ایک بین الاقوامی ادارہ قائم کیا جائے (۷) تعلیم کے ضمن میں صوتی اور بصری ذرائع استعمال کیے جائیں اور (۸) ثقافتی تبادلوں کے لیے ریڈیو استعمال کیا جائے۔

ایشیا کے معدنی وسائل کا مسئلہ

ایشیا میں معدنی وسائل کی ترقی کے متعلق ایکیفے سب کمیٹی کا اجلاس نومبر میں کلکتہ میں ختم ہو گیا

دوران مذاکرات میں اس علاقے کے معدنی ذخائر پر بھی تبادلۂ خیالات ہوا جن میں ریڈیائی اثرات پائے جاتے ہیں علاوہ ازیں معدنی تحقیقات کے لیے فضائی جائزوں کے استعمال اور معدنی و طبقاتی تحقیقات کے ضمن میں تربیت یافتہ عملے کی ضرورت پر زور دیا گیا۔

اجلاس میں فیصلہ ہوا کہ پٹرولیم کے ذرائع کو ترقی دینے کے موضوع پر ایشیائی علمی اجتماع اگلے سال بھارت میں منعقد کیا جائے۔ سب کمیٹی نے یہ بھی طے کیا کہ ایکیفے اور اقوام متحدہ کی فنی امداد کے ادارے کے مشترکہ اہتمام میں ایشیا کے ماہرین معدنیات و طبقات الارض کو ۱۹۵۹ء میں ریاست ہائے متحدہ امریکہ اور کینیڈا کا دورہ کرانے کے انتظامات شروع کرا دیے ہیں۔

ریڈیائی اثرات والی دھاتوں کی تحقیقات سے متعلق اجلاس میں زور دیا گیا کہ اس مقصد کے لیے ایسے طریقے استعمال کیے جائیں جو کم خرچ ہوں اور زیادہ ماہرین کی ضرورت نہ پڑے۔ کیوں کہ ایشیا میں ان کی سخت کمی ہے۔ سب کمیٹی نے زیادہ مقدار میں اور مسلسل غیر ملکی امداد کا مطالبہ کیا تاکہ معدنی اور طبقاتی تحقیقات کے لیے فنی ماہرین کا جو عام قحط ہے اسے دور کیا جا سکے۔

معدنی اشیا کی تجارت کو ترقی دینے کے سلسلے میں سب کمیٹی نے طے کیا کہ دھاتوں کی گلائی اور صفائی زیادہ تر علاقے ہی میں ہو۔ اس نے مشورہ دیا کہ اقوام متحدہ کے زیر اہتمام ایشیائی ماہرین اعداد و شمار کی جب کانفرنس ہو تو وہ معدنی اشیا کی تجارت سے متعلق صحیح اعداد و شمار موجود نہ ہونے کے پہلو پر غور کرے۔

ایشیا میں بجلی کی ضروریات کا پہلے سے منصوبہ بنانے کی اہمیت پر زور دیتے ہوئے سب کمیٹی نے ایکیفے سے کہا کہ وہ اس ضمن میں مقررہ مدت کے بعد باقاعدہ اطلاعات دیا کرے۔ کوئلے اور خام لوہے کا بھی ذکر آیا کیوں کہ ایشیا میں صنعتی ترقی کے لیے ان میں اضافہ نہایت ضروری ہے۔ دلدلی کوئلہ استعمال کرنے کے امکانات پر بھی غور کیا جائے۔

بھارت کے مختلف علاقوں میں دھاتوں کو صاف کرنے کے جو کارخانے اور ادارے قائم ہیں ان کا معائنہ کرنے کے لیے ماہرین نے ۱۷ نومبر سے دورہ شروع کر دیا ہے۔

اگلے سال کے لیے اقوام متحدہ کی فنی امداد:۔ اقوام متحدہ کی فنی امداد کے بورڈ کے ایگزیکٹو چیرمین

مسٹر ڈیوڈ اوون نے فنی امدادی کمیٹی کے اجلاس میں جو صدر مقام پر منعقد ہوا تھا، فنی امداد کے اگلے سال کے لیے توسیعی پروگرام کی تفصیل بیان کی۔ فنی امداد کی کمیٹی، ادارے کی پالیسی مرتب کرتی ہے، اور فنی امداد کے سالانہ توسیعی پروگرام کو جو ادارے کا بورڈ مرتب کرتا ہے غور و خوض کے بعد منظور کرتی ہے۔

سرمائے کی کمی :۔ مسٹر اوون نے بتایا کہ بورڈ نے اگلے سال اس میدان عمل میں ۲ کروڑ ۹ لاکھ ۲۵ ہزار ۸۷۲ ڈالر خرچ کرنے کی سفارش کی تھی۔ مطلب یہ کہ ۱۹۵۷ء میں فنی امداد کی کمیٹی نے جو بجٹ منظور کیا تھا اس سے یہ رقم بقدر دو لاکھ ڈالر کم تھی۔

انہوں نے واضح کیا کہ تمام مجوزہ منصوبوں کو عمل میں لانے کی صورت میں مالی وسائل سے تقریباً دس لاکھ ڈالر زیادہ خرچ کرنے پڑتے۔ لیکن بورڈ نے اپنی ذمہ داریوں کا جائزہ لینے کے بعد فیصلہ کیا کہ اس موقع پر پروگرام میں کتر بیونت کرنا عقل بندی کے خلاف ہوگا۔ اراکین نے محسوس کیا کہ مجوزہ اخراجات میں کمی کی سفارش پیچیدگیاں پیدا کرے گی۔ اس لیے مناسب ہے کہ مزید چندے جمع کرنے کی صورت پیدا کی جائے۔

افریقہ کے لیے امداد :۔ ایگزیکٹو چیئرمین نے بتایا کہ اگلے سال کے پروگرام میں جو اضافے ہوئے ہیں ان میں قابل قدر امداد براعظم افریقہ کے لیے مخصوص کی گئی ہے، یعنی میزانیہ کی ۳۴ فی صد رقم وہاں کے ملکوں پر خرچ کی جائے گی۔ جبکہ پچھلے سال رقم کا تناسب ۷ء۲۰ فی صدی تھا۔ امداد کے سلسلے میں چار نئے آزاد ملکوں یعنی گھانا، مراکش، سوڈان اور تیونس پر سب سے زیادہ توجہ دی جا رہی ہے۔ اسی طرح ایشیا میں نو آزاد ملک ملایا میں زائد منصوبوں کو عمل میں لانے کا فیصلہ کیا گیا ہے۔ اس طرح پروگرام کے باقی حصوں میں کمی کر دینی پڑی ہے۔ گویا باقی دنیا کو نسبتاً کم امداد دی جائے گی۔

مسٹر اوون نے بتایا کہ اس سنگاہت کے پیش نظر کہ نو آزاد ملک زیادہ امداد کے مستحق ہیں۔ بعض ممبر ملکوں خصوصاً انڈونیشیا، برما، بھارت، اسرائیل، مصر اور یوگوسلاویہ سے درخواست کی گئی تھی کہ وہ اپنے پروگرام میں کمی قبول کرکے زیادہ سے زیادہ قربانی کا ثبوت دیں، اور یہ امر باعث مسرت ہے کہ ان ملکوں نے درخواست مان لی ہے۔

مزید ماہرین کا مطالبہ :۔ امداد کی قسموں کا ذکر کرتے ہوئے مسٹر اوون نے کہا کہ وظائف

اور آلات و سامان کے لیے حکومتوں کے مطالبات میں زبردست کمی ہوئی ہے۔ اس کے برعکس فنی ماہرین کی
پر زیادہ زور دیا جا رہا ہے۔ چناں چہ اگلے سال کے پروگرام کو پوری طرح عمل میں لایا گیا تو اس کا مطلب یہ ہوگا
ماہرین کی تعداد میں ساڑھے چار سو کا اضافہ کر کے کل تعداد دو ہزار سات سو ستر کر دینی پڑے گی۔ ایسے منصو
پر خاص زور دیا جا رہا ہے جن کے لیے ماہرین کی جماعتیں درکار ہوں گی۔ بعض بڑے پیمانے کے منصوبے
بھی ہیں جن میں سے ہر ایک کے لیے بیک وقت ۱۷ ماہرین تک کی ضرورت ہوگی۔

طبقاتی کام:- حکومتوں نے طبقاتی فنی امداد کے منصوبوں میں بھی زیادہ دلچسپی کا اظہار کیا ہے۔
ایسی کئی مثالیں موجود ہیں۔ ان میں سب سے زیادہ قابل ذکر یہ درخواست ہے کہ وسطی امریکہ کے لیے اقتصا
تعاون کی ایک کمیٹی قائم کی جائے۔ بعض اہم طبقاتی منصوبے محض وسائل نہ ہونے کے باعث ملتوی کر

امداد کی نوعیت:- ایگزیکٹو چیئرمین نے مثالوں کے ذریعہ سمجھایا کہ اقوام متحدہ کی طرف سے
کس کس قسم کی امداد دی جا رہی ہے۔ مثلاً افغانستان میں شہری پرواز کی ترقی سے لے کر برما میں معدنیا
کی تلاش تک اور برازیل میں دریاؤں کو بہتر بنانے تک اس کی نوعیت مختلف ہے۔

مسٹر اووین نے بتایا کہ بہت سی حکومتوں کو زائد امداد دینے کی ضرورت ہے۔ اور اس ضرورت کا
احساس اس طرح ہوتا ہے کہ ان حکومتوں نے اپنے متعدد منصوبوں کو جو بلا شبہ بڑی اہمیت رکھتے ہیں محض
اس لیے ملتوی کر دیا ہے کہ ان کو عمل میں لانے کے لیے ان کے پاس سرمائے کی کمی ہے۔

یونی سیف کے چار لاکھ ٹن دودھ کی تقسیم

یونی سیف کے ایگزیکٹو ڈائرکٹر مسٹر مورس پیٹ کے بیان کے مطابق اقوام کے بچوں کے اس فنڈ نے پچھ
دس سال میں ضرورت مند بچوں اور ماؤں کے لیے تقریباً چار لاکھ ٹن دودھ کا خشک سفوف تقسیم کیا ہے۔

اس سال ۸۴ ملکوں اور علاقوں میں یونی سیف کا دودھ ۴۵ لاکھ سے زیادہ ضرورت مندوں کو فراہم کی
جا رہا ہے۔ یہ زیادہ تر مدرسوں میں صبح کے وقت یا بعد دوپہر دیا جاتا ہے۔ پاکستان میں تقریباً ۵۸ ہزار ماؤں اور
بچوں کو دودھ کے خشک سفوف کی صورت میں بہتر غذا فراہم کی جا رہی ہے، اور یہ کام زیادہ تر مشرقی پاکستان میں
ماؤں اور بچوں کی فلاح و بہبود کے مرکزوں سے ہو رہا ہے۔ یونی سیف نے اس مقصد کے لیے ۴۴ لاکھ ۴۲ ہزار ڈالر